فَسْئَلُوْا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ

إنما شفاء العي السؤال

احسن الفتاویٰ

بحذف مکررات وتخریجات زائد مسائل غیر مہمہ

جلد ۲

(از)

فقیہ العصر مفتی اعظم حضرت مفتی رشید احمد صاحب دامت برکاتہم

(واحد تقسیم کنندگان)

ایچ ایم سعید کمپنی

ادب منزل پاکستان چوک کراچی

فہرست مضامین احسن الفتاویٰ جلد چہارم

رسائل

شخص وتر کی قضا مسجد میں پڑھتا ہے اور اس خیال سے کہ لوگوں کو معلوم نہ ہو تیسری رکعت میں تکبیر قنوت کے لئے رفع یدین نہیں کرتا تو کیا اس کی وتر کی نماز صحیح ہو جائیگی؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

قضا نمازوں کو مخفی طور پر ادا کرنا چاہئے لیکن مسجد میں ادائیگی کو علانیہ نہیں کہا جائے گا لوگوں کو کیا معلوم کہ نوافل پڑھ رہے ہیں یا قضا، البتہ نماز عصر کے بعد اور بوقت فجر لوگوں کے سامنے قضا نماز نہ پڑھے، کیونکہ اس وقت میں نوافل مکروہ ہیں، لہٰذا دیکھنے والے اس نماز کو قضا ہی سمجھیں گے اور گناہ کا اظہار بھی مستقل گناہ ہے، لوگوں کے سامنے وتر کی قضا میں دعاء قنوت سے قبل تکبیر کہے مگر ہاتھ نہ اٹھائے۔ قال فی الشامیۃ عن الامداد اما فی القضاء عند الناس فلا یرفع حتی لا یطلع احد علی تقصیرہ اھ (رد المحتار ص ج ۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۴ ربیع الآخر سنہ ۹۵ھ

وتر کی قضا علانیہ کرے تو تکبیر قنوت میں ہاتھ نہ اٹھائے:

سوال: قضا نماز مخفی طور پر ادا کرنی چاہئے، مگر وتر کی قضا میں تیسری رکعت میں دعاء قنوت سے پہلے تکبیر کے لئے ہاتھ اٹھائیگا تو لوگوں کو معلوم ہو جائیگا اس صورت میں کیا کرے؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

ایسی صورت میں قنوت کے لئے تکبیر کہے مگر ہاتھ نہ اٹھائے، قال ابن عابدین رحمہ اللہ تعالیٰ تحت (قولہ کالقنوت) وھذا کما فی الامداد عن مجمع الروایات لو فی الوقت، اما فی القضاء عند الناس فلا یرفع حتی لا یطلع احد علی تقصیرہ اھ (رد المحتار ص ج ۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۴ ربیع الآخر سنہ ۹۰ھ

عصر کی قضا مغرب سے پہلے پڑھے:

سوال: عصر کی نماز فوت ہو گئی تو اذان مغرب کے بعد عصر کی قضا پڑھے یا مغرب کی نماز ادا کرے حالانکہ جماعت بھی ہونیوالی ہے؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

اگر یہ شخص صاحب ترتیب ہے تو پہلے عصر کی قضا پڑھے پھر مغرب کی نماز ادا کرے فوت جماعت کو سقوط ترتیب کے لئے سبب قرار نہیں دیا گیا۔ اور اگر صاحب ترتیب نہیں تو پہلے نماز مغرب جماعت کے ساتھ ادا کرے، بعد میں عصر کی قضا پڑھے، صاحب ترتیب وہ ہے

جس کے ذمہ چھ نمازیں قضا رہ گئی ہوں، قال فی التنویر الترتیب بین الفروض الخمسۃ والوتر اداءً وقضاءً لازم (ویبدأ سطر) لا اذا ضاق الوقت او نسیت الفائتۃ او فاتت ست اعتقادیۃ بخروج وقت السادسۃ (رد المحتار ص۶۸۹ ج۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۱۲ جمادی الاولیٰ سنہ ۹۰ھ

چھ نمازوں سے کم قضا ہوں تو ان میں ترتیب واجب ہے:

سوال: زید سے تقریباً دو ماہ کی نمازیں قضا ہو گئیں، سب قضا کرنے کے بعد اب اگر ایک دو نمازیں قضا ہوں تو یہ صاحب ترتیب ہوگا یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

صورت مذکورہ میں جب تک دوبارہ چھ نمازیں قضا نہ ہوں صاحب ترتیب رہے گا، قال فی التنویر الترتیب بین الفروض الخمسۃ والوتر اداءً وقضاءً لازم (الی قولہ) الا اذا ضاق الوقت او نسیت الفائتۃ او فاتت ست اعتقادیۃ وفی الشامیۃ خرج الفرض العملی وهو الوتر والنفل فان الترتیب بینه وبین غیره وان کان فرضاً لکن لا یحسب مع الفوائت اھ (رد المحتار ص۶۸۶ ج۱)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲۲ ذی الحجہ سنہ ۹۲ھ

نمازوں کی قضا کے لئے سنن اور اہم نوافل نہ چھوڑے:

سوال: کیا یہ جائز ہے کہ سنت، نفل اور تراویح کی بجائے اس وقت میں قضا نمازیں پوری کرنے کی کوشش کروں، بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

قضا نمازیں پڑھنے کے لئے سنت مؤکدہ اور تراویح نہ چھوڑیں، بلکہ حضرات فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ نوافل ماثورہ مثل چاشت، اوابین اور صلوٰۃ التسبیح وغیرہ کو بھی قضا پر مقدم فرماتے ہیں، مگر یہ اس صورت میں معلوم ہوتا ہے کہ اسباب ظاہرہ کے پیش نظر موت سے قبل قضا نمازوں سے سبکدوشی کی توقع ہو، اگر قضا نمازیں بہت زیادہ ہیں اور عمر کم نظر آرہی ہے تو اصولاً نوافل پر قضا کو ترجیح لازم ہے، قال فی شرح التنویر ویجوز تاخیر الفوائت وان وجبت علی الفور لعذر السعی علی العیال وفی الحوائج علی الاصح اھ وفی الشامیۃ (قولہ وفی الحوائج) ای المحتاج الیہا ... ما یحتاج لنفسہ من جلب نفع ودفع ضرر واما النفل فقال فی المضمرات الاشتغال بقضاء الفوائت اولیٰ واہم من النوافل

برکۃ عن عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ (طحطاوی علی العلائیۃ ص ۲۰ ج ۱)

قول اول زیادہ مشہور ہے اور باب قضاء الفوائت میں زیادہ تر اسی کو ذکر کیا ہے، مگر علامہ شامی نے نماز وقت عشاء میں صرف قول ثالث ذکر فرمایا ہے جو دلیل کی حیثیت سے، نیز بعض کتب میں باب صلوٰۃ المسافر میں اثناء نماز میں خروج وقت کے بعد نیت اقامت کو غیر معتبر قرار دیا ہے جو اسی قول ثالث پر مبنی ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۱۰ محرم سنہ ۹۰ھ

سفر کی قضاء حضر میں اور حضر کی سفر میں:

سوال: اگر سفر کی نماز کی قضاء سفر ختم ہوجانے کے بعد کرے تو کیا ظہر اور عصر اور عشاء کی نمازوں کے لئے دو رکعت قصر ہی کی نیت کرے یا پوری چار رکعت ادا کی جائے؟ کیونکہ اب سفر کی حالت نہیں ہے، اور اس کے برعکس صورت میں اگر سفر میں سابقہ نمازوں کی جو چار چار رکعت پڑھنا چاہئے تھی قضاء کرے تو مذکورہ نمازوں میں پوری چار چار رکعت پڑھے یا دو دو؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

نماز سفر کی قضاء میں قصر کرے اگرچہ سفر ختم ہونے کے بعد ہو، اور نماز حضر کی قضاء پوری پڑھے اگرچہ سفر میں ہو۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲۲ جمادی الاولیٰ سنہ ۹۹ھ

وتر کی قضاء میں بھی ترتیب لازم ہے:

سوال: کیا قضاء نمازوں میں وتر عشاء کے فرضوں سے پہلے بھی پڑھ لینے کی اجازت ہے یا فرضوں کے تابع ہونے کی شرط اس میں بھی ہے؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

قضاء میں بھی فرض اور وتر کے مابین ترتیب لازم ہے، البتہ غیر صاحب ترتیب کی قضاء میں دوسری نمازوں کی طرح فرض اور وتر کے درمیان بھی ترتیب ساقط ہے، جس کے ذمہ پانچ فرض نمازوں سے زیادہ قضاء ہوں وہ غیر صاحب ترتیب ہے، اس تعداد میں وتر داخل نہیں، وتر کے علاوہ چھ یا اس سے زائد فرائض قضاء ہوں تو ترتیب ساقط ہوگی۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۹ ذی قعدہ سنہ ۹۹ھ

صاحبِ ترتیب کی تعریف :

سوال : قضاء نمازوں میں ترتیب کس شخص پر ضروری ہے ؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

جس کے ذمہ چھ فرض نمازیں قضاء نہ ہوں وہ صاحب ترتیب ہے ، چھ یا زیادہ فرائض کی قضاء اس کے ذمہ ہو تو اس پر ترتیب لازم نہیں ، وتر شمار نہیں کئے جائیں گے مثلاً ایک فجر سے دوسری فجر تک کی نمازیں قضاء ہو گئیں تو ان کی قضاء میں ترتیب لازم نہیں اس سے کم قضاء ہوں تو ترتیب لازم ہے ، فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۹ ذی قعدہ سنہ ۹۹ھ

خوفِ فوتِ جمعہ مسقطِ ترتیب نہیں :

سوال : کسی کی فجر کی نماز قضاء ہو گئی اور بوقت جمعہ یاد آئی ، اب اگر قضاء پڑھتا ہے تو جمعہ فوت ہو جائے گا اس کے لئے شرعاً کیا حکم ہے ؟

الجواب باسم ملہم الصواب

اگر صاحب ترتیب ہے تو فجر کی قضاء پہلے پڑھے اسکے بعد جمعہ مل جائے تو بہتر ورنہ ظہر کی نماز پڑھے ، نقل فی الشامیۃ عن التاتارخانیۃ انہ یصلیہا عندہما وان خاف فوت الجمعۃ مع الامام ثم یصلی الظہر وعند محمد یصلی الجمعۃ ثم یقضی الفجر اھ (رد المحتار ص ۶۴۳ ج ۱)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲۹ شعبان سنہ ۱۴۰۰ھ

فدیۂ نماز کی مقدار : ۲٫۲۵ کلوگرام گیہوں کی قیمت ،
میت کی طرف سے اس کا بیٹا فدیۂ نماز ادا کر سکتا ہے :

یہ دونوں مسئلے غلطی سے جلد ۳ باب صفۃ الصلوٰۃ میں درج ہو گئے ہیں ، وہاں دیکھ لئے جائیں اور ان کی مکمل تحقیق کے لئے جلد ہذا باب صدقۃ الفطر کے آخر میں رسالہ "بسط الباع لتحقیق الصاع" ملاحظہ ہو ۔ (مرتب)

باب سجود السہو

سورت یا دعاء قنوت سہواً چھوٹ گئی تو سورت کیلئے قیام کیطرف لوٹے قنوت کیلئے نہیں :

سوال : ایک شخص سے سورت یا دعاء قنوت متروک ہوگئی رکوع میں جاکر یاد آیا تو رکوع کو چھوڑ کر قیام کرکے سورت یا قنوت پڑھی تو نماز صحیح ہوگی یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب ومنه الصدق والصواب

اگر سورت رہ گئی تو رکوع چھوڑ کر قیام کی طرف رجوع کرے اور سورت پڑھے اگرچہ رکوع تمام کرکے قومہ کی طرف منتقل ہوچکا ہو، پھر دوبارہ رکوع کرکے آخر میں سجدۂ سہو کرے۔ اگر دوبارہ رکوع نہ کریگا تو نماز نہ ہوگی۔ اگر یاد آجانے کے باوجود قیام کی طرف نہ لوٹا تو اس کا حکم صراحۃً نظر سے نہیں گزرا، البتہ فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ کی تعبیر سے قیام کی طرف رجوع کا وجوب معلوم ہوتا ہے لہٰذا عمداً ترک واجب کی وجہ سے نماز واجب الاعادہ ہوگی، اور اگر قنوت چھوٹ گئی تو رکوع سے عود الی القیام نہ کرے صرف آخر میں سجدۂ سہو کرے، عود کی صورت میں بھی نماز فاسد نہ ہوگی اس صورت میں رکوع کا اعادہ نہ کرے سجدۂ سہو کرے۔ اگر رکوع دوبارہ کرلیا تو بھی سجدۂ سہو کرلینے سے نماز ہوجائے گی اور اگر ایک سورت پڑھ کر دوسری سورت کے لئے رکوع سے قیام کی طرف رجوع کیا تو اسکا حکم بعینہٖ قنوت کی طرح ہے۔ (راجع التفصیل فی شرح التنویر وحاشیتہ لابن عابدین باب سجود السہو)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۱۲ ذی قعدہ سنہ [illegible] ھ

سوال مثل بالا :
رکوع میں جانے کے بعد یاد آیا کہ سورت نہیں پڑھی تو کیا سجدۂ سہو کرلینے سے نماز ہوجائے گی؟
بینوا توجروا

الجواب باسم ملهم الصواب

رکوع میں یا قومہ میں ترک سورت یاد آگیا تو سورت پڑھکر دوبارہ رکوع کرے اور سجدۂ سہو کرے، بدون سورت پڑھے سجدۂ سہو کرلیا تو بھی نماز واجب الاعادہ ہے،
اگر امام کو سری نماز میں ایسی صورت پیش آجائے اور کثرت جماعت کی وجہ سے رکوع

قعدہ اخیرہ چھوڑنے سے فرض نفل بن گئے تو سجدۂ سہو نہیں:

سوال: صلوٰۃ ظہر میں قعدہ اخیرہ بھول گیا اور رکعت خامسہ کو مقید بسجدہ بھی کر لیا تو سجدۂ سہو ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب ومنہ الصدق والصواب

اس صورت میں سجدۂ سہو نہیں، قال فی شرح التنویر ولا یسجد للسہو علی الاصح لان النقصان بالفساد لا ینجبر وفی الشامیۃ (قولہ لان النقصان) ای الحاصل بترک القعدۃ لا ینجبر بسجود السہو فان قلت انہ وان فسد فرضا فقد صح نفلا ومن ترک القعدۃ فی النفل ساہیا وجب علیہ سجود السہو فلماذا لم یجب علیہ السجود نظرا لہذا الوجہ قلت انہ فی حالۃ ترک القعدۃ لم یکن نفلا انما تحقق النفلیۃ بتقیید الرکعۃ بسجدۃ والفرضیۃ عارضۃ اھ (رد المحتار ص ۵۵۳ ج ۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۱۴ رجب سنہ ۸۸ھ

چار رکعت نفل میں قعدہ اولیٰ پر سلام پھیر دیا تو سجدۂ سہو نہیں:

سوال: چار رکعت نفل کی نیت باندھی اور قعدۂ اولیٰ پر سہواً سلام پھیر دیا، بعدہ یاد آیا تو ثالثہ کی طرف قیام کر کے شفع ثانی کامل کیا تو سجدۂ سہو لازم ہوگا یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب ومنہ الصدق والصواب

اس صورت میں سجدۂ سہو نہیں، کیونکہ نوافل میں اربع رکعات کی نیت سے صرف شفع واحد ہی واجب ہوتا ہے، جب شفع ثانی واجب ہی نہیں تو سلام پھیرنے سے تاخیر فی الفرض واقع نہ ہوئی جو سبب تھا وجوب سجدہ کا، باقی رہا یہ سوال کہ شفع ثانی صحیح ہوا یا نہیں؟ پس ثالثہ کی طرف قیام کرتے وقت تکبیر کہی ہو تو یہ تکبیر تحریمہ کے قائم مقام ہو جائے گی۔ فقہ میں اس کے نظائر موجود ہیں کہ فقط تکبیر کو گرچہ تحریمہ کے سوا کسی اور نیت سے کہی ہو بمنزلہ تحریمہ کے قرار دیا گیا اور نیت کا اعتبار نہیں کیا گیا۔ لہٰذا شفع ثانی صحیح ہو جائے گا۔ البتہ اگر ثالثہ کی طرف قیام کے وقت تکبیر نہیں کہی تو شفع ثانی کی ابتداء صحیح نہیں ہوئی۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲۲ رجب سنہ ۸۸ھ

عہ وفیہ الخ القیام من شفعہ الاول التحریمۃ وعلیہ تصحیح جواز العبارۃ انہ لو کبر للقیام اذا سلم ساہیا وقد قعد العقود ... ساہیا لا یبطل لانہ دعاء ... (رد المحتار ص ۴۰۳ ج ۱) منہ

دو رکعت نفل کی نیت کی اور قعدہ کے بعد سہواً دو رکعتیں اور پڑھ لیں تو سجدہ سہو نہیں:

سوال: دو رکعت نفل کی نیت سے نماز شروع کی، قعدہ کے بعد سہواً تیسری رکعت کیلئے قیام کیا اور شفع ثانی کامل کرلیا تو اس پر سجدہ سہو لازم ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب ومنہ الصدق والصواب

جب بناء النفل علی النفل بلا سلام جائز ہے تو سجدہ سہو کا کوئی سبب نہیں، بلکہ جب چار رکعت نفل کی نیت باندھی جائے تو بھی بتصریح فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ شفع واحد ہی واجب ہوتا ہے، چار کی نیت کا کوئی اعتبار نہیں، بلا تسلیم اور بلا تکبیر تحریمہ کے محض قیام الی الثالثہ سے شفع ثانی لازم ہوتا ہے، معہذا اس صورت میں سجدہ سہو نہیں تو اس پر قیاس کرتے ہوئے صورت مسئولہ میں بھی سجدہ سہو نہ ہوگا، کیونکہ اس میں بھی شفع ثانی کا وجوب قیام الی الثالثہ سے ہوا ہے۔ قال فی شرح التنویر وکل شفع منہ صلوٰۃ وفی الشامیۃ کأنہ واللہ اعلم تمکنہ من الخروج علی رأس الرکعتین فاذا قام الی شفع آخر کان بانیا صلوٰۃ علی تحریمۃ صلوٰۃ ومن ثم صرحوا بانہ لو نوی اربعا لا یجب علیہ بتحریمتہا سوی الرکعتین فی المشہور عن اصحابنا ولأن القیام الی الثالثۃ بمنزلۃ تحریمۃ مبتدأۃ حتی ان فساد الشفع الثانی لا یوجب فساد الشفع الاول (رد المحتار باب صفۃ الصلوٰۃ ج ۱ ص ۴۳۸) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲۲ رجب سنہ ۷۰ھ

امام کے سجدہ سہو کے بعد شریک ہونے والے پر سجدہ سہو نہیں:

سوال: اگر کوئی امام کے ساتھ ایسی حالت میں شریک ہوا کہ امام سہو کے سجدوں میں سے ایک یا دونوں کرچکا تھا تو اس کا کیا حکم ہے؟ بینوا توجروا

الجواب ومنہ الصدق والصواب

اگر دوسرے سجدہ میں شریک ہوا تو اس پر پہلا سجدہ نہیں، اور اگر دونوں کے بعد شریک ہوا تو دونوں سجدے اس سے ساقط ہیں۔ قال فی الہندیۃ فی فصل سہو الامام من الباب الثانی عشر ولو دخل معہ بعد ما سجد سجدۃ السہو یتابعہ فی الثانیۃ ولا یقضی الاولیٰ وان دخل معہ بعد ما سجدھما لا یقضیہما کذا فی التبیین (عالمگیریۃ ج ۱ ص ۱۲۹) وھکذا فی الشامیۃ ایضاً فی باب سجود السہو ج ۱ ص ۶۹۶) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲۳ صفر سنہ ۶۹ھ

مسبوق امام کے ساتھ سجدۂ سہو سے قبل کھڑا ہوگیا:

سوال: مسبوق کو سہو امام کا علم نہ تھا۔ اس لئے سجدۂ سہو سے پہلے قیام کرلیا، بعد میں سجدۂ سہو کا علم ہوا تو کیا کرے؟ بینوا توجروا

الجواب ومنہ الصدق والصواب

جب تک رکعت کو مقید بسجدہ نہیں کیا واپس لوٹ کر امام کی متابعت کرے اور اگر مقید بسجدہ کرلیا ہے تو واپس نہ آئے بلکہ آخر میں سجدۂ سہو کرے، اس صورت میں عود کرنے سے نماز فاسد ہوجائے گی۔ قال فی فصل سہو الامام من الباب الثانی عشر من الہندیۃ ولو لم یتابع الامام فی سجود السہو وقام الی القضاء لا یسقط عنہ ویسجد فی آخر صلاتہ ولو علم الامام فقام المسبوق ثم تذکر الامام ان علیہ سہوا فسجد لہ قبل ان یقید المسبوق الرکعۃ بسجدۃ فعلیہ ان یرفض ذلک ویعود الی متابعتہ ثم اذا سلم الامام قام الی القضاء ولا یعتد بما فعلہ من القیام والقراءۃ والرکوع ولو لم یعد الی متابعۃ الامام ومضی علی قضائہ فانہ تجوز صلاتہ ویسجد للسہو بعد فراغہ استحسانا ولو سجد الامام بعد ما قید ہذا المسبوق الرکعۃ بسجدۃ فانہ لا یعود فان عاد الی متابعتہ فسدت صلاتہ کذا فی السراج الوہاج (عالمگیریہ جلد ۱ ص ۹۲) وایضا قال فی الفصل السابع من الباب الخامس لو قام الی قضاء ما سبق بہ وعلی الامام سجدتا السہو قبل ان یدخل معہ کان علیہ ان یعود فیسجد معہ ما لم یقید الرکعۃ بسجدۃ فان لم یعد حتی سجد یمضی وعلیہ ان یسجد فی آخر صلاتہ (عالمگیریہ ج ۱ ص ۹۲) والعبارتان المذکورتان مذکورتان فی الشامیۃ ایضا بتغییر یسیر واحدہما فی بیان المسبوق ج ۱ ص ۵۵۵ وص ۵۵۹ والاخری فی باب سجود السہو ج ۱ ص ۶۹۶۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲۴ صفر سنہ ۹۶ھ

مسبوق نے امام کے ساتھ سلام پھیر دیا:

سوال: مسبوق نے بھول کر امام کے ساتھ سلام پھیر دیا اور سلام کے بعد یاد آنے پر اپنی بقیہ رکعت پوری کرلی تو اس پر سجدۂ سہو لازم ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

اگر امام کے ساتھ اس طرح سلام پھیرا کہ امام کے لفظ سلام کی میم کے ساتھ مسبوق نے بھی

سلام کی میم کہہ لی تو اس پر سجدۂ سہو نہیں، اس سے تاخیر ہو گئی تو سجدۂ سہو واجب ہو گا اس لئے کہ لفظ سلام سے اقتدا ختم ہو جاتی ہے، عموماً مقتدی کا لام امام کے سلام کے بعد ہوتا ہے اس لئے سجدۂ سہو لازم ہے۔ قال فی الشامیۃ تحت قولہ والمسبوق یسجد مع امامہ فاذا سلم الامام قام الی القضاء فان سلم فان کان عامدا فسدت والا لا ولا سجود علیہ ان سلم سہوا قبل الامام او معہ وان سلم بعدہ لزمہ لکونہ منفردا حینئذ بحر واراد بالمعیۃ المقارنۃ وھو نادر الوقوع کما فی شرح المنیۃ (رد المحتار ص۴۶۲ ج۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۵ ذی الحجہ سنہ ۹۲ھ

امام نے بلا وجہ سجدۂ سہو کیا تو مسبوق کی نماز کا حکم:

سوال: اگر امام نے اس گمان پر سجدۂ سہو کیا کہ اس پر سجدۂ سہو واجب ہے بعد میں معلوم ہوا کہ سجدہ واجب نہ تھا تو کیا مسبوق کی نماز فاسد ہو جائے گی؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

اصل قاعدہ کے مطابق تو مسبوق کی نماز فاسد ہو جاتی ہے مگر اکثر مساجد میں غلبۂ جہل کی وجہ سے عدم فساد کا فتویٰ دیا گیا ہے، اس لئے مسبوق کو ایسی صورت کا علم ہو جائے تو نماز لوٹا لے۔

قال فی الخانیۃ اذا ظن الامام ان علیہ سہوا فسجد للسہو وتابعہ المسبوق فی ذلک ثم علم ان الامام لم یکن علیہ سہو فیہ روایتان واختلف المشایخ لاختلاف الروایتین واشہرھما ان صلوۃ المسبوق تفسد وکان الشیخ الامام ابو حفص الکبیر رحمہ اللہ تعالیٰ یقول لا تفسد وان لم یعلم ان لم یکن سہو علی الامام لم تفسد صلوۃ المسبوق فی قولہم (قاضیخان ص۱۲۳ ج۱)

وفی العلائیۃ ولو ظن الامام السہو فسجد لہ فتابعہ فبان ان لا سہو فالاشبہ الفساد لاقتدائہ فی موضع الانفراد۔

وفی الشامیۃ (قولہ فالاشبہ الفساد) وفی الفیض وقیل لا تفسد وبہ یفتی وفی البحر عن الظہیریۃ قال الفقیہ ابو اللیث فی زماننا لا تفسد لان الجہل فی القراء غالب اھ واللہ اعلم (رد المحتار ص۵۰۷ ج۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۳ شوال سنہ ۹۶ھ

قعدۂ اخیرہ میں تشہد یا درود کے تکرار سے سجدۂ سہو نہیں:

سوال: اگر کسی نے آخری قعدہ میں تشہد یا درود شریف کل یا بعض، عمداً یا سہواً دوبار

پڑھ لیا تو اس پر سجدۂ سہو واجب ہوگا یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

سجدہ سہو واجب نہیں، اس لئے کہ یہ دعاء و ثناء کا موقع ہے خواہ اس میں کتنا ہی طول ہو، قال ابن نجیم رحمہ اللہ تعالیٰ ولو کرر التشہد فی القعدۃ الاخیرۃ فلا سہو علیہ (البحر الرائق ج ۲)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲ر محرم سنہ ۸۸ھ

قعدہ اولیٰ میں تکرار تشہد سے سجدہ سہو واجب ہے:

سوال: اگر قعدہ اولیٰ میں پورا تشہد یا کچھ حصہ دوبارہ پڑھ لیا تو اس کا کیا حکم ہے، سجدہ سہو واجب ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

قعدہ اولیٰ میں تکرار تشہد سے فرض قیام الی الثالثۃ میں تاخیر لازم آتی ہے، اس لئے بصورت عمد نماز واجب الاعادہ ہے اور بصورت سہو سجدہ سہو لازم ہے، اگر تاخیر بقدر رکن ہو یعنی بقدر تین بار سبحان ربی الاعلیٰ عہ ۲۸ حروف مقروءہ ہو، اس سے کم تکرار پر سجدۂ سہو نہیں، قال ابن نجیم رحمہ اللہ تعالیٰ لو کرر التشہد فی القعدۃ الاولیٰ فعلیہ السہو لتاخیر القیام (البحر الرائق ص ۹۹ ج ۲)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲ر محرم سنہ ۹۰ھ

قعدہ اولیٰ میں کتنی زیادتی موجب سجدہ سہو ہے:

سوال: آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ کسی رکن میں تین تسبیح کی مقدار سے جو سجدہ سہو کا حکم ہو اس سے تین بار سبحان اللہ مراد نہیں بلکہ تین بار سبحان ربی العظیم یا سبحان ربی الاعلیٰ مراد ہے اس پر یہ اشکال ہے کہ عام کتابوں میں لکھا ہے کہ پہلے قعدہ میں اگر اللّٰہم صلّ علیٰ محمد تک پڑھ لیا تو سجدہ سہو واجب ہوگیا حالانکہ یہ مقدار تین بار سبحان ربی العظیم سے بہت کم ہے، امید ہے کہ جواب شافی سے نوازیں گے، بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

یہ اشکال تو سبحان اللہ پر بھی ہوتا ہے، تین بار سبحان اللہ کے مجموعہ حروف مقروءہ ستائیس بنا

عہ تسبیح سے سبحان ربی الاعلیٰ مراد ہے، تفصیل باب مفسدات الصلوٰۃ میں ستر کھلنے کے بیان میں ہے ۱۲ منہ

اور اللھم صل علیٰ محمد کے اٹھارہ، حقیقت یہ ہے کہ تاخیر بقدر رکن سے سجدۂ سہو واجب ہوتا ہے، مگر قدر رکن میں دو قول ہیں، ایک قدر قراءۃ ما تجوز بہ الصلوٰۃ کما فسرہ العلامۃ الطحطاوی رحمہ اللہ تعالیٰ فی مراقی الفلاح قدر الرکن بآیۃ، اور دوسرا قول بقدر تین تسبیح، پھر قدر ما تجوز بہ الصلوٰۃ میں دو قول ہیں، ایک بشمول حروف محذوفہ اٹھارہ حروف اور دوسرا تیس حروف، ان اقوال میں سے راجح یہ ہے کہ رکن اقصر بطریق مسنون مراد ہے اور وہ تین بار سبحان ربی العظیم یا سبحان ربی الاعلیٰ کی مقدار ہے جس کے حروف ملفوظہ بیالیس ہیں، قال ابن عابدین رحمہ اللہ تعالیٰ فی حاشیتہ علی البحر (قدر الکثیر ما یؤدی فیہ رکن) ای بسنتہ کما قیدہ فی المنیۃ قال شارحہا ابن امیر حاج ای مع السنۃ ای بما ہو مشروع فیہ من الکمال المسنون کالتسبیحات فی الرکوع والسجود مثلاً وہو تقیید غریب ووجہہ قریب ولو اقتصر علی التقیید بکونہ قصیراً او طویلاً اھ ای تقیید الرکن ای علی المراد منہ قد یکون طویلاً بسنتہ کالقعود الاخیر او القیام المشتمل علی قراءۃ المسنون او قصیراً رکن قصیر کالرکوع او السجود بسنتہ ای قدر ثلاث تسبیحات وبالثانی جزم البرہان الحلبی فی شرح المنیۃ حیث قال وذلک مقدار ثلاث تسبیحات اھ فافاد ان المراد اقصر رکن وکأنہ لانہ الاحوط واللہ تعالیٰ اعلم (منحۃ الخالق علی البحر الرائق ص۱۰۲ ج۲)

قعدۂ اولیٰ میں تشہد پر زیادۃ موجب سجدہ میں مختلف اقوال ہیں، ایک بقدر رکن، دوسرا بقدر اللھم صل علیٰ محمد، تیسرا وعلیٰ آل محمد تک، چوتھا عند الصاحبین رحمہما اللہ تعالیٰ حمید مجید تک، ان میں سے قول اول اصح ہے، اور قول ثانی رکن بقدر اٹھارہ حروف کے مطابق ہے اور قول ثالث رکن بقدر تیس حروف کے مطابق، یہ بھی ممکن ہے کہ امام ابو حنیفہ کے حکم اول میں رکن قرار دیا گیا ہو، پھر قول ثانی میں نفس درود اور اس میں اصل مقصود کو ملحوظ رکھا گیا اور قول ثالث میں تابع کو بھی، اور قول رابع میں تشبیہ و دعاء برکت کو بھی، یعنی کامل وظیفہ کا اعادہ کیا گیا۔

علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ نے قول ثالث کو ترجیح دی ہے مگر قدر رکن میں قول راجح بیالیس حروف کی بناء پر صلّ علیٰ محمد میں علیٰ کے لام تک تاخیر سے سجود واجب ہونا چاہئے، یہ قول اوسع بھی ہے اور صاحبین رحمہما اللہ تعالیٰ کے ہاں تو اس سے بھی زیادہ وسعت ہے، البتہ قول ثالث اوسط و احوط ہے، لفظ سیدنا کے اضافہ کی صورت میں آل سیدنا محمد میں میم مشددہ میں دوسری میم تک بیالیس حروف ہیں، فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲ محرم سنہ ۸۶ھ

فاتحہ سے ایک حرف بھی چھوٹ گیا تو سجدۂ سہو واجب ہے:

سوال: نماز میں سورۂ فاتحہ سے سہواً ایک دو یا تین آیات چھوڑ دیں تو کیا اس پر سجدۂ سہو واجب ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملهم الصواب

سورۂ فاتحہ سے اگر ایک حرف بھی سہواً چھوٹ گیا تو سجدۂ سہو واجب ہے،

قال فی شرح التنویر یجب السهو بترک اکثرها لا اقلها لکن فی المجتبی یسجد بترک آیة منها وهو اولی قلت وعلیه فکل آیة واجبة وقال ابن عابدین رحمه الله تعالی (قوله وعلیه) ای وبناء علی ما فی المجتبی فکل آیة واجبة وفیه نظر لان الظاهر ان ما فی المجتبی مبنی علی قول الامام بان تمامها واجبة وذکر الآیة تمثیل لا تقیید اذ یلزم بترک شیء منها آیة او اقل ولو حرفا لا یکون آتیا بکلها الذی هو الواجب کما ان الواجب ضم ثلاث آیات فلو قرأ دونها کان تارکا للواجب افاده الرحمتی (رد المحتار ص [illegible] ج ۱) فقط والله تعالی اعلم

[illegible] ذی الحجہ سنہ [illegible]ھ

قعدہ اخیرہ کے بعد اٹھ گیا:

سوال: ایک شخص امام کے ساتھ ابتداءِ نماز سے شریک تھا قعدہ اخیرہ میں جب امام سلام پھیرنے لگا تو اس شخص نے غلطی سے یہ سمجھا کہ ابھی ایک رکعت باقی ہے جب کھڑا ہو گیا تو یاد آیا کہ نماز تو پوری ہو گئی اب اس شخص پر سجدۂ سہو لازم ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملهم الصواب

اگر سجدہ سے قبل یاد آ گیا تو لوٹ آئے، اور سجدہ کے بعد یاد آیا تو ایک رکعت اور ملا کر دو نفل کر لے، دونوں صورتوں میں سجدۂ سہو واجب ہے۔ قال فی التنویر وان قعد فی الرابعة مثلا قدر التشهد ثم قام عاد وسلم وان سجد للخامسة سلموا وضم الیها سادسة لتصیر الرکعتان له نفلا وسجد للسهو، وقال الشارح فی الصورتین لنقصان فرضه بتأخیر السلام فی الاولی وترکه فی الثانیة (رد المحتار ص [illegible] ج ۱) فقط والله تعالی اعلم

۱۱ صفر سنہ ۸۸ھ

قعدہ اخیرہ کے بعد اٹھ گیا تو لوٹ کر فوراً سجدۂ سہو کرے:

سوال: آخری تشہد پڑھنے کے بعد بھول کر کھڑا ہو گیا اور پھر یاد آنے پر بیٹھ گیا تو

بیٹھ کر پھر سے تشہد پڑھ کر سجدۂ سہو کرے یا کہ بیٹھتے ہی بغیر تشہد کے سجدۂ سہو کرے؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

تشہد پہلے پڑھ چکا ہے اس لئے بیٹھ کر دوبارہ تشہد نہ پڑھے بلکہ بیٹھتے ہی سجدۂ سہو کرے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۱۰ ربیع الاول سنہ ۸۸ھ

قعدہ اخیرہ چھوڑ کر اٹھ گیا:

سوال: ظہر کی نماز میں آخری قعدہ نہ کیا تیسری رکعت کے بعد یاد آیا، چار رکعت پوری کر لی اور سجدۂ سہو بھی کر لیا تو نماز ہوئی یا نہیں یعنی دو فرض اور دو نفل۔

اگر ایسا واقعہ ظہر کی سنتوں میں پیش آجائے اور پانچویں رکعت کے سجدہ کے بعد یاد آئے تو چھٹی بھی پوری کرے اور سجدۂ سہو بھی کرے تو نماز ہوگی یا نہیں، چار رکعت سنت اور دو نفل۔

اگر ایسا واقعہ نوافل میں پیش آئے اور تیسری رکعت کے بعد یاد آئے اور چاروں پوری کرلے اور سجدۂ سہو بھی کرے تو نماز ہوگی یا نہیں، ان سب نمازوں کا اعادہ واجب ہوگا؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

اگر نفل یا سنت نماز میں دو رکعت کی نیت باندھی اور قعدہ اخیرہ بھول گیا اور ساتھ دو رکعتیں اور ملا لیں تو اس صورت میں سجدۂ سہو واجب ہے اور چاروں رکعات ہوگئیں مگر تراویح میں دو رکعتیں شمار ہوں گی یعنی چار رکعتوں میں سے دو تراویح ہوگئیں اور دو نفل ہوں گی۔

ظہر کی سنتوں میں قعدہ اخیرہ سہواً چھوڑ دیا اور چھ رکعت پوری کر کے سجدۂ سہو کر لیا تو نماز ہوگئی، چار رکعت سنت مؤکدہ اور دو نفل۔

فرضوں کی صورت میں پوری نماز نفل ہو جائے گی اور سجدۂ سہو واجب نہیں، قال فی العلائیۃ ولا یجب السجود علی الامام لان النقصان بالفساد لا ینجبر، وفی الشامیۃ (قولہ لان النقصان) ای الحاصل بترک القعدۃ لا ینجبر بسجود السہو فان قلت انہ وان فسد فرضا انقلب نفلا ومن ترک القعدۃ فی النفل ساھیا وجب علیہ سجود السہو فلماذا لم یجب علیہ نظرا لہذا الوجہ قلت انہ فی محل ترک القعدۃ لم یکن نفلا انما انقلب نفلا بتقیید الرکعۃ بسجدۃ والحکم فالمعتبرۃ مایرفعہ (رد المحتار ص ۱ ج ۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲ ذوالحجہ سنہ ۸۸ھ

تشہد سے قبل سجدہ سہو کر لیا:

سوال: زید پر سجدہ سہو واجب تھا مگر زید نے بلا التحیات کے سجدہ سہو کر لیا تو نماز صحیح ہوئی یا نہیں یا اعادہ واجب ہوگا؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

اگر قصداً ایسا کیا تو نماز واجب الاعادہ ہے اور اگر سہواً ہوگیا تو اس میں یہ تفصیل ہے کہ اگر بقدر تشہد نہیں بیٹھا تو سجدہ سہو غیر محل میں ہونے کی وجہ سے غیر معتبر ہے لہٰذا تشہد کے بعد پھر سجدہ سہو کرے، اگر نہیں کیا تو نماز واجب الاعادہ ہوئی اور اگر بقدر تشہد بیٹھنے کے بعد سجدہ سہو کیا لیکن نہ تشہد پڑھا اور نہ سلام پھیرا یونہی سجدہ کر لیا تو نماز صحیح ہوگئی اور یہی سجدہ کافی ہے،

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۱۹ ربیع الاول سنہ ۸۰ھ

پہلی رکعت پر قعود موجب سجدہ سہو کی مقدار:

سوال: اگر کوئی شخص پہلی یا تیسری رکعت میں بھول کر بیٹھ جائے تو کتنی مقدار بیٹھنے سے سجدہ سہو واجب ہوگا، ایک عالم فرماتے ہیں کہ تھوڑی سی دیر بیٹھنے سے بھی سجدہ سہو واجب ہو، غنیۃ المستملی کا حوالہ دیتے ہیں، کیا یہ صحیح ہے؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

منیہ میں مطلق بیٹھنے سے سجدہ سہو کا وجوب مذکور ہے مگر راجح یہ ہے کہ تین بار سبحان ربی الاعلیٰ کی مقدار بیٹھنے سے سجدہ سہو واجب ہوگا اس سے کم پر نہیں، اس لئے کہ وجوب سجدہ سہو کی وجہ تاخیر قیام ہے اور تاخیر وہ معتبر ہے جو بقدر ادائے رکن مع سنتہ ہو، اور وہ رکوع یا سجدہ ہے ان کی مسنون تسبیح سبحان ربی العظیم اور سبحان ربی الاعلیٰ ہے۔ ان دونوں میں سے ہر ایک کے حروف مقروءہ چودہ ہیں اور تین تسبیحات کے بیالیس، اور تشہد میں ایہا کی ’’ہ‘‘ تک بیالیس حروف مقروءہ ہوتے ہیں لہٰذا اس سے کم پر سجدہ سہو واجب نہیں، فی واجبات الصلوٰۃ من الشامیۃ ومنہا القعدۃ فی آخر الرکعۃ الاولیٰ او الثالثۃ فیجب ترکہا ویلزم من فعلہا ایضاً تاخیر القیام الی الثانیۃ او الرابعۃ عن محلہ وھذا اذا کانت القعدۃ طویلۃ اما الجلسۃ الخفیفۃ التی استحبہا الشافعی رحمہ اللہ تعالیٰ فترکہا غیر واجب عندنا بل ھو الافضل کما سیاتی (رد المحتار ص ۴۳۲ ج ۱) وفی العلائیۃ ویکبر للنہوض علیٰ صدور قدمیہ بلا اعتماد وقعود استراحۃ ولو فعل لا بأس وفی الشامیۃ

یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

فاتحہ سے قبل تشہد پڑھنے سے فرض قراءت میں تاخیر ہوئی، اور فرض میں تاخیر بقدر تین بار سبحان ربی الاعلیٰ موجب سجدۂ سہو ہے، اس کے مجموعہ حروف مفردہ بیالیس ہیں اور تشہد میں ایہا کی "ہ" تک بیالیس حروف مفردہ ہو جاتے ہیں، لہٰذا سہواً یہاں تک پڑھ گیا تو سجدۂ سہو واجب ہوگا اس سے کم پر نہیں، فقط واللہ تعالیٰ اعلم

غرۂ ذی الحجہ سنہ ۸۸ھ

تشہد کی جگہ فاتحہ پڑھ لی:

سوال: قعدہ میں بھولے سے التحیات کی جگہ کچھ اور پڑھ دیا، یا الحمد پڑھ لی، تو کیا سجدۂ سہو واجب نہیں جیسا کہ "معلم الدین" میں لکھا ہے، بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

اگر تشہد سے قبل تین بار سبحان ربی الاعلیٰ (مجموعہ حروف مفردہ بیالیس) کی مقدار سورۂ فاتحہ پڑھ لی تو سجدۂ سہو واجب ہوگا، سورۂ فاتحہ میں الدین کی "ی" تک بیالیس حروف مفردہ ہو جاتے ہیں، البتہ آخری تشہد کے بعد فاتحہ پڑھنے سے سجدۂ سہو نہیں، قال فی الہندیۃ

وإذا فرغ من التشهد قرأ الفاتحة فلا سهو عليه، وإذا قرأ الفاتحة مكان التشهد فعليه السهو وكذا إذا قرأ الفاتحة ثم التشهد كان عليه السهو كذا روي عن أبي حنيفة رحمه الله تعالى في الواقعات الناطفية وذكر هناك إذا بدأ في موضع التشهد بالقراءة ثم تشهد فعليه السهو ولو بدأ بالتشهد ثم بالقراءة فلا سهو عليه (عالمگیریۃ ص ۱۲۷ ج ۱)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲۹ ذی الحجہ سنہ ۸۸ھ

نماز مغرب میں قعدہ اخیرہ بھول گیا:

سوال: مغرب کی نماز میں قعدہ اخیرہ بھول گیا اور چوتھی رکعت پڑھ کر یاد آیا تو واپس قعدہ کی طرف لوٹ کر سجدہ سہو کرکے نماز تمام کی تو نماز ہوگئی یا نہیں یا پھر سے لوٹانی پڑے گی اور صورت مذکورہ میں سجدہ سہو واجب ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

اس صورت میں سجدۂ سہو واجب نہیں، مغرب کے فرض نہیں ہوئے بلکہ یہ چار

رکعتیں نفل ہوگئیں اسلئے پانچویں رکعت نہ ملائے البتہ اگر چوتھی رکعت کے سجدہ سے قبل یاد آجائے تو لوٹ کر سجدۂ سہو کرنے سے فرض نماز صحیح ہو جائے گی، فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲ ذی الحجہ سنہ ۹۰ھ

نماز مغرب میں قعدہ اخیرہ کے بعد کھڑا ہوگیا :

سوال : مغرب کی نماز میں دوسری رکعت سمجھ کر کھڑا ہوگیا پھر یاد آیا کہ یہ چوتھی رکعت ہے قعدہ میں بیٹھ گیا تو کیا سجدۂ سہو کرنے سے نماز ہو جائے گی؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

اگر چوتھی رکعت کا سجدہ نہ کیا ہو تو بیٹھ کر سجدۂ سہو کرکے نماز پوری کرلے، اور اگر چوتھی رکعت کا سجدہ کرلیا ہو تو پانچویں رکعت کا ملانا مستحب ہے آخری دو رکعت نفل ہو جائیں گی سجدۂ سہو اس صورت میں بھی واجب ہے، قال فی التنویر وان قعد فی الرابعۃ ثم قام عاد وسلم وان سجد للخامسۃ سلموا وضم الیہا سادسۃ، وقال ابن عابدین رحمہ اللہ تعالیٰ ثم ان الضم ندبا علی الاظہر وقیل وجوبا ح عن البحر (رد المحتار صـــ ج ۱)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲۵ محرم سنہ ۹۲ھ

ترک سلام سے سجدۂ سہو واجب ہے :

سوال : زید نے نماز میں سلام ایک طرف یا دونوں طرف نہ پھیرا اور تشہد، درود شریف، دعا پڑھ کر ایسے ہی کھڑا ہوگیا تو نماز ہوگی یا نہیں؟ اگر ہوگی تو بلا کراہت یا بکراہت اور کراہت تحریمی یا تنزیہی؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

اگر ایک طرف سلام پھیرنے کے بعد کھڑا ہوا تو نماز بلا کراہت ہوگئی، اس لئے کہ پہلے سلام سے نماز ختم ہو جاتی ہے مگر چونکہ دوسرا سلام بھی واجب ہے اس لئے قبلہ سے سینہ پھیرنے اور کوئی بات کرنے سے قبل یاد آجائے تو دوسرا سلام پھیرلے، بہتر ہے کہ بیٹھ کر سلام پھیرے، کھڑے کھڑے پھیر لیا تو بھی واجب ادا ہوگیا مگر خلاف سنت ہوا، اور اگر دونوں طرف سلام نہیں پھیرا اور مسجد سے نکلنے اور بات کرنے سے پہلے یاد آگیا تو بیٹھ کر سجدۂ سہو کرکے سلام پھیرے ورنہ نماز مکروہ تحریمی اور واجب الاعادہ ہوگی، اگر دونوں سلام عمداً

چھوڑ دے تو سجدۂ سہو کافی نہیں اعادہ واجب ہے۔

سلام اول سہواً چھوڑنے کی صورت میں مسجد سے نہ نکلنے کی قید ہے اور سلام ثانی چھوڑنے کی صورت میں قبلہ سے سینہ نہ پھیرنے کی، کما فرقوا بین تسلیم من علیہ سجود السہو ناسیا وعامداً۔ (خارج مسجد کا حکم عنوان "سجدۂ سہو بھول گیا" کے تحت ملاحظہ ہو) قال فی العلائیۃ ولفظ السلام مرتین فالثانی واجب علی الاصح برہان دون علیکم وتنقضی قدوۃ بالاول قبل علیکم علی المشہور عندنا وعلیہ الشافعیۃ (رد المحتار ص ۴۴۳ ج ۱) وفیہا ونسی الیسار اتی بہ مالم یستدبر القبلۃ فی الاصح وتنقطع التحریمۃ بتسلیمۃ واحدۃ برہان وتاتارخانیۃ (رد المحتار ص ۴۴۳ ج ۱)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۴ ذی قعدہ سنہ ۹۰ھ

تاخیر سلام موجب سجدۂ سہو ہے:

سوال: اگر کسی نے قعدہ اخیرہ میں تشہد، درود شریف اور دعا پڑھ لی لیکن سلام پھیرنے اور خروج بصنعہ میں تاخیر کی، کیا ایسے شخص پر سجدۂ سہو لازم ہے؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

اگر مزید دعائیں پڑھتا رہا یا حمد وثناء وغیرہ ذکر میں مشغول رہا تو سجدۂ سہو نہیں خواہ کتنی ہی تاخیر ہو جائے، البتہ اگر بقدر تین بار سبحان ربی الاعلیٰ عمداً خاموش رہا تو نماز واجب الاعادہ ہے اور سہواً اتنی دیر خاموش رہا تو سجدۂ سہو واجب ہے، قال فی الدر: ویسجد للسہو فی الصورتین لنقصان فرضہ بتاخیر السلام فی الاولیٰ وترکہ فی الثانیۃ۔

(رد المحتار ص ۴۹۸ ج ۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲۹ ذی الحجہ سنہ ۹۰ھ

فرض کی تیسری رکعت میں ایک آیت جہراً پڑھ لی:

سوال: تیسری رکعت میں جہراً امام نے الحمد للہ رب العالمین تک پڑھا تو سجدۂ سہو واجب ہوا یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

فرض کی آخری دو رکعتوں میں اخفاء واجب ہے لہٰذا اس میں بشمول حروف محذوفہ تیس حروف یا زیادہ جہراً پڑھنے سے سجدۂ سہو لازم ہوگا، تیس حروف الرحیم کی را مشددہ میں پورے

بار تک ہوتے ہیں اسلئے صورت مسئولہ میں سجدہ سہو نہیں (و) فی واجبات الصلاۃ من التنویر
والجهر والاسرار فيما يجهر ويسر، وفي الشامية عن البحر والاسرار يجب على الامام والمنفرد
فيما يسر فيه وهو صلاة الظهر والعصر والثالثة من المغرب والاخريان من العشاء (رد المحتار ص [illegible] ج ۱)
وفي سجود السهو من التنوير والجهر فيما يخافت فيه وعكسه بقدر ما تجوز به الصلاة في الفصلين،
وفي الشامية والتصحيح ظاهر الرواية وهو التقدير بما تجوز به الصلاة من غير تفرقة (رد المحتار ص [illegible] ج ۱)
فقط واللہ تعالیٰ اعلم

[illegible] محرم سنہ ۹۰ھ

جمعہ وعید میں سجدۂ سہو کا حکم:

سوال: عید کی نماز میں امام صاحب دوسری رکعت میں تیسری تکبیر بھول گئے، تو
اس پر سجدۂ سہو واجب ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

نماز عید میں چھ تکبیروں میں سے ہر ایک تکبیر بلکہ دوسری رکعت کے رکوع کی تکبیر بھی
واجب ہے لہٰذا ان میں سے کسی ایک کا ترک بھی موجب سجدۂ سہو ہے مگر جمعہ وعیدین میں
اگر جماعت اتنی کثیر ہو کہ سجدۂ سہو کرنے سے نماز میں خلل کا اندیشہ ہو تو سجدۂ سہو معاف ہے
غیر جمعہ وعیدین میں بھی جماعت کثیرہ کا یہی حکم ہے، (فی واجبات الصلاۃ من العلائیۃ) وتکبیرات
العيدين وكذا احدها وتكبير ركوع ركعة الثانية (رد المحتار ص [illegible] ج ۱) وفيها في السهو في صلاة
العيد والجمعة والمكتوبة والتطوع سواء والمختار عند المتأخرين عدمه في الاوليين لدفع الفتنة كما في جمعة البحر
واقره المصنف وبه جزم في الدرر وفي الشامية الظاهر ان الجمع الكثير فيما سواهما كذلك كما بحثه
بعضهم وكذا بحثه الرحمتي وقال خصوصا في زماننا وفي جمعة حاشية ابي السعود عن العزمية انه ليس المراد
عدم جوازه بل الاولى تركه لئلا يقع الناس في الفتنة اهـ (قوله وبه جزم في الدرر) لكنه قيده
بما اذا حضر جمع كثير والا فلا داعي الى الترك اهـ (رد المحتار ص [illegible] ج ۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

[illegible] رجب سنہ ۹۰ھ

رکوع میں قنوت پڑھنے سے سجدۂ سہو ساقط نہیں ہوتا:

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ میں کہ دعاءِ قنوت قیام کی حالت میں
بھول جائے اور رکوع میں یاد آئے تو رکوع کی حالت میں دعاءِ قنوت پڑھ لی جائے تو سجدۂ سہو

واجب ہوگا یا نہیں؟ اگر رکوع کے بعد دعاء قنوت یاد آجائے تو سجدہ سے پہلے دعاء قنوت پڑھ کر بعد میں سجدۂ سہو کریں یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

دونوں صورتوں میں سجدۂ سہو واجب ہوگا، اگر رکوع میں جاکر قنوت یاد آئی تو رکوع یا قومہ میں قنوت نہ پڑھے بلکہ صرف سجدۂ سہو پر اکتفاء کرے، قال فی التنویر وشرحہ ثم تذکرہ فی الرکوع لا یقنت فیہ ولا یعود الی القیام، فان عاد الیہ وقنت ولم یعد الرکوع لم تفسد صلوتہ وسجد للسہو، وفی الشرح قنت اولا لزوالہ عن محلہ (رد المحتار ص ۱۴۲ ج ۲)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۱۰ ربیع الاول سنہ ۹۱ھ

کھانسی وغیرہ کی وجہ سے تاخیر پر سجدۂ سہو نہیں :

سوال : اگر نماز میں کھانسی، ہچکی یا چھینک آنے کی وجہ سے تین تسبیح کہنے کی مقدار قراءت سے رک جائے تو سجدۂ سہو واجب ہوگا یا نہیں؟ اور سجدۂ سہو نہ کرنے کی صورت میں نماز کا اعادہ واجب ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

اس صورت میں سجدۂ سہو نہیں، نہ ہی نماز کا اعادہ واجب ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

غرۃ جمادی الاولیٰ سنہ ۹۱ھ

تین سجدے کرنے تو سجدۂ سہو واجب ہے :

سوال : ایک رکعت میں بھول کر تین سجدے کرلئے تو سجدۂ سہو واجب ہوگا یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

قعود یا قیام کے فرض میں تاخیر کی وجہ سے سجدۂ سہو واجب ہے؛ قال الحلبی رحمہ اللہ تعالیٰ ویجب بتکرار الرکن نحو ان یرکع مرتین او یسجد ثلاث مرات (غنیۃ ص ۴۲۳ ج ۱)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۱۲ جمادی الاولیٰ سنہ ۹۱ھ

سجدۂ سہو سے قبل وبعد درود احوط ہے:

سوال: مصلی کے ذمہ سجدہ سہو واجب ہو تو صرف التحیات پڑھ کر سجدۂ سہو کرے یا کچھ زیادہ درود شریف سے بھی پڑھے؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

خواہ درود شریف پڑھ کر سجدۂ سہو کرے یا پہلے، دونوں طرح درست ہے، بہتر یہ ہے کہ سجدۂ سہو سے قبل بھی درود پڑھے اور بعد بھی، قال فی الخانیۃ ومن علیہ السہو یصلی علی النبی علیہ الصلوٰۃ والسلام فی القعدۃ الاولی فی قول ابی حنیفۃ وابی یوسف رحمہما اللہ تعالی وفی قول محمد رحمہ اللہ تعالی فی القعدۃ الثانیۃ والاحوط ان یصلی فی القعدتین (فتاوی قاضی خان علی هامش العالمگیریۃ ص۱۲۲ ج۱) وفی الهدایۃ ویأتی بالصلاۃ علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم والدعاء فی قعدۃ السہو هو الصحیح وقیل یأتی بهما فی القعدۃ الاولی کذا فی التبیین والاحوط ان یأتی بهما فی القعدتین کذا فی فتاوی قاضیخان (عالمگیریۃ ص۱۲۵ ج۱) فقط واللہ تعالی اعلم

۱۰ر شعبان سنہ ۹۳ھ

بدون سلام سجدۂ سہو مکروہ تنزیہی ہے:

سوال: زید نے بھول کر بغیر سلام کے سجدۂ سہو کرلیا تو نماز ہوگی یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

نماز ہوگئی مگر ایسا کرنا مکروہ تنزیہی ہے، قال فی شرح التنویر ولو سجد قبل السلام جاز وکرہ تنزیها، قال ابن عابدین رحمہ اللہ تعالی هو ظاهر الروایۃ وفی المحیط وروی عن اصحابنا انہ لا یجزیہ ویعیدہ بعدہ (ردالمحتار ص۶۹۱ ج۱) فقط واللہ تعالی اعلم

۲۳ر جمادی الآخرہ سنہ ۹۵ھ

قعدۂ اولیٰ بھول گیا:

سوال: اگر امام ظہر کی نماز میں قعدۂ اولیٰ بھول جائے پھر لقمہ لینے کے بعد بیٹھ جائے تو کیا سجدۂ سہو کرلینے سے نماز ہوجائے گی؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

اگر گھٹنے سیدھے ہونے سے قبل لوٹ آئے تو سجدۂ سہو واجب نہیں، گھٹنے سیدھے

ہوگئے تو قعدہ کی طرف لوٹنا جائز نہیں، سجدۂ سہو واجب ہے، اگر بوجہ جہالت کھڑے سیدھے ہونے کے بعد لوٹ آیا تو مقتدی نہ بیٹھیں بلکہ کھڑے رہیں اور امام پر واجب ہے کہ قعدہ چھوڑ کر کھڑا ہو جائے، اگر کھڑا نہ ہوا اور تشہد پڑھ لیا تو بھی نماز ہو جائے گی مگر سجدۂ سہو اس صورت میں بھی واجب ہوگا، قال فی التنویر سہا عن القعود الاول من الفرض ثم تذکرہ عاد الیہ ما لم یستقم قائما والا لا ویسجد للسہو فلو عاد الی القعود تفسد صلوتہ وقیل لا وھو الاشبہ وفی العلائیۃ لا تفسد لکنہ یکون مسیئا ویسجد لتاخیر الواجب وھو الاشبہ کما حققہ الکمال وھو الحق بحر، وفی الشامیۃ یعنی اذا عاد قبل ان یستقیم قائما وکان الی القعود اقرب فانہ لا سجود علیہ فی الاصح وعلیہ الاکثر واختار فی الولوالجیۃ وجوب السجود واما اذا عاد وھو الی القیام اقرب فعلیہ سجود السہو کما فی نور الایضاح وشرحہ بلا حکایۃ خلاف فیہ وصحح اعتبار ذلک فی الفتح بما فی الکافی ان استوی النصف الاسفل وظہرہ بعد منحن فھو اقرب الی القیام وان لم یستو فھو اقرب الی القعود (قولہ لکنہ یکون مسیئا) ای ویأثم کما فی الفتح فلو کان اماما لا یعود معہ القوم تحقیقا للمخالفۃ ویلزمہ القیام للحال شرح المنیۃ عن القنیۃ (رد المحتار ص ۵۵۱ ج ۱)

عود بعد القیام کی صورت میں نماز کے اعادہ کا صریح حکم نہیں ملا مگر کلیہ کا مقتضی یہ ہے کہ نماز واجب الاعادہ ہے لان عدم العود واجب وترکہ عمدا، فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۱۹ ر شعبان سنہ ۹۳ھ

بیٹھ کر نماز پڑھتے ہوئے تشہد کی بجائے قراءت شروع کر دی:

سوال: کوئی شخص بیٹھ کر نماز پڑھ رہا ہو بھول کر قعدہ میں تشہد کی بجائے الحمد شروع کر دی، بعد میں یاد آگیا تو کیا کرے؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

بیٹھ کر نماز پڑھنے کی صورت میں قراءت بحکم قیام ہے اسلئے اگر نفل میں یہ صورت پیش آئی خواہ دوسری رکعت کے بعد ہو یا چوتھی کے بعد بہرکیف قراءت چھوڑ کر تشہد پڑھے اور سجدۂ سہو کرے، اور اگر بوجہ مرض فرض بیٹھ کر پڑھ رہا تھا تو قعدۂ اولیٰ میں تشہد کی طرف نہ لوٹے، اور قعدۂ اخیرہ میں لوٹ آئے، دونوں صورتوں میں سجدۂ سہو واجب ہے، اگر ہاتھ باندھ لئے ہوں مگر ابھی قراءت شروع نہ کی ہو تو یہ بحکم قیام نہیں لہٰذا ہاتھ چھوڑ کر تشہد پڑھے سجدۂ سہو واجب نہیں، قال ابن عابدین رحمہ اللہ تعالیٰ اعلم ان حالۃ القراءۃ تنوب عن القیام فی

مریض یصلی بالایماء حین نوی فی حالة التشهد الاولی تحا حالة القیام فقرأ ثم تذکر لا یعود الی التشهد کما فی البحر عن الولوالجیة (رد المحتار ص ۵۵۰ ج ۱) وفی الخانیة رجل صلی اربع رکعات جالسا فلما قعد فی الرکعة الرابعة منها قرأ ورکع قبل ان یتشهد قال هو بمنزلة القیام ویمضی ولو کان حین رفع رأسه من السجدة الثانیة فی الرکعة الثانیة نوی القیام ولم یقرأ ثم علم قال یعود ویتشهد لانه بمجرد النیة لا یصیر قائما (خانیة علی هامش الهندیة ص ۱۲۳ ج ۱)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲۲ ربیع الاول سنہ ۸۱ھ

نابالغ نے سجدۂ سہو چھوڑ دیا:

سوال: نابالغ کو نماز میں سجدۂ سہو واجب ہو جائے اور یہ نہ کرے تو اسکی نماز صحیح ہوئی یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

بالغ کی طرح نابالغ کی نماز بھی ناقص ہوئی، البتہ بالغ پر اسکی نماز کا اعادہ واجب ہے نابالغ پر اعادہ واجب نہیں، مگر سات برس کا ہو تو اسکے ولی پر واجب ہے کہ اس کو اعادہ کا حکم دے اور دس برس کا ہو تو مار کر اعادہ کرائے، فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۶ شوال سنہ ۸۵ھ

ترک قعدہ کے بعد فوراً عود میں وجوب سجدۂ سہو کی وجہ:

سوال: اگر سہواً دوسری رکعت پر قعدہ بھول گیا اور تیسری کے لئے کھڑا ہو گیا ہو یا صرف گھٹنے سیدھے ہو گئے ہوں اور پھر قعدہ کی طرف واپس آگیا تو اس پر سجدۂ سہو واجب ہے حالانکہ اسمیں تین بار سبحان ربی الاعلیٰ کی مقدار تاخیر نہیں ہوئی، اسکی کیا وجہ ہے؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

تاخیر بقدر رکن بطریق مسنون موجب سجدۂ سہو ہونے کا قاعدہ اس وقت ہے جبکہ خود کوئی رکن نہ ادا کیا ہو، صورت مسئولہ میں قیام خود رکن ہے، لہٰذا قیام کی طرف انتقال ہی موجب سجدہ ہے اگرچہ بقدر تین تسبیح تاخیر نہ پائی جائے، غالباً اسی بنا پر صاحب منیہ نے پہلی اور تیسری رکعت پر مجرد جلوس کو موجب سجدہ قرار دیا ہے مگر علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس کے خلاف وجوب سجدہ کے لئے جلوس طویل کی شرط لگائی ہے اسکی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ سجدہ سے قیام

کی طرف انتقال میں غیر اختیاری طور پر ذرا قعود ہوتا ہے اور بوقت عدم جلسۂ استراحت کی صورت میں تو قصداً قعود ہے لہٰذا اولیٰ اور ثالثہ پر سہواً قعود سے کسی جدید رکن کی طرف انتقال نہیں پایا گیا، اسلئے یہاں مجرد جلوس موجب سجدہ نہیں بلکہ تاخیر بقدر رکن سے سجدہ واجب ہوگا۔

تنبیہ: سہواً تیسری رکعت کے لئے سیدھا کھڑا ہوگیا یا تھوڑے سیدھے ہوگئے تو قعدہ کی طرف نہ لوٹے اگر لوٹ آیا تو پھر فوراً کھڑا ہوجائے، اگر فوراً دوبارہ کھڑا نہ ہوا بلکہ تشہد پڑھنے کے بعد اٹھا تو بھی نماز ہوجائیگی، سجدۂ سہو دونوں صورتوں میں واجب ہے، اگر جہالت سے امام بیٹھ جائے تو مقتدی نہ بیٹھیں بلکہ کھڑے رہیں، قال فی العلائیۃ فلو عاد الی القعود بعد ذلک تفسد صلوتہ لرفض الفرض لما لیس بفرض وصححہ الزیلعی وقیل لا تفسد لکنہ یکون مسیئا ویسجد لتاخیر الواجب وھو الاشبہ کما حققہ الکمال وھو الحق بحر وفی الشامیۃ (قولہ لکنہ یکون مسیئا) ای ویاثم کما فی الفتح فلو کان اماما لا یعود معہ القوم تحقیقا للمخالفۃ ویلزمہ القیام للحال شرح المنیۃ عن القنیۃ (رد المحتار ص۵۴۹ ج۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۱۲ ذی قعدہ سنہ ۸۸ھ

ایک سجدہ بھول گیا:

سوال: اگر نماز میں دوسرا سجدہ بھول گیا اور دوسری رکعت میں تین سجدے کرلئے تو سجدۂ سہو کرلینے سے نماز صحیح ہوئی یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

اس صورت میں بھی نماز ہوگئی مگر بہتر یہ ہے کہ جب یاد آئے فوراً سجدہ کرلے، جس رکن میں یاد آنے پر سجدہ کیا اس رکن کا اعادہ مستحب ہے، البتہ قعدۂ اخیرہ کے درمیان یا اس کے بعد سجدہ کیا تو تشہد کا اعادہ واجب ہے، سجدۂ سہو بہرصورت واجب ہے۔

اگر سلام پھیرنے کے بعد مسجد سے نکلنے سے قبل یاد آگیا تو فوراً سجدہ کرے پھر تشہد دوبارہ پڑھ کر سجدۂ سہو کرے اس کے بعد حسب قاعدہ تشہد، درود شریف اور دعاء پڑھ کر سلام پھیرے، قال فی التنویر آخر باب الاستخلاف ولو تذکر فی رکوعہ او سجودہ سجدۃ صلبیۃ فسجدھا اعادھما ندبا وفی الشامیۃ (قولہ فسجدھا) افاد ان سجودھا عقب التذکر غیر واجب لما فی البحر عن الفتح لہ ان یقضی السجدۃ المتروکۃ عقب التذکر ولہ ان یؤخرھا الی آخر الصلوۃ فیقضیھا ھناک اھ (رد المحتار ص۵۵۵ ج۱)

وفي واجبات الصلوة منها تحت (قوله كالسجدة) قال في شرح المنية حتى لو ترك سجدة من ركعة ثم تذكرها فيما بعدها من قيام او ركوع او سجود فانه يقضيها ولا يقضي ما فعله قبل قضائها مما هو بعد ركعتها من قيام او ركوع او سجود بل يلزمه سجود السهو فقط لكن اختلف في لزوم قضاء ما تذكرها فقضاها فيه كما لو تذكر وهو راكع او ساجد انه لم يسجد في الركعة التي قبلها فانه يسجدها وهل يعيد الركوع او السجود المتذكر فيه ففي الهداية انه لا تجب اعادته بل تستحب معللا بان الترتيب ليس بفرض بين ما يتكرر من الافعال وفي الخانية انه يعيده والا فسدت صلاته (الى قوله) والمعتمد ما في الهداية فقد جزم به في الكنز وغيره في آخر باب الاستخلاف وصرح في البحر بضعف ما في الخانية هذا والتقييد بالترتيب بينها وبين ما بعدها للاحتراز عما قبلها من ركعتها فان الترتيب بين الركوع والسجود من ركعة واحدة شرط كما مر ننبه عليه في الفتح وفي شرح التنوير ونسي سجدة من الاولى قضاها ولو بعد السلام قبل الكلام لكنه يتشهد ثم يسجد للسهو ثم يتشهد لانه يبطل بالعود الى الصلبية والتلاوية اما السهوية فترفع التشهد لا القعدة (رد المحتار ص ۴۳۶ ج ۱) وفي سجود السهو منه ولو نسي السهو او سجدة صلبية او تلاوية يلزمه ذلك ما دام في المسجد (رد المحتار ص ۵۰۱ ج ۱) فقط والله تعالى اعلم

۱۰ صفر سنہ ۹۰ھ

سجدۂ سہو بھول گیا:

سوال: منفرد اگر سجدۂ سہو کرنا بھول جائے اور دعاء تک پڑھ جائے لیکن سلام ابھی نہ پھیرا ہو تو کس ترکیب سے سجدہ سہو ادا کرے اور کیا بعد سجدہ سہو کے درود و دعاء پھر سے پڑھ کر سلام پھیرے؟ اور اگر سلام بھی پھیر دیا ہے تو کیا کرے؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

سجدۂ سہو کے بعد تشہد، درود اور دعاء دوبارہ پڑھ کر سلام پھیرے، اگر سلام کے بعد سجدۂ سہو یاد آیا مگر ابھی مسجد سے نہیں نکلا اور کوئی بات نہیں کی تو بھی یہی حکم ہے اور اگر مسجد سے نکل گیا یا بات کرلی تو نماز کا اعادہ کرے، اگر خارج مسجد میدان میں جماعت کے ساتھ ہو تو یہ شرط ہے کہ صفوف سے تجاوز نہ کیا ہو اور اکیلا ہو تو چاروں طرف بقدر موضع سجود سے نہ نکلا ہو، اگر ۹۹، ۳۳۴ مربع میٹر سے چھوٹے کمرے یا اس سے چھوٹے صحن میں ہو تو اس سے باہر

نہ گیا ہو، ۹۰ / ۴۴ ۴ مربع میٹر یا اس سے بڑا گھر اور صحن بحکم صحرا ہے، قال فی العلائیۃ ولو نسی السہو او سجدۃ صلبیۃ او تلاویۃ یلزمہ ذلک ما دام فی المسجد، وفی الشامیۃ ای و ان تحول عن القبلۃ استحسانا لان المسجد کلہ فی حکم مکان واحد ولذا صح الاقتداء فیہ وان کان بینہما فرجۃ وما اذا کان فی الصحراء فان تذکر قبل ان یجاوز الصفوف من خلفہ او یمینہ او یسارہ عاد الی قضاء ما علیہ لان ذلک الموضع ملحق بالمسجد وان مشی امامہ فالاصح موضع سجودہ او سترتہ ان کانت لہ سترۃ بین یدیہ کما فی البدائع والفتح (رد المحتار ص ۶۱۲)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۱۲ / شعبان سنہ ۹۹ھ

امام نے سلام کے بعد پانچویں رکعت پڑھ لی :

سوال : مسجد میں نماز عصر ہو رہی تھی جماعت سے، امام آخری قعدہ میں بیٹھا پیچھے سے ایک مقتدی نے لقمہ دیا اللہ اکبر، جبکہ وہ چوتھی ہی رکعت تھی، امام نے ایک طرف سلام پھیرا تو اسی مقتدی نے دوبارہ اللہ اکبر کہا اب امام کو شک ہو گیا اور وہ پانچویں رکعت میں کھڑا ہو گیا پانچویں رکعت پر امام نے سجدہ سہو کیا اور سلام پھیرا گیا ایسی صورت میں امام اور مقتدیوں کی نماز ہو گئی یا دوبارہ پڑھیں؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

امام اور مقتدیوں کی نماز صحیح ہو گئی، البتہ مسبوق کی نماز نہیں ہوئی لاقتدائہ فی موضع الانفراد، مگر مسبوق امام کی پانچویں رکعت میں اسکی اقتداء نہ کرتا بلکہ امام سے الگ ہو کر اپنی گئی ہوئی نماز پوری کرتا تو اسکی نماز بھی صحیح ہو جاتی۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲۵ / رجب سنہ ۹۹ھ

قنوت کی بجائے فاتحہ یا تشہد پڑھ گیا :

سوال : وتروں میں دعاءِ قنوت کی جگہ الحمد شریف یا التحیات سہواً پڑھ گیا تو کیا سجدۂ سہو واجب ہے یا نہیں یا اگر دعاءِ قنوت کی جگہ الحمد شریف پڑھا یا التحیات، یاد آنے پر دعاءِ قنوت پڑھا تو پھر بھی سجدہ سہو واجب ہوگا یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

ان دونوں صورتوں میں سجدۂ سہو واجب نہیں اسلئے کہ وتر کی آخری رکعت میں کوئی

بھی دعاء پڑھ لینے سے واجب ادا ہو جاتا ہے البتہ معہود دعاء مسنون ہے اور دعاء مسنون کے ساتھ مزید کوئی دعاء ملا لینا افضل ہے، قال ابن نجیم رحمہ اللہ تعالیٰ وفی غیرہ جاز ودعاء فی صحة غیرہ کان حسنا (البحر الرائق ص ۱۳۲ ج ۲) حمد وثناء اور تسبیح وتہلیل وغیرہ بھی دعا ہی ہے

وقال الشاعر یعنی الکریم بعد دعاء وحمد

أأذکر حاجتی أم قد کفانی حیاؤک إن شیمتک الحیاء

إذا أثنی علیک المرء یوماً کفاہ من تعرضک الثناء

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۱۰ شعبان سنہ ۹۰ھ

ترک سجدۂ سہو سے نماز واجب الاعادہ ہے:

سوال: حافظ صاحب تراویح کے آخری قعدہ پر نہ بیٹھے سیدھے کھڑے ہو گئے لقمہ ملنے پر فوراً بیٹھ گئے اور سجدۂ سہو نہ کیا تو نماز تمام ہوئی یا واجب الاعادہ ہوگی؟ اگر نماز واجب الاعادہ ہے تو ان دو تراویح کو دوبارہ ادا کرتے وقت قرآن مجید بھی دوبارہ پڑھے یا چھوٹی سورتوں سے دو تراویح ادا کرے شرعاً کیا حکم ہے؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

یہ دو رکعتیں واجب الاعادہ ہیں ان میں پڑھا ہوا قرآن بھی دہرایا جائے،

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۱۹ شوال سنہ ۹۰ھ

سکوت بقدر تین تسبیح موجب سجدۂ سہو ہے:

سوال: تراویح میں حافظ الحمد کے بعد یا درمیان میں پڑھتے پڑھتے خاموش ہو گیا اور یاد آنے میں تین تسبیح کی مقدار خاموش رہا تو سجدۂ سہو واجب ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

تین بار سبحان ربی الاعلیٰ کہنے کی مقدار خاموش رہا تو سجدۂ سہو واجب ہوگا ورنہ نہیں، فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲۳ شوال سنہ ۹۰ھ

نماز کے بعد شک غیر معتبر ہے :

سوال : نماز پوری کرنے کے بعد اگر شبہ ہوگیا کہ تین رکعتیں پڑھی ہیں یا چار تو اعادہ کرے یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملهم الصواب

اعادہ نہ کرے نماز ہوگئی ، قال شارح التنویر رحمہ اللہ تعالیٰ ولا یصلی بعد صلوۃ مثلها فی القراءۃ والجماعۃ او لا تعاد عند توهم الفساد للنهی (رد المحتار ص [illegible] ج ۱) وفی الشامیۃ عن الفتح لو شک بعد الفراغ منها او بعد ما قعد قدر التشهد لا یعتبر (رد المحتار ص [illegible] ج ۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۱۲ جمادی الآخرۃ سنہ ۹۴ھ

تشہد سے ایک لفظ بھی چھوٹ گیا تو سجدۂ سہو واجب ہے :

سوال : اگر تشہد سے کچھ حصہ رہ جائے تو سجدۂ سہو واجب ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملهم الصواب

تشہد پورا واجب ہے ، اس میں سے ایک لفظ بھی رہ گیا تو سجدۂ سہو واجب ہے قال فی الدر وواجباتہا ... والتشہد الخ ویسجد للسہو بترک بعضہ ککلہ الخ وفی الشامیۃ (قولہ والتشہد) ای تشہد القعدۃ الاولیٰ وتشہد الاخیرۃ والتشہد المروی عن ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ لا یجب بل هو افضل من المروی عن ابن عباس وغیرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم (قولہ بترک بعضہ ککلہ) قال فی البحر من باب سجود السہو فانہ یجب سجود السہو بترکہ ولو قلیلا فی ظاهر الروایۃ لانہ ذکر واحد منظوم فترک بعضہ کترک کلہ اھ (رد المحتار ص [illegible] ج ۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۹ ربیع الآخر سنہ ۱۴۰۰ھ

سورۂ فاتحہ بھول گیا :

سوال : نماز میں فاتحہ پڑھنا بھول گیا تو یاد آنے پر سورۂ فاتحہ اور سورت کا دوبارہ پڑھنا ضروری ہے یا نہیں؟ نیز سجدۂ سہو بھی ضروری ہے یا نہیں؟ تفصیل سے آگاہ فرمائیں ، بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

اگر سجدہ سے قبل سورۂ فاتحہ کا ترک یاد آ گیا تو فوراً سورۂ فاتحہ پڑھ کر دوبارہ دوسری سورت پڑھے کیونکہ فاتحہ اور سورت میں ترتیب واجب ہے، اس کے بعد رکوع دوبارہ کرے اور سجدۂ سہو کرے، قال فی الدر وقراءتہا یتحقق الترک بالسجود فلو تذکرہا ولو بعد الرفع من الرکوع عاد ثم اعاد الرکوع الا انہ فی تذکر الفاتحۃ یعید السورۃ ایضاً، وقال العلامۃ الطحطاوی رحمہ اللہ تعالیٰ فی حاشیتہ علی الدر (قولہ یعید السورۃ) ای لاجل الترتیب بینہما وفی البحر عن المحیط لو ترک السورۃ فذکرہا قبل السجود عاد وقرأہا وکذا لو ترک الفاتحۃ فذکرہا قبل السجود ویعید السورۃ لانہا تقع فرضا بالقراءۃ بخلاف ما لو تذکر القنوت فی الرکوع فانہ لا یعود ومتی عاد الی القراءۃ فانہ یعید رکوعہ لارتفاضہ وفی الخلاصۃ ویسجد للسہو فیما اذا عاد او لم یعد الی القراءۃ (قولہ ایضاً) ای کما یعید الرکوع (طحطاوی ص۲۰۳ ج۱)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۱۰ رجب سنہ ۱۴۰۰ھ

سورت کے بعد تکرار فاتحہ موجب سجدۂ سہو نہیں:

سوال: حافظ نے نماز تراویح میں سجدۂ تلاوت کرنے کے بعد دوبارہ سورۂ فاتحہ پڑھ لی تو سجدۂ سہو واجب ہوگا یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

سجدۂ سہو واجب نہیں، اس لئے کہ فاتحہ کا تکرار ضم سورت کے بعد ہوا ہے، قال العلائی رحمہ اللہ تعالیٰ فی واجبات الصلوٰۃ وکذا ترک تکریرہا قبل سورۃ الاولیین، وفی الشامیۃ فلو قرأہا فی رکعۃ من الاولیین مرتین وجب سجود السہو لتاخیر الواجب وہو السورۃ (الی قولہ) ولو قرأہا قبل السورۃ مرۃ وبعدہا مرۃ فلا یجب کما فی الخانیۃ واختارہ فی المحیط والظہیریۃ والخلاصۃ وصحح الزاہدی عدمہ لعدم لزوم التاخیر لان الرکوع لیس واجبا بأثر السورۃ فانہ لو جمع بین سور بعد الفاتحۃ لا یجب علیہ شیء وکذا فی البحر (رد المحتار ص۴۳۱ ج۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲۱ شعبان سنہ ۱۴۰۰ھ

فرض کی تیسری رکعت میں تکرار فاتحہ سے سجدۂ سہو نہیں:

۴ سوال: اگر فرض کی تیسری یا چوتھی رکعت میں سورۂ فاتحہ دوبارہ پڑھ لیا تو

سجدۂ سہو واجب ہوگا یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

سجدۂ سہو واجب نہیں، فی واجبات الصلوٰۃ من العلائیۃ وکذا ترک تکریرھا قبل سورۃ الاولیین، وفی الشامیۃ قال فی شرح المنیۃ قید بالاولیین لان الاقتصار علی مرۃ فی الاخریین لیس بواجب حتی لا یلزمہ سجود السہو بتکرار الفاتحۃ فیھما سہواً ولو تعمدہ لا یکرہ الخ (رد المحتار ص ۴۳۲ ج ۱)

۲۴ر شوال سنہ ۱۴۰۰ھ

فرض کی تیسری رکعت میں سورت ملانے سے سجدۂ سہو نہیں:

سوال: فرض نماز مغرب میں تیسری رکعت میں نماز وتر کی طرح الحمد کے ساتھ سورت ملانا چاہئے یا نہیں؟ اگر غلطی کی تو سجدۂ سہو واجب ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

سب فرائض میں یکساں حکم ہے یعنی صرف پہلی دو رکعتوں میں سورت ملانا واجب ہے، بعد والی میں واجب نہیں جائز ہے نہ ملانا بہتر ہے، اگر سورت ملالی تو سجدۂ سہو واجب نہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۹ر رمضان سنہ ۱۴۰۰ھ

رکوع بھول گیا:

سوال: رکوع کرنا بھول گیا، سجدہ میں یاد آیا تو فوراً رکوع کرکے دوسرا سجدہ کرلیا تو سجدۂ سہو سے نماز ہوگئی یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

رکوع و سجود میں ترتیب فرض ہے، اس لئے پہلا سجدہ نہیں ہوا، رکوع کے بعد دو سجدے فرض تھے آپ نے ایک کیا ہے، اس لئے نماز نہیں ہوئی، قال فی العلائیۃ وبقی من الفروض تمییز المفروض وترتیب القیام علی الرکوع والرکوع علی السجود، وفی الشامیۃ (قولہ وترتیب القیام علی الرکوع الخ) ای تقدیمہ علیہ (الی قولہ) حتی لو سجد ثم رکع فان سجد ثانیاً صحت لما قلنا (رد المحتار ص ۴۱۹ ج ۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۷ر شعبان سنہ ۱۴۰۲ھ

باب صلوٰۃ المریض

کرسی پر بیٹھ کر نماز پڑھنا :

سوال : زید نمیں آدمی ہے ایک پاؤں سے معذور ہے بیٹھکر جماعت سے نماز ادا نہیں کرتا، احقر نے ایک دن جمعہ کو جماعت سے نماز پڑھتے اس طرح دیکھا کہ ایک کرسی سجدہ کی جگہ رکھی اور ایک کرسی پر بیٹھا جماعت کے بیچ میں، تو طریقہ مذکورہ سے نماز ہوئی یا نہیں، شرعاً یہ فعل درست ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملهم الصواب

اگر ایک کرسی پر بیٹھ کر دوسری کرسی پر سجدہ کیا تو نماز صحیح ہو جائے گی بشرطیکہ سجدہ کے وقت گھٹنے بھی کرسی پر رکھے، مگر ایسا کرنا مکروہ ہے، زمین پر بیٹھ کر نماز ادا کرنا چاہیئے، اور اگر بوقت سجدہ گھٹنے کرسی پر نہ رکھے تو یہ نماز واجب الاعادہ ہے، معلوم ہوا ہے کہ بعض لوگ کرسی پر بیٹھ کر سجدہ کی بجائے اشارہ سے نماز پڑھتے ہیں اگر زمین پر بیٹھ کر سجدہ کی قدرت ہو تو کرسی پر اشارہ سے نماز نہیں ہوگی، فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

غرۂ شعبان سنہ ۸۸ھ

بیہوشی میں فوت شدہ نمازوں کا حکم :

سوال : آپریشن کے لئے مریض کو بیہوش کیا جاتا ہے تو کیا بیہوشی کی حالت میں اس کی جو نمازیں قضا ہوں گی ان کی قضا ضروری ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملهم الصواب

اگر بیہوشی ایک دن رات یا اس سے کم رہی تو اس وقت کی نمازیں قضاء کی جائینگی، اور اگر چھٹی نماز کا وقت بھی بیہوشی کی حالت میں گزر جائے تو اس صورت میں اختلاف ہے اس لئے قضا کر لینا بہتر ہے، یہ حکم اپنے اختیار سے بیہوش کرنے کا ہے، قدرتی بیہوشی میں اگر پانچ نمازوں سے زیادہ قضا ہو گئیں تو بالاتفاق ان نمازوں کی قضا معاف ہے، قال فی التنویر وشرحہ ومن جن او اغمی علیہ یوما ولیلۃ قضی الخمس وان زاد وقت صلوٰۃ لا، وزال عقلہ ببنج او خمر لزمہ القضاء وان طال لتعدیہ فی الشرح لانہ بصنع العباد کالنوم وفی الشامیۃ لان سقوط القضاء عرف بالاثر اذا حصل بآفۃ سماویۃ فلا یقاس علیہ ما حصل بفعلہ وعنہ

محرم یسقط القضاء بالبنج والاول لانہ مباح فصار کالمریض کما فی البحر وغیرہ والظاھر انہ عطف المدوا علی البنج عطف تفسیر وان المراد شرب البنج لاجل التداوی اما لو شربہ للسکر فیکون معصیۃ بصنعہ کالخمر (رد المحتار ص۵۲۶ ج۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲۳ محرم سنہ ۹۵ھ

مریض کے لئے استقبال قبلہ کا حکم:

سوال: آپریشن کے بعد کچھ وقت مطلقاً اس کے بعد کچھ روز تک حرکت کرنے کو ڈاکٹر منع کرتے ہیں ایسی صورت میں نماز اگر لیٹ کر اشاروں سے یا بیٹھ کر پڑھی جائے اور چارپائی کا رُخ قبلہ کی طرف نہ ہو تو کیا جس طرف بھی رُخ ہو نماز پڑھ لی جائے؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

قبلہ کی طرف رُخ کرنا ضروری ہے، اگر ہسپتال کا عملہ اس میں تعاون نہ کرے تو اس وقت جیسے بھی ہوسکے نماز پڑھ لی جائے مگر بعد میں قضا ضروری ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲۴ محرم سنہ ۹۵ھ

جماعت میں قیام کی قدرت نہ ہو تو تنہا نماز پڑھے:

سوال: زید ضعف یا مرض کی وجہ سے اگر مسجد میں جاکر جماعت کے ساتھ نماز پڑھتا ہے تو امام کے ساتھ اتنی دیر قیام نہیں کرسکتا۔ اس صورت میں بیٹھ کر جماعت سے نماز پڑھے یا کہ جماعت ترک کردے اور گھر ہی میں کھڑا ہو کر نماز پڑھے؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

جماعت سنت مؤکدہ یا واجب ہے اور قیام فرض ہے، اس لئے جماعت میں شامل ہونے کی غرض سے ترک قیام جائز نہیں۔ بیٹھ کر نماز نہ ہوگی، گھر میں کھڑا ہو کر نماز پڑھے، ممکن ہو تو گھر میں جماعت کرلے، قال فی العلائیۃ ولو اضعفہ عن القیام الخروج لجماعۃ صلی فی بیتہ قائما بہ یفتی خلافا للاشباہ وقال ابن عابدین رحمہ اللہ تعالیٰ (قولہ الخروج لجماعۃ) ای فی المسجد وھو تصویر لمسئلۃ بما اذا لم تتیسر لہ الجماعۃ فی بیتہ افادہ ابو السعود (قولہ بہ یفتی) لان القیام فرض بخلاف الجماعۃ وبہ قال مالک واحمد فحکی خلافا لا محل بناؤہ علی ان الجماعۃ فرض عندہ (رد المحتار ص۴۴ ج۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲۴ رمضان سنہ ۹۰ھ

سوال متعلق بالا:

سوال: آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ مریض مسجد جاکر کھڑا ہوکر نماز نہ پڑھ سکتا ہو مگر جماعت کے ساتھ قیام پر قادر نہ ہو تو گھر ہی میں کھڑا ہوکر نماز پڑھے، امام کے ساتھ بیٹھ کر پڑھنا باعث ثواب نہیں، مگر فیض الباری ص۲۸۱ ج ۲ میں ہے کہ با جماعت بیٹھ کر افضل ہے، اس پر نظر ثانی فرمائیں۔ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

اس بارہ میں تین قول ہیں، ایک یہ کہ امام کے ساتھ بیٹھ کر نماز پڑھے، دوسرا یہ کہ امام کے ساتھ کھڑا ہوکر نماز شروع کرے پھر بیٹھ جائے پھر بوقت رکوع قیام کی قدرت ہو تو کھڑا ہوکر رکوع کرے، تیسرا قول یہ کہ گھر میں کھڑا ہوکر نماز پڑھے امام کے ساتھ بیٹھ کر پڑھے گا تو نماز نہیں ہوگی، یہ قول مفتی بہ ہونے کے علاوہ احوط بھی ہے۔ قال العلامة الحصکفی رحمه الله تعالیٰ ولو اضعفه عن القیام الخروج لجماعة صلی فی بیته قائما به یفتی خلافا للاشباه۔ وقال ابن عابدین رحمه الله تعالیٰ (قوله به یفتی) وجهه ان القیام فرض بخلاف الجماعة وبه قال مالک والشافعی رحمهما الله تعالیٰ خلافا لاحمد رحمه الله تعالیٰ بناء علی ان الجماعة فرض عنده وقیل یصلی مع الامام قاعدا عندنا ایضا لانه عاجز وذلک ذکره فی المحیط وصححه الزاهدی فی شرح المنیة۔ وثم قول ثالث مشی علیه فی المنیة وهو انه یشرع مع الامام قائما ثم یقعد فاذا جاء وقت الرکوع یقوم ویرکع۔ ای ان قول الاشباه مشی علیه الشارح تبعا للقهستانی فی الخلاصة انه الاصح ویفتی قال فی الحلیة وفیه شبهة لان القیام فرض فلا یجوز ترکه للجماعة التی هی سنة بل یصلی هذا عند تعذر ترکهما (رد المحتار ص۵۷۸ ج ۱) وقال ابن نجیم رحمه الله تعالیٰ والاشبه ما صحح فی الخلاصة لان القیام فرض فلا یجوز ترکه لاجل الجماعة التی هی سنة بل یصلی هذا عندی (البحر الرائق ص۱۱۴ ج ۲) شامیہ اور بحر کی عبارات مذکورہ سے ثابت ہوا کہ صاحب بحر کو اس مسئلہ میں تردد نہیں بلکہ وہ عدم جواز کے قائل ہیں۔ فیض الباری حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی تصنیف نہیں بلکہ امالی کا مجموعہ ہے اس کے کئی مواضع میں لکھنے والوں سے بہت اختلاط ہوا ہے، اس لئے اصل ماخذ کی طرف رجوع کئے بغیر فیض الباری پر اعتماد صحیح نہیں، مسئلہ زیر نظر میں صاحب بحر کی طرف تردد کی نسبت غلط ہونے کے علاوہ افضلیت میں اختلاف کی نسبت بھی غلط ہے، صحیح یہ ہے کہ افضلیت میں نہیں بلکہ نماز کی صحت میں اختلاف ہے، حدیث سے استدلال اس لئے صحیح نہیں کہ اس میں یہ احتمال ہے کہ ان مریضوں کو گھر میں بھی قیام پر قدرت نہ ہوگی۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔ ۹ ربیع الاول سنہ ۱۴۰۰ ہجری

(مزید تحقیق تتمہ میں ہے)

معذور تنہا طہارت سے نماز پڑھ سکتا ہو تو جماعت ترک کر دے:

سوال: ایک شخص ریح کا مریض ہے، اگر تنہا نماز پڑھے تو باوضو پڑھ سکتا ہے مگر جماعت کے ساتھ باوضو نماز مکمل نہیں کر پاتا، اس کے لئے شرعاً کیا حکم ہے، جماعت کے ساتھ نماز پڑھے اور معذور ہونے کی وجہ سے اس کی نماز صحیح ہوگی یا کہ باوضو تنہا نماز پڑھا کرے، بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

یہ شخص شرعاً معذور نہیں، جماعت کے ساتھ بے وضو نماز پڑھے گا تو نماز نہ ہوگی، اس پر لازم ہے کہ گھر ہی میں تنہا نماز پڑھا کرے، بلکہ بوقت مجبوری نماز کی سنتیں اور واجبات وغیرہ بھی ترک کر دے صرف فرائض پر اکتفاء کرے، قال فی العلائیۃ یجب رد عذرہ او تقلیلہ بقدر قدرتہ ولو بصلاتہ مومیا وبردہ لا یبقی ذا عذر، وقال ابن عابدین رحمہ اللہ تعالیٰ قال فی البحر ومتی قدر المعذور علی رد السیلان برباط او حشو او کان لو جلس لا یسیل ولو قام سال وجب ردہ وخرج بردہ عن ان یکون صاحب عذر ویجب ان یصلی جالسا بایماء ان سال بالمیلان لان ترک السجود اھون من الصلوٰۃ مع الحدث اھ (رد المحتار ص۲۸۳ ج ۱) وقال ایضا تحت (قولہ ولو مومیا) قال الرحمتی ثم ھل یشترط ان لا یمکن الا (الوضوء والصلوٰۃ) مع سننھما او الاقتصار علی فرضھما؟ یراجع اھ اقول الظاھر الثانی، تأمل (رد المحتار ص۲۸۴ ج ۱)

قلت ویؤید الثانی ما مر عن البحر ان ترک السجود اھون من الصلوٰۃ مع الحدث۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲۷ رمضان سنہ ۸۵ھ

سجدہ سے عاجز کا حکم:

سوال: میرے والد صاحب بیمار ہیں ان کی ہڈیوں میں کمر میں اور گھٹنوں میں درد رہتا ہے سینہ میں بھی تکلیف ہے جس کی وجہ سے وہ صحیح طریقہ پر رکوع و سجود نہیں کر سکتے گزشتہ کئی ماہ سے وہ نماز بیٹھ کر پڑھتے ہیں رکوع و سجود میں جتنا جھک سکتے ہیں اتنا جھک جاتے ہیں زیادہ جھکنے پر تکلیف ہوتی ہے کچھ احباب نے اس پر اعتراض کیا ہے کہ سجدہ بغیر کسی سخت چیز پر پیشانی رکھے نہیں ہو سکتا، اس کے لئے ایک تپائی بنوائی چاہئے اگر پیشانی فرش پر نہیں رکھی جا سکتی ہے تو اس تپائی پر رکھنی چاہئے ورنہ نماز صحیح نہ ہوگی، از راہ کرم شرعی حکم تحریر فرمائیں، جزاکم اللہ تعالیٰ

الجواب باسم ملهم الصواب

اگر سر اتنا جھکایا جا سکتا ہو کہ زمین تک ایک بالشت یا اس سے کم فاصلہ رہ جائے تو کسی اینٹ یا تپائی وغیرہ پر سجدہ کرنا لازم ہے، اشارہ سے نماز نہ ہوگی بشرطیکہ ایسی کوئی چیز میسر ہو، اگر ایسی کوئی چیز موجود نہیں یا سر اتنا نہیں جھک سکتا تو اشارہ سے نماز درست ہے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۴ر شعبان سنہ ۹۹ھ

سجدہ سے عاجز پر قیام فرض نہیں:

سوال: ایک شخص کی آنکھوں کا آپریشن ہوا ہے، ڈاکٹر نے نماز میں رکوع و سجدہ سے منع کیا ہے، یہ شخص بیٹھ کر اشارے سے نماز پڑھتا ہے، وہ کھڑا ہو سکتا ہے، اور اس سے کوئی ممانعت بھی ڈاکٹر کی طرف سے نہیں، کیا بیٹھ کر اس کی نماز صحیح ہے؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملهم الصواب

جو شخص سجدہ پر قادر نہ ہو اس سے قیام کا فرض ساقط ہے اس کو اختیار ہے خواہ حالتِ قیام ہی میں سجدہ کے لئے اشارہ کرے یا رکوع کے بعد بیٹھ کر اشارہ کرے یا ابتداء ہی سے بیٹھ کر نماز پڑھے۔ آخری صورت افضل ہے، پھر درمیانی پھر پہلی، قال فی شرح التنویر (وان تعذرا) لیس تعذرهما شرطا بل تعذر السجود کاف (لا القیام اومأ قاعدا) وهو افضل من الایماء قائما لقربه من الارض، وفی الشامیة (قوله بل تعذر السجود کاف) نقله فی البحر عن البدائع وغیرها وفی الذخیرة رجل بحلقه خراج ان سجد سال وهو قادر علی الرکوع والقیام والقراءة یصلی قاعدا یومئ ولو صلی قائما برکوع وقعد واومأ بالسجود اجزأه والاول افضل لان القیام والرکوع لم یشرعا قربة بنفسهما بل لیکونا وسیلتین الی السجود اھ (رد المحتار ص ۵۱۵ ج ۱)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۴ر شعبان سنہ ۹۹ھ

باب سجود التلاوة

نماز میں سجدۂ تلاوت :

سوال : کیا فرماتے ہیں مفتیانِ کرام اس مسئلہ میں کہ نماز میں سجدۂ تلاوت فی الفور ضروری ہوتا ہے یا اس کے بعد کچھ آیات پڑھ کر بھی سجدہ ادا کرسکتا ہے اور آیت سجدہ کے بعد کتنی آیات پڑھی جا سکتی ہیں؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

آیت سجدہ کے بعد تین آیات تک تاخیر جائز نہیں، ایک قول کے مطابق تین آیات تک بھی جواز ہے، اس سے زیادہ جائز نہیں، قول اول ارجح واحوط ہے، البتہ آخر سورت میں باتفاق تین چار آیات تک تاخیر کی بھی گنجائش ہے، خواہ آیت سجدہ پر سجدہ کرکے بقیہ سورت پوری کرکے رکوع کرے یا آیت پر سجدہ نہ کرے بلکہ سورت پوری کرنے کے بعد رکوع کرے، اگر وسط سورت میں آیت سجدہ کے بعد عمداً تین آیتیں پڑھ لیں تو نماز واجب الاعادہ ہے، صلوٰۃ معادہ میں یہی آیت سجدہ پڑھ کر سجدۂ تلاوت کرے، اور اگر سہواً اتنی تاخیر ہوگئی تو نماز ہی میں اس کی قضاء کرے اور آخر میں سجدۂ سہو بھی کرے، قال فی العلائیۃ فعلی الفور لصیرورتھا جزءا منھا ویأثم بتاخیرھا ویقضیھا ما دام فی حرمۃ الصلوٰۃ ولو بعد السلام فتح، وفی الشامیۃ لانھا وجبت بما ھو من افعال الصلوٰۃ وھی القراءۃ وصارت من اجزائھا فوجب اداؤھا مضیقا کما فی البدائع ولذا کان المختار وجوب سجود السھو لو تذکرھا بعد محلھا اھ (رد المحتار ص [illegible] ج ۱) وقال فی شرح التنویر وتؤدی برکوع صلوٰۃ اذا کان الرکوع علی الفور من قراءۃ آیۃ او آیتین وکذا الثلاث علی الظاھر کما فی البحر ان نواہ ای کون الرکوع لسجود التلاوۃ علی الراجح وتؤدی بسجودھا کذلک ای علی الفور، وفی الشامیۃ تحت (قولہ علی الظاھر کما فی البحر) وفی الامداد الاحتیاط قول شیخ الاسلام خواھر زادہ بانقطاع الفور بالثلاث وقال شمس الائمۃ الحلوانی لا ینقطع ما لم یقرأ اکثر من ثلاث وقال الکمال ابن الھمام قول الحلوانی ھو الروایۃ اھ قلت وصرح فی المنیۃ بانہ الاصح روایۃ فان محمدا نص علی انہ اذا بقی بعد السجدۃ آیات عند ختم السورۃ ای کسورۃ الانشقاق و سورۃ بنی اسرائیل ان شاء ختم السورۃ ورکع لھا وان شاء سجد لھا ثم قام فاکمل السورۃ ثم رکع اھ ومثلہ فی الفتح لکن فی البحر عن المجتبی ان الرکوع ینوب عنھا

بشرط النیۃ وانہ لا یفصل بثلاث الا اذا کانت الثلاث من اٰخر السورۃ اھ ومقتضاہ ان الخلاف فیما فی وسط السورۃ وان ھذہ روایۃ وبہ صرح فی الحلیۃ عن الاصل وغیرہ نعم قال بعدہ ان الفرق غیر ظاھر لوجہ، قلت قد یوجہ بان قراءۃ الثلاث من اٰخر السورۃ لا تفصل لانہا اتمام للسورۃ وعدم رفضہ باقیھا فکان فی قراءتہا زیادۃ طلب فلو تفصل بخلاف الثلاث من وسط السورۃ فانہ لیس فیہا زیادۃ طلب لعدم ما ذکرنا فعدت فاصلۃ تأمل (رد المحتار ص۷۱۲ ج۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۷ محرم سنہ ۸۷ھ

نمازی نے غیر امام سے آیت سجدہ سنی :

سوال : ایک شخص خارج صلوٰۃ آیت سجدہ تلاوت کر رہا تھا اور دوسرے نے جو کہ نماز میں تھا سن لیا، آیا اس مصلی سامع پر سجدۂ تلاوت واجب ہوا یا نہیں؟ اگر واجب ہے تو کب ادا کرے؟ اگر نماز ہی میں ادا کرلے تو سجدۂ تلاوت ادا ہوا یا نہیں، نیز اس کی نماز ہوگئی یا نہیں؟

دوسری صورت یہ کہ نماز کے اندر آیت سجدہ تلاوت کر رہا تھا اور دوسرے شخص نے جو خارج صلوٰۃ تھا یا نماز میں تھا مگر پڑھنے والے کا مقتدی نہ تھا، تلاوت سن لی تو یہ شخص سجدۂ تلاوت کب ادا کرے، اگر اپنی نماز میں ہی سجدۂ تلاوت ادا کرلے تو ادا ہوا یا نہیں؟ اور اسکی نماز ہوگئی یا نہیں؟ بینوا بالتفصیل اٴجرکم الجلیل

الجواب باسم ملہم الصواب

مصلی سامع پر سجدۂ تلاوت واجب ہے نماز سے فارغ ہونے کے بعد سجدۂ تلاوت کرے، اگر نماز کے اندر ہی سجدۂ تلاوت کرلیا تو ادا نہیں ہوا نماز کے بعد دوبارہ سجدہ کرے اور یہ نماز واجب الاعادہ ہے، البتہ اگر سامع نے نماز کے اندر ہی خود بھی اس آیت کی تلاوت کرکے نماز ہی میں سجدہ کرلیا تو یہ سجدہ ادا ہوگیا اور نماز بھی واجب الاعادہ نہیں،

اگر کسی نے نماز میں آیت سجدہ جہراً پڑھی تو بھی سامع پر سجدۂ تلاوت واجب ہے خواہ سامع خارج صلوٰۃ ہو یا تالی سے الگ کسی دوسری نماز میں ہو، خواہ منفرد ہو یا کسی دوسرے امام کا مقتدی ہو، اگر سامع بھی نماز میں ہے مگر تالی کا مقتدی نہیں تو اسکا وہی حکم ہے جو سوال کی شق اول کے جواب میں گزرا یعنی نماز سے فارغ ہونے کے بعد سجدۂ تلاوت کرے، اگر

الجواب باسم ملہم الصواب

مگر ذکر وغیرہ میں مشغول ہونے کی وجہ سے آیت سجدہ سنی ہی نہیں تو سجدۂ تلاوت واجب نہیں، اور اگر آیت سنی ہو تو سجدہ واجب ہے اپنے طور پر سجدہ کرلے اس میں امام کی اقتداء نہ کرے، البتہ اگر اسی رکعت میں اس امام کے ساتھ نماز میں شریک ہوجائے تو اس سے سجدۂ تلاوت ساقط ہوجائے گا، دوسری رکعت میں اقتداء سے ساقط نہ ہوگا، فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۱۰ر شوال سنہ ۸۶ھ

امام کا رکوع میں سجدۂ تلاوت کی نیت کرنا:

سوال: امام نے آیت سجدہ کی تلاوت کے بعد فوراً رکوع کردیا اور اس میں سجدہ کی نیت کرلی مگر مقتدی نے نیت نہیں کی تو سجدۂ صلوٰۃ میں مقتدی کا سجدۂ تلاوت ادا ہوجائیگا یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

اس میں اختلاف ہے ایک قول پر مقتدی کا سجدہ ادا نہ ہوگا، نہ رکوع میں اور نہ سجدہ میں، اس لئے مقتدی امام کے سلام کے بعد سجدۂ تلاوت کرکے قعدہ دوبارہ کرکے سلام پھیرے، مگر راجح یہ ہے کہ رکوع میں امام کی نیت مقتدی کی طرف سے بھی کافی ہے، اس لئے رکوع میں امام و مقتدی دونوں کا سجدہ ادا ہوجائے گا، بہتر یہ ہے کہ امام رکوع میں نیت نہ کرے تاکہ سجدۂ نماز میں امام و مقتدی دونوں کا سجدہ بلا اختلاف ادا ہوجائے، اور مقتدی کے لئے بہتر یہ ہے کہ اگر اس کو سجدہ کا علم ہوجائے تو رکوع میں نیت کرلے اس احتمال کی وجہ سے کہ امام نے رکوع میں نیت کرلی ہو، قال فی العلائیۃ: ولو نواها فی رکوعه ولم ینوها المؤتم لم تجزه ویسجد اذا سلم الامام ویعید القعدة ولو ترکها فسدت صلوته کذا فی القنیة، وینبغی حمله علی الجهریة، نعم لو رکع وسجد لها فوراً نابت بلا نیة. وفی الشامیة: وفی القهستانی واستظهر ان نیة الامام کافیة کما فی الکافی فلو لم ینو المقتدی لا ینوب علی رأی فیسجد بعد سلام الامام ویعید القعدة الاخیرة کما فی المنیة اهـ وایضاً فیها عقب قوله وینبغی حمله علی الجهریة: والاولی ان یحمل علی القول بان نیة الامام لا تنوب عن نیة المؤتم، والمتبادر من کلام القهستانی السابق خلاف الاصح حیث قال علی رأی فتأمل (رد المحتار ص ۷۲۰ ج ۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۱۰ر شوال سنہ ۹۲ھ

آیت سے قبل سجدہ کرلیا تو نماز واجب الاعادہ ہے:

سوال : امام نے دو رکعت نماز تراویح پڑھائی، اسمیں سجدۂ تلاوت والی سورت پڑھائی اور بھول کر سجدے والی آیت سے پہلے ہی سجدہ کرلیا اور نماز پوری کرکے سلام پھیر دیا اور سجدہ سہو نہ کیا، تو کیا یہ نماز پوری ہوگئی؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملهم الصواب

اس صورت میں نماز واجب الاعادہ ہے، سجدہ غیر واجبہ کی زیادتی کی وجہ سے سجدۂ سہو کرلیا جاتا تو بھی نماز کا اعادہ واجب ہوتا، کیونکہ یہ سہو نہیں بلکہ جہل ہے جو عذر نہیں بلکہ حکم عمد ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲۱ رمضان سنہ ۹۶ھ

جنب، حائض، مجنون یا نابالغ سے آیت سجدہ سُنی:

سوال : جنبی، حیض ونفاس والی عورت، مجنون یا بچے سے آیت سجدہ سُنی تو سجدۂ تلاوت واجب ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملهم الصواب

جنب نے آیت سجدہ پڑھی یا سُنی تو اس پر سجدۂ تلاوت واجب ہے۔
حائض، مجنون اور نابالغ پر واجب نہیں، خواہ خود پڑھیں یا کسی سے سُنیں۔
جنب، حائض اور صبی ممیز سے آیت سجدہ سننے والے پر سجدہ واجب ہے۔
مجنون اور صبی غیر ممیز سے سننے پر واجب نہیں۔

قال فی التنویر یجب علی من کان اھلا لوجوب الصلوٰۃ اداء وقضاء فلا تجب علی کافر وصبی ومجنون وحائض ونفساء قرؤا او سمعوا وتجب بتلاوتھم خلا المجنون المطبق، وفی العلائیۃ فی شرح قولہ اداء وقضاء فکان الاھل لھا تلا والجنب والسکران والنائم، وفی الشامیۃ عن الفتح قید بقولہ خلا المجنون لان السبب سماع تلاوۃ صحیحۃ وصحتھا بالتمییز ولم یوجد وھذا التعلیل یفید التفصیل فی الصبی فلیکن ھو المعتبر ان کان ممیزا وجب بالسماع منہ والا فلا واستحسنہ فی الحلیۃ (رد المحتار ج ۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۱۷ رجب سنہ ۷۷ھ

بغرض استفہام آیت سجدہ پڑھنا:

سوال : ایک آدمی دوسرے سے پوچھتا ہے کہ فلاں آیت سجدۂ تلاوت کی ہے

یا نہیں؟ یا آیت کا کوئی لفظ پڑھ کر پوچھا کہ اس لفظ پر سجدہ ہوگا یا کس لفظ پر؟ اس سے سجدہ تلاوت واجب ہوگا یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

اگر آیت سجدہ پوری نہیں پڑھی تو سجدۂ تلاوت واجب نہیں، اس لئے کہ سجدہ پوری آیت پڑھنے سے واجب ہوتا ہے، فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۱۹/ رمضان سنہ ۸۸ھ

آیت سجدہ کی ہجی سے سجدہ واجب نہیں:

سوال: اگر سجدہ کی آیت بچوں کو ہجی کرائی جائے تو سجدہ واجب ہوگا یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

پوری آیت مسلسل پڑھنے سے سجدہ واجب ہوتا ہے، ہجی سے واجب نہیں ہوتا، قال فی شرح التنویر یجب بسبب تلاوۃ آیۃ، قال ابن عابدین رحمہ اللہ تعالیٰ احترز عما لو کتبہا او تہجاہا فلا سجود علیہ کما سیاتی (ردالمحتار ص [illegible] ج ۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۱۹/ رمضان سنہ ۸۸ھ

آیت سجدہ کے معنی پوچھنا:

سوال: ایک آدمی نے کسی عالم سے آیت سجدہ کے معنی پوچھے، اس سے بھی سجدہ واجب ہوگا یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

اگر پوری آیت پڑھ کر معنی دریافت کئے تو سجدہ واجب ہے ورنہ ادھوری آیت کی تلاوت سے واجب نہیں، البتہ ترجمہ کرنے والے اور ترجمہ سننے والے پر سجدہ واجب ہوگا، مگر لفظ بلفظ ترجمہ کیا ہو، آیت سجدہ کی تفسیر سے سجدہ واجب نہیں، فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۱۹/ رمضان سنہ ۸۸ھ

مدرسہ حفظ میں بچوں کی تلاوت سے سجدہ کا حکم:

سوال: حفظ قرآن میں بچے جو پڑھتے ہیں اس سے بھی سجدہ واجب ہوتا ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

نابالغ بچے پر سجدہ واجب نہیں، بچے سے سننے پر وجوب سجدہ میں یہ تفصیل ہے کہ بچہ ممیز یعنی سمجھدار ہو تو سامع پر سجدہ واجب ہے اور چھوٹے بچے سے سننے پر واجب نہیں۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۱۰ رمضان سنہ ۸۸ھ

آیت سجدہ کے ترجمہ سے بھی سجدہ واجب ہے:

سوال: اگر کوئی سجدہ کی آیت نہ پڑھے بلکہ صرف اسکا ترجمہ کرے تو ترجمہ کرنے والے اور سننے والے پر سجدہ واجب ہوگا یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

لفظی ترجمہ کرنے والے پر سجدہ واجب ہے اور سننے والے کو اگر معلوم ہو کہ یہ ترجمۂ قرآن کا ہے اور اس کا مطلب بھی سمجھ جائے تو اس پر بھی سجدہ واجب ہوگا ورنہ نہیں، یہ حکم جب ہے کہ لفظ بلفظ ترجمہ کیا ہو، اگر لفظی ترجمہ کی بجائے تفسیر کی تو پڑھنے والے اور سننے والے کسی پر بھی سجدہ نہیں، قال فی الخلاصۃ والسماع شرط فی غیر التالی ولو بالفارسیۃ اذا اخبر، وفی الشامیۃ (قولہ اذا اخبر) ای بانہا آیۃ سجدۃ سواء فہمہا اولا، وهذا عند الامام وعندهما ان علم السامع انہ یقرأ القرآن لزمتہ والا فلا بحر، وفی الفیض وبہ یفتی، وفی النہر عن السراج ان الامام رجع الی قولهما وعلیہ الاعتماد اھ والمراد من قولہ ان علم السامع ان یفہم معنی الآیۃ کما هو صریح المجتبی حیث قال وجبت علیہ سواء فہم معنی الآیۃ اولا عندہ وعندهما ان فہمہا وجبت والا فلا لانہ اذا فہم کان سامعا للقرآن من وجہ دون وجہ اھ ملخصا (رد المحتار ج۱)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۱۰ رمضان سنہ ۸۸ھ

آیت سجدہ پوری پڑھے تو سجدہ واجب ہوگا:

سوال: سجدۂ تلاوت کی آیت پوری پڑھنے سے سجدہ واجب ہوتا ہے یا کچھ حصہ پڑھنے سے بھی واجب ہو جاتا ہے؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

پوری آیت پڑھنے سے سجدہ واجب ہوتا ہے، اگر آیت سے ایک لفظ بھی باقی رہ

گیا تو سجدہ واجب نہیں، بلکہ اگر بعد والی آیت کا بھی آیت سجدہ سے تعلق ہو تو ان دونوں آیتوں کی پوری تلاوت کے بعد سجدہ واجب ہوگا، قال فی شرح التنویر یجب بسبب تلاوۃ آیۃ ای اکثرھا مع حرف السجدۃ، وقال ابن عابدین رحمہ اللہ تعالیٰ: ھذا خلاف الصحیح الذی جزم بہ فی نور الایضاح فقال فی السراج وھل تجب السجدۃ بشرط قراءۃ جمیع الآیۃ ام بعضھا فیہ اختلاف والصحیح انہ اذا قرأ حرف السجدۃ وقبلہ کلمۃ او بعدہ کلمۃ وجب السجود والا فلا وقیل لا یجب الا ان یقرأ اکثر آیۃ السجدۃ مع حرف السجدۃ ولو قرأ آیۃ السجدۃ کلھا الا الحرف الذی فی آخرھا لا یجب علیہ السجود اھ لکن قولہ ولو قرأ آیۃ السجدۃ الخ یقتضی انہ لابد من قراءۃ الآیۃ بتمامھا کما یعلم من اطلاق المتون ویأتی قریبا ما یؤیدہ الا ان یقال ان سیاق الآیۃ قرینۃ علی ان المراد بقولہ الا الحرف الخ الکلمۃ التی فیھا مادۃ السجود واطلاق الحرف علی الکلمۃ شائع فی عرف القراء (وبعد اسطر) ان السبب تلاوۃ آیۃ تامۃ کما ھو ظاہر اطلاق المتون وان المراد بالآیۃ ما یشمل الآیۃ والآیتین اذا کانت الثانیۃ متعلقۃ بالآیۃ التی ذکر فیھا حرف السجدۃ (وبعد اسطر) ونبہ بما ذکرناہ ان ما فی السراج خلاف المذھب الذی مشی علیہ الشراح والمتون تأمل (رد المحتار ص۵۷۲ ج۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۹/ رمضان سنہ ۸۸ھ

جہاں سجدہ والی آیت سے ایک آیت بعد سجدہ لکھا ہے اس کا حکم:

سوال: کہیں کہیں حرف والے محل السجدۃ سے ایک آیت کے بعد جائے سجدہ لکھا ہوا ہوتا ہے وہاں سجدہ کس جگہ پر کرنا چاہیے؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

دوسری آیت پوری پڑھ کر سجدہ کرے، پہلی آیت پر سجدہ کر لیا تو ادا ہوگا، قال فی الشامیۃ ان المراد بالآیۃ ما یشمل الآیۃ والآیتین اذا کانت متعلقۃ بالآیۃ التی ذکر فیھا حرف السجدۃ (الی ان قال) انہ لا یجب السجود فی سورۃ حٰم السجدۃ الا عند تمام الآیۃ الثانیۃ احتیاطا کما صرح بہ فی الحلیۃ وغیرھا لان الوجوب لا یکون الا بعد وجود سببہ فلو سجد بعد الآیۃ الاولیٰ لا یکفی لانہ یکون قبل سببہ (رد المحتار ص۵۷۳ ج۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۱۱/ رمضان سنہ ۸۸ھ

آیت سجدہ لکھنے سے سجدہ واجب نہیں :

سوال : اگر سجدہ کی آیت لکھی مگر زبان سے تلاوت نہیں کی تو سجدہ واجب ہوگا یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

صرف لکھنے سے سجدہ واجب نہیں ہوتا ، قال فی التنویر یجب بتلاوۃ آیۃ ، وقال ابن عابدین رحمہ اللہ تعالیٰ احترز بھا لو کتبہا او تہجاھا فلا سجدۃ علیہ کما سیأتی (رد المحتار ص ۷۱۸ ج ۱)
فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۶/ رمضان سنہ ۸۸ھ

اُستاذ و شاگرد کا ایک ہی آیت دہرانا :

سوال : اُستاذ و شاگرد کو قرآن پڑھاتا ہے اور سجدۂ تلاوت آجائے اور اس کو بار بار پڑھنا پڑے تو سجدہ ایک واجب ہے یا دو؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

اگر ایک آیت ایک ہی مجلس میں بار بار پڑھے اور سُنے تو ایک ہی سجدہ واجب ہوگا ،
قال فی الشامیۃ تحت (قولہ بشرط اتحاد الآیۃ والمجلس) فان اجتمع التلاوۃ والسماع ولو من جماعۃ ففی البدائع انہ لا یتکرر ولو اجتمع سببا الوجوب وھما التلاوۃ والسماع بان تلاھا ثم سمعھا او بالعکس او تکرر احدھما اھ وفی البزازیۃ سمعھا من غیرہ ومن آخرین ایضا وقرأھا کفت سجدۃ واحدۃ فی الاصح لاتحاد الآیۃ والمکان اھ وخرج بقولہ الثانیۃ فعلی ھذا لو قرأھا وسمعھا بعضھم من بعض کفتھم واحدۃ (رد المحتار ص ۷۲۳ ج ۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۵/ جمادی الاولیٰ سنہ ۹۰ھ

لاؤڈ اسپیکر سے آیت سجدہ سُننا :

سوال : تراویح میں حافظ سے لاؤڈ اسپیکر میں غیر نمازیوں نے سجدۂ تلاوت کی آیت سنی تو ان پر سجدۂ تلاوت واجب ہوگا یا نہیں؟ خواہ ان کو سجدہ کی آیت معلوم ہو یا نہ ہو ، بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

راجح یہ ہے کہ لاؤڈ اسپیکر سے سنائی دینے والی آواز خود متکلم کی آواز ہے ، صورت صدیٰ کی

کی طرح صوت متکلم کی نقل نہیں، اس لئے لاؤڈ اسپیکر سے سننے والوں پر بھی سجدۂ تلاوت واجب ہوگا البتہ اگر سننے والوں کو آیت سجدہ کا علم نہ ہو تو ان پر سجدہ واجب نہیں، قال فی الشامیۃ لا یجب علی الاصم مالم یعلم کما فی الفتح ای وان لم یعلم (رد المحتار ص۵۱۲ ج۱)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۱۸ رجب سنہ ۹۰ھ

ٹی وی پر آیت سجدہ سننے کا حکم:

سوال: ٹی وی یا ریڈیو پر جو تلاوت کی جاتی ہے یا ختم قرآن فی التراویح نشر کیا جاتا ہے اور دکھایا جاتا ہے اس کے سامعین پر سجدۂ تلاوت واجب ہوگا یا نہیں؟ اسی طرح ٹیپ ریکارڈر کا کیا حکم ہے؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

ٹیپ ریکارڈر سے سننے پر سجدۂ تلاوت واجب نہیں اسلئے ٹی وی اور ریڈیو پر اگر ٹیپ سنایا جا رہا ہو تو سجدہ واجب نہیں، اور اگر براہ راست قاری کی آواز ہو تو واجب ہوگا

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲ ذیقعدہ سنہ ۹۵ھ

ایک آیت ایک مجلس میں متعدد لوگوں سے سنی:

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ شاگرد نے آیت سجدہ تلاوت کی، استاد نے سنی، پھر اسی طرح استاد نے تلاوت کی شاگرد نے سنی یا استاد نے کئی شاگردوں سے وہی آیت سنی تو کیا ان پر متعدد سجدے ہونگے یا کہ ایک ہی سجدہ کافی ہوگا؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

تعدد سجدہ کے لئے ضروری ہے کہ سبب متعدد ہو یا اختلاف مکان ہو، یہاں نہ تعدد سبب ہے اور نہ اختلاف مکان، اس لئے سجدہ واحدہ کافی ہو جائے گا، قال فی الشامیۃ تجب لو تلاہا بشرط اتحاد الآیۃ والمجلس) وفی البزازیۃ سمعہا من آخر ومن آخر ایضا و قرأہا العشی سجدۃ واحدۃ فی الاصح لاتحاد الآیۃ والمکان اہ ونحوہ فی الخانیۃ فعلی ھذا لو قرأہا جماعۃ وسمعہا بعضہم من بعض کفتہم واحدۃ (رد المحتار ص۷۲۹ ج۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۱۲ ربیع الاول سنہ ۹۹ھ

سجدۂ تلاوت کی نیت میں تعیین ضروری نہیں :

سوال : زید کے ذمہ تلاوت کے کئی سجدے ہیں کیا ان کو ادا کرتے وقت یہ نیت ضروری ہے کہ یہ فلاں آیت کا سجدہ ہے یا صرف سجدۂ تلاوت کی نیت کافی ہے ؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملهم الصواب

صرف سجدۂ تلاوت کی نیت کافی ہے ، آیت کی تعیین ضروری نہیں ، قال فی العلائیۃ بشروط الصلوٰۃ المتقدمۃ خلا التحریمۃ ونیۃ التعیین ، وفی الشامیۃ ای تعیین انھا سجدۃ آیۃ کذا ، فھو مثل القنیۃ کما لا تعیین کونھا عن التلاوۃ فشرط کما تقدم فی بحث النیۃ من شروط الصلوٰۃ الا اذا کانت فی الصلوٰۃ وسجدھا فورًا کما مر (رد المحتار ص[illegible] ج۱)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۱۲ ربیع الاول سنہ ۹۹ھ

امام کے سجدۂ تلاوت پر مقتدی رکوع میں چلا گیا :

سوال : امام صاحب نے عصر کی نماز میں سورۂ انشقاق پڑھی اور آیت سجدہ پر سجدہ کیا مگر مقتدی غلط فہمی سے رکوع میں رہے ، بعض نے متنبہ ہونے پر سجدہ کر لیا اور بعض امام کے اٹھنے پر رکوع ہی سے واپس اٹھ کھڑے ہوئے ، انکی نماز اور سجدۂ تلاوت کا کیا حکم ہے ؟ نماز اور سجدہ ہو گیا یا نہیں ؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملهم الصواب

امام کو ایسا کرنا جائز نہیں تھا ، مقتدیوں میں انتشار ، انکی نماز میں خلل بلکہ خطرۂ فساد اور انکے لئے ادا سجدہ کی کوئی صورت نہ رہنے کا خطرہ پیدا کرنے کا گناہ امام پر ہوگا صحیح طریقہ یہ تھا کہ امام سورت پوری کرکے رکوع کرتا اور رکوع میں سجدہ کی نیت نہ کرتا ، اسکے بعد نماز کے سجدہ میں امام و مقتدی سب کا سجدۂ تلاوت ادا ہو جاتا ، سورۂ انشقاق میں آیت سجدہ کے بعد اگرچہ چار آیات ہیں مگر تکمیل سورت کیلئے اسکی گنجائش ہے کہ سورت پوری کرکے رکوع کرے ، کذا فی الشامیۃ ،

صورتِ سوال میں مقتدیوں پر لازم تھا کہ متنبہ ہونے پر رکوع چھوڑ کر سجدہ کریں ، بلکہ رکوع کے بعد متنبہ ہوا تو بھی سجدۂ تلاوت ادا کرکے امام کا اتباع کریں ، جن لوگوں نے سجدہ نہیں کیا انکے لئے ادا سجدہ کی کوئی صورت نہیں ، ترک واجب کا گناہ امام پر رہا ، اگر کسی

مقتدی نے اشتباہ ہی کی حالت میں رکوع کے بعد نماز کا سجدہ بھی کرلیا تو اس کے ضمن میں اسکا سجدۂ تلاوت ادا ہوگیا اور اگر نماز کا دوسرا سجدہ بھی کرلیا تو اسکی نماز فاسد ہوجائیگی

قال فی شرح التنویر ویظہر یتحمل بہا اقتداء القوم انہ رکع خصوص رکع وقصد وتجعل لہا ومن رکع وتجعل سجدۃ اجزأتہ عنہا ومن رکع وسجد السجود تین فسدت صلوتہ لانہ انفرد برکعۃ تامۃ (رد المحتار ص [illegible] ج ۱)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۱۶ شعبان سنہ ۹۹ھ

سجدۂ تلاوت بلا وضوء جائز نہیں :

سوال : سجدۂ تلاوت بلا وضو ادا ہوجائے گا یا نہیں ؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

جائز نہیں ، فقط واللہ تعالیٰ اعلم ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۱۰ ذی قعدہ سنہ ۹۹ھ

سواری پر آیت سجدہ کا تکرار :

سوال : چلتی ہوئی سواری پر سجدہ کی آیت کا تکرار کیا تو ایک ہی سجدہ واجب ہوگا یا جتنی بار آیت کو پڑھا اتنے ہی سجدے واجب ہیں ؟ بینوا توجروا ۔

الجواب باسم ملہم الصواب

گھوڑا، اونٹ اور ہر قسم کی گاڑی وغیرہ خشکی کی سواری پر نماز کے اندر آیت سجدہ کا تکرار کیا تو ایک ہی سجدہ واجب ہے اور بیرون نماز کے تکرار آیت سے تکرار سجدہ واجب ہے ، کشتی میں ہر صورت تکرار آیت سے ایک ہی سجدہ واجب ہے خواہ نماز میں ہو یا خارج نماز ، جو کتب میں عدم تکرار سجدہ کی تعلیل ہے ظاہر ہے کہ بحری جہاز اور ہوائی جہاز میں تکرار سجدہ واجب ہے۔ لان سیرہما مضاف الیہ کالسیارۃ ۔ قال فی التنویر والتنقل من غصن الی آخر وسدیہ فی نہر وحوض تبدیل مجلس اخری ، وفی العلائیۃ بخلاف زوایا مسجد وبیت وسفینۃ سائرۃ وفعل قلیل کاکل لقمتین وقیام ورد سلام وکذا دابۃ یصلی علیہا لان الصلوۃ تجمع الاماکن ولو لم یصل تتکرر ، وفی الشامیۃ لان سیرہا مضاف الیہ حتی یجب علیہ ضمان ما اتلفت بخلاف سیر السفینۃ ح عن البحر (رد المحتار ص [illegible] ج ۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم ۔

۳ ربیع الاول سنہ [illegible]ھ

سورۂ ص میں سجدۂ تلاوت کا مقام :

سوال : قرآن کریم میں سورۂ ص میں " اناب " پر لفظ سجدہ لکھا ہوا ہے مگر حضرت مفتی

کفایت اللہ صاحب کا فتویٰ ہے کہ یہ سجدہ مختلف فیہ ہے اس کی تحقیق فرمائیں، حضرت مفتی صاحب کے فتویٰ کی فوٹو کاپی ارسال ہے۔ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا جواب صحیح ہے، اس میں دونوں قول ہیں مگر دوسری آیت پر سجدہ کرنے میں احتیاط ہے اس لئے یہ قول راجح ہے، قال ابن عابدین رحمہ اللہ تعالیٰ وفی ص عندہ وحسن مآب وھو اولیٰ من قول الزیلعی عندہ وأناب لما نذکرہ وفی حم السجدۃ عند وَھُمْ لَا یَسْأَمُوْنَ (الی قولہ) لانہ لو وجبت عند تعبدون فات التأخیر الی یسأمون لا یضر بخلاف العکس لانھا تکون قبل وجود سبب الوجوب فتوجب نقصانا فی الصلوٰۃ لو کانت صلوتیۃ ولا نقص فیما قلناہ اصلا کذا فی البحر عن البدائع، امداد ملخصا (رد المحتار ص ... ج ۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۲۵ رجب [illegible]

نماز میں سجدۂ تلاوت بھول گیا:

سوال: نماز میں سجدہ کی آیت پڑھی مگر سجدہ کرنا بھول گیا اور سلام پھیر دیا تو اب کیا کرے؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

اگر سلام کے بعد یاد آیا تو سجدۂ تلاوت کر کے تشہد دوبارہ پڑھے پھر سجدۂ سہو کر کے حسب قاعدہ نماز پوری کرے، اگر آیت سجدہ کے بعد دو یا زیادہ آیات پڑھنے کے بعد نماز کے اندر ہی یاد آ گیا تو بہتر یہ ہے کہ فوراً سجدہ کر لے جس رکن میں یاد آئے یہ سجدہ کیا اس رکن کا اعادہ مستحب ہے، آخر نماز تک سجدہ کی تاخیر بھی جائز ہے، البتہ قعدۂ اخیرہ کے درمیان یا اس کے بعد سجدہ کیا تو قعدہ کا اعادہ فرض اور تشہد کا اعادہ واجب ہے، اور ہر صورت سجدۂ سہو واجب ہے، ملخص الی آخر بابلا ستقلال من الشامیۃ۔ اگر سجدۂ تلاوت میں تین آیتوں سے زیادہ تاخیر کی تو نماز کا اعادہ واجب ہے، سجدۂ سہو کافی نہیں، فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۱۰ رمضان [illegible]

باب صلوٰۃ المسافر

وطن اقامت کے قریب رات ٹھیرا تو پوری نماز پڑھے :

سوال : ایک مسافر نے ٹھیڑی میں اقامت کی، یہ پھیری لگا کر کپڑا بیچتا ہے، اسنے ایک رات خیرپور میں گزاری، وہاں عشاء کی نماز پڑھائی اور پوری چار رکعتیں پڑھیں، کہتا ہے کہ میں ٹھیڑی میں مقیم ہوں اور ٹھیڑی سے خیرپور مسافت سفر نہیں، اس بارہ میں کیا تفصیل ہے؟ مقتدیوں کی نماز صحیح ہوئی یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب ومنہ الصدق والصواب

اگر صرف ٹھیڑی میں کم از کم پندرہ شب مسلسل گزارنے کی نیت کی ہو تو ٹھیڑی اس کا وطن اقامت ہوگیا اس کے بعد جب تک ٹھیڑی سے بارادہ سفر شرعی نہیں نکلے گا ٹھیڑی اور اس کے گرد و نواح میں پوری ہی نماز پڑھے گا، لہٰذا خیرپور میں اسکا پوری نماز پڑھنا صحیح ہے، قصر جائز نہیں، قال فی شرح التنویر ویبطل وطن الاقامۃ بمثلہ و بالوطن الاصلی و بانشاء السفر و فی الشامیۃ عن الکافی والتتارخانیۃ خراسانی قدم بغداد لیقیم بہا نصف شہر ومکی قدم الکوفۃ کذلک ثم خرج کل منہما الی قصر ابن ھبیرۃ فانہما یتمان فی طریق القصر لان من بغداد الی الکوفۃ اربعۃ ایام والقصر متوسط بینہما الخ (رد المحتار ص ۸۰۳ ج ۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

سلخ رجب سنہ ۷۳ھ

نماز مغرب پڑھ کر ہوائی جہاز میں سوار ہوا اور آفتاب دوبارہ نظر آنے لگا :

سوال : ایک شخص مغرب کی نماز ادا کر کے ہوائی جہاز پر سوار ہوا، جہاز مغرب کی طرف اتنا تیز چلا کہ آفتاب دوبارہ نظر آنے لگا تو کیا اس پر مغرب کی نماز دوبارہ واجب ہوگی؟ نیز صائم نے روزہ افطار کر لیا تھا تو روزہ صحیح ہوگا یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

مغرب کی نماز دوبارہ پڑھنا واجب نہیں، روزہ بھی صحیح ہوگیا، مگر قواعد سے معلوم ہوتا ہے کہ دوبارہ غروب تک امساک واجب ہے، قال فی شرح التنویر فلو غربت ثم عادت ھل یعود الوقت الظاھر نعم، وقال ابن عابدین رحمہ اللہ تعالیٰ (قولہ الظاھر نعم) بحث صاحب النھر حیث قال ذکر الشافعیۃ ان الوقت یعود (الی قولہ) قلت علی ان الشیخ اسمٰعیل رد ما بحثہ

فی الظهر تبعاً لمشایخه بان صلوة العصر بغیبوبة الشفق تصیر قضاء ورجوعها لا یعیدها اداءً وما فی الحدیث خصوصیة لعلی رضی الله تعالیٰ عنه کما یعطیه قوله علیه الصلوة والسلام انه کان فی طاعتك وطاعة رسولك اه قلت ویلزم علی الاول بطلان صوم من افطر قبل ردها وبطلان صلوة المغرب لو سلمنا عود الوقت بعودها للکل والله اعلم (رد المحتار ص۲۳۲ ج۱)

فقط والله تعالیٰ اعلم

۲۹ ربیع الاول سنہ ۹۲ھ

ہوائی سفر میں دن بہت بڑا یا بہت چھوٹا ہو جائے تو نماز روزہ کا حکم:

سوال: زید ہوائی جہاز کے ذریعہ مغرب کی سمت جا رہا ہے سورج غروب نہیں ہو رہا تو نماز کس طرح ادا کرے اور روزہ کس وقت افطار کرے؟ یا اس کے برعکس مشرق کی طرف جا رہا ہے جس کا دن بالکل چھوٹا رہے گا اس کی نماز اور روزہ کے متعلق کیا حکم ہے؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملهم الصواب

قال العلامة ابن عابدین رحمه الله تعالیٰ تحت (قوله حدیث الدجال) قال الرملی فی شرح المنهاج ویجری ذلك فیما لو مکثت الشمس عند قوم مدة اه قال فی امداد الفتاح قلت وکذلك یقدر لجمیع الآجال کالصوم والزکوٰة والحج والعدة وآجال البیع والسلم والاجارة وینظر ابتداء الیوم فیقدر کل فصل من الفصول الاربعة بحسب ما یکون لکل یوم من الزیادة والنقص کذا فی کتب الائمة الشافعیة ونحن نقول بمثله اذ اصل التقدیر مقول به اجماعا فی الصلوات اه (وتعبد المصطفیٰ) وفی هذا الحدیث ان لیلة طلوعها من مغربها تطول بقدر ثلاث لیال لکن ذلك لا یعرف الا بعد مضیها لانبهامها علی الناس فحینئذ قیاس ما مر انه یلزم قضاء الخمس لان الزائد لیلتان فیقدران عن یوم ولیلة وواجبهما الخمس۔

وقال ایضاً تحت قوله فاقد وقت العشاء (تتمة) لم ار من تعرض عندنا لحکم صومهم فیما اذا کان یطلع الفجر عندهم کما تغیب الشمس او بعده بزمان لا یقدر فیه الصائم علی اکل ما یقیم بنیته ولا یمکن ان یقال بوجوب موالاة الصوم علیهم لانه یؤدی الی الهلاك فان قلنا بوجوب الصوم یلزم القول بالتقدیر وهل یقدر لیلهم باقرب البلاد الیهم کما قاله الشافعیة هنا ایضاً ام یقدر لهم بما یسع الاکل والشرب ام یجب علیهم القضاء فقط دون الاداء کل محتمل فلیتأمل (رد المحتار ص۲۳۹ ج۱)

ان عبارات سے ثابت ہوا کہ مغرب کی طرف جانے والا شخص اگر چوبیس گھنٹے میں پانچ نمازیں ان کے اوقات میں ادا کر سکتا ہو تو ہر نماز اس کا وقت داخل ہونے پر ادا کرے اور اگر اس کا دن اتنا طویل ہو گیا کہ چوبیس گھنٹے میں پانچ نمازوں کا وقت نہیں آتا تو عام ایام میں اوقات نماز کے فصل کا اندازہ کر کے اس کے مطابق نمازیں پڑھے، یہی حکم روزہ کا ہے کہ اگر طلوع فجر سے لے کر چوبیس گھنٹے کے اندر غروب ہو جائے تو غروب کے بعد افطار کرے، جن ممالک میں مستقل طور پر ایام اتنے طویل ہوں کہ چوبیس گھنٹے میں صرف بقدر کفایت کھانے پینے کا وقت ملتا ہو انہیں قبل الغروب افطار کی اجازت نہیں تو عارضی طور پر شاذ و نادر ایک دن طویل ہو جانے سے بطریق اولیٰ اس کی اجازت نہ ہوگی البتہ اگر چوبیس گھنٹے کے اندر غروب نہ ہو تو چوبیس گھنٹے پورے ہونے سے اتنا وقت پہلے کہ اس میں بقدر ضرورت کھا پی سکتا ہو افطار کر لے، اگر ابتداء صبح صادق کے وقت بھی سفر میں تھا تو اس پر روزہ فرض نہیں بعد میں قضا رکھے اور اگر اس وقت مسافر نہ تھا تو روزہ رکھنا فرض ہے اور اتنے طویل روزے کا تحمل نہ ہو تو سفر ناجائز ہے۔

جو شخص جانب مشرق جا رہا ہے نماز کے اوقات اس پر گزرتے رہیں گے، ان اوقات میں نماز ادا کرے گا اور روزہ غروب کے بعد افطار کرے کیونکہ صوم کے معنی ہیں طلوع فجر سے غروب شمس تک امساک۔ قال فی التنویر هو امساك عن المفطرات حقيقة او حكما فی وقت مخصوص وفی شرحه وهو اليوم وفی الحاشية ای اليوم الشرعی من طلوع الفجر الى الغروب (رد المحتار ص... ج ۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲۹ ربیع الاول سنہ ۹۱ھ

سفر میں سنت پڑھنے کا حکم:

سوال: مسافر کے لئے سنن رواتب کا ترک جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

جلدی کی صورت میں سنت فجر کے سوا دوسری سنتوں کا چھوڑنا جائز ہے، بحالت اطمینان سنن مؤکدہ پڑھنا ضروری ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سفر میں سنتیں پڑھنا ثابت ہے (اعلاء السنن ص... تا ص... ج ۷)

وقال فی الدر ويأتی المسافر بالسنن ان كان فی حال امن وقرار والا بان كان فی خوف وفرار لا يأتی بها هو المختار لانه ترك لعذر تجنيس، وقيل الا سنة

الفجر (رد المحتار ص۱۲۲ ج۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲۹ جمادی الاولیٰ سنہ ۹۰ھ

حدود شہر سے نکلنے پر حکم قصر شروع ہوگا:

سوال: سفر کا حکم کہاں سے شروع ہوگا، اپنے محلے سے نکل کر یا پورے شہر کی آبادی سے نکلنے کے بعد؟

ایک شخص کورنگی ۵ سے سفر پر روانہ ہو رہا ہے آیا وہ سٹی اسٹیشن پر قصر نماز پڑھے یا نہیں اور واپسی میں لانڈھی اسٹیشن پر قصر پڑھے یا نہیں جبکہ کورنگی ۵ پہنچنے تک نماز کا وقت ختم ہوجاتا ہے، تشریح سے وضاحت فرمائیں۔

الجواب باسم ملہم الصواب

شہر کی جس جانب سے جہت سفر نکل رہا ہو اس جانب کے مکانات سے باہر نکلنے پر حکم قصر شروع ہوتا ہے، مکانات سے آباد مکان مراد ہیں غیر آباد کھنڈرات کا اعتبار نہیں، اسی طرح بوقت واپسی مکانات کی حدود میں داخل ہونے پر حکم قصر ختم ہوجاتا ہے، مکان خواہ پختہ ہوں یا شہر سے ملحق جھونپڑیاں وغیرہ ہوں، بلکہ جھونپڑیوں کے بعد ان سے متصل بستی بھی اسی شہر کے حکم میں ہے۔

اگر فناء مصر (شہر کی ضروریات مثلاً قبرستان، گھوڑ دوڑ اور کوڑے وغیرہ کے لئے متعین میدان) کے درمیان زرعی زمین حائل نہ ہو اور عمارات سے قدر غلوہ (۱۴۰ یا ۲۰۰ میٹر) سے کم فاصلہ پر ہو تو فناء سے بھی تجاوز کے بعد قصر کا حکم ہوگا، البتہ ایسی فناء کے بعد اس سے ملحق بستی کا اعتبار نہیں، فناء مصر میں صحت جمعہ کے لئے عدم انفصال وقدر الغلوہ مشروط نہیں، صرف حکم قصر کے لئے یہ شرط ہے، شامیہ باب المسافر میں قدر غلوہ کے عدم اعتبار سے مقصد یہ ہے کہ خود فناء مقید بقدر غلوہ نہیں، شہر سے فصل بقدر غلوہ معتبر ہے۔

اگر شہر کی جانب سفر میں مکانات ختم ہوگئے مگر کسی ایک جانب راستے سے دور کوئی محلہ اس طرف بڑھا ہوا ہے تو اس کا اعتبار نہیں، البتہ اگر دونوں جانب اس قسم کی آبادی ہو تو ان کی محاذات سے خروج کے بعد حکم قصر ہوگا۔

کراچی کی عمارات غالباً ہیری اسٹیشن تک پہنچ چکی ہیں، سٹی اسٹیشن اور لانڈھی اسٹیشن پر بہر صورت قصر جائز نہیں، پوری نماز پڑھے، وهذا خلاصة ما هو مشروح في الهندية والشامية، فقط واللہ تعالیٰ اعلم

غرۂ رجب سنہ ۹۰ھ

جو آبادی شہر سے متصل نہ ہو وہ مستقل ہے:

سوال: ایک شخص لاہور شہر سے پندرہ میل مضافات میں رہتا ہے، اس کے گھر سے چار میل کے فاصلہ پر ایک بس اسٹاپ ہے، اب اس کو مسافر کہاں سے شمار کریں گے پہلے اسٹیشن سے یا دوسرے سے؟ آبادی مسلسل دوسرے بڑے اسٹیشن تک لگی ہوئی ہے اور اگر آبادی منقطع بھی ہو مگر یہاں کے عرف میں اس کو لاہور ہی شمار کیا جائے تو پھر کیا حکم ہوگا؟ یعنی سفر اور اقامت کا حکم ضلع کے اعتبار سے ہوگا یا بستی کے اعتبار سے یعنی جس دیہات میں وہ رہتا ہے، بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

اگر اس بستی سے شہر تک مسلسل عمارات نہیں بلکہ بقدر غلوہ (۱۹۹ سے ۲۶۱ میٹر) یا اس سے زائد خلا ہے یا درمیان میں زرعی اراضی ہیں تو یہ مستقل آبادی شمار ہوگی اس کے مکانات سے نکلنے پر قصر کا حکم شروع ہو جائے گا، اور اگر شہر سے متصل ہے خواہ شہر کی نواحی کچی آبادی یا جھونپڑی وغیرہ ہی سے متصل ہو تو یہ شہر میں داخل ہے اس لئے حدودِ شہر سے باہر نکلنے پر مسافر ہوگا۔

اسٹیشن اگر شہر سے متصل ہو یعنی درمیان میں زرعی زمین یا ۱۹۹، ۲۶۱ میٹر خلا نہ ہو تو اس پر حکم قصر نہیں، قال ابن عابدین رحمہ اللہ تعالیٰ: قلت (قوله من خرج من عمارۃ موضع اقامته) واشار الی انه یشترط مفارقة ما کان من توابع موضع الاقامة کربض المصر وهو ما حول المدینة من بیوت ومساکن فانه فی حکم المصر وکذا القری المتصلة بالربض فی الصحیح (وبعد سطر) واما الفناء وهو المکان المعد لمصالح البلد کرکض الدواب ودفن الموتی والقاء التراب فان اتصل بالمصر اعتبر مجاوزته وان انفصل بغلوة او مزرعة فلا (الی قوله) والقریة المتصلة بالفناء دون الربض لا تعتبر مجاوزتها علی الصحیح کما فی شرح المنیة (رد المحتار ص ۵۲۳ ج ۱)

عباراتِ فقہ میں اتصالِ آبادی کا کوئی معیار نظر سے نہیں گزرا، بظاہر اس کا مدار عرف پر ہے یعنی دیکھنے میں اتصال نظر آئے مگر وجود مزارع یا بقدر غلوہ بعد ہرکیف موجبِ انفصال ہے کیونکہ فناءِ مصر صحتِ جمعہ میں اگرچہ مطلقاً بحکم مصر ہے مگر حکمِ قصر میں وجودِ مزارع یا بقدر غلوہ الحاق بالمصر سے مانع ہے، حالانکہ فناء متعلقاتِ مصر سے ہے تو قریہ مستقلہ میں یہ فصل بطریقِ اولیٰ مانعِ الحاق ہوگا، البتہ فصل مذکور کے باوجود اگر عام عرف میں دو مقام ایک ہی شہر کے دو محلے سمجھے جاتے ہوں تو حکم اتحاد ہوگا۔

ریلوے اسٹیشن فناءِ مصر میں داخل ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۸ ذی الحجہ سنہ ۹۰ھ

لنگرگاہ پر حکم قصر کی تفصیل :

سوال : ہمارا شہر دریا کے کنارے پر واقع ہے فاصلہ تقریباً پچاس گز سے زیادہ نہیں، اور دریا میں کشتی تقریباً ایک سو سے تین سو گز کے فاصلہ پر رکتی ہے، گہرائی کم ہونے کی وجہ سے، یہ قدیم زمانہ سے مشہور لنگرگاہ ہے کیا اس سے قصر کا حکم شروع ہوگا؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

لنگرگاہ فنائے مصر ہے جس کا حکم یہ ہے کہ شہر سے ایک سو پچاس گز = ۱۳۷٫۱۶ میٹر سے کم فاصلہ پر ہو اور درمیان میں زرعی زمین نہ ہو تو یہاں قصر نہیں، کم از کم اتنا فاصلہ ہو یا درمیان میں زرعی زمین ہو تو حکم قصر شروع ہوگا، پس اس لنگرگاہ کے سامنے دریا کے کنارے پر اگر کوئی عمارت ہے تو وہ شہر سے پچاس گز اور اس سے لنگرگاہ سو گز پر ہے، درمیان میں ۱۹۱٫۴۴ میٹر خلا نہیں اس لئے بحکم شہر ہے، اور اگر دریا کے کنارے پر کوئی مکان اس جانب نہیں تو شہر سے ۱۳۷٫۱۶ میٹر خلا ہونے کی وجہ سے یہاں حکم قصر ہے، قال فی الشامیۃ واما الفناء وهو المكان المعد لمصالح البلد كركض الدواب ودفن الموتى والقاء التراب فان اتصل بالمصر اعتبر مجاوزته وان انفصل بغلوة او مزرعة فلا (رد المحتار ص ۵۲۱ ج ۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۱۲ر رمضان سنہ ۱۵ھ

اتصال آبادی کا معیار :

سوال : جھنگور ایک تحصیل ہے اس کے اندر دو موضع ہیں ایک دوسرے سے تقریباً ایک میل دور ہیں کے فاصلہ پر واقع ہیں، ہر ایک کافی آبادی ہے جتنے رقبے میں یہ موضع واقع ہیں وہ سب علاقہ جھنگور کہلاتا ہے، مندرجہ بالا بیان کے تحت مندرجہ ذیل سوالات کا جواب کیا ہوگا؟

(۱) جو شخص سفر کرنا چاہے وہ اپنی بستی کی آبادی سے باہر نکل کر مسافر ہے یا سب بستیوں سے تجاوز کے بعد؟

(۲) جب واپس آیا تو اپنی بستی میں داخل ہو کر مقیم ہوگا یا مطلق جھنگور میں داخل ہونے سے؟

(۳) باہر کا آدمی بیس دن کی نیت سے جھنگور آیا مگر کبھی اس بستی میں اور کبھی اس بستی میں، یہ قصر کرے یا پوری نماز پڑھے؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

دو بستیوں کے درمیان وجود مزارع یا قدر غلوہ (۱۹۱٫۴۴ میٹر) علامت انقطاع ہے،

معہذا اگر دو مواضع عرفِ عام میں ایک ہی شہر کے دو محلے سمجھے جاتے ہوں تو فصل مذکور کے باوجود دونوں کو ایک موضع قرار دیا جائے گا۔

سوال میں مذکور تفصیل سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر موضع مستقل ہے اور جھگور ان سب مواضع پر شامل علاقہ کا نام ہے، لہٰذا سفر کی ابتداء و انتہاء اور اقامت میں ہر موضع الگ شمار کیا جائے گا، اگر کم از کم پندرہ شب ایک جگہ گزارنے کی نیت ہو اور صرف دن میں دوسرے موضع میں جائے تو مقیم ہوگا ورنہ نہیں، فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲۹ جمادی الآخرۃ سنہ ۹۱ھ

صرف زمین ہونے سے وطن نہیں بنتا:

سوال: ایک شخص درسانو چھنو کا رہنے والا ہے اور اسکی زمین لسبیلہ میں ہے، مگر اسکے اہل و عیال وہاں نہیں صرف زمین ہے، درسانو چھنو سے لسبیلہ تک بہتر میل کا فاصلہ ہے اب وہ شخص درسانو چھنو سے کراچی اگر جو بائیس میل ہے کچھ گھنٹے قیام کر کے کراچی سے لسبیلہ جاتا ہے جو کراچی سے پچاس میل کے فاصلہ پر ہے، تو کیا یہ شخص کراچی تک مقیم سمجھا جائے گا جبکہ شروع ہی سے اسکا ارادہ لسبیلہ جانے کا تھا اور پھر لسبیلہ جانے کے بعد وہاں زمین کی وجہ سے مقیم سمجھا جائے گا یا مسافر؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

یہ شخص لسبیلہ جانے کی نیت سے درسانو چھنو سے نکلتے ہی مسافر ہو گیا، کراچی میں قصر کریگا اور لسبیلہ میں بھی مسافر ہی رہے گا زمین کی وجہ سے مقیم نہ ہوگا، قال فی شرح التنویر الوطن الاصلی ھو موطن ولادتہ او تأھلہ او توطنہ (رد المحتار ص ۷۳۵ ج ۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۸ رمضان سنہ ۸۸ھ

وطن اصلی میں صرف زمین رہ جانے سے وطن نہیں رہتا:

سوال: والد صاحب نے ایک قصبہ میں زمین خریدی اور وہاں مستقل رہائش اختیار کر لی میں اس زمانے میں بالغ تھا مگر والد صاحب ہی کی کفالت میں تھا، اس لئے میں بھی اسی موضع کو اپنا وطن اصلی سمجھتا تھا، بعد میں بسلسلہ ملازمت مختلف مقامات پر میرا قیام مع اہل و عیال رہا مگر ان میں سے کسی موضع کو بھی میں نے وطن اصلی بنانے کی نیت نہیں کی، بالآخر کراچی پہنچ کر اس کو وطن اصلی بنا لیا، اب سابق وطن اصلی میں صرف میری زمین ہے جو والد صاحب

نے اپنی حیات ہی میں مجھے ہبہ فرمادی ہے، علاوہ ازیں والد صاحب اور دوسرے بھائی بہن بھی یہیں مقیم ہیں، اس صورت میں وہ موضع میرے لئے وطن اصلی رہا یا نہیں؟ وہاں جاکر قصر کروں یا پوری نماز پڑھوں؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملهم الصواب

کراچی کو وطن اصلی بنا لینے سے سابق وطن باطل ہوگیا، صرف زمین باقی رہ جانے سے وہ وطن نہیں رہے گا، قال شارح التنویر الوطن الاصلی هو موطن ولادته او تأهله او توطنه یبطل بمثله اذا لم یبق له بالاول اهل، وفی الشامیة عن شرح المنیة ولو کان له اهل ببلدتین فایتهما دخلها صار مقیما فان ماتت زوجته فی احداهما وبقی له فیها دور وعقار قیل لا یبقی وطنا له اذ المعتبر الاهل دون الدار کما لو تأهل ببلدة واستقرت سکنا له ولیس له فیها دار وقیل تبقی اهـ وفیها (قوله اذا لم یبق له بالاول اهل) ای وان بقی له فیه عقار قال فی النهر ولو نقل اهله ومتاعه وله دور فی البلد لا تبقی وطنا له وقیل تبقی کذا فی المحیط وغیره (رد المحتار ص ۱۳۳ ج ۱)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۱۰ رمضان سنہ ۹۸ھ

تابع کو متبوع کی نیت اقامت کا علم نہ ہوا:

سوال: ایک شخص نے مسافرانہ نماز پڑھی، دوران نماز میں اس نے ارادہ کیا کہ اب مجھے پندرہ روز تک یہیں رہنا ہے اس لئے وہ تو اپنی شروع کردہ نماز کو پوری کرکے فارغ ہوا، اسکے ڈرائیور کو یہ علم نہیں تھا کہ اس کے مالک نے نیت اقامت کی کرلی ہے، نماز کے بعد اسکے مالک نے اس کو بتایا تو ڈرائیور یہ دوگانہ دوبارہ پڑھے یا آئندہ سے چار پڑھے؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملهم الصواب

ملازم کو جب تک مالک کی نیت کا پتہ نہ چلے اس وقت تک وہ قصر ہی پڑھے گا، لہٰذا ڈرائیور کا یہ دوگانہ صحیح ہوگیا، آئندہ پوری نماز پڑھے، مگر احتیاطاً یہ نماز بھی لوٹالے تو بہتر ہے۔

قال فی شرح التنویر والاعتبار بنیة المتبوع لا التابع فلو نوی المتبوع الاقامة ولم یعلم التابع فهو مسافر حتی یعلم علی الاصح وفی الفیض وبه یفتی کما فی المحیط وغیره دفعا للضرر عنه وفی الشامیة وقیل یلزمه الاتمام کالعزل الحکمی ای بسبب الوکالة وهو الاحوط کما فی الفتح وهو ظاهر الروایة کما فی الخلاصة بحر (رد المحتار ص ۵۳۶ ج ۱)

اگر یہ دونوں جماعت کر لیتے، مالک امام بنتا تو جماعت کا ثواب بھی ہوتا اور ذرا پوری کی نماز میں بھی کوئی اشکال نہ ہوتا۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۸ رمضان سنہ ۸۸ھ

مسافر نے سہواً پوری نماز کی نیت کر لی :

سوال : سفر میں قصر کی بجائے سہواً پوری نماز کی نیت کر لی یا حضر میں پوری نماز کی بجائے قصر کی نیت سہواً کر لی تو کیا کرنا چاہیئے؟ کیا نماز ہی میں نیت کی تصحیح کر لے؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملهم الصواب

نماز ہی میں نیت کی تصحیح کرے مگر زبان سے نیت کے الفاظ ادا نہ کرے، دل ہی دل میں نیت کر لے، فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲۳ ذی قعدہ سنہ ۸۸ھ

مسافر نے سہواً پوری نماز پڑھ لی :

سوال : مسافر نے بھول کر دو رکعت کی بجائے چار رکعتیں پڑھ لیں خواہ درمیان میں قعدہ کیا ہو یا نہ کیا ہو دونوں صورتوں میں نماز ہوئی یا نہیں اگر قعدہ کر لیا ہو تو سجدہ سہو سے تلافی ہو جائے گی؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملهم الصواب

قعدہ اولیٰ کر لیا ہو تو سجدہ سہو سے نماز ہو جائے گی ورنہ نہیں، قال فی التنویر فلو اتم مسافر ان قعد فی الاولیٰ تم فرضه واساء وما زاد نفل وان لم یقعد بطل فرضه (رد المحتار)

تیسری رکعت کے سجدہ سے قبل یاد آگیا تو لوٹ کر بیٹھ جائے یہ نماز واجب الاعادہ ہوگی۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۱۴ جمادی الآخرہ سنہ ۹۲ھ

سفر میں عمداً قصر نہ کیا تو توبہ و اعادہ واجب ہے :

سوال : اگر کوئی شخص سفر میں جان بوجھ کر قصر نہ کرے بلکہ پوری نماز پڑھے تو اس کا کیا حکم ہے؟ کیا اس کی نماز ہو جائے گی؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملهم الصواب

مسافر پر قصر واجب ہے، یہ شخص عمداً ترک واجب کی وجہ سے گنہگار ہوگا، اس لئے اس پر توبہ اور اس نماز کا اعادہ واجب ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۱۴ جمادی الآخرہ سنہ ۹۲ھ

جنگی قیدیوں کے لئے حکم قصر!

سوال : مودودی صاحب نے لکھا ہے کہ "آپ حضرات کا قید میں قیام بلا ارادہ اور غیر اختیاری ہے اس لئے آپ قصر نماز پڑھیں، سنت پوری پڑھیں، جس جگہ پر قیام اپنی نیت اور ارادے سے نہ ہو وہاں کے لئے یہی حکم ہے اس پر اکثر فقہاء اور محدثین کا اتفاق ہے کہ جس مقام پر مجبوراً ٹھہرنا پڑے اور ہر وقت یہ نیت ہو کر رکاوٹ دور ہوتے ہی انشاء اللہ واپسی ہوگی تو وہاں جتنی مدت بھی قیام ہو قصر ہوگا، حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ ایک علاقہ میں برف کی وجہ سے چھ مہینے تک رکے رہے اور قصر پڑھتے رہے جنگی حالات میں بعض صحابۂ کرام کو بعض مقامات پر کئی ماہ تک مجبوراً ٹھہرنا پڑا، حضرت انس دو سال تک شام میں رکے رہے اور قصر فرماتے رہے۔ جمعہ آپ پر واجب نہیں پڑھ سکیں تو ثواب ملے گا۔"

تفہیم القرآن میں بھی انھوں نے یہی لکھا ہے اسکے برعکس آپ نے پوری نماز پڑھنے کا فتویٰ دیا ہے اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ آیا یہ قیدیوں پر بھی لاگو ہے! حالات یہ ہیں کہ ہم عملاً ایک جیل کی چار دیواری میں بند ہیں جہاں اردگرد پہرہ ہے لہٰذا براہِ کرم فقہ حنفیہ کے مطابق قدرے تفصیل کے ساتھ اس مسئلے پر روشنی ڈالیں کیا فتویٰ ہے؟ ابھی تک چونکہ نماز میں پڑھاتا ہوں سب میرے پیچھے پوری نماز پڑھ رہے ہیں مزید اطمینان کیلئے لکھ رہا ہوں۔

الجواب باسم ملہم الصواب

نماز کے قصر و اتمام کا مدار اقامت اختیاری و اضطراری پر نہیں بلکہ اسکا مدار پندرہ روز تک اقامت کے تیقن و عدم تیقن پر ہے، چنانچہ بیوی، خادم، غلام اور قیدی کی اقامت اختیاری نہیں ہوتی بلکہ شوہر اور مولیٰ کی اقامت کے تابع اور غیر اختیاری ہوتی ہے، معہٰذا جب انھیں پندرہ روز تک شوہر اور مولیٰ کی اقامت کا علم ہو جائے تو ان پر اتمام ضروری ہے، مودودی صاحب کی تحریر میں جو حوالے نقل کئے گئے ہیں ان سب میں قصر اس بناء پر نہیں کہ اقامت غیر اختیاری تھی بلکہ اس بناء پر ہے کہ پندرہ روز تک اقامت کا یقین نہ تھا انھوں نے بے علمی کی وجہ سے غلط سمجھا اور اپنا زعم فاسد اکثر فقہاء و محدثین کی طرف منسوب کر دیا اللہ تعالیٰ ان کو علماء کی طرف رجوع اور بدون علم شوقِ اجتہاد کی بجائے فسئلوا اهل الذکر ان کنتم لا تعلمون پر عمل کی ہدایت فرمائیں،

غرضیکہ جنگی قیدی کو اگر قرائن سے ظن غالب ہو جائے کہ پندرہ روز تک اسے اس

مقام پر رکھا جائے گا تو اس پر اتمام ضروری ہے قصر جائز نہیں، آپ جمعہ پڑھ سکتے ہیں۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۱۰ شوال سنہ ۹۲ھ

سوال مثل بالا:

سوال: طویل انتظار کے بعد دو روز پہلے آپ کا ۳ شوال کا لکھا خط متعلقہ قصر نماز میں اس دن پہنچا جبکہ مولانا مفتی اعظم محمد شفیع صاحب اور جامعہ اشرفیہ لاہور سے آمدہ فتویٰ کے مطابق یہاں قصر نماز شروع کر دی گئی تھی ذاتی طور پر آپ کا استدلال پسند آیا اور احتیاطاً قصر نماز پڑھا کر علیحدہ پوری نماز پڑھتا رہا لیکن مقتدیوں کے اصرار پر صرف قصر نماز پر اکتفاء کرنا پڑا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

۵ جنوری کا نوشتہ دو روز ہوئے موصول ہوا، بذریعہ ٹیلیفون دار العلوم سے انکے فتویٰ متعلقہ قصر سے متعلق دریافت کیا تو فوری جواب دیا جو میں نے لکھا تھا یعنی اگر پندرہ روز ایک مقام پر ٹھیرنے کا یقین نہیں تو قصر پڑھیں مجھے اس پر تعجب ہوا کہ اس سے آپ نے اتمام کا حکم کیسے سمجھا؟ اسلئے میں نے ان سے فتویٰ کی نقل منگوا کر دیکھی جس میں یہ عبارت ہے

"جو پاکستانی مسلمان ہندوستان کی قید میں ہیں، اگر انہیں یہ پتہ نہیں کہ کب خلاصی ہو کر روانہ ہو جائیں گے یا کب ایک کیمپ سے دوسرے کیمپ میں بھیجا جائے گا تو انکی نیت اقامت معتبر نہیں وہ برابر مسافر ہی رہیں گے گھروں میں پہنچنے تک یا قید سے چھوٹ کر کسی شہر یا بستی میں پندرہ دن سے کم اپنے اختیار سے کام کرنے تک ہمیشہ مسافر رہیں گے، وفی تحفة الفقهاء العبد اذا خرج مع مولاه ولا یعلم سیر المولیٰ فانه یسأله فان اخبره ان مسیرة مدة السفر صلی صلوٰة المسافرین وان کان دون ذلک صلی صلوٰة الاقامة وان لم یخبره بذلک فان کان مقیما قبل ذلک صلی صلوٰة الاقامة وان کان مسافرا قبل صلی صلوٰة المسافرین کذا فی الخلاصة اه وفی المحیط صلوٰة الاسیر والعبد وان کان مسیرة العدو ثلاثة ایام یقصر وان کان دون ذلک یتم وان لم یعلم یسأل کما مر فی العبد (البحر الرائق ص ۱۴۰ ج ۲)"

فتویٰ مذکورہ کی عبارت ادا سے مراد ہے تو ظاہر ہے اسکا منشا اور مطلب وہی ہے جو آپ نے لکھا ہے یعنی جب رہائی کی تاریخ کا کوئی علم نہیں تو قصر ہی کیا جائے، مگر یہ مطلب نہ صحیح ہے اور نہ یہی دار العلوم والوں کی مراد ہے انھوں نے اسکا اعتراف بھی کیا ہے دراصل کے فتویٰ کی عربی عبارات بھی اسی کی مثبت ہیں، ان کی مراد اس سے وہی ہے کہ پندرہ روز ٹھیرنے کا یقین نہ ہو تو قصر پڑھیں میں ان کو بھی لکھ رہا ہوں کہ وہ عبارت کی ترمیم کر کے مستفتی کو بھی اسکی اطلاع کریں تاکہ مراد سمجھنے میں غلط فہمی نہ ہو اور نمازیں ضائع نہ ہوں۔

حاصل یہ ہے کہ اس پر تمام ارباب فتاویٰ متفق ہیں کہ ایک مقام پر پندرہ روز ٹھیرنے کا یقین ہو تو اتمام کریں ورنہ قصر کریں، اسمیں اختیار و عدم اختیار کو کوئی دخل نہیں البتہ اسمیں اختلاف رائے ہو سکتا ہے کہ حالات کے پیش نظر پندرہ روز کی اقامت ایک جگہ پر متیقن ہے یا نہیں! اس میں سیاسی حالات میں بصیرت رکھنے والوں کی رائے کا اعتبار ہوگا، اگر ان کو ظن غالب ہو کہ پندرہ روز سے قبل رہائی یا نقل مکانی متوقع نہیں تو اتمام فرض ہوگا ورنہ قصر کریں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲۸ ذی الحجہ سنہ ۹۲ھ

مقیم کے پیچھے مسافر کی نماز فاسد ہوگئی تو دو رکعت لوٹائے:

سوال: ایک مسافر نے مقیم امام کے ساتھ نماز شروع کی، تیسری رکعت میں شامل ہوا اور امام کے ساتھ ہی سلام پھیر دیا، اس کے بعد علم ہوا کہ امام کے تابع ہونے کی وجہ سے اس پر چار رکعتیں فرض تھیں، اب اعادہ کے وقت دو رکعتیں پڑھے یا کہ چار کا اعادہ کرے؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملهم الصواب

دو رکعتیں پڑھے، قال فی العلائیۃ وان اقتدی المسافر بالمقیم فیصح فی الوقت ویتم لا بعدہ فیما یتغیر وفی الشامیۃ تحتہ (قولہ فیصح فی الوقت ویتم) ای سواء بقی الوقت او خرج قبل اتمامها لتغیر فرضه بالتبعیۃ لاتصال المغیر بالسبب وهو الوقت ولو افسده صلی رکعتین لزوال المغیر بخلاف ما لو اقتدی به متنفلا حیث یصلی اربعاً اذا افسده لانه التزم صلوٰۃ الامام (رد المحتار ص۶۱۳ ج۱)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲۶ جمادی الاولیٰ سنہ ۸۹ھ

ہوائی جہاز میں مسافت قصر:

سوال: ایک ملک میں سفر کے تین راستے ہوں، اوّل خشکی کا راستہ، دوم دریا اور سوم خشکی مگر پہاڑی راستہ ہے، خشکی کے راستہ میں تین دن گزرنے پڑتے ہیں یہی حال پہاڑی راستہ کا ہے مگر دریا کے راستہ سے دو دن گزارنے پڑتے ہیں، جب زید سفر کرنا چاہے دریا کے راستہ سے تو اس کے لئے قصر کرنا درست ہے یا نہیں؟ اگر قصر کرنا درست نہیں تو زید جب ہوائی جہاز پر سفر کرتا ہے تو اس میں بطریق اولیٰ قصر کرنا درست نہیں ہوگا اس بارے میں عبارت مستخلص الحقائق شرح کنز الدقائق ملاحظہ ہو، حتی لو کان لموضع طریقان احدھما فی البحر والآخر فی البر او فی الجبل بحیث لو سار فی البر قطعہ فی ثلاثۃ ایام ولو سار فی البحر قطعہ فیما اقل من ذلک باعتدال الریح وکان بحیث لو سار فی البر قطعہ فی اقل من ثلاثۃ ایام ولو سار فی الجبل قطعہ فی ثلاثۃ ایام لمکان الصعود والنزول فان سار فی البر قصر وان سار فی البحر لا، وکذلک الجبل کما فی ینابیع وغیرہ (ص ۵۵)

بیّنوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

اگر دریا کا راستہ اختیار کرنے سے دو دن کی مسافت بنتی ہے تو اس راستہ میں قصر کرنا درست نہ ہوگا، ہوائی جہاز کو اس پر قیاس کرنا صحیح نہیں، اس لئے کہ قصر کا اصل مدار اس پر ہے کہ خشکی یا دریا میں معتدل سیر سے تین روز کی مسافت ہو، اگر اتنی مسافت مرکب سریع کے ذریعہ جلد طے کرلی تو بھی قصر واجب ہوگا، قال فی العلائیۃ حتی لو اسرع فوصل فی یومین قصر، وفی الشامیۃ ای الی مکان مسافۃ ثلاثۃ ایام بالسیر المعتاد بحر (رد المحتار ص ۱۲۴ ج ۱)

لہٰذا ہوائی جہاز خشکی کے راستہ کی محاذات پر پرواز کریگا تو معتدل سیر سے تین روز کی مسافت ہونے کی وجہ سے قصر واجب ہوگا اور دریا کی محاذات پر پرواز ہوگی تو قصر جائز نہیں، فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲۰ رمضان المبارک سنہ ۹۵ھ

مسافر مسبوق خلف المقیم پوری نماز پڑھے:

سوال: مقیم امام کا مقتدی مسافر مسبوق اپنی رہی ہوئی نماز بحساب قصر پڑھے یا امام کی اقتداء کی وجہ سے پوری چار رکعت پڑھے؟

بیّنوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

اقتداء نماز میں امام کے تابع ہونے کی وجہ سے پوری چار رکعتیں پڑھے،
فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۱۲ شعبان سنہ ۹۸ھ

مسافر خلف المقیم چار رکعت کی نیت کرے:

سوال: چار رکعت والی نماز میں مقیم امام کے پیچھے مسافر مقتدی نیت کتنی رکعت کی باندھے گا یعنی نیت کرتے وقت چار کہے گا یا دو کہے گا؟

الجواب باسم ملہم الصواب

امام کی متابعت کی وجہ سے مقتدی کی بھی چاروں رکعات فرض ہیں اس لئے چار کی نیت کرے، فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۳ جمادی الآخرہ سنہ ۹۸ھ

بحری جنگی مشقوں میں حکم قصر:

سوال: پاک بحریہ کے جہاز جب جنگی مشقوں کے لئے سمندر میں گشت کرتے ہیں تو ان کا عملہ نماز پوری پڑھے یا قصر کرے، ایک عالم دین نے خود جہاز پر جاکر موقع دیکھ کر اور حالات سن کر قصر پڑھنے کا فتویٰ دیا مگر دار الافتاء مدرسہ عربیہ نیوٹاؤن سے استفسار کیا گیا تو انھوں نے پوری نماز پڑھنے کا فتویٰ لکھا، یہ فتویٰ ارسال خدمت ہے ملاحظہ فرما کر تحریر فرمادیں کہ کونسا فتویٰ صحیح ہے؟ بینوا توجروا

سوال: پاک بحریہ (پاکستان نیوی) کے جہاز جب سمندر میں مختلف جنگی مشقوں کے لئے جاتے ہیں تو آیا ان میں نماز قصر پڑھنی ہوگی یا پوری، جبکہ ان جہازوں کے تفصیلی حالات حسب ذیل ہیں،

(۱) کھانے پینے، رہائش وغیرہ دیگر تمام ضروریات زندگی جو ویسے گھر میں مقیم ایک آدمی کے لئے ہوتی ہیں سب مہیا ہیں، جہاز اکثر دو دنوں سے لیکر ہفت عشرہ تک مسلسل سمندر میں چلتے رہتے ہیں، بعض اوقات کراچی سے صرف تیس چالیس میل پر ہوتے ہیں لیکن کل سفر کے حساب سے وہ سیکڑوں میل ایک ہی دن میں طے کرجاتے ہیں مثلاً کبھی ان مشقوں کے دوران مشرق کو کبھی مغرب و شمال و جنوب کو ۲۰-۲۵ یا ۳۰ میل قطر کے دائرہ کے اندر گھومتے رہتے ہیں تو کیا یہاں کل سفر کا حساب ہوگا یا کراچی سے فاصلہ کا؟

(۲) ایک بار مشقاً انھوں نے شرعی تین منزل (۴۸ میل) کراچی سے فاصلہ طے کر لیا اور پھر دو یا تین دن اس سے کم فاصلہ پر رہے اور مختلف اطراف کو چلتے رہے تو یہاں قصر ہوگی یا نہیں؟

(۳) جہاز صرف چند گھنٹوں کے لئے سمندر میں گیا کراچی بندرگاہ سے پورے اڑتالیس ۴۸ یا پچاس میل سیدھا ایک طرف گیا اور پھر سیدھا واپس بندرگاہ آگیا تو کیا حکم ہے؟

(۴) جہاز چند گھنٹوں کے لئے کراچی سے روانہ ہوا پھر سیدھا ایک طرف نہیں بلکہ مختلف اطراف کو مڑتا ہوا۔ اس نے پچاس سے زائد میل سفر کیا اور اسی طرح واپس ہوتے ہوئے پچاس سے زائد میل سفر ہوا جبکہ اس دوران کبھی بھی اور کسی جگہ پر بھی کراچی سے ۴۸ میل پر نہ تھا تو کیا حکم؟

(۵) بندرگاہ سے جہاز کا بیس ۲۰ پچیس ۲۵ میل کے فاصلہ پر دو تین دن مشقیں کرتے رہے پھر تیسرے یا چوتھے دن ۴۸ میل سے زائد فاصلہ پر جاکر پھر واپس آگئے تو آیا بعد میں سب نمازیں واپس بندرگاہ تک پوری ہونگی یا قصر؟

(۶) کراچی سے جہاز چلا پچاس ۵۰ سے زیادہ میل فاصلہ تک جانے کا ارادہ تھا پھر راستہ میں خراب ہوگیا یا کسی مصلحت کی بنا پر واپس آگیا تو نماز پوری ہوگی یا قصر؟

(۷) بعض اوقات جنگی مشقوں کی مصلحتوں کی بنا پر کسی کو بھی نہیں بتایا جاتا سوائے چند مخصوص افراد کے جو اس کام (یعنی سمتوں اور فاصلوں کا معلوم کرنا) پر مامور ہوتے ہیں کہ جہاز بندرگاہ سے اتنے فاصلے پر ہے تو کیا معلوم کرنا فرض ہے جبکہ ان افراد کو جن کو معلوم ہو سختی سے منع کر دیا ہو کہ کسی کو نہ بتائیں تو کیا وہاں اپنے اندازہ پر قصر یا پوری نماز پڑھیں گے؟
علاوہ ازیں بحری سفر کے بارے میں شرعی احکام سے متعلق آگاہ فرمادیں کہ کتنے میل کی مسافت پر قصر کا حکم ہے؟ بینوا توجروا

جواب از مدرسہ نیو ٹاؤن

(۱) دوران مشق اگر جہاز ۴۸ میل سے کم فاصلہ کے قطر میں مشرق و مغرب جنوب شمال چکر لگاتے ہیں تو نماز پوری پڑھی جائے اگرچہ کل سفر کے حساب سے سیکڑوں میل طے کر جائیں جب تک ساحل کراچی سے ۴۸ میل کا فاصلہ نہ ہو جائے قصر نہ کیا جائے۔

(۲) جب ایک بار ساحل کراچی سے ۴۸ میل سفر کیا اور سفر شروع کرتے وقت

۴۰ میل یا اس سے زیادہ کا ارادہ بھی تھا تو اس صورت میں روانگی کے بعد واپسی تک قصر کیا جائے۔

③ قصر کیا جائے۔

④ نماز پوری پڑھی جائے۔

⑤ اگر سفر شروع کرتے وقت ۴۰ میل یا اس سے زیادہ کا ارادہ تھا تو شروع سے قصر کیا جائے، اگر شروع سے ۴۰ میل کا ارادہ نہیں تھا تو ۴۰ میل ہوجانے کے بعد بندرگاہ واپسی تک قصر کیا جائے

⑥ جس وقت ارادہ تبدیل ہوا اس وقت سے نماز پوری پڑھی جائے اس سے قبل قصر کیا جائے،

⑦ ظاہر ہے کہ جہاز کے عام ملازمین کمانڈر کے تابع ہیں اور اس سلسلہ میں مسئلہ یہ ہے کہ متبوع یعنی کمانڈر کی نیت کا اعتبار ہوگا اور جب نیت معلوم ہوسکے جیسا کہ سوال میں کہا گیا ہے کہ نیت اور ارادہ معلوم کرنا مشکل ہے تو اگر آفیسران نمازی ہیں تو ان کو دیکھ لیا جائے کہ کس طرح نماز پڑھتے ہیں قصر کے ساتھ یا پوری نماز پڑھتے ہیں ورنہ تابع یعنی جہاز کے باقی حضرات اپنی حالت کا اعتبار کریں ۴۰ میل کے بعد قصر کریں اور اس سے پہلے اتمام یعنی پوری نماز پڑھیں، فقط واللہ تعالیٰ اعلم

یکم محرم الحرام سنہ ۱۴۰۰ھ

الجواب باسم ملہم الصواب

جس عالم نے وجوب قصر کا فتویٰ دیا ہے ان کو غالباً اس مسئلہ سے اشتباہ ہوا ہے کہ جب کسی مقام تک پہنچنے کے دو راستے ہوں، قریب کے راستے سے مسافت قصر نہ ہو اور بعید راستہ سے مسافت قصر ہو تو براہ بعید سفر کرنے والے پر قصر واجب ہے، صورت سوال کو اس پر قیاس کرنا صحیح نہیں، اس لئے کہ مسئلہ مذکورہ اس صورت میں ہے کہ منزل مقصود تک پہنچنے کے راستے متعین ہوں جیسا کہ بالعموم بری سفر میں ہوتا ہے، مسافر کا اصل مقصد ایک مخصوص مقام ہوتا ہے اور اسکا دائیں بائیں مڑنا انحراف طریق کی وجہ سے ہوتا ہے پس انحراف طریق کی وجہ سے اگر مسافت سفر متحقق ہوجائے تو قصر واجب ہے اگرچہ خط مستقیم یا طریق قریب مسافت سفر سے کم ہو، اگر بعید طریق سے قطع نظر مطلقاً بھی ویسا انحراف کی

مسافت کا اعتبار کیا جائے تو اس پر لازم آئیگا کہ اگر کوئی شخص اپنے شہر سے باہر نکل کر شہر سے متصل ہی چکر کاٹتا رہے یا ہل جوتتا رہے یا کچھ لوگ شہر سے باہر نکل کر کبڈی کھیلنا شروع کر دیں اور مجموعہ مسافت، مسافتِ سفر کے برابر ہو جائے تو ان پر قصر واجب ہو جائے اور یہ بدیہی البطلان ہے، والمقدمۃ المستلزمۃ للباطل باطل، غرضیکہ صورتِ مسئولہ میں وجوب کا قول صحیح نہیں، مدرسہ نیوٹاؤن کا جواب صحیح ہے مگر اس میں بھی سوال اول کے جواب میں چند اشتباہ واقع ہوئے ہیں جو درج ذیل ہیں،

(۱) اس میں بری اور بحری میل کا فرق ملحوظ نہیں رکھا گیا، بری میل ۱۷۶۰ گز، اور بحری میل ۲۰۲۶،۶۷ گز ہوتا ہے۔

(۲) مسافتِ سفر بصورتِ قطر کی قید صحیح نہیں بلکہ ساحل سے بُعد کا اعتبار ہے خواہ بصورتِ قطر ہو یا نہ ہو۔

(۳) بحری سفر کو بھی بری پر قیاس کرکے اڑتالیس میل کو مسافتِ قصر قرار دینا صحیح نہیں، مذہب میں اصل اعتبار میلوں کی بجائے تین روز کی مسافت کا ہے بری سفر میں اسکا تخمینہ ۴۸ میل شرعی کیا گیا ہے مگر یہ فیصلہ بحری سفر پر جاری نہیں ہو سکتا، بحری جہاز کے کپتان سے تحقیق ہوئی کہ عام معمولی کشتی معتدل ہوا میں پانچ چھ میل بحری فی گھنٹہ طے کرتی ہے، ماہرین فن ملاحوں اور پاک بحریہ کے افسروں سے بھی اسکی تصدیق ہوئی۔ مجموعہ پانچ شہادتوں سے ثابت ہوا کہ معتدل ہوا میں معمولی کشتی کی اوسط رفتار ۵½ میل بحری فی گھنٹہ ہے، لہٰذا بحری سفر میں مسافتِ قصر کا حساب یوں ہوگا تین دن = ۷۲ گھنٹے × ۵½ = ۳۹۶ بحری میل،

کشتی چونکہ رات دن مسلسل چلتی ہے اسلئے بحری سفر کی صورت میں تین دن رات مسلسل چلنے کی مسافت کو مسافتِ قصر قرار دیا جائیگا اس سے کم مسافت کے قصد پر قصر کرنا جائز نہیں،

(فائدہ) میل انگریزی = ۱۷۶۰ گز، میل شرعی ۲۰۰۰ گز، میل بحری ۲۰۲۶،۶۷ گز،

بری سفر میں ۴۸ میل انگریزی مسافتِ سفر نہیں بلکہ ۴۸ میل شرعی ہیں، البتہ مفتیٰ بہ قول کے مطابق ۴۵ میل شرعی = ۵۱ میل انگریزی مسافتِ سفر ہے تفصیل بندہ کے رسالہ "القول الاظہر فی مسئلۃ السفر" میں ہے، فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۹ شوال سنہ ۹۷ھ

ریل قبلہ سے پھر گئی:

سوال: ریل میں سفر کرتے ہوئے اس نے کعبہ کی طرف رُخ کیا اور نماز کے دوران میں گاڑی کا رُخ کعبہ سے پھر گیا تو کیا اس کی نماز باقی رہے گی؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملهم الصواب

ریل کا رُخ پھرنے کا علم ہوتے ہی فوراً قبلہ کی طرف گھوم جائے، اگر نہیں گھوما یا گھومنے کی جگہ نہیں تھی تو نماز دوبارہ پڑھے، البتہ نماز کے بعد ریل گھومنے کا علم ہوا تو یہ نماز صحیح ہو گئی، فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲۰ صفر سنہ ۹۱ھ

ڈرائیور سفر میں ہمیشہ قصر پڑھے گا:

سوال: ٹرک اور ریل چلانے والے ڈرائیور لوگ جبکہ ۵۰ میل سے زائد سفر کرتے ہیں بلکہ یہ لوگ تو ہمیشہ ہی سفر ہی سفر میں ہوتے ہیں کیونکہ کراچی سے لاہور تک اور لاہور سے کراچی تک، کراچی سے پشاور وغیرہ تک چلتے پھرتے ہیں تو یہ لوگ نماز قصر پڑھیں گے یا اتمام کریں گے؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملهم الصواب

جب تک سفر میں رہیں گے قصر پڑھیں گے، فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲ رجب سنہ ۹۵ھ

عورت سفر میں وطن کے قریب جا کر پاک ہوئی تو پوری نماز پڑھے:

سوال: کوئی عورت سفر میں حیض کے ساتھ ہو اور ایسی جگہ پہنچ کر پاک ہوئی جہاں سے وطن مسافت سفر سے کم ہو اور اس حالت میں اس پر نماز کا وقت آ گیا تو یہ قصر پڑھے گی یا پوری نماز پڑھے گی؟ اور اگر یہ نماز قضا ہو گئی تو پوری نماز قضا کرے گی یا دوگانہ؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملهم الصواب

خواہ ادا پڑھے یا قضاء، بہر صورت اس پر پوری نماز فرض ہے، قال فی العلائیۃ طهرت الحائض وبقي لمقصدها يومان تتم في الصحيح كصبي بلغ بخلاف كافر أسلم (رد المحتار ص ۵۳۹ ج ۱) یہ حکم جب ہے کہ ابتداء سفر سے حائضہ ہو، اگر حالت طہارت میں سفر کی ابتداء ہوئی ہو تو حیض ختم ہونے کے بعد بھی قصر ہی پڑھے گی، کما یفہم من قول ابن عابدین رحمہ اللہ

تعالیٰ عنہما من الصلوٰۃ ما یجب بعضہا فلابد فیہا من الاولیٰ ۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۹ ر شعبان سنہ ۹۰ ھ

بیل گاڑی پر نماز :

سوال : جبکہ گاڑی میں بیل جتے ہوئے ہوں اس پر کھڑا ہوکر نماز ادا کرنا خواہ فرض ہو یا سنن و نوافل ہو صحیح ہے یا نہیں ؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

فرائض و سنن مؤکدہ بدون عذر جائز نہیں، نوافل جائز ہیں، اگر استقبال قبلہ مشکل ہو تو وہ بھی معاف ہے، اسی طرح گھوڑے پر بھی نوافل پڑھے جا سکتے ہیں، سجدہ کی بجائے اشارہ کافی ہے۔ نہ استقبال قبلہ ضروری اور نہ ہی گھوڑے اور رکاب اور زین وغیرہ کی طہارت، خود گاڑی پر نجاست نہ ہو، اگر گاڑی ایسی ہو کہ اسکا وزن جانور پر نہ ہو جیسے اونٹ گاڑی تو اس پر فرض نماز بھی جائز ہے مگر استقبال قبلہ اور قیام شرط ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۱۰ ر جمادی الاولیٰ سنہ ۹۰ ھ

ریل گاڑی اور بس میں نماز :

سوال : ریل گاڑی یا بس کے سفر میں نماز کیسے پڑھے؟ اگر ڈرائیور بس نہ روکے اور بس اسٹاپ یا اسٹیشن تک پہنچنے میں وقت نکل جانیکا خطرہ ہو، اگر کھڑا نہ ہو سکتا ہو تو بیٹھ کر نماز ہو جائے گی؟ اور قبلہ کی طرف رخ نہ ہو سکے تو کیا کرے؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

ریل گاڑی اور بس میں کھڑے ہو کر قبلہ رخ نماز پڑھیں، گرنے کا خطرہ ہو تو کسی چیز سے ٹیک لگا کر یا ہاتھ سے کوئی چیز پکڑ کر کھڑے ہوں، حالت قیام میں ہاتھ باندھنا سنت ہے فرض نہیں اور قیام فرض ہے، اسلئے بوقت ضرورت ہاتھ چھوڑ کر کسی چیز کو پکڑ کر کھڑا ہو، اگر قبلہ رخ ہونے کی گنجائش نہ ہو تو دو نشستوں کے درمیان قبلہ رخ کھڑا ہو کر قیام و رکوع کا فرض ادا کرے اور سجدہ کے لئے پچھلی نشست پر کرسی کی طرح بیٹھ جائے یعنی پاؤں نیچے ہی رہیں اور سامنے کی نشست پر سجدہ کرے، اس صورت میں بحالت سجدہ گھٹنے کسی چیز پر نہیں ٹکیں گے مگر سجدہ میں گھٹنے رکھنا فرض نہیں بلکہ واجب یا سنت ہے، بوقت عذر اس کے ترک سے نماز ہو جائے گی، اگر کسی وجہ سے قیام یا استقبال قبلہ کا فرض

کسی طرح بھی ادا نہ ہو سکے تو اس وقت جیسے بھی ممکن ہو نماز پڑھ لے مگر بعد میں ایسی نماز کا اعادہ کرے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۱۵ رجب سنہ [illegible]ھ

کشتی اور بحری جہاز میں نماز:

سوال: کشتی کنارے سے لگی ہوئی ہو اور اس سے اتر کر نماز پڑھنا ممکن ہو تو کشتی کے اندر نماز صحیح ہوگی یا نہیں؟ بحری جہاز کا حکم بھی کشتی کی طرح ہے یا اس سے مختلف ہے؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

کشتی اور بحری جہاز کا لنگر زمین پر ٹکا ہوا ہو تو اس میں نماز صحیح ہے اور اگر زمین پر مستقر نہیں تو بعض نے امکان خروج کے باوجود نماز کی صحت کا قول کیا ہے مگر راجح یہ ہے کہ اس صورت میں کشتی اور جہاز کے اندر نماز صحیح نہیں باہر نکل کر پڑھے، بلکہ چلتی کشتی کو بھی اگر کنارے پر لگا کر نکلنا ممکن ہو تو قول راجح کی بنا پر اس میں بھی نماز درست نہیں، اگر ملاح کشتی کنارے لگانے پر راضی نہ ہو یا بندرگاہ پر جہاز کا عملہ باہر نکلنے کی اجازت نہ دے تو اندر ہی نماز پڑھ لی جائے مگر بعد میں اسکا اعادہ واجب ہے، قال ابن عابدین رحمہ اللہ تعالیٰ ثم اعلم ان ما فی الھدایۃ وغیرھا من الجواز قائما مطلقا ای استقرت علی الارض اولا صرح فی الایضاح بمنعہ فی الاول حیث امکنہ الخروج الحاقا لھا بالدابۃ نھر واختارہ فی المحیط والبدائع بحر وعزاہ فی الامداد ایضا الی مجمع الروایات عن المصفی وجزم بہ فی نور الایضاح وعلی ھذا ینبغی ان لا تجوز الصلوۃ فیھا سائرۃ مع امکان الخروج الی البر وھذہ المسألۃ الناس عنھا غافلون، شرح المنیۃ (ردالمحتار ص[illegible] ج ۱)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۱ ر جمادی الاولیٰ سنہ [illegible]ھ

ہوائی اور بحری جہاز میں نماز:

سوال: ہوائی جہاز میں نماز ہو جاتی ہے یا نہیں؟ اگر جائز نہیں اور جہاز کے اترنے تک نماز قضا ہو جانے کا خطرہ ہے تو کیا کرے؟

بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

بوقت پرواز ہوائی جہاز میں نماز کا حکم چلتے ہوئے بحری جہاز کی طرح ہے، یعنی اس میں بوجہ عذر نماز جائز ہے، کالصلوٰۃ علی الدابۃ، البتہ ٹھہرنے کی حالت میں دونوں کا حکم مختلف ہے، ہوائی جہاز زمین پر ہو تو اس میں بالاتفاق نماز صحیح ہے، اور بحری جہاز کنارے کے ساتھ لگا ہوا ہو تو اس میں نماز کا جواز مختلف فیہ ہے، عدم جواز راجح ہے، اگر بحری جہاز کا عملہ نماز کے لئے اُترنے کی اجازت نہ دے تو جہاز میں نماز پڑھ لے مگر بعد میں اعادہ واجب ہے۔
فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۶ر شوال سنہ ۹۰ھ

بندرگاہ کراچی میں قصر نہیں:

سوال: کراچی کے رہنے والے لوگ یا جہاز کے ملازم بحری جہاز سے سفر کریں تو ان کو قصر نماز کب شروع اور ختم کرنا چاہئے؟ کیا جہاز میں بیٹھ جانے کے بعد جب تک جہاز ساحل سمندر پر کھڑا رہے قصر نماز پڑھتے رہیں؟ یا اس کے روانہ ہونے کے بعد قصر کرنا شروع کریں؟ جو جہاز سامان تجارت لے کر باہر جاتے ہیں یعنی کارگو شپ، ان پر غلہ یا دیگر سامان لادنے میں بعض اوقات کافی وقت لگ جاتا ہے، اسی طرح آنے والے جہاز کراچی پہنچنے کے بعد بھی ساحل پر کوئی برتھ خالی نہ ہونے کی وجہ سے کچھ فاصلہ پر سمندر میں کھڑے رہتے ہیں اور سامان کے اُترنے میں کافی وقت خرچ ہوتا ہے، تو وہ لوگ قصر نماز کب ختم کریں؟ جہاز کے کراچی پہنچنے پر یا جہاز سے اُترنے کے بعد؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

بندرگاہ اور انتظارگاہ یعنی بندرگاہ پر جگہ نہ ہونے کی صورت میں جہاں جہاز انتظار میں ٹھہرائے جاتے ہیں فناء مصر میں داخل ہیں، فناء و مصر کے درمیان زرعی زمین اور ۱۶ سے ۲۰ امیٹر کا فاصلہ نہ ہو تو احکام سفر میں فناء بحکم مصر ہے، لہٰذا بوقت روانگی اور بوقت واپسی دونوں صورتوں میں ان مقامات میں نماز پوری پڑھی جائے گی، البتہ جو شخص کراچی میں مقیم نہ ہو اور یہاں پندرہ روز ٹھہرنے کی نیت نہ ہو وہ قصر پڑھے گا۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۲۰ر رجب سنہ ۱۴۰۲ھ

وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب
القول الاظہر
فی
تحقیق مسافۃ السفر
فاروقی

تحقیق مسافت سفر :

تحقیق صاع و مسافت سفر (مشمولہ رسالہ اوزان شرعیہ مصنفہ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب) سے متعلق ایک سوال کے جواب میں دونوں مسائل کی تحقیق لکھی گئی تھی۔ چونکہ دونوں مسئلے الگ ابواب سے متعلق ہیں اسلئے ہر ایک کے لئے الگ نام تجویز کرکے اسے اسکے باب میں شامل کیا گیا ہے۔ صاع سے متعلق تحقیق بنام "بسط الباع لتحقیق الصاع" باب صدقۃ الفطر میں ہے۔ مسافت سفر کی تحقیق یہاں درج کی جاتی ہے۔ اسکا سوال رسالہ بسط الباع کے شروع میں ہے۔ (مرتب)

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رسالہ اوزان شرعیہ میں فرماتے ہیں :

"راجح اور صحیح مذہب امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ کا یہ ہے کہ کسی خاص مقدار کی تحدید میلوں وغیرہ سے نہ کی جائے بلکہ تین دن رات میں جس قدر مسافت انسان پیدل چلکر بآسانی طے کر سکے یا اونٹ کی سواری پر بآسانی طے کرے وہ مقدار مسافت شرعی ہے اور حسب تصریح ابن ہمام بیلوں کی سواری کا بھی یہی حکم ہے۔ اور حسب تصریح البحر الرائق اونٹ سے بھی قافلہ کا اونٹ مراد ہے، تیز رو سانڈنی مراد نہیں۔

اور تین دن رات کا یہ مطلب نہیں کہ دن رات چلے بلکہ مراد صرف دن میں چلنا ہے اور وہ بھی پورا دن نہیں بلکہ جسقدر عادۃً متوسط قوت کا آدمی چل سکتا ہے جس کو بعض فقہاء نے صبح سے زوال آفتاب تک مقدر فرمایا ہے (کما ذکرہ الشامی وشلبی فی البحر ص [illegible] ج ۱)"

آگے فرماتے ہیں :

"مذہب متون و شروح میں جمہور مشائخ حنفیہ کا مختار یہی ہے کہ میلوں کی تعیین نہ کی جائے۔ فتح القدیر، عمدۃ القاری، البحر الرائق، شامی، درمختار وغیرہ سب کا اسی پر اتفاق ہے۔ اسکے خلاف بعض فقہاء نے فراسخ یا میلوں کی تعیین بھی فرمائی ہے حضرت امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کا مذہب یہ ہے کہ ۴۸ میل سے کم میں قصر نہ کرے اور یہی امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کا مذہب ہے اور امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ سے بھی ایک روایت یہی ہے (عمدۃ القاری ص [illegible] ج ۳)

اور مشائخ حنفیہ میں سے بعض نے اکیس فرسخ جسکے ترسٹھ میل ہوتے ہیں، بعض

نے اٹھارہ فرسخ جسکے چوّن میل ہوتے ہیں، اور بعض نے پندرہ فرسخ جس کے پینتالیس میل ہوتے ہیں مسافت قصر قرار دی ہے، عمدۃ القاری میں اٹھارہ فرسخ کے قول پر فتویٰ نقل کیا ہے اور البحر الرائق میں بھی بحوالہ نہایہ اسی قول پر فتویٰ نقل کیا ہے۔ رد شامی اور بحر نے بحوالہ مجتبیٰ اکثر ائمہ خوارزم کا فتویٰ پندرہ فرسخ کی روایت پر ذکر کیا ہے (بحر ص۱۳۰ ج۲) انتھیٰ ما فی الاوزان الشرعیۃ۔

قال العبد الضعیف

حضرات کا اگرچہ راجح قول یہی ہے کہ مسافت سفر کے لئے میلوں وغیرہ سے کوئی خاص مقدار متعین نہیں بلکہ تین دن رات میں متوسط قوت کا آدمی پیدل جتنی مسافت بسہولت طے کرسکے وہ سفر شرعی کی مسافت ہے مگر جس زمانہ میں قافلے بپیادہ یا اونٹوں وغیرہ پر چلا کرتے تھے اس زمانہ میں اسکا اندازہ لگانا سہل تھا، موٹر، ریل اور ہوائی جہاز کے اس دور میں تین دن کی پیدل مسافت کا اندازہ لگانا کسی کے بس کی بات نہیں، شاید آئندہ اس سے بھی زیادہ تیز رفتاری کا زمانہ آنے والا ہے لہٰذا احکام شرع میں سہولت کے پیش نظر اب میلوں کی تعیین ضروری معلوم ہوتی ہے، میلوں کی تعیین میں مختلف اقوال ہیں۔

۲۱ فرسخ، ۱۸ فرسخ، ۱۶ فرسخ، ۱۵ فرسخ۔ ایک فرسخ = ۳ میل شرعی ہے۔ پھر میل شرعی کی مقدار میں اختلاف ہے ۳ ہزار قدم = ۶ ہزار ذراع، ۳ ۱/۲ ہزار ذراع اور ۴ ہزار ذراع یعنی دو ہزار انگریزی گز، یہی قول معتمد علیہ ہے۔

فرسخ، میل شرعی، میل انگریزی اور کلومیٹر

فرسخ = ۳ میل شرعی = ۳٫۴۰۹۰۹۰۹ میل انگریزی = ۵٫۴۸۶۴ کلومیٹر

میل شرعی = ——— ——— ۲۰۰۰ گز

میل انگریزی = ——— ——— ۱۷۶۰ گز

میل شرعی = ۱٫۱۳۶۳۶۳۶ میل انگریزی = ۱٫۸۲۸۸۰۰۰ کلومیٹر

میل انگریزی = ۰٫۸۸۰۰۰۰۰ میل شرعی = ۱٫۶۰۹۳۴۴ کلومیٹر

کلومیٹر = ۰٫۵۴۶۸۰۶۶ میل شرعی = ۰٫۶۲۱۳۷۱۱ میل انگریزی

کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ میں ائمہ ثلاثہ کے ہاں مسافت سفر = ۱۶ فرسخ، اور فرسخ = ۳ میل، اور میل = ۶ ہزار ذراع لکھا ہے، نیز اس مسافت کو ۸۰٫۶۴ کلومیٹر

القول الاظہر ——— ۳

قرار دیا ہے اور حنفیہ کی طرف ۲۲ فرسخ کا قول منسوب کیا ہے

اس تحریر میں میل = ۶ ہزار ذراع کی نسبت ائمہ ثلاثہ کی طرف اور مسافت سفر = ۲۲ فرسخ کی نسبت حنفیہ کی طرف صحیح نہیں، ممکن ہے کہ ۶ ہزار ذراع کا کوئی قول کسی امام کا ہو مگر اسے ائمہ ثلاثہ کا مذہب قرار دینا صحیح نہیں، چنانچہ علامہ احمد بن دردیر نے الشرح الصغیر علی اقرب المسالک الی مذہب الامام مالک میں ۳½ ہزار ذراع کے قول کی تصحیح فرمائی ہے۔ پھر میل = ۶ ہزار ذراع لیکر ۲۲ فرسخ کو = ۱۶۴،۰۰۸ کلومیٹر قرار دینا صحیح نہیں، صحیح حساب کی رُو سے ۱۲۱،۰۷۳۴ کلومیٹر بنتے ہیں۔

کثرت سے احناف نے ۱۸ فرسخ = ۵۴ میل شرعی = ۶۱ ۴/۱۱ میل انگریزی کو متوسط قول قرار دیکر اس پر فتویٰ دیا ہے۔ علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ نے بھی اسی قول کو مفتی بہ لکھا ہے اور احتیاط بھی اسی میں ہے۔

دوسرے درجہ میں ۱۶ فرسخ = ۴۸ میل شرعی = ۵۴ ۶/۱۱ میل انگریزی کو مسافت سفر قرار دینے کا قول ہے۔ اگرچہ یہ قول احناف میں سے کسی سے منقول نہیں، مگر تاہم یہ قول دو وجہ سے تیسرے قول پر ترجیح کا مستحق ہے، ایک یہ کہ یہ قول دوسرے تینوں ائمہ کا بھی ہے دوسری وجہ یہ کہ رسالہ اوزان شرعیہ میں علامۃ القاری سے اس کی تائید میں یہ حدیث نقل کی ہے یا اھل مکۃ لا تقصروا الصلوٰۃ فی ادنی من اربعۃ برد من مکۃ الی عسفان (عمدۃ القاری ص ۱۵۲ ج ۳)

رسالہ اوزان شرعیہ میں برید کو ۱۲ میل انگریزی قرار دیکر اس حدیث سے ۴۸ میل انگریزی کی مسافت پر استدلال کیا ہے جو صحیح نہیں، کیونکہ برید = ۱۲ میل شرعی ہے چنانچہ خود اوزان شرعیہ ص ۳۴ پر ہے۔

"برید چار فرسخ یا بارہ میل کی مسافت کو کہا جاتا ہے" اور ص ۳۲ پر فرسخ کو تین میل شرعی کے برابر لکھا ہے، ان دونوں عبارتوں کو ملانے سے ثابت ہوا کہ برید = ۱۲ میل شرعی ہے۔

تیسرے درجہ پر ۱۵ فرسخ = ۴۵ میل شرعی = ۵۱ ۳/۲۲ میل انگریزی کا قول ہے اس سے کم مسافت کا کوئی قول نہیں۔

القول الازہر۔ ۴۰

مذکورہ سب اقوال کا نقشہ

	فرسخ	میل شرعی	میل انگریزی	کلومیٹر
زیادہ سے زیادہ	۲۱	۶۳	۷۱٫۵۹۰۹	۱۱۵٫۲۱۳۴
مفتی بہ قول	۱۸	۵۴	۶۱٫۳۶۳۶	۹۸٫۷۵۵۲
دوسرا قول	۱۶	۴۸	۵۴٫۵۴۵۵	۸۷٫۷۸۲۴
کم از کم	۱۵	۴۵	۵۱٫۱۳۶۴	۸۲٫۲۹۶۰

اکابر علماء ہند کی طرف ۴۸ میل انگریزی کا قول منسوب کیا جاتا ہے مگر اکابر کی تحریرات کے تتبع سے ثابت ہوا کہ انہیں مطلق میل کا ذکر ہے اسکے ساتھ انگریزی کی قید نہیں اور متبادر یہ ہے کہ ان کی مراد میل شرعی ہے، اسلئے کہ ۴۸ میل انگریزی کا کوئی ماخذ نظر نہیں آتا، بہشتی زیور میں انگریزی میل کا ذکر ہے جو جامع یا بعد کے ناشرین کا تسامح معلوم ہوتا ہے۔

حسب پہاڑی علاقوں میں ۱۵ میل انگریزی سے کم کا کوئی قول نہیں تو ہمارے میدانی علاقوں میں ۴۸ میل انگریزی کو مسافت قصر قرار دینے کی کوئی گنجائش نہیں، عمل کے لئے مفتی بہ قول ہی لینا چاہیئے، معہذا اکابر علماء ہند کے قول ۴۸ میل شرعی = ۵۴ میل انگریزی کے مطابق بھی عمل جائز ہے۔

حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کا فتوی

مقدار سفر شرعی سوال: کتنی مقدار مسافت سفر میں نماز قصر کرنا چاہیئے حسب احادیث صحیحہ۔

(از عزیز الدین صاحب مرادآبادی)

جواب: چار برید یعنی سولہ فرسخ اڑتالیس میل کی تین منزلیں ہوتی ہیں۔ حدیث موطا مالک سے ثابت ہوتی ہیں۔ مگر مقدار میل کی مختلف ہے لہٰذا تین منزل جامع سب اقوال کو ہو جاتی ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

رشید احمد عفی عنہ

فرسخ اور میل کی تحدید سوال: فرسخ اور میل کی تحدید معتبر کیا ہے؟

(از عزیز الدین صاحب مرادآبادی)

جواب: فرسخ تین میل کا اور میل چار ہزار قدم کا لکھتے ہیں مگر یہ سب تقریبی امور ہیں، اصل میل اس مسافت کا نام ہے کہ نظر میل کرے اور یہ بھی مختلف ہے وقت اور محل اور رائی کے اعتبار سے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

رشید احمد عفی عنہ (فتاوی رشیدیہ ص۴۲۳)

القول الاظہر ——— ۵

حضرت گنگوہی قدس سرہ کے اس فتویٰ سے ثابت ہوا کہ ۴۸ میل سے میل شرعی مراد ہیں۔
باقی رہا تین منزل کے فیصلہ کو ترجیح دینا سو اس سے متعلق ہم اوپر تحریر کر چکے ہیں کہ اس سرعت سیر کے زمانہ میں تین منازل کی میلوں سے تحدید کی ضرورت ہے

حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب قدس سرہ کے فتاویٰ سے بھی شرعی میلوں کا حساب ثابت ہوتا ہے، بعض حضرات نے حدیث اربعۃ برد کی وجہ سے قول ثالث اور بعض نے سہولت کے پیش نظر قول رابع اختیار فرمایا ہے، مگر یہ حدیث ضعیف ہے اور قول رابع اگرچہ اوسع ہے مگر قول ثانی اوسع اور متفق بہ ہونے کے علاوہ احوط بھی ہے، سفر کی انتہائی سہولتوں اور تیز رفتار سواریوں کے اس دور میں مسافت سفر میں سہولت کی بجائے جانب احتیاط کی ترجیح انسب ہے!

بحری سفر:

بحری سفر میں تین روز کی مسافت کی تعیین کشتی کی رفتار اوقات کار پر موقوف ہے۔ اس کی تحقیق کے لئے ماہرین فن کو دارالافتاء میں بلایا گیا جس کی تفصیل یہ ہے:

بحری جہاز کے کپتان ۲، پاک بحریہ کے افسر ۲، بادبانی کشتیوں کے سمندر میں طویل اسفار کے پرانے تجربہ کار ملاح ۹، مجموعہ = ۱۳ ماہرین فن۔

ان سب نے بالاتفاق بلاشک وشبہ یقینی وقطعی طور پر یہ جوابات دیئے:

① بادبانی کشتی کسی عارض کے بغیر سمندر میں کہیں نہیں رکتی شب و روز مسلسل چلتی ہے۔

② معتدل ہوا میں بادبانی کشتی کی اوسط رفتار فی گھنٹہ ۵ ۱/۲ میل بحری ہے۔

لہٰذا مسافت قصر: ۳ دن = ۷۲ گھنٹے × ۵ ۱/۲ = ۳۹۶ میل بحری۔ بحری میل = ۲۰۲۶/۶۷ گز۔

بحری راستہ کی محاذاۃ میں بری مسافت کے اعتبار کی تحقیق تتمہ میں آئیگی ان شاء اللہ تعالیٰ۔

واللہ تعالیٰ اعلم ۔ ۲۳ ذی قعدہ سنہ ۹۵ھ

(یہ تحقیق مکمل ہو گئی ہے اگر ضرورت ہوئی تو شائع ہوگی ان شاء اللہ تعالیٰ مرتب)

ضمیمہ

مولانا مہربان علی صاحب بڑوتوی کا رسالہ "شرعی مسافت" موصول ہوا جس میں بندہ کے رسالہ "القول الاظہر فی تحقیق مسافۃ القصر" پر تنقید ہے، اس سے متعلق چند امور تحریر کئے جاتے ہیں۔

القول الاظہر ــــــــــ ۶

(۱) اس سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ اقوال اکابر میں "میل" سے انگریزی میل ہی مراد ہے۔ اللہ تعالیٰ مؤلف کو جزاء خیر عطاء فرمائیں۔

(۲) رسالہ کے صلا پر ہے:

"اکابر اوران کے پیچھے چلنے والی ساری اُمت کی نمازیں خراب ہوتی ہوئی نظر آتی ہیں۔"

بندہ کو اکابر کی رائے سے اختلاف نہیں تھا بلکہ کلام اکابر کے محمل میں اختلاف تھا، اس سے نمازوں کے فساد کا وہم کیسے ہوا؟ بلکہ اگر اختلاف رائے بھی ہوتا تو بھی فساد نماز کی کوئی وجہ نہیں، مجتہد فیہا مسائل میں اختلاف رائے کی وجہ سے مخالف کی عبادت پر حکم فساد لگانے کا کوئی جواز نہیں۔

مسائل مجتہد فیہا کی امثلہ غیر محصورہ میں سے صرف چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں، مؤلف کے زعم فساد کو سامنے رکھ کر غور فرمائیں:

(۱) حضرات صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور ائمہ مذاہب رحمہم اللہ تعالیٰ میں قراءۃ الفاتحۃ خلف الامام کے بارے میں اختلاف ہے، عند البعض حرام اور عند البعض فرض۔ بزعم مؤلف ان حضرات نے اختلاف کا بہت بڑا فتنہ برپا کر کے حضرات صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے لیکر قیامت تک آنے والی ساری اُمت کی نمازیں برباد کر دیں۔

(۲) خروج الدم و مس المرأۃ سے نقض وضوء کا اختلاف بھی عصر صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے چلا ہوا ہے، پھر ائمہ مذاہب رحمہم اللہ تعالیٰ نے بزعم مؤلف اس فتنہ کو مزید ایسا بھڑکایا کہ تا قیامت پوری اُمت کی نمازیں برباد۔

(۳) خود مسئلہ زیر بحث میں دوسرے مذاہب سے قطع نظر صرف مذہب حنفی میں ہی پانچ اقوال ہیں، ایک قول عدم تحدید اور چار اقوال مقدار تحدید ہیں۔ بزعم مؤلف ان حضرات نے ایک دوسرے کے مقابلہ میں محاذ آرائی کر کے ساری اُمت کی نمازیں تباہ کر دیں۔

(۴) اس مسئلہ میں علماء ہند کے بھی پانچ اقوال ہیں، جن کی تفصیل یہ ہے:

(۱) حضرت گنگوہی قدس سرہٗ عدم تحدید کے قائل ہیں۔ کما سیجئ۔

(۲) چوبیس میل انگریزی، حضرت نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ (رسالہ "شرعی مسافت" صلا)

(۳) چھتیس میل انگریزی، حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری، حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب، حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب، حضرت مولانا عبدالحی صاحب

لکھنوی، حضرت مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی رحمہم اللہ تعالیٰ (ص۱۸ و ص۱۹)

④ پینتالیس میل انگریزی بلکہ اس سے بھی کم کی طرف رجحان۔ حضرت مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ (ص۳)

⑤ اڑتالیس میل انگریزی، حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی، حضرت حکیم الامۃ و دیگر اکابر رحمہم اللہ تعالیٰ (ص۱ تا ص۲۵)

بزعم مؤلف ان اکابر میں سے بھی کسی کو امت پر رحم نہیں آیا۔ ہم عصر، ہم وطن، ہم عقیدہ اور ہم مشرب ہونے کے علاوہ باہم قریبی روابط رکھنے کے باوجود بھی آپس میں اختلاف کا محاذ کھول کر ساری امت کی نمازیں برباد کر ڈالیں۔

نیز بزعم مؤلف حضرت مدنی قدس سرہٗ اکابر سے اختلاف رائے کے باوجود محض اکابر کی مروت سے عمر بھر اپنی نمازیں بھی برباد کرتے رہے اور امت کی نمازیں بھی۔

تنبیہ: جس طرح مسافت قصر سے کم سفر میں قصر جائز نہیں اسی طرح مسافت قصر میں اتمام جائز نہیں۔ اگر کسی نے اتمام کیا تو اس نماز کا اعادہ واجب ہے اس لئے بزعم مؤلف صرف زیادہ مسافت کا قائل ہی ظالم نہیں بلکہ قلت مسافت کا قائل بھی امت کی نمازیں برباد کرنے کے ظلم کا مرتکب ہے۔

احتیاط: صورت اختلاف و اشتباہ میں بوجوہ ذیل اتمام ارجح و احوط ہے:

① اتمام اصل ہے اور قصر بوجہ عارض، لہٰذا بدون تیقن عارض قصر جائز نہیں۔

② مقام قصر میں اتمام سے نماز مع الکراہۃ ہو جاتی ہے، مگر مقام اتمام میں قصر سے نماز قطعاً ہوتی ہی نہیں، لہٰذا قول مسافت بعیدہ واجب العمل ہے، وفقہ علیہ (الامام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ (کتاب الحجۃ ص۱۹۹ ج۱)

③ مذاہب ثلاثہ میں مقام قصر میں بھی اتمام جائز ہے، ان کے مطابق نماز بلا کراہت ہوگی، مگر مقام اتمام میں قصر سے کسی مذہب پر بھی نہیں ہوگی۔

یہ تفصیل اختلاف رائے کے بارے میں ہے۔ بندہ کی تحریر میں اکابر سے اختلاف رائے نہیں، بظاہر تو اختلاف ضرور نظر آتا ہے کہ بندہ نے اڑتالیس میل کی بجائے چوّن میل شرعی کو ترجیح دی ہے، مگر یہ بھی غلط فہمی پر مبنی ہے۔ رسالہ اوزان شرعیہ کے اسلوب تحریر سے بندہ یہ سمجھ رہا تھا کہ قول اکابر حالات زمانہ کے پیش نظر نہیں بلکہ

حضرات فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ کے اقوال مختلفہ میں سے اڑتالیس میل شرعی کے قول کو ترجیح دے رہے ہیں۔ اس پر بندہ نے لکھا کہ کتب فقہ میں چونسٹھ میل شرعی کو ترجیح دی گئی ہے۔ رسالہ "اوزان شرعیہ" کے اسلوب تحریر سے دو غلط فہمیوں کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

(۳) صـ۶ پر مؤلف کے حاشیہ میں اور صـ۲۴ پر ایک تصدیق میں "تیز رفتاری" پر بحث مذکور ہے۔

بندہ کی عبارت کا مطلب اسقدر واضح ہے کہ یہ دونوں حضرات اسے ذراسی توجہ سے دیکھیں تو ان شاء اللہ تعالیٰ اپنی بحث کا عبث ہونا سمجھ جائیں گے۔

میرا مقصد یہ ہے کہ مال و زر کی افراط اور تیز تر سواریوں کی بہتات کی وجہ سے لوگ اتنی طویل مسافت تک پیدل یا بیل گاڑی اور قافلہ کی رفتار پر چلنے کی مشقت چھوڑ دیں گے تو تین دن کی مسافت کی تحدید کا فیصلہ کرنا کیسے ممکن ہوگا؟

(۴) صـ۸ پر مؤلف نے اور صـ۲۴ پر مصدق نے اکابر کی تحریرات کے تتبع پر اشکال تحریر کیا ہے۔

بندہ نے تتبع میں استقصاء کی ضرورت اس لئے نہیں سمجھی کہ کلام اکابر کے محمل کی تعیین پر قرائن خارجیہ قویہ موجب غلبۂ ظن پیش نظر تھے، مثلاً

(۱) رسالہ "اوزان شرعیہ" کا اسلوب تحریر، بالخصوص اس تحریر میں حضرت گنگوہی قدس سرہ کا فتویٰ، اس تحریر کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

(۲) اڑتالیس میل انگریزی کا کتب فقہ میں کوئی ماخذ نہ ملنا۔

(۳) کتب فقہ اور کلام اکابر کے درمیان عدد "اڑتالیس" میں توافق۔

(۴) اکابر کے بارے میں یہ حسن ظن کہ وہ بلا ضرورت شدیدہ کتب مذہب کے خلاف فتویٰ نہیں دیتے۔

(۵) اڑتالیس میل انگریزی اور قول فقہاء ۴۸ میل شرعی = ۵۱ میل انگریزی میں کوئی معتد بہ فرق نہیں۔ صرف ایک میل یومیہ کا فرق ہے اس صورت میں تحدید فقہاء کو چھوڑ کر تحدید جدید کی کیا ضرورت؟

(۵) صـ۲ پر مؤلف نے حضرت گنگوہی قدس سرہ کے فتویٰ سے اڑتالیس میل انگریزی کا ثبوت اپنے خیال میں بہت مدلل پیش فرمایا ہے۔

یہ دعویٰ او دلائل بیّن البطلان ہیں، اسلئے کہ چار ہزار قدم کا میل شرعی ہونا متفق علیہ ہے دلائل میں رسالہ "اوزان شرعیہ" اور اس پر اکابر کی تصدیقات سے استدلال اس لئے باطل ہے کہ بندہ کی تحریر سابق میں بحث ہی اسی پر ہے کہ اس فتوی سے انگریزی میل پر استدلال صحیح نہیں، اس لئے کہ اس سے تو شرعی میل ثابت ہوتا ہے، تعجب ہے کہ مؤلف نے بحث کو مستدل بنانے کی جرأت کیسے کی؟

مؤلف نے تیسری دلیل میں عرف کا ذکر فرمایا ہے۔

اعتبار عرف جب صحیح ہو سکتا تھا کہ فتوی میں چار ہزار قدم کا ذکر نہ ہوتا، میل شرعی کی مقدار مصرح ہونے کے باوجود اسے عرف پر محمول کر کے انگریزی میل مراد لینا کھلا ہوا تعنت ہے۔

(۶) صلا پر مؤلف نے اور صث پر مصدق نے بندہ کی طرف جمہور علماء رحمہم اللہ اور تمام اکابر کے تخطیہ و تغلیط کی نسبت تحریر کی ہے۔

اوپر نمبر ۲ کے تحت لکھا جا چکا ہے کہ بندہ کو اکابر سے اختلاف رائے نہیں تھا کسی کے کلام کا محمل نہ سمجھنے کو تخطیہ و تغلیط کہنے کا کیا جواز ہے؟

علاوہ ازیں اگر واقعۃً اختلاف رائے ہوتا تو اس کے اظہار کو کوئی بھی ذی علم تنقیص نہیں کہہ سکتا، وضوح دلیل کے باوجود کسی کی مروت یا عقیدت سے کتمان ما فی الضمیر مداہنت فی الدین ہونے کی وجہ سے حرام ہے۔

حضرت امام رحمہ اللہ تعالیٰ بلکہ سب ہی ائمہ رحمہم اللہ تعالیٰ کے فتاوی کئی صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے خلاف ہیں۔

حضرت امام رحمہ اللہ تعالیٰ کے اصحاب رحمہم اللہ تعالیٰ آپ کے کئی اقوال کے خلاف گیا بلکہ حضرت امام اپنے اصحاب کو خود حکم فرمایا کرتے تھے کہ میرے خلاف وضوح دلیل کے بعد اپنی تحقیق پر عمل کیا کریں۔

حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ تعالیٰ دوسرے مذاہب کے ائمہ رحمہم اللہ تعالیٰ پر کس قدر زور دار تردید فرماتے ہیں،

بلکہ مشائخ مذہب میں باہم بھی بکثرت رد و قدح کا تعامل ہے جس سے شروح حدیث و کتب فقہ کے ذخائر بھرے پڑے ہیں۔

القول الاظہر — ۱۰

خود ہمارے اکابر نے مسئلہ زیر بحث میں اپنے اکابر یعنی حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ تعالیٰ کے خلاف فتویٰ دیا ہے۔

کیا یہ سب حضرات معاذ اللہ! عمر بھر اپنے اکابر کی تنقیص جیسے جرم عظیم اور گناہ کبیرہ کے مرتکب رہے؟ ہرگز نہیں۔ یہ حضرات اپنے قلوب میں اکابر کی عظمت و محبت بدرجۂ کمال رکھنے کے باوجود اختلاف رائے کے اظہار کو فرض اور اس کے اخفاء و کتمان کو مداہنت و حرام سمجھتے تھے۔

بندہ اپنے شاگردوں کو بار بار بہت تاکید کے ساتھ یہ تنبیہ کرتا رہتا ہے کہ اگر کسی مسئلہ میں آپ کی رائے مجھ سے مختلف ہو تو اسے ضرور ظاہر کیا کریں، پھر اگر اجتماعی غور کے بعد بھی اتفاق نہ ہو تو آپ کے لئے مجھ سے موافقت کرنا جائز نہیں، بلکہ اپنی رائے پر قائم رہنا اور بوقت ضرورت اسکا اظہار بھی آپ پر فرض ہے۔

غرضیکہ آپس میں بحث و تمحیص کے ذریعہ مسائل شرعیہ کی تنقید و تنقیح کا سلسلہ حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے لیکر اب تک پوری امت میں چلا آیا ہے اور تا قیامت جاری رہے گا، حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور بعد کی پوری امت کے تعامل کو غلط قرار دینا اور تنقیص اکابر شمار کرنا ان کی شان میں بہت بڑی سخت گستاخی ہے، اسلام کے اس مسلّم اصول اور اس کے مطابق پوری امت کے اس تعامل پر اعتراض کرنا سخت جہالت اور خطرناک ضلالت ہے۔

مؤلف اور مصدق کے بارے میں حسن ظن ہے کہ وہ اس قدر واضح حقیقت سے بے خبر نہیں ہونگے، بظاہر ان کو جو اشکال ہوا اس کی یہ توجیہ ہو سکتی ہے کہ شاید ان کے ذہن میں امت کے تعامل اور بندہ کے طرز عمل میں کوئی عمیق فرق ہوگا، اگر وہ اس کی وضاحت فرما دیتے تو بندہ پر احسان عظیم ہوتا کہ اس پر غور کرکے اپنی اصلاح کی کوشش کرتا۔

⑦ ص ۲۳ کے آخر میں مصدق صاحب نے بندہ کی تحریر پر یہ اعتراض فرمایا ہے کہ اس میں ایک قول کو ثابت کرکے اس کے خلاف کو ممنوع قرار دے دیا ہے۔

یہ اعتراض اس لئے صحیح نہیں کہ آگے عنوان "صحیح طریق کار" کے تحت مذکور تفصیل کے مطابق بندہ کی پوری تحریر کا محور یہی ہے کہ مقدار تحدید سے متعلق حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ تعالیٰ کے اقوال مختلفہ میں سے کسی قول کو ترجیح دی جا رہی ہے۔ اکابر کے

فتوی کو بھی میں اسی سے متعلق سمجھ رہا تھا، اس لئے میری تحریر میں "اس سے کم کا کوئی قول نہیں ملتا" ——— "اس سے کم کی کوئی گنجائش نہیں" ——— "اڑتالیس میل انگریزی کا کوئی رد نہیں ملتا" جیسے جملوں پر کوئی اعتراض کرنا بندہ کے مطلب اور پوری تحریر کے محور سے اغماض کا نتیجہ ہے۔ چنانچہ اسی رسالہ کے صفحہ ۲۹ میں مندرج تصدیق میں بندہ کے مقصد کی صحیح تشریح موجود ہے، غنیمت ہے کہ اتنے حضرات میں کوئی ایک تو بات سمجھنے والا ملا۔

(۸) صفحہ ۲۴ کے آخر میں اپنی مصدق صاحب نے بندہ کی طرف حدیث اربعۃ برد کی تضعیف منسوب فرما کر اس کی تردید فرمائی ہے۔

حالانکہ تضعیف حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمائی ہے، جو بندہ نے اعتماداً نقل کردی، مگر مصدق نے اس کو ایسے انداز سے پیش کیا ہے کہ گویا یہ غلطی بندہ ہی سے ہوئی ہے۔

مصدق صاحب کی ان چار بالکل صریح اور بڑی لغزشوں سے جو اوپر نمبر ۳، نمبر ۶، نمبر ۷ اور نمبر ۸ میں تحریر کی گئی ہیں واضح طور پر ثابت ہو گیا کہ آپ نے بندہ کی تحریر پر تردید لکھتے وقت تحریر کو پڑھنے میں ذرا سی بھی توجہ سے کام لینے کی ضرورت محسوس نہیں فرمائی، گویا

این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

بالخصوص مصدق صاحب نے نمبر ۸ میں مذکور چوتھی غلطی تو بہت بڑی سخت کی ہے، مفتی اعظم حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے ایسے رسالہ کے ایک جزء کی تردید کی ہے جس پر حضرت حکیم الامت قدس سرہ اور دوسرے بہت بڑے بڑے اکابر کی تصدیقات ہیں، یہ غلطی بزعم مؤلف بلکہ صفحہ ۲ پر خود مصدق صاحب کی تحریر کے مطابق بھی اکابر کی تغلیط، تخطیہ و تنقیص ہونے کی وجہ سے ناقابل معافی جرم ہے۔

مصدق صاحب کی یہ چار غلطیاں جو بہت بڑی واضح اور بدیہی ہیں، صرف ان کی نشاندہی پر اکتفاء کرتا ہوں ورنہ دس صفحات پر پھیلی ہوئی اس تحریر میں جگہ جگہ بالخصوص صفحہ ۲۴ میں مندرجہ ترجیحات پر بے ساختہ دل سے "ماشاء اللہ" کی داد نکل رہی ہے۔

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا ست

(۹) صفحہ ۹ پر ایک مصدق صاحب نے بندہ کی طرف "فساد نیت" منسوب کرکے احسان عظیم فرمایا ہے، جزاہ اللہ تعالیٰ احسن الجزاء۔

ان کا یہ احسان صرف مجھ پر ہی نہیں بلکہ خود ان پر بھی ہے، اس لئے کہ انکی یہ تحریر پڑھنے کے بعد میں نے انکے لئے روزانہ ایصال ثواب اور دعاء خیر کا معمول بنالیا ہے۔

(۱۰) اس رسالہ میں علماء ہند کے پانچ اقوال نقل کرنے کے باوجود اڑتالیس میل انگریزی کے قول کو اس انداز سے پیش کیا گیا ہے کہ گویا یہ نص قطعی ہے جس میں تا قیامت ذرہ برابر بھی کسی قسم کی کمی بیشی کرنا حرام ہے۔

بندہ کی تحریر پر یہ اعتراض نہیں ہو سکتا جس کی مفصل وجہ اوپر نمبر ۸ میں گزر چکی ہے۔

(۱۱) اگر عوام میں خطرۂ انتشار وغیرہ مصالح کے پیش نظر کسی ایک تحدید کو برقرار رکھنا ضروری ہے اور بلا ضرورت شدیدہ اسے بدلنا صحیح نہیں تو حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ کی تحدید کو کیوں چھوڑ دیا؟ بالخصوص جبکہ زیادہ تفاوت بھی نہیں، صرف ایک میل یومیہ کم کرنے کی کیا سخت مجبوری اور ضرورت شدیدہ پیش آئی؟

اور اگر تغیر زمان کے مطابق تغیر تحدید لازم ہے اور اس کے لئے کوئی معمولی مصلحت بھی کافی ہے تو اس پر یہ اشکال ہے کہ اکابر کی اس تحدید پر تقریباً ایک صدی کا طویل عرصہ گزر گیا ہے تو کیا قوموں میں روز افزوں غیر معمولی انحطاط وسقوط اس تحدید میں مزید تخفیف کو مقتضی نہیں؟

بالخصوص جبکہ مؤلف کی تحریر کے مطابق حضرت مدنی قدس سرہ اپنے زمانہ میں مزید ایک میل یومیہ تخفیف کی ضرورت محسوس فرماتے تھے، آپ کے بعد بھی تقریباً نصف صدی مزید گزر رہی ہے تو اب بطریق اولیٰ تخفیف پر غور کرنا چاہئے۔

صحیح طریق کار:

بنظر بندہ صحیح طریق کار یہ ہے کہ وقت کے ایسے اہل تحقیق علماء کی جماعت جن پر عوام کو اعتماد ہو اپنے زمانہ کے حالات پر بنظر عمیق غور کرنے کے بعد اگر تبدیل تحدید کی معتدبہ ضرورت عامہ محسوس کریں تو اسکے مطابق متفقہ فیصلہ کا اعلان کریں۔

اکابر کی تحدید اسی پر مبنی تھی، آئندہ تغیر زمانہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس تحدید کی تغییر یا تجدید اور حالات کے مطابق بشرائط مذکورہ تغییر و تبدیلی کا سلسلہ جاری رہنا چاہئے۔

بندہ کی سابق تحریر اس خیال کے تحت تھی کہ اکابر کا فتویٰ حالات زمانہ کی تغییر و تفتیش کی بجائے اقوال فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ پر مبنی ہے۔ اور انہوں نے اقوال مختلفہ میں

سے اڑتالیس میل شرعی کے قول کو اختیار فرمایا ہے۔

یہ دو غلط فہمیاں رسالہ "اوزانِ شرعیہ" کے اسلوبِ تحریر سے پیدا ہوئیں، رسالہ مذکورہ میں پہلے علماءِ ہندوستان کا قول اڑتالیس میل انگریزی لکھا۔

پھر اس پر حدیث اربعۃ برد سے استدلال پیش فرمایا۔

پھر اس پر حضرت گنگوہی قدس سرہ کے فتویٰ کی تفریع فرمائی، جس میں چار برید = اڑتالیس میل کا ذکر ہے۔

اس تفصیل کو دیکھ کر ہر شخص یہی سمجھے گا کہ دعویٰ اور دلائل میں مطابقت نہیں۔ دعویٰ ہے اڑتالیس میل انگریزی اور دلائل میں چار برید ہے جسکے اڑتالیس میل شرعی بنتے ہیں، چنانچہ خود رسالہ "اوزانِ شرعیہ" صلا میں برید = چار فرسخ اور صلا میں فرسخ = تین میل شرعی قرار دیا ہے۔

اور حضرت گنگوہی قدس سرہ کے فتویٰ میں بھی میل = چار ہزار قدم کی تصریح ہے اور یہ مسلم ہے کہ چار ہزار قدم کا میل شرعی ہوتا ہے۔

رسالہ "اوزانِ شرعیہ" کے آخر میں جو نقشہ دیا ہے اسمیں بھی فرسخ = تین میل شرعی لکھنے کے بعد برید = بارہ میل انگریزی کر دیا ہے۔ جب برید = چار فرسخ اور فرسخ = تین میل شرعی ہے تو برید = بارہ میل انگریزی کیسے ہو گیا؟

مؤلف نے رسالہ "اوزانِ شرعیہ" کی تحریر کی جو وضاحت فرمائی ہے اسکا حاصل یہ ہے کہ پوری عبارت دیکھنے سے صحیح ہو جاتا ہے کہ قول اکابر میں انگریزی میل مراد ہے، چنانچہ آگے چلکر صلا پر حضرت گنگوہی قدس سرہ کا فتویٰ رسالہ "اوزانِ شرعیہ" میں بطور تائید لانے سے بھی ثابت کیا ہے کہ اس عبارت اور اسکی دلیل سے انگریزی میل ثابت کرنا مقصود ہے۔

اس بارے میں گزارش ہے کہ بندہ نے اس سے کب انکار کیا ہے؟ بلکہ بندہ نے تو اپنی تحریر سابق میں بھی یہی تو اشکال پیش کیا ہے کہ انگریزی میل کے دعویٰ اور اکابر کی طرف اسکی نسبت کے اثبات کے لئے جو دلائل تحریر فرمائے ہیں ان سے نہ تو انگریزی میل کا دعویٰ ثابت ہوتا ہے اور نہ ہی اکابر کی طرف انگریزی میل کی نسبت ثابت ہوتی ہے بلکہ اس کے برعکس دعویٰ اور نسبت دونوں کے لئے پیش کردہ دلائل سے شرعی میل ثابت ہو رہا ہے۔

حضرت گنگوہی قدس سرہ کے اس فتویٰ میں اگرچہ عدمِ تحدید کی طرف اشارہ ہے مگر چونکہ

آپ رحمہم اللہ اکابر ہیں اسلئے بندہ اس سے یہی سمجھا کہ انکے بعد اکابر نے جو تحدید فرمائی ہے وہ بھی کسی کے مطابق شرعی میل سے ہی ہوگی، اسی لئے بندہ نے مراد اکابر سمجھنے کے لئے زیادہ تتبع وجستجو کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اسکے بعد دوسرے اکابر کی عبارات سامنے آنے سے معلوم ہوا کہ انہوں نے اپنے زمانہ کے لوگوں کے قویٰ اور راستوں کے حالات پیش نظر رکھتے ہوئے مقدار تحدید سے متعلق اقوال فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ سے ہٹ کر اڑتالیس میل انگریزی سے تحدید فرمائی ہے۔

بہرحال بندہ نے اپنے اشتباہ کی بناء لکھدی ہے، اسکی وجہ خواہ قصور عبارت کتاب ہو یا قصور فہم بندہ، لہٰذا کسی کو اشتباہ کی تقریر مذکور کے کسی جزء میں کوئی کلام ہو تو پیش کرنے کی حاجت نہیں۔

بندہ نے اپنی تحریر شائع کرنے سے قبل دو ماہرین فن اور مشہور مفتیان کرام مولانا محمد عاشق الٰہی صاحب بلند شہری ثم المدنی اور مفتی عبد الستار صاحب مفتی دار الافتاء جامعہ خیر المدارس ملتان سے اس بارے میں استشارہ کیا تھا، ان دونوں حضرات کی بھی مذکورہ دو بنیادی باتوں کی طرف توجہ نہیں گئی، بلکہ کلام اکابر میں "میل" سے میل شرعی مراد ہونے پر حضرت گنگوہی قدس سرہ کے فتویٰ سے استدلال مفتی عبد الستار صاحب ہی نے پیش فرمایا تھا۔

بہرکیف اب اکابر کی مراد اور انکے فتویٰ کی بناء واضح ہوگئی تو میں اپنی تحریر سابق سے رجوع کرتا ہوں، جب تک اہل تفقہ علماء حالات زمانہ پر از سر نو اجتماعی طور پر غور و فکر کرکے کوئی نیا فیصلہ نہیں کرلیتے اسوقت تک مسافت سفر حسب ذیل رہے گی:

مسافت سفر = ۴۸ میل انگریزی = ۷۷ء۲۴۸۵ کلومیٹر

یہ بھی یاد رہے کہ یہ فیصلہ پاکستان اور ہندوستان کے ہموار علاقوں کے لئے ہے، دوسرے علاقوں کا فیصلہ وہاں کے باشندوں کے قویٰ اور راستوں کے حالات پر موقوف ہوگا۔

حرف آخر: یہ طریق کار اگرچہ اصل مذہب کے مطابق ہے مگر زمان ائمہ رحمہم اللہ تعالیٰ میں چونکہ قافلوں کے سفر کا عام دستور تھا اس لئے تین دن کی مسافت عام معروف تھی، سب لوگ جانتے تھے، کسی کے لئے بھی اسکا معلوم کرنا کچھ بھی مشکل نہ تھا، لیکن اس زمانہ میں اسکی تعیین میں مندرجہ ذیل مشکلات ہیں:

① ایک ہی ملک کے مختلف علاقوں میں تعیین مقادیر کے لئے وہاں کے باشندوں اور راستوں کے حالات پر اجتماعی غور کرنے کی غیر معمولی جد و جہد۔

② پھر مرور زمان کے بعد دوبارہ وہی مشقت۔

③ اختلاف آراء کا ظن غالب جو عوام میں انتشار اور دین سے تنفر کا باعث ہے۔

(۴) پیدل اور بیل گاڑی وغیرہ پر سفر معدوم یا کالمعدوم ہو جانے کی صورت میں تحدید کے فیصلہ کا تعسر بلکہ تعذر۔

(۵) اکابر سے عقیدت میں اس قدر غلو کہ ان کی طرف سے اپنے زمان و مکان کے حالات پر مبنی تحدید کے خلاف اختلاف امکنہ، مرور ازمنہ و تغیر احوال کے بعد بھی تا قیامت کچھ سوچنے یا کہنے کو حرام سمجھا جانے لگے، ان حالات میں تو مرور ازمنہ و تغیر احوال کے بعد بھی کوئی تجدید تحدید کی تجویز پیش کرنے کی جرأت کیسے کر سکتا ہے؟

ان مشکلات مذکورہ کے پیش نظر سہولت اور مصلحت تو اسی میں ہے کہ حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ تعالیٰ کے اقوال میں سے ہی کسی قول کو معیار بنایا جائے، البتہ اگر کسی زمان یا مکان میں اس پر عمل کرنا بہت ہی دشوار ہو جائے اور یہ تعسر اہل تفقہ کی نظر میں خوب واضح اور محقق ہو جائے تو ایسی مجبوری کی حالت میں تجدید تحدید کی کوشش کی جائے۔ اگرچہ پیدل سفر متروک ہو جانے کی وجہ سے آئندہ اس قسم کی کوئی مجبوری پیش آنے کا بظاہر کوئی احتمال نہیں۔

حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ تعالیٰ نے اسی مصلحت کے پیش نظر "ما کثیر" کی مقدار میں قول تحدید کو اختیار فرمایا ہے۔ اس لئے کہ رائی مبتلی بہ کے حوالہ کرنا اختلاف طبائع کی وجہ سے اختلاف آراء و انتشار کا باعث ہے۔

رخصت سفر سے تو مقصد ہی دفع مشقت و اعطاء سہولت ہے، پھر اس میں ایسا قول اختیار کرنا جس کو زیر عمل لانے میں مذکورہ بالا مشکلات کی مشقت کے تحمل سے کوئی مفر نہیں سفر میں مقصد رخصت کے خلاف ہے۔ ایک دو میل زیادہ مسافت قطع کرنے کی مشقت مشکلات مذکورہ کی مشقت کے مقابلہ میں بہت اہون ہے بالخصوص جبکہ سفر کی سہولتوں اور بہتر سے بہتر سواریوں کی کثرت میں روز بروز غیر معمولی اضافہ ہوتا جا رہا ہے جس کے پیش نظر بعید نہیں کہ عنقریب ہی پیدل اسفار کا سلسلہ دنیا سے بالکل ختم ہی ہو جائے۔ بلکہ پاکستان میں تو اب بھی شاید ہی کہیں یہ سلسلہ رہ گیا ہو۔

اپنا عندیہ پیش کر دیا ہے، ہو سکتا ہے کوئی "مہربان" اسے بھی تنقیص اکابر، اکابر اور ان کے پیچھے چلنے والی ساری امت کی نمازوں کے فساد کا حکم اور تحریک ہوس جاہ سمجھ لے۔ رزقنا اللّٰہ الجمیع لما یحب و یرضی۔

رشید احمد

۲۳ رمضان سنہ ۱۴۱۰ھ

وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب
وطن الارتحال
یبقی
ببقاء الاثقال

سفر مع ترکِ انتقال سے وطنِ اقامت باطل نہیں ہوتا

مخدوم مکرم جناب حضرت مفتی صاحب مدظلہم العالی السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ مزاج گرامی
ایک مسئلہ برائے تحقیق وتصدیق ارسالِ خدمت ہے امید ہے کہ مدلل جواب سے نوازیں گے۔ مدرسہ میں بحمد اللہ خیریت ہے حضرت مہتمم صاحب مدظلہم العالی بھی بخیریت ہیں۔ فقط والسلام

بندہ عبدالستار عفا اللہ عنہ نائب مفتی خیر المدارس ملتان ۱/۴/۹۵ھ

سوال: میں منڈی بہاء الدین میں خطیب ہوں اور مستقل طور پر ملازمت کر رہا ہوں۔ مجھے محکمہ اوقاف کی طرف سے ایک رہائشی مکان بھی ملا ہوا ہے۔ میرے بال بچے مع گھریلو سامان کے بھی میرے ہمراہ اسی مکان میں رہائش رکھتے ہیں۔ البتہ میرا وطن اصلی سلانوالی ضلع سرگودھا ہے، وہیں کا رہنے والا ہوں اور وطن اقامت یہ منڈی بہاء الدین ہے۔ ایک عالم فاضل فرماتے ہیں کہ سفر شرعی کے لئے منڈی بہاء الدین سے باہر جب بھی میں جاؤں اور پھر واپس منڈی میں آؤں تو نماز قصر کروں تاوقتیکہ واپسی کے بعد منڈی میں پندرہ یوم ٹھہرنے کا ارادہ نہ ہو۔ مثلاً اگر کسی سفر شرعی سے واپسی کے بعد ہفتہ عشرہ تک کہیں دوبارہ سفر پر جانا ہو تو قصر لازم ہوگی اور پوری نماز مقتدیوں کو نہیں پڑھا سکتے۔ قابل دریافت امر یہ ہے کہ منڈی بہاء الدین میں باقاعدہ رہائش رکھنے اور بال بچے موجود ہونے کے باوجود پھر بھی کیا سفر شرعی سے واپسی کے بعد اقامت شرعی کے لئے پندرہ روز کی نیت کرنا شرط ہے یا نہیں۔ اور منڈی سے باہر اکثر جانا ہی پڑتا ہے۔ اور گاہ گاہ یہ اسفار مختصر وقفات کے بعد مسلسل ہوتے ہیں تو میں امامت کیسے کرا سکتا ہوں؟ مدلل رقام فرمایا جائے۔

الجواب: فاضل موصوف کا مذکورہ بالا فتویٰ غالباً متون کے اطلاق سفر پر مبنی ہے۔ متون کی عبارت یہ ہے (ویبطل الوطن الاصلی بمثلہ لا السفر ووطن الاقامۃ بمثلہ و السفر والاصلی (کنز وغیرہ) اس عبارت سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ وطن اقامت سے محض خروج بنیت سفر اسکے لئے مبطل ہے۔ لیکن اس کے ظاہر کو کافی سمجھنے کی بجائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسکی صحیح مراد تک پہنچنے کے لئے دیگر عبارات فقہیہ پر بھی نظر کر لی جائے۔ عبارات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وطن اقامت سے محض سفر کرنا ہی مبطل نہیں بلکہ دراصل سفر بصورت ارتحال مبطل ہے۔ یعنی یہ بطلان اسوقت ہوگا جبکہ وطن اقامت سے

بنیت سفر جاتے وقت اپنا سامان وغیرہ بھی ہمراہ لیجائے جس سے یہ سمجھا جائے کہ شخص مذکور کا ارادہ فی الحال یہاں واپس آنیکا نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ وطن اصلی سفر سے باطل نہیں ہوتا کیونکہ وطن اصلی سے سفر کرنا ترک توطن بالوطن الاصلی یا اعراض عن التوطن پر دلالت نہیں کرتا بلکہ اہل وعیال وغیرہ کی موجودگی اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ جانیوالا اس مقام پر واپس لوٹ آنے کے قصد وارادہ سے جارہا ہے حتیٰ کہ اگر وطن اصلی سے جانے والا اہل وعیال سمیت چلا جائے اور دوسری جگہ وطن اصلی بنالے تو پہلے وطن اصلی کی وطنیت بھی ختم ہو جاتی ہے جیسا کہ تمام کتب فقہ میں مصرح ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ دراصل بطلان وطن کا مدار سفر وغیرہ مع ترک توطن یا اعراض عن التوطن پر ہے محض خروج بنیت سفر پر نہیں، پس جس وطن سے بھی ترک توطن کا عزم کرلیا اور وہاں سے نکل پڑا یا دوسری جگہ وطن بنالیا وہ وطن باطل ہو جائے گا خواہ یہ وطن اصلی ہو یا وطن اقامت، البتہ ان دونوں وطنوں سے سفر کرنے میں عام طور پر ایک فرق ہوا کرتا ہے جس کی وجہ سے ان دونوں اوطان کے متعلق سفر کا حکم مختلف بتلایا گیا کہ سفر وطن اصلی کے لئے مبطل نہیں اور وطن اقامت کے لئے مبطل ہے وہ فرق یہ ہے کہ وطن اصلی سے سفر عام حالات میں بدون ارادۂ ترک توطن ہوتا ہے۔ کسی حاجت کے لئے سفر ہوا واپس پھر وہیں آنا ہوتا ہے اور یہ سفر بصورت ارتحال نہیں ہوتا اور وطن اقامت سے سفر عموماً بارادۂ ترک توطن ہوتا ہے۔ کیونکہ اصلی رہائش تو کسی دوسری جگہ ہے یہاں قیام برائے حاجت تھا ضرورت پوری ہو لے پر یہاں سے جانا ہی ہوگا جیسے اسفار تجارت وملاقات وحج وغیرہ۔ پس یہ سفر عموماً بصورت ارتحال ہی ہوتا ہے۔ اس فرق کے پیش نظر یہ کہا گیا ہے کہ سفر وطن اقامت کے لئے مبطل ہے کیونکہ وطن اقامت کے بارے میں سفر کا عام معروف ومعتاد فرد ایسا سفر ہی ہوتا ہے والمطلق اذا اطلق یراد بہ الفرد الکامل، پس متون کی تعبیر سفر کا اسی فرد مطلق کے بارہ میں ہوگی تمام سفروں کے بارہ میں نہیں، چنانچہ بدائع کی تعلیل سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح ہے کہ جو سفر وطن اقامت کے لئے مبطل ہے وہ کونسا سفر ہے؟ اور متون میں اس مقام پر جو لفظ سفر مذکور ہے اس سے کیا مراد ہے؟ ملک العلماء امام ابوبکر الکاسانی تحریر فرماتے ہیں۔ وینتقض بالسفر ایضا لان توطنہ فی ھذا المقام لیس للقرار ولکن لحاجۃ فاذا سافر منہ یستدل بہ علی انقضاء حاجتہ فصار معرضا عن التوطن بہ فصار ناقضا لہ دلالۃ (ص۱۰۴ ج ۱)

وطن ارتحال ــــــــــ ۳

تعلیل سے ظاہر ہے کہ یہ وہ سفر ہے جو اس امر کی دلیل بن سکے کہ اب یہاں رہائش کی حاجت
نہیں رہی اور جانے والا اس مقام کی وطنیت کو ختم کر چکا ہے البتہ اس سفر میں ہوتا ہے جو کہ
بصورت ارتحال ہوتا ہے اور جس شہر میں زید کے بیوی بچے ہیں اور کامل رہائش ہے ایک
دو دن کے لئے اگر زید کہیں جائے تو زید کا یہ سفر قضاء حاجت اعراض عن التوطن اور نقض
للتوطن کسی امر پر بھی ہرگز ہرگز دلالت نہیں کرتا بلکہ بقاء ثقل بقاء توطن کی قطعی دلیل ہے اور
اگر لفظ سفر سے مراد سفر شرعی کا ہر فرد ہو خواہ وہ بصورت ارتحال ہو یا بصورت ارتحال نہ ہو
تو دلیل اور دعویٰ میں انطباق کیسے ہوگا؟ جبکہ دعویٰ عام اور دلیل خاص ہے۔

اس کے علاوہ صاحب بحر وغیرہ نے اس امر کی تصریح نقل کی ہے کہ بقاء ثقل سے
وطن اقامت باقی رہتا ہے گو دوسری جگہ بھی مقیم ہو جائے اس تصریح سے تعلیل بدائع کا
مفہوم بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ وھذا نصہ وفی المحیط ولو کان لہ اھل بالکوفۃ واھل
بالبصرۃ فمات اھلہ بالبصرۃ وبقی لہ دور وعقار بالبصرۃ لا تبقی وطنا لہ وقیل
تبقی وطنا لانھا کانت وطنا لہ بالاھل والدار جمیعا فبزوال احدھما لا یرتفع الوطن
کوطن الاقامۃ یبقی ببقاء الثقل وان اقام بموضع آخر اھ (ص۱۳۲ ج ۲) اور بحوالہ
محیط بعینہ یہی جزئیہ مجمع الانہر (ص۱۶۱ ج۱) میں بھی موجود ہے صاحب بحر اور صاحب نہر نیز
منحۃ الخالق میں علامہ شامی نے اس پر کوئی کلام نہیں فرمایا۔

فائدہ:

تفصیل بالا اور دیگر عبارات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وطن اصلی ہو یا وطن اقامت
درحقیقت اس وقت باطل ہوتے ہیں جبکہ ان کے شمار کردہ مبطلوں میں دلالۃ معنی نقض
الوطن السابق پائی جائے۔ دیکھئے وطن اصلی کے لئے دوسرے وطن اصلی کو مبطل قرار دیا
گیا ہے اور متون میں یہ بطلان مطلق ہے کسی قید کے ساتھ مقید نہیں حالانکہ دوسرا وطن اصلی علی
الاطلاق پہلے کے لئے مبطل نہیں بلکہ اس صورت میں مبطل ہے جبکہ پہلے سے نقض وطنیت کرتے
ہوئے دوسرے کو بھی وطن اصلی بنائے ورنہ اگر پہلے وطن کو حالت سابقہ پر رکھتے ہوئے دوسرے
مقام پر بیوی کر لیتا ہے اور اسے بھی مستقل رہائش کے لئے تجویز کر لیتا ہے تو پہلا وطن اصلی
اس سے باطل نہیں ہوگا۔ کما فی البحر وغیرہ قیدنا بکونہ انتقل عن الاول باھلہ لانہ لو
لم ینتقل بھم ولکنہ استحدث اھلا فی بلدۃ اخری فان الاول لم یبطل ویتم فیھما (بحر)

بلکہ علامہ طحطاوی نے لکھا ہے کہ دو سے زائد بھی وطن اصلی ہو سکتے ہیں اور متون میں دوسرے نمبر پر
مبطل وطن اقامت کو شمار کیا گیا ہے کہ دوسرا وطن اقامت پہلے کے لئے مبطل ہے، اور اسفار میں
یہاں بھی اطلاق ہے اور بظاہر کوئی قید موجود نہیں علاوہ ازیں جیسے صورت اولیٰ میں اطلاق مقید ہے
ایسے ہی یہاں بھی مقید ہے۔ یعنی دوسرا وطن اقامت پہلے کے لئے تب ہی مبطل ہوگا جبکہ پہلے
کی وطنیت کو ختم کر کے وطن اقامت بنایا گیا ہو۔ اور اگر پہلے کی وطنیت کو ختم نہیں کیا گیا بلکہ اسکی
رہائش بدستور باقی ہے بیوی بچے اور سامان وہیں ہے اور دوسرے مقام میں کسی شرعی اقامت کے
ساتھ مقیم ہو گیا تو اس سے پہلا وطن اقامت باطل نہیں ہوگا جیسا کہ جزئیہ محیط میں مصرح ہے
کوطن الاقامۃ یبقی ببقاء الثقل وان اقام بموضع آخر اھ پس جیسے ان دونوں مبطلوں کیا
الفاظ مطلق ہیں لیکن مراد خاص ہے اسی طرح مبطل ثالث (سفر) کے بارے میں کہا جائیگا کہ گو لفظ اس
میں عموم ہے مگر مراد خاص سفر ہے جو بصورت ارتحال ہوتا ہے جیسا کہ تفصیل بدائع سے مفہوم ہوتا ہے۔
بنا بر اہل و ثقل سے بقاء اقامت و توطن رہتا ہے عرف سے بھی اسکی تائید ہوتی ہے
چنانچہ جو شخص بال بچوں سمیت ایک شہر میں رہ رہا ہو گو یہ اسکا وطن اصلی نہ ہو یہ شخص اگر ایک
دو دن کے لئے سفر پر چلے جانے سے یہ نہیں کہا جاتا کہ وہ یہاں سے ترک سکونت کر گیا ہے
نہ اس سفر کو کوئی ترک سکونت کہتا ہے اور نہ ہی سفر سے واپسی کو کوئی تجدید توطن یا استیناف
سکونت قرار دیتا ہے۔ البتہ اگر بیوی بچے وغیرہ بھی ہمراہ لیجائے اور ارادہ یہاں واپسی کا
نہ ہو تو اب یقیناً کہا جاتا ہے کہ وہ یہاں سے رہائش ترک کر گیا ہے۔

تفصیل بالا سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص کسی شہر میں باقاعدہ بیوی بچوں سمیت
رہائش رکھتا ہے اور اسکا ذریعہ معاش بھی اسی شہر سے متعلق ہو تو اسکا یہ توطن تب
باطل ہوگا جبکہ اس شہر سے رہائش ختم کر کے چلا جائے، محض عارضی اور وقتی اسفار سے
اسکا یہ وطن اقامت باطل نہیں ہوگا اور متون کے جزئیہ کا یہی مطلب ہے کہ وطن اقامت
سے جب سفر بصورت ارتحال ہوگا تو یہ اسکے لئے مبطل ہوگا۔ پس صورت مسئولہ میں سائل سفر کے
بعد جب بھی منڈی بہاء الدین پہنچے گا مقیم تصور کیا جائیگا اور نماز پوری پڑھیگا۔ بلکہ بعض عبارات
سے تو ایسے مقام کے وطن اصلی ہونیکا شبہ ہوتا ہے۔ کتاب الفقہ للعلامۃ عبد الرحمٰن الجزیری مطبوعہ مصر میں
وطن اصلی کی تعریف یہ کی گئی ہے۔ وھو الذی ولد فیہ او لہ فیہ زوجۃ فی عصمتہ او قصد ان یرتزق فیہ
وان لم یولد بہ ولم یکن لہ بہ زوجۃ اھ (ج ۱ باب صلاۃ المسافر) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔ عبد الستار نائب مفتی خیر المدارس ملتان ۱۴

وطن للارتحال ———— ۵

الجواب باسم ملہم الصواب

مسئلہ صحیح ہے کہ بقاء ثقل سے وطن اقامت باطل نہیں ہوتا، البتہ تحریر میں امور ذیل قابل اصلاح ہیں۔

(۱) کتاب الفقہ کی عبارت "او قصد ان یتوطن فیہ" سے اس پر استدلال یا اس کی تائید صحیح نہیں۔ کیونکہ قصد ارتزاق سے مقصد یہ ہے کہ قصد ارتزاق علی سبیل الدوام ہو، جیسا کہ مطلقاً تولد یا تزوج سے وطن اصلی نہیں بن جاتا جب تک کہ اس میں اقامت علی سبیل الدوام کا قصد نہ ہو۔ قال فی الخانیۃ المسافر اذا جاوز عمران مصرہ (الی قولہ) ان کان ذلک وطنا اصلیا بان کان مولدہ و سکن فیہ او لم یکن مولدہ ولکنہ تاھل بہ وجعلہ دارا الخ (خانیۃ علی ھامش الہندیۃ ص ج ۱)

اس سے ثابت ہوا کہ موضع تولد وتاہل وطن اصلی جب ہوگا جبکہ اس میں سکونت وجعل دار کا قصد بھی ہو، اثبات مسئلہ کے لئے جو دوسرے دلائل تحریر کئے گئے ہیں وہ کافی ووافی ہیں۔

(۲) اس امر کی توضیح ضروری ہے کہ بقاء وطن اقامت کا حکم اس صورت میں ہے جبکہ وہاں اہل وعیال چھوڑ کر گیا ہو یا سامان اپنے مقبوضہ مکان میں رکھ کر گیا ہو۔ اگر سامان کسی کے پاس ودیعت رکھ کر گیا تو وطن اقامت باطل ہو جائے گا اس لئے کہ اسے عرف میں سکونت نہیں کہا جاتا۔ وقال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ تعالیٰ (قولہ حلف لا یساکن فلانا) فان کان ساکنا معہ فان اخذ فی النقلۃ وھی ممکنۃ والا حنث قال محمد رحمہ اللہ تعالیٰ فان کان وھب لہ المتاع وقبضہ منہ وخرج من ساعتہ ولیس من رأیہ العود فلیس بساکن وکذا ان اودعہ المتاع او اعارہ ثم خرج لا یرید العود (رد المحتار ص ج ۳)

(۳) تحریر میں عبارت "در صورت بطلان وطن کا مدار (الی) خواہ یہ وطن اصلی ہو یا وطن اقامت" کی ترمیم ضروری ہے۔ کیونکہ وطن اصلی صرف اعراض عن التوطن سے باطل نہیں ہوتا بلکہ اعراض کے ساتھ توطن بوطن آخر بھی شرط ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

رشید احمد

۱۲ رمضان المبارک سنہ ۸۶ ہجری

مسئلہ مذکورہ بالا سے متعلق متضاد جوابات میں فیصلہ

مخدوم العلماء جناب حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ مزاج گرامی، گرامی نامہ بوساطت حضرت مولانا خیر محمد صاحب دامت برکاتہم موصول ہوا۔ مسئلہ وطن اقامت کے بارے میں بعینہٖ فتویٰ قاسم العلوم مع تحریر خیر المدارس ارسال خدمت ہے۔ اُمید ہے کہ رائے عالی سے جلد مطلع فرمایا جائیگا،

بندہ عبد الستار عفا اللہ عنہ

از دار الافتاء خیر المدارس ملتان

فتویٰ قاسم العلوم

هو المصوب

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ عبارات فقہیہ متون و شروح و حواشی پر غور کرنے سے بظاہر جو معلوم ہوتا ہے وہ فی الواقع تدبر و تامل کے بعد بھی اس کی صحیح مزید ہے وہ یہ کہ وطن اقامت مطلق خروج بنیت سفر سے باطل ہو جاتا ہے۔ خواہ خروج مذکور کے وقت یہاں واپس آنیکا کوئی ارادہ نہ ہو یا خروج کے وقت چند روز کے بعد کسی وقت اس وطن اقامت میں واپس آنے کے ارادے سے سفر پر گیا ہو۔ نیز ساز و سامان، متاع و ثقل ساتھ لیجا چکا ہو یا اسی وطن میں سامان و ثقل چھوڑ چکا ہو بہر صورت سفر شرعی سے وطن اقامت باطل ہو جاتا ہے۔ متون و شروح کی عبارتوں پر بار بار غور فرمالیں یہی مطلب صاف طور پر سمجھ میں آئیگا۔ اور یہی چیز ہی وطن اصلی اور وطن اقامت کے درمیان مابہ الامتیاز ہے۔ وطن اقامت کے لئے سفر شرعی کا ہر فرد مبطل ہے اور وطن اصلی کے لئے سفر شرعی کا کوئی فرد مبطل نہیں۔ چنانچہ وطن اصلی سے نکلنے والا بقصد اعراض عن توطنہٖ اگرچہ ساز و سامان اہل و عیال وغیرہ یہاں سے اُٹھا لے، کوئی گھر مکان وغیرہ بھی اس کا یہاں نہ رہ جائے۔ دور دراز سفر کرتا پھرے کئی مقامات کو یکے بعد دیگرے محض وطن سکنی یا وطن اقامت بنالے تب بھی اسکا وہ وطن اصلی باطل نہیں ہوا ہے اور یہ استفسار کے افراد کا ملہ نیز یہ اوطان اقامت وطن اصلی کے لئے ہرگز مبطل نہیں ہیں۔ یہاں تک کہ کسی مقام کو وطن اصلی (دائمی رہائش گاہ) نہ بنالے۔ کما قال

 وطن اقامت ۔۔۔۔۔۔ ۔

الشامی تحت قول التنویر الوطن الاصلی یبطل بمثلہ (ص ۵۹۵ ج ۱) (قولہ یبطل بمثلہ) سواء کان بینھما مسیرۃ سفر اولا۔ ولا خلاف فی ذلک کما فی المحیط قہستانی وقید بقولہ بمثلہ لانہ لو انتقل منہ قاصدا غیرہ ثم بدا لہ ان یتوطن فی مکان آخر فمر بالاول اتم لانہ لم یتوطن غیرہ۔ نھر۔ وفی الدر المختار ایضا (ص ۵۹۵ ج ۱) ویبطل (وطن الاقامۃ بمثلہ و) بالوطن (الاصلی) و بانشاء (السفر) وقال الشامی تحتہ مطلقا (قولہ و بانشاء السفر) ای منہ وکذا من غیرہ اذا لم یمر فیہ علیہ قبل سیرہ مدۃ السفر ۱ھ

باقی بحر کی عبارت بحوالہ محیط "کوطن الاقامۃ یبقی ببقاء الثقل وان اقام بموضع آخر" سے بمثلہ کی تقیید معلوم ہوتی ہے نہ کہ والسفر کی تقیید۔ اور اس عبارت کا مطلب یہ ہوگا کہ بدون انشاء سفر اگر ایک شخص وطن اقامت سے نکل کر کسی دوسری قریب جگہ کو وطن اقامت بنالے تو بنا بر اطلاق اس عبارت متون کے کہ "وطن الاقامۃ بمثلہ" بہرصورت وہ پہلا وطن اقامت باطل ہوجائے گا لیکن محیط نے یہ قید لگادی ہے کہ یہ بطلان تب ہوگا کہ سازوسامان ثقل وغیرہ منتقل کرکے قریب کی دوسری جگہ میں نیت اقامت کرچکا ہو۔ اور اگر ثقل منتقل نہ کیا ہو تو پہلا وطن اقامت بھی بدستور باقی ہے، اور وہ دوسرا بھی وطن اقامت اس کا بن گیا ہے۔ ھذا ھو الظاھر۔ ھکذا افھمہ باقی بدائع کی عبارت مذکورہ میں دعوی عام ہے اور تعلیل خاص ہے اور ایسا استدلال فقہاء کے کلام میں متعدد مقامات میں موجود ہے۔ نیز رسم المفتی کا اصول ہے کہ تعلیلات فقہاء سے احکام فقہیہ ثابت نہیں ہوا کرتے۔ اس کے لئے نقل یا اصل درکار ہے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ عبداللطیف معین مفتی مدرسہ قاسم العلوم ملتان

۲۳ رمضان سنہ ۸۶ھ

جواب از خیر المدارس

مدرسہ قاسم العلوم کے نائب مفتی صاحب اپنا جواب تحریر کرکے مدرسہ خیر المدارس میں خود تشریف لائے تھے۔ زبانی بات چیت ہوتی رہی۔ جواباً ہم نے ان کی خدمت میں یہ

عرض کر دیا تھا کہ:

(۱) آپ کا دعویٰ یہ ہے کہ ہر سفر شرعی وطن اقامت کے لئے مبطل ہے۔ اور اس کی دلیل میں جو عبارات آپ نے پیش کی ہیں یہ وہی عام عبارات ہیں جن میں سے ایک عبارت ہم اپنی تحریر کے شروع میں لکھ چکے ہیں اور یہ عبارات اثبات استغراق کے لئے ناکافی ہیں۔ کیونکہ کوئی لفظ دال علی الاستغراق موجود نہیں۔ ورنہ ہر وطن اصلی پہلے وطن اصلی کے لئے مبطل ہو جائے گا اور ہر وطن اقامت پہلے وطن اقامت کے لئے مبطل بن جائیگا (حالانکہ آپ ان میں جواز تعدد کے قائل ہیں) کیونکہ متون میں تینوں مبطلوں کی تعبیر تقریباً یکساں ہے۔

(۲) عبارت محیط کو صاحب بحر نے کسی مبطل کی تقیید کے لئے نقل نہیں کیا بلکہ دوسرے وطن اصلی کی بحث میں اس کا تذکرہ آگیا ہے اور نیز یہ کہ اس عبارت میں جو "الا اذا قام بموضع اٰخر" موجود ہے اس "موضع آخر" کو مادون السفر کی قید کے ساتھ مقید کرنا بلا دلیل ہے اور جیسا کہ اس کے مشبہ وطن اصلی میں ایسی کوئی قید موجود نہیں لہٰذا اس مشبہ میں بھی ایسی کوئی قید موجود نہیں۔

(۳) تعلیل بدائع کے متعلق یہ عرض کیا گیا تھا کہ تعلیل ہذا سے یہ امر بالکل واضح ہے کہ کم از کم صاحب بدائع یقیناً اس لفظ سفر کو ہر سفر کے لئے عام نہیں لے رہے ہیں بلکہ سفر کا وہ مخصوص فرد سمجھ رہے ہیں جس میں دلالت علی نقض الوطن پائی جائے۔ پس اس لفظ سفر سے یہی مراد لینا چاہئے اور اگر کسی فقیہ کے کلام سے اس لفظ کا عموم اور تمام افراد سفر کو شامل ہونا تحقیق ہو جائے گا تو تسلیم کر لیا جائے گا۔

باقی یہ کہنا کہ فقہاء کے کلام میں ایسا استدلال متعدد مقامات پر موجود ہے اسکے معنی تو یہ ہوئے کہ فقہاء ایسے دعویٰ اور دلیل کے عدم انطباق کو نہیں سمجھتے اور صاحب بدائع بھی اس موٹی سی بات سے بے خبر ہیں۔ یہ بات کم از کم ہم تو تسلیم کرنے سے قاصر ہیں۔

تعلیل مسئلہ سے صورت مسئلہ کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ یہ حقیقت کسی اہل علم سے مخفی نہیں۔ تتبع کرنے سے اس کی بے شمار نظائر مل سکتی ہیں۔ فقط

خادم مسلک:

عبد الستار عفا اللہ عنہ

۲۸ / ۱۰ / ۱۳۸۲ھ

الجواب باسم ملہم الصواب

قاسم العلوم کے فتوی میں جزئیہ محیط کا جو مطلب بیان کیا گیا ہے وہ صحیح نہیں، جزئیہ بدون انشاء سفر کسی دوسری قریب جگہ کو وطن اقامت بنانے کی قید بلا دلیل ہے اگر صورت زیر بحث میں دوسری جگہ وطن اقامت بنالینا سابق وطن اقامت کے لئے مبطل نہیں تو انشاء سفر کیوں مبطل ہے؟ دونوں میں مابہ الفرق کیا ہے؟

جب وطن اقامت مبطل نہیں تو سفر بطریق اولیٰ مبطل نہ ہوگا کیونکہ سفر کی بہ نسبت وطن قوی ہے یہ امر معقول ہونے کے علاوہ عبارات فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ سے بھی ثابت ہے۔ چنانچہ جملہ کتب میں یہ مصرح ہے کہ وطن اصلی کے لئے سفر مبطل نہیں اور دوسرا وطن اصلی مع اہل مبطل ہے۔ الاول یبطل بمثلہ اس سے معلوم ہوا کہ سفر کی بہ نسبت وطن میں قوۃ الابطال زیادہ ہے۔ وھو ظاھر جدًا۔ وطن اقامت کا مبطل نہ ہونا اور سفر کا مبطل ہونا بالکل غیر معقول ہے۔ تعلیل بدائع سے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بھی قرین قیاس نہیں۔ اگرچہ حکم عقلیہ پر احکام شرعیہ کے وجود و عدم کا مدار نہیں ہوتا مگر علت پر معلول کا مدار لازم ہے۔ وہ علت کیا ہوئی جس پر معلول کا مدار نہ ہو؟

ہاں ایسے مواقع کہ جہاں وجود علت ایسا مخفی ہو کہ اس کا علم حاصل کرنا متعسر ہو وہاں شریعت مقدسہ نے سبب کو علت کے قائم مقام قرار دے کر حکم نافذ کردیا ہے جیسے کہ نوم کو خروج ریح اور سفر کو مشقت کا قائم مقام قرار دے کر نقض وضوء اور قصر و افطار کے احکام جاری کئے گئے ہیں۔ مسئلہ زیر بحث اس نوعیت کا نہیں کہ یہاں سبب یعنی سفر کو علت یعنی اعراض عن الوطن کے قائم مقام کرکے نفس سفر پر ہی ابطال وطن کا حکم لگایا جاسکے بلکہ اعراض تو مسافر کے اختیار میں ہے اور اس کی نیت پر موقوف ہے۔

خلاصہ یہ کہ بندہ کی نظر میں خیر المدارس کا جواب صحیح ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

رشید احمد

۱۳ ذی قعدہ سنہ ۹۲ ہجری

سوال مثل بالا

بخدمت اقدس حضرت مفتی صاحب، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

جناب سے درج ذیل مسئلہ کی تحقیق مطلوب ہے۔ ملتان کے ایک عالم اور مفتی صاحب کی تحقیق بھی پیش خدمت ہے۔ بغور مطالعہ فرمانے کے بعد اس کی تائید یا تردید بالدلائل تحریر فرمائیں

وطن لازم کل —— ۱۰-

تاکہ تشفی ہو، اُمید ہے کہ جناب والا اپنی تحقیق سے ضرور مطلع فرمائیں گے۔

سوال : زید ملتان میں ملازمت کرتا ہے، یہیں اس کی رہائش ہے، یعنی ملتان اس کا وطن اقامت ہے۔
اس کا گھریلو سامان، بیوی بچے اسکے ساتھ ملتان میں رہائش پذیر ہیں، جبکہ اس کا وطن اصلی
ڈاکل پور ہے۔ اب وہ سفر شرعی کے لئے ملتان سے باہر جاتا ہے اور واپس پر ملتان میں پندرہ روز
ٹھیرنے کا ارادہ نہیں کرتا، کیونکہ ہفتہ عشرہ تک اس کو دوبارہ کہیں سفر پر جانا ہے تو اس حالت
میں وہ قصر کریگا یا اتمام؟ سفر شرعی سے وطن اقامت میں واپسی کے بعد اتمام صلوٰۃ کے لئے
پندرہ روز اقامت کی نیت شرط ہے یا نہیں؟

جواب :

یہ جواب بھی مفتی عبد الستار صاحب ہی کا نوشتہ ہے۔ اسمیں بھی مضمون اور دلائل کا
اکثر حصہ وہی ہے جو اوپر گزرا، اس لئے اس جواب میں سے صرف وہ امور نقل کئے
جاتے ہیں جو سابق جواب سے زائد ہیں۔ مرتب

جو شخص کسی شہر میں باقاعدہ بیوی بچوں سمیت رہائش رکھتا ہو تو اسکا یہ وطن تب
باطل ہوگا جبکہ وہ اس شہر سے رہائش ختم کر کے چلا جائے، محض عارضی اور وقتی اسفار سے
اسکا یہ وطن اقامت باطل نہیں ہوگا اور متون کے جزئیہ کا یہی مطلب ہے کہ وطن اقامت
سے جب ارتحال ہوگا تو یہ اس کے لئے مبطل ہوگا محض سفر مبطل نہیں ہوگا۔
جس وطن سے ترک وطن کر لیا وہ وطن باطل ہوگیا خواہ یہ وطن اصلی ہو یا وطن اقامت
البتہ وطن اقامت سے سفر عام طور پر چونکہ ایسا ہی ہوتا تھا یعنی ارتحال ہوتا تھا کیونکہ یہاں پہ
قیام برائے حاجت تھا ضرورت پوری ہونے پر ارتحال ہی ہوگا خصوصاً اس زمانہ میں جبکہ
آمد و رفت کے موجودہ ذرائع مفقود تھے لہٰذا نفس سفر کو اس سفر کے لئے مبطل قرار دیا ہے
اور کسی قید کی حاجت نہیں سمجھی گئی جیسا کہ دوسرے وطن اصلی کو پہلے کے لئے بلا کسی قید کے
مبطل ٹھیرایا ہے حالانکہ یہ بطلان پہلے کے ترک کے ساتھ مقید ہے (اسکی قدرے تفصیل آگے
آرہی ہے) مگر چونکہ عام طور پر جب دوسرے مقام کو مستقل وطن بنایا جاتا ہے تو پہلے کو چھوڑ کر
ہی بنایا جاتا ہے لہٰذا اس قید کی تصریح کی "متون" میں ضرورت نہیں سمجھی گئی تو گویا کہ متون
کی تعبیر وطن اقامت سے ایک خاص سفر کے بارے میں ہے تمام سفروں کے بارے میں نہیں۔
وطن اقامت سفر سے باطل ہو جاتا ہے۔ کتاب الفقہ لعبد الرحمٰن الجزیری میں اس کی

وطن بلا ارتحال ———— ۱۱

تعبیر ان الفاظ سے کی گئی ہے۔ ثانیہا یبطل بمثلہا وبالسفر مسافۃ قصر الی مکان صالح للاقامۃ واقام بہ خمسۃ عشر یوما او نوی قرار تحول عنہ الی مکان آخر واقام بہ کذلک الخ

یہ شبہ نہ کیا جائے کہ یہ حکم اس صورت میں ہے جبکہ شرعی سفر نہ ہو بلکہ وطن اقامت میں اپنا سامان وغیرہ چھوڑ کر کسی قریبی مقام پر چلا جائے کیونکہ یہ تقیید بلا دلیل ہے اور موضع آخر مطلق ہے جو کہ دونوں مسافتوں سفر اور ما دون السفر کو شامل ہے اور اگر متون کے اطلاق سفر کو دلیل تقیید قرار دیا جائے اور یوں کہا جائے کہ چونکہ متون میں شرعی سفر کو وطن اقامت کے لئے مطلقاً مبطل قرار دیا گیا ہے خواہ یہ ارتحال ہو یا محض سفر شرعی، لہٰذا پیش نظر جزئیہ ہذا کو ما دون السفر کے ساتھ مقید کیا جائیگا، تو اسکا جواب یہ ہے کہ اسکے برعکس کیوں نہیں کر لیا جاتا (یعنی جزئیہ محیط کو مطلق رکھا جائے اور متون کے اطلاق کو مقید کیا جائے) وجہ ترجیح کیا ہے؟ خصوصاً جبکہ متون کے اطلاق کی دلیل تقیید صاحب بدائع کی تعلیل سے واضح ہو جاتی ہے پس جب دونوں امر محتمل ہوئے تو تقیید کا ثبوت نہ ہو سکے گا اور اگر بالفرض یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ محیط کا جزئیہ ما دون السفر پر محمول ہے تو بھی نفس مسئلہ کے ثبوت پر کوئی اثر نہیں پڑتا کیونکہ جزئیہ ہذا میں یہ بھی مصرح ہے کہ دوسرے موضع میں مقیم ہو جانے سے پہلا وطن اقامت باطل نہ ہوگا بلکہ موجودگی سامان کیوجہ سے باقی رہے گا (جیسا کہ دوسرا وطن اصلی بنا لینے سے پہلا وطن اصلی باطل نہیں ہوگا تاوقتیکہ پہلے کو قصداً باطل نہ کرے اور وہاں سے رہائش وغیرہ ختم نہ کر دے) حالانکہ متون میں دوسرے وطن اقامت کو پہلے کیلئے مبطل لکھا ہے پس جزئیہ ہذا سے بقاء ثقل کا وطن اقامت کے لئے مانع بطلان ہونا ثابت ہو گیا اور یہی مطلوب تھا۔ پس جیسے دوسرے وطن اقامت سے اندریں صورت پہلا وطن اقامت باطل نہیں ہوتا ایسے ہی سفر سے بھی باطل نہیں ہوگا کیونکہ وجود مقتضی اور وجود مانع میں دونوں برابر ہیں (متون کے اطلاق کے اعتبار سے دونوں میں) دوسرا وطن اقامت بنا لینا مقتضی بطلان ہے (اور جزئیہ محیط کے اعتبار سے) بقاء ثقل مانع بطلان ہوا، اسی طرح عدۃ میں سفر شرعی کرنا مقتضی اور بقاء ثقل مانع بطلان۔

یمین کے بارے میں بھی فقہاء نے اسی امر کو مبنی قرار دیا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی شہر میں نہ رہنے کی قسم کھائے تو شہر سے محض چلے جانا بر یمین کے لئے کافی نہیں ہوگا بلکہ اس کے

وطن کا ارتحال ـــــــــ ۱۲

ساتھ عدم عود کا عزم ہونا بھی ضروری ہے اور اگر واپس آنیکے ارادہ سے گیا ہے تو اس سفر کے باوجود اسکی سکونت کو باقی تصور کیا جائیگا گو وہ وہاں موجود نہ ہو بلکہ صاحب نہر نے اس پر یہ بھی اضافہ کیا ہے کہ بال بچوں سمیت چلا جائے تو سکونت سے نکلیگا ورنہ نہیں۔ گو رملی وغیرہ نے اسکی تردید کی ہے اور کہا ہے کہ یہ ضروری نہیں البتہ عزم عدم عود لازمی ہے۔

نقل الکاکی والبحر: لا یسکن هذه البلاد او البیت او المحلة فخرج وبقی متاعه واهله حنث لانه لا یعد ساکنا ببقاء اهله ومتاعه فیها عرفا (الی ان قال) فیها بالاستثناء والسکة كالمحلة لانه لو کان الیمین علی المصر او القریة لا یتوقف البر علی نقل المتاع والاهل كما روی عن ابی یوسف لانه لا یعد ساکنا فی الذی انتقل عنه عرفا بخلاف الاول وقال ابن ... وفی تتمة الفتاوی وفی المصر وفی القریة لا یعد ساکنا بترك اهله ومتاعه فیها ولو خرج ... ان یحنث تبعا الاولی لکونه یعد ساکنا مطلقا غیر مسلم بل انما یعد ساکنا اذا کان قصد العود ... امرأة خرج منها لا بقصد العود لا یعد ساکنا ولعله ... کما لو ابانت المرأة الخ (بحر ص۳۰۳ ج۴) وکذا فی الشامیة (ص۳۰ ج۳) ومسألة ابانت المرأة کذا ابن الشحنة وعلیه وخرج ... ولم یرد العود الیه (الی قوله) لو یحنث (بحر ص۳۰۹ ج۴) وکذا فی الشامیة ص۶۰ ج۳

"ولم یرد العود الیه" کی قید سے معلوم ہوا کہ بیوی اسی شہر میں چھوڑ کر نیت واپسی اگر شہر سے چلا گیا تو حانث ہو جائیگا۔ اور لا یسکن علی هذا المصر میں اسے صادق نہیں تصور کیا جائیگا بلکہ اسکی سابقہ سکونت و اقامت کو باقی سمجھا جائیگا۔ سکونت اور اقامت شرعی دونوں کا مصداق تقریباً ایک ہی ہے جیسا کہ جزئیہ ذیل سے معلوم ہوتا ہے۔ وفی الواقعات لا یساکن فلانا فنزل منزله فمکث فیه یوما او یومین لا یحنث لانه لا یکون ساکنا معه حتی یقیم معه فی منزله خمسة عشر یوما وهذا بمنزلة ما لو حلف لا یسکن الکوفة فمر بها مسافرا فنوی ان یقیم بها اربعة عشر یوما لا یحنث فان نوی خمسة عشر یوما یحنث (بحر ص۳۱۴ ج۴)

اور صاحب نہر اور رملی کے کلام سے پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ ایک باشندہ جب کسی شہر سے سفر پر جائے اور اسکے بیوی بچے وہیں رہیں اور واپسی کا ارادہ بھی ہو تو شہر میں اسکی سکونت باقی تصور کی جاتی ہے تو جیسے اس صورت میں سکونت کو باقی قرار دیا جاتا ہے اسی طرح ایسی صورت میں اقامت کو بھی باقی سمجھا جائیگا تاکہ اقامت و سکونت میں جیسے حدوثاً مساوات ہے ایسے ہی زوالاً بھی مساوات باقی رہ سکے۔

واللہ تعالیٰ اعلم ـــــــ ۱۳

واضح رہے کہ بقاء ثقل سے یہ مراد ہے کہ سامان پر اس کا قبضہ بھی باقی ہو اور اگر کسی کے پاس سامان ودیعت رکھ دیا یا کسی کو عاریت پر دیدیا تو اس سامان کا بقاء موجب بقاء اقامت و سکنی نہیں ہوگا۔ کما یدل علیہ قولہ محمد الآتی حلف لا یساکن فلانا فان کان ساکنا معہ فان اخذ فی النقلۃ وھی ممکنۃ والا حنث قال محمد فان کان وھب لہ متاعہ وقبضہ منہ وخرج من ساعتہ ولیس من رأیہ العود فلیس بساکن وکذلک ان اودعہ المتاع او اعارہ ثم خرج لا یرید العود الا (شامی ص ۲۳۳ ج ۳)

پس صورت مسئولہ میں زید سفر کے بعد جب بھی وطن ملتان پہنچے گا خود بخود مقیم تصور ہوگا اور نماز پوری پڑھے گا۔ نیز ایک وجہ یہ بھی ہے کہ موضع اشتباہ میں اتمام لازم ہے۔ مزید یہ کہ وطن اقامت کا جہاں بیوی بچے موجود ہوں محض عارضی سفر سے باطل نہ ہونا اس امر سے بھی ظاہر ہے کہ عارضی سفر سے واپسی پر بلا تجدید نیت اقامت اسکا مسافر رہنا بعید ہے اور یہ تب ہی ہو سکتا ہے کہ اس کی سابقہ اقامت کو باقی سمجھا جائے۔ اگر سفر سے وطن اقامت باطل ہو گیا ہوتا تو یہ شخص ہمیشہ مسافر رہتا تاوقتیکہ پندرہ روز ٹھہرنے کی جدید نیت نہ کر لیتا۔ تو معلوم ہوا کہ محض سفر سے وطن اقامت باطل نہیں ہوتا۔ فقط واللہ اعلم

عبدالستار نائب مفتی خیر المدارس ملتان ۱ ۹/۹۶

الجواب باسم ملہم الصواب

بندہ کے نزدیک یہ جواب صحیح ہے۔ کچھ عرصہ قبل اسی مسئلہ سے متعلق خیر المدارس اور قاسم العلوم ملتان کے متضاد جوابات خیر المدارس کی طرف سے بندہ کے پاس بھیجے گئے تھے اسوقت بھی جانبین کے دلائل پر غور کرنے کے بعد بندہ نے خیر المدارس کے جواب کو صحیح قرار دیا تھا اور اسکے مطابق فیصلہ لکھا تھا۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

رشید احمد

غرہ جمادی الاولیٰ سنہ ۹۶ھ

اس تحقیق کے خلاف ایک تحریر کا جواب تتمہ میں ہے

بعد میں حضرت والا نے اس جواب کی اشاعت سے منع فرما دیا تھا۔ حضرت کی تحریر کا عکس یہ ہے:

مفتی دار العلوم کی تحریر ۱ جو جواب یہاں سے لکھا تھا اسے مشتہر نہ کریں

وفی الشامیۃ تحتہ (قولہ جاز) ای ولا یبطل الغسل فاصلا لانہ من اعمال الصلوٰۃ ولکن الاولیٰ اعادتہا کما لو تطوع بعدہا او افسد الجمعۃ او فسدت بتذکر فائتۃ فیہا کما فی البحر (شامیۃ ج ۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۱۳/ ذی قعدہ سنہ ۹۲ھ

خطبہ وجمعہ میں زیادہ فصل ہوجائے تو اعادۂ خطبہ لازم ہے:

سوال: جمعہ اور خطبہ کے درمیان فصل ہوجائے تو کیا خطبہ کا اعادہ ضروری ہوگا؟ بینوا توجروا

الجواب ومنہ الصدق والصواب

خطبہ وجمعہ میں معتد بہ فصل ہوجانے سے اعادہ خطبہ ضروری ہے، کما فی الشامیۃ (قولہ والخامس کونہا قبلہا) ای بلا فاصل کثیر (رد المحتار بیان شروط صحۃ الجمعۃ) وایضاً قال فی شرح التنویر ولو خطب جنبا ثم اغتسل وصلی جاز ولو فصل باجنبی فان طال بان رجع لبیتہ فتغدی او جامع واغتسل استقبل خلاصۃ ای لزوما لبطلان الخطبۃ، سراج وفی الشامیۃ (قولہ جاز) ای ولا یبطل الغسل فاصلا لانہ من اعمال الصلوٰۃ ولکن الاولیٰ اعادتہا کما لو تطوع بعدہا او افسد الجمعۃ او فسدت بتذکر فائتۃ فیہا کما فی البحر (شامیۃ ج ۱) وایضاً فی شرح التنویر ویکرہ الفصل بامر الدنیا، وفی الشامیۃ انما یکرہ بنہی عن منکر او امر بمعروف فلا وکذا بوضوء او غسل لو ظہر انہ محدث او جنب کما مر بخلاف الاکل او شرب حتی لو طال الفصل استأنف الخطبۃ کما مر فافہم (رد المحتار ج ۱ ص ...) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۵/ ذی قعدہ سنہ ۹۲ھ

جیل میں جمعہ پڑھنے کا حکم:

سوال: قیدیوں کے لئے جیل میں جمعہ پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ بینوا بالبرہان توجروا عند الرحمٰن

الجواب ومنہ الصدق والصواب

اگر حکومت کی طرف سے جیل میں جمعہ پڑھنے کی اجازت ہو تو عبارات ذیل سے جواز معلوم ہوتا ہے۔

فی شرح التنویر فی شروط صحۃ الجمعۃ والسابع الاذن العام (الی قولہ) فلا یضر غلق

باب القلعة لعدو او لعادة قديمة لان الاذن العام مقرر لاهله وغلقه لمنع العدو لا المصلي، وفي الشامية تحت (قوله او قصر) قلت وينبغي ان يكون محل النزاع ما اذا كانت لا تقام الا في محل واحد اما لو تعددت فلا لانه لا يتحقق التفويت كما افاده التعليل تأمل (رد المحتار ج ۱) فقط والله تعالى اعلم

۲۰ جمادی الاولی سنہ [illegible]

ایک شہر میں متعدد جگہ جمعہ جائز ہے:

سوال: محقق مذہب پر ایک ہی شہر میں متعدد مقامات پر جمعہ پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب ومنه الصدق والصواب

جائز ہے، البتہ حتی الامکان ایک مقام پر بڑے اجتماع کی کوشش کرنا چاہئے، قال في شرح التنوير وتؤدى في مصر واحد بمواضع كثيرة مطلقا على المذهب وعليه الفتوى، وقال في الشامية وبما ذكرنا اندفع ما في البدائع من ان ظاهر الرواية جوازها في موضعين لا في اكثر وعليه الاعتماد اه فان المذهب الجواز مطلقا (رد المحتار ج ۱) فقط والله تعالى اعلم

۱۵ ذی قعدہ سنہ [illegible]

خطبہ میں حاضرین درود شریف نہ پڑھیں:

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس بارہ میں کہ خطیب آیت "ان الله وملائكته يصلون على النبي الآية" پڑھتا ہے تو لوگ بآواز بلند درود شریف پڑھتے ہیں، ایسے ہی کلمات دعائیہ پر آمین کہتے ہیں، کیا یہ فعل شرعاً درست ہے؟ اور اگر آہستہ کہا جائے تو جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب ومنه الصدق والصواب

زبان سے پڑھنا جائز نہیں، دل میں پڑھ سکتے ہیں۔ قال في التنوير اذا خرج الامام فلا صلوة ولا كلام الى تمامها وكل ما حرم في الصلوة حرم فيها بلا فرق بين قريب وبعيد، وفي الشرح فيحرم اكل وشرب وكلام ولو تسبيحا او رد سلام او امرا بمعروف بل يجب عليه ان يستمع ويسكت وكان ابو يوسف رحمه الله تعالى ينظر في كتابه ويصححه والاصح انه

لا بأس بان یشیر برأسہ او بیدہ عند رؤیۃ منکر والصواب انہ یصلی علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم عند سماع اسمہ فی نفسہ وفی الشامیۃ ای بان یسمع نفسہ او یصحح بشفتیہ فانہ امر فسرہ۔ وعن ابی یوسف رحمہ اللہ تعالی قلب ایضا رأیا لانہ یحرز الانصات والصلوۃ علیہ صلی اللہ علیہ وسلم کما فی الکرمانی قہستانی قبیل باب الامامۃ واقتصر فی الجوہرۃ علی الاخیر حیث قال ولم ینطق بہ لانہ تدرک فی غیر ھذا الحال والسامع یفوت (رد المحتار ص[illegible] ج ۱)

فقط واللہ تعالی اعلم — ۱۲ ربیع الاول سنہ [illegible]ھ

جمعہ کی اذان اول کے بعد بیع و شراء ناجائز ہے:

سوال: جمعہ کی اذان اول کے بعد بیع و شراء کا کیا حکم ہے؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

جمعہ کی اذان اول کے بعد بیع و شراء مکروہ تحریمی ہے، ایسی بیع سے توبہ اور اس کا فسخ دیانۃً واجب ہے قضاءً نہیں، بیع فاسد قضاءً بھی واجب الفسخ ہوتی ہے، آجکل نماز جمعہ سے قبل تقریر کا دستور ہو گیا ہے جس کی وجہ سے اذان اول اور خطبہ کے درمیان بہت وقفہ رکھا جاتا ہے اس کی وجہ سے جو لوگ اذان اول سنکر فوراً جمعہ کی تیاری میں مشغول نہیں ہوتے بلکہ اس گناہ کا سبب مسجد کی منتظمہ ہیں اس لئے منتظمین بھی سخت گنہگار ہوں گے، منتظمین پر لازم ہے کہ اذان اول و خطبہ کے درمیان زیادہ فصل نہ رکھیں، قال فی التنویر وکرہ البیع عند الاذان الاول، وفی الشامیۃ معزیا الی النہر عن النہایۃ ان فسخہ واجب علی کل منہما ایضا صونا لہما عن المحظور وعلیہ مشی المصنف فی آخر الباب ویأتی تمامہ (رد المحتار ص۱۲۲ ج۴) وقال ابن عابدین رحمہ اللہ تعالی فی آخر الباب بعد نقل قول البعض قلت ویمکن التوفیق بوجوبہ علیہما دیانۃ بخلاف البیع الفاسد فانہما اذا اصرا علیہ یفسخہ القاضی جبرا علیہما (رد المحتار ص[illegible] ج۴) فقط واللہ تعالی اعلم

۲۵ صفر سنہ ۸۶ھ

عید میں دوسری رکعت کے رکوع کی تکبیر واجب ہے:

سوال: سنا گیا ہے کہ نماز عید میں دوسری رکعت کے رکوع کی تکبیر واجب ہے، کیا یہ صحیح ہے؟ حوالہ تحریر فرمائیں، بینوا توجروا

الجواب ومنہ الصدق والصواب

یہ قول صحیح ہے، قال فی واجبات الصلوۃ من شرح التنویر وتکبیرات العیدین وکذا احدھا وتکبیر رکوع رکعۃ الثانیۃ (رد المحتار ص[illegible] ج۱) فقط واللہ تعالی اعلم

۲۰ صفر سنہ ۸۶ھ

نماز عید یا خطبہ کے بعد دعاء مانگنا:

سوال: نماز عید یا خطبہ کے بعد دعاء مانگنا ثابت ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب ومنه الصدق والصواب

خطبہ کے بعد دعاء ثابت نہیں، نماز عید کے بعد اثبات دعاء کیلئے دو حدیثیں پیش کی جاتی ہیں۔

① روی البخاری رحمہ اللہ تعالیٰ عن ام عطیۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہا قالت کنا نؤمر ان نخرج یوم العید حتی نخرج البکر من خدرها حتی نخرج الحیض فیکن خلف الناس فیکبرن بتکبیرهم ویدعون بدعائهم یرجون برکۃ ذلک الیوم وطهرته (ص ۱۳۲ ج ۱)؛ وفی روایۃ فیشهدن جماعۃ المسلمین ودعوتهم (ص ۴۳ ج ۱) وعند الترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ ویشهدن دعوۃ المسلمین (ص ۱۰۲)

② عن انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا کان لیلۃ القدر نزل جبرئیل علیہ السلام فی کبکبۃ من الملائکۃ یصلون علی کل عبد قائم او قاعد یذکر اللہ عز وجل فاذا کان یوم عیدهم یعنی یوم فطرهم باهی بهم ملائکته فقال یا ملائکتی ما جزاء اجیر وفی عمله قالوا ربنا جزاؤه ان یوفی اجره قال ملائکتی عبیدی وامائی قضوا فریضتی علیهم ثم خرجوا یعجون الی الدعاء وعزتی وجلالی وکرمی وعلوی وارتفاع مکانی لاجیبنهم فیقول ارجعوا فقد غفرت لکم وبدلت سیئاتکم حسنات قال فیرجعون مغفوراً لهم رواه البیهقی فی شعب الایمان (مشکوٰۃ ص ۱۸۳)

ان حدیثوں سے استدلال میں کلام ہے اور استحباب دعاء بعد الصلوات کے کلیہ میں اندراج بھی بدیں وجہ مخدوش ہے کہ نماز عید کے بعد متصل بلا فصل خطبہ ہے، علاوہ ازیں خطبہ بھی دعاء ہی ہے، مزید برآں نماز عید کے بعد دعاء میں مندرجہ ذیل بدعات بھی شامل کر دی گئی ہیں:

① دعاء کا التزام اور تارک پر نکیر شدید، اس سے تو امر مستحب بھی واجب الترک ہو جاتا ہے۔

② رفع الیدین کا التزام۔ دعاء بعد النوافل میں استحباب رفع الیدین متفق علیہ ہے اور دعاء بعد الفرائض میں مختلف فیہ، عدم ثبوت راجح ہے جس کی تفصیل تتمۂ احسن الفتاویٰ میں ہے، [illegible]۔

③ جہر اور اس کا ایسا التزام کہ کسی حالت میں بھی نہیں چھوڑا جا سکتا۔

④ اجتماعیت اور اس کا التزام نمبر ۳ سے بھی زیادہ۔

⑤ اہتمام بالامام اور اس کا التزام۔ اس پر شدت بھی اوپر کے نمبروں سے کم نہیں۔
وجوہ مذکورہ کی بنا پر اس رسمی دعاء سے احتراز لازم ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۹ رمضان سنہ [illegible]ھ

نمازِ عید میں تکبیر چھوٹ گئی:

سوال: امام سے سہواً عید کی نماز میں ایک تکبیر چھوٹ گئی تو نماز ہوئی یا نہیں؟ اور اگر مقتدی تکبیر کہنا بھول جائے تو اس کی نماز ہوئی یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

مقتدی کی تکبیر چھوٹ گئی تو رکوع میں تکبیر نہ کہے، البتہ اقتداء کے بعد امام کے رکوع سے قبل مقتدی کو تکبیرات کا موقع نہ ملا تو رکوع سے قبل تکبیریں کہے، اگر تکبیریں حالت قیام میں کہنے سے خطرہ ہو کہ امام رکوع سے اٹھ جائے گا تو رکوع میں جا کر تسبیحات کی بجائے تکبیریں کہے، مگر تکبیر کے لئے ہاتھ نہ اٹھائے، اگر تکبیرات پوری کرنے سے قبل امام رکوع سے اٹھ گیا تو باقی تکبیریں ساقط ہو گئیں۔

امام سے پہلی رکعت کی تکبیر چھوٹ گئی اور فاتحہ و سورت سے فراغت کے بعد یاد آئی یا دوسری رکعت کی تکبیر رکوع میں یاد آئی تو اب تکبیر نہ کہے، بلکہ سجدۂ سہو سے جبر نقصان کرے، اگر کثرتِ ازدحام کی وجہ سے سجدۂ سہو کرنے سے نماز میں خلل کا اندیشہ ہو تو سجدۂ سہو معاف ہے۔ اگر امام تکبیر کے لئے رکوع چھوڑ کر قیام کی طرف لوٹ آیا تو ایک قول پر نماز فاسد ہو گئی، مگر عدم فساد راجح ہے، البتہ اس صورت میں رکوع کا اعادہ نہ کرنے پر نماز واجب الاعادہ ہو گی، اگر سورت پوری کرنے سے قبل تکبیر یاد آگئی تو تکبیر کہہ کر فاتحہ و سورت دوبارہ پڑھے اور سجدۂ سہو کرے، وذکر ابن عابدین رحمہ اللہ تعالیٰ فی وجوب اعادۃ القراءۃ اشکالاً ثم نقل جواباً غیر شافٍ فلیحرر۔

وجوب اعادہ سے متعلق شامیہ میں یہ عبارت ہے: وفی البحر عن المحیط ان بدأ الامام بالقراءۃ سہواً فتذکر بعد الفاتحۃ والسورۃ یمضی فی صلاتہ وان لم یقرأ الا الفاتحۃ کبر واعاد القراءۃ لزوماً لان القراءۃ اذا لم تتم کان امتناعاً عن الاتمام لا رفضاً للفرض اھ (رد المحتار [illegible]) اس عبارت کے پیش نظر موقع وجوب اعادہ میں تین احتمال ہیں: فاتحہ کے بعد مطلق حروف خواہ تین حروف پڑھنے سے قبل، یا بقدر قراءت کا قصر ہو اس کی تکمیل سے قبل، یا رکوع سے قبل، مگر دوسرا متعین ہے۔ متون میں کوئی صریح جزئیہ نہیں ملا، بظاہر احتمال اول مراد ہے یعنی فاتحہ کے بعد تین حروف پڑھنے سے قراءت کا اتمام ہو جاتا ہے، [illegible]

سد بالفاتحة والسورۃ میں صورت سے یہی مقدار مراد ہے، وھو معروف فی کلام الفقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔ ۲۵ ذی الحجہ سنہ ۸۱ھ

اذان اول کے بعد کھانا:

سوال: جمعہ کی اول اذان کے بعد کھانا وغیرہ کھانا جبکہ خطبہ کی اذان سے پہلے پہنچ جانے کا یقین ہو شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

اگر کھانے کی رغبت غالب ہو اور نماز سے فراغت تک کھانا بے لذت ہو جانے کا خطرہ ہو تو کھانا کھا سکتا ہے بشرطیکہ فوت جمعہ کا اندیشہ نہ ہو۔ قال فی العلائیة مع التنویر وحضور طعام تتوقہ نفسہ ان خاف فوت جمعة او مکتوبة لا جماعة، وفی الشامیة والاکل ای الذی تمیل الیہ نفسہ ویخاف ذهاب لذتہ عذر فی ترک الجماعة کما عرف فی بابها لکن یشکل ما مر من وجوب السعی الی الجمعة بالاذان الاول وترک البیع ولو ماشیا ولازمہ عدم الاکل فی السعی لفعل (رد المحتار ص ۶۶۱ ج ۱)

وقال الرافعی رحمہ اللہ تعالیٰ (قولہ لکن یشکل ما مر من وجوب السعی الخ) بتقیید ما مر بما اذا یندفع الاشکال وذلک لان حضور الاکل المذکور حیث کان عذرا فی سقوط واجب الجماعة لشغل بال المصلی یکون عذرا فی سقوط واجب السعی اذ لا فرق بین واجب وواجب بخلاف ما اذا خاف فوت الجمعة او الوقت لفوات الفرض لا الواجب (التحریر المختار ص ۱۰۴) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔
۲۹ جمادی الاولیٰ سنہ ۸۰ھ

اذان جمعہ کے بعد مسافر کے لئے خرید و فروخت:

سوال: جمعہ کی اذان کے بعد مسافر کے لئے خرید و فروخت یا ہوٹل میں کھانا کھانا جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

فی نفسہ جائز ہے مگر مواقع تہمت سے بچنے کے لئے احتراز واجب ہے، کسی کو کیا معلوم کہ یہ مسافر ہے۔
فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔ ۲۴ شعبان سنہ ۹۱ھ

جمعہ کی طرف جاتے ہوئے بیع و شراء:

سوال: جمعہ کی اذان اول کے بعد نماز جمعہ کے لئے جاتے ہوئے راستہ میں رکے بغیر چلتے چلتے کسی قسم کا کوئی سودا کر سکتے ہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملهم الصواب

اس میں اختلاف ہے، عدم جواز ارجح واحوط ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۳، شوال سنہ ۹۰ھ

بحالت خطبہ اشارہ سے نہی عن المنکر جائز ہے:

سوال: خطبہ شروع ہونے کے بعد اگر کوئی شخص سنتوں کی نیت باندھنا چاہے تو اس کو منع کرنا جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملهم الصواب

حالت خطبہ میں زبان سے نہی عن المنکر جائز نہیں، اشارہ سے جائز بلکہ فرض ہے، یہ حکم غیر خطیب کے لئے ہے، خطیب پر زبان سے بھی نہی عن المنکر فرض ہے، لہٰذا خطیب کسی کو سنتیں پڑھتے ہوئے دیکھے تو اس کو زبان سے تنبیہ کرے ورنہ مقتدی اشارہ سے منع کریں۔ قال فی العلائية والاصح لا بأس بان يشير برأسه او يده عند رؤية منكر (رد المحتار ص ۷۶۸ ج ۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۹ ذی الحجہ سنہ ۹۰ھ

کراہت بیع کے لئے اذان محلہ معتبر ہے:

سوال: جمعہ کی اذان اول کے بعد خرید و فروخت اور دوسرے کام ناجائز ہو جاتے ہیں، اگر کئی مسجدوں سے مختلف وقتوں میں اذان سنائی دے تو خرید و فروخت وغیرہ کس وقت ناجائز ہوگی؟ سب سے پہلی اذان پر یا آخری پر؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملهم الصواب

اس بارے میں کوئی صریح جزئیہ اس لئے نہیں تھا کہ پہلے زمانے میں پورے شہر میں صرف ایک ہی جگہ جمعہ ہوتا تھا، لہٰذا اس کو عام نمازوں کی اذان پر قیاس کیا جائے گا، عام اذان کی اجابت باللسان میں اذان اول کا اعتبار ہے اور اجابت بالقدم میں اذان محلہ کا اعتبار ہے، اس سے ثابت ہوا کہ وجوب سعی الی الجمعہ وکراہت بیع میں مسجد محلہ کی اذان معتبر ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۹ ذی الحجہ سنہ ۹۰ھ

خطبہ سے قبل سراً تعوذ مسنون ہے:

سوال: اذان دینے سے قبل یا خطبہ جمعہ پڑھنے سے قبل یا وعظ کہنے سے قبل خدا کی حمد یعنی وعظ کہنے سے قبل جو خطبہ پڑھا جاتا ہے اس سے قبل آہستہ یا جہراً اعوذ باللہ الخ اور بسم اللہ الرحمن الرحیم

جہرًا یا سرًا پڑھنا جائز ہے یا نہیں ؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملهم الصواب

خطبۂ جمعہ سے قبل صرف اعوذ باللہ سرًا پڑھے، صرف خطبۂ اولیٰ سے قبل، بقیہ مواضع میں اعوذ باللہ یا بسم اللہ مسنون نہیں۔ قال فی العلائیة ویبدأ بالتعوذ سرًا، وقال ابن عابدین رحمہ اللہ تعالیٰ ای قبل الخطبة الاولیٰ (رد المحتار ص ۷۵۸ ج ۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۱۰ شوال [illegible]ھ

نمازِ عید کے لئے شہر سے باہر نکلنا سنت ہے :

سوال : کیا فرماتے ہیں علماء دین ودین مسئلہ کہ نمازِ عیدین محلہ کی مساجد میں کرنے میں سو دو سو آدمیوں کا اجتماع ہوتا ہو، بلا کراہت درست ہے یا اس اجتماعِ عید کے بارے میں شرعًا عظیم اجتماع مطلوب ہے ؟ اور اس اجتماع کی کیا حد ہے ؟ نیز کیا عیدگاہ کا حدودِ شہر سے باہر ہونا مطلوب شرعی ہے اگر یہ مطلوب شرعی ہے تو پھر موجودہ صورت میں ملتان شہر کی فضا یا کوئی سی بھی عیدگاہ حدودِ شہر سے باہر نہیں کیونکہ آجکل آبادی میں اضافہ کی وجہ سے شہر ہر طرف سے چار چار پانچ پانچ میل پھیل چکا ہے براہ کرم اس مسئلہ کو تفصیل اور دلائل و براہین سے تحریر فرما کر عامۃ المسلمین کی صحیح رہنمائی فرمائیں۔ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملهم الصواب

عیدگاہ شہر سے باہر ہونا سنت مؤکدہ ہے، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم عیدین کی نماز ہمیشہ باہر ادا فرماتے تھے، بلکہ معذورین کو بھی ساتھ لے جانے کا اہتمام فرماتے تھے، صرف ایک مرتبہ بارش کی وجہ سے باہر تشریف نہیں لے جا سکے (رواہ ابوداود فی سننہ) اس لئے اصل حکم یہی ہے کہ عید کے لئے شہر سے باہر ایک ہی جگہ اجتماعِ عظیم ہو اس میں شوکتِ اسلام کا مظاہرہ بھی ہے، مگر بڑے شہروں سے باہر نکلنا مشکل ہے، اس لئے شہر کے اندر بڑے میدان میں یا بوقتِ ضرورت مسجد میں ادا کرنا بلا کراہت درست ہے لیکن حتی الامکان کوشش کی جائے کہ ہر محلہ میں چھوٹے چھوٹے اجتماعات کی بجائے ایک مقام پر بڑے اجتماع کی کوشش کی جائے۔ قال فی الدر والخروج الیها ای الجبانة لصلوٰة العید سنة وان وسعهم المسجد الجامع هو الصحیح وفی الشامیة قال فی الظهیریة وقال بعضهم لیس بسنة وتعارف الناس ذلک لضیق المسجد وکثرة الزحام والصحیح هو الاول اھ وفی الخلاصة والخانیة السنة ان یخرج الامام الی الجبانة ویستخلف غیره لیصلی فی المصر بالضعفاء بناء علی ان صلوٰة العیدین فی موضعین جائزة بالاتفاق وان لم یستخلف فله ذلک اھ (رد المحتار ص ۷۷۷ ج ۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۱۰ ذی الحجہ [illegible]ھ

منبر کے درجات :

سوال : منبر کے درجے تین سے کم یا زیادہ کئے جائیں تو جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملهم الصواب

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے منبر کے تین درجات تھے، اس سے موافقت اولیٰ ہے اور کمی وزیادتی بھی جائز ہے۔ قال ابن عابدین رحمه الله تعالیٰ و منبره صلی الله علیه وسلم کان ثلاث درج غیر المسماة بالمستراح (رد المحتار ص ۷۶۲ ج ۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۲۲ ذی الحجہ ۸۳ھ

نماز عید سے قبل فجر کی قضا جائز ہے :

سوال : عید کی نماز سے پہلے نفل پڑھنا مکروہ ہے، مگر کسی کی فجر کی نماز قضا ہوگئی تو عید سے پہلے فجر کے فرض مع سنت قضا کرسکتا ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملهم الصواب

جائز ہے مگر گھر میں خفیۃ پڑھے تاکہ دیکھنے والوں کو بدگمانی نہ ہو۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۲۵ ذی الحجہ ۸۳ ہجری

عید مسجد میں پڑھی تو اس میں زوال کے بعد نفل جائز ہے :

سوال : بہشتی زیور میں ہے کہ جہاں عید کی نماز ہو وہاں عید سے قبل اور بعد نفل نماز مکروہ ہے۔ تو اگر مسجد میں عید کی نماز پڑھی ہو تو اس میں نفل نماز جیسے ظہر کے نفل اور عصر کی چار سنت غیر مؤکدہ پڑھنا بھی اس مسجد میں مکروہ ہے یا بلا کراہت جائز ہوں گے؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملهم الصواب

عیدگاہ میں کراہت نوافل کی وجہ یہ ہے کہ نماز عید پر زیادتی کا وہم نہ ہو، اور نماز عید کا وقت زوال تک ہے، اس لئے زوال کے بعد اس مسجد میں نوافل مکروہ نہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۲۵ ذی الحجہ ۸۳ھ

کارخانہ میں جمعہ پڑھنا :

سوال : کارخانہ میں ایک مسجد ہے جس میں جمعہ کی نماز ہوتی ہے اور دیگر پانچ وقتی نمازوں میں سے ظہر و عصر باقاعدہ ہوتی ہے کیونکہ دو وقت کے سوا لوگ اپنے اپنے گھر چلے جاتے ہیں۔ باقی وقتوں میں چوکیدار وغیرہ کبھی کبھی نماز پڑھتے ہیں۔ کارخانہ میں سے بعض وقت نماز کے بہانہ پر لوگ چوری بھی کرلیتے ہیں اب تک

کارخانہ نماز جمعہ کے لئے عام اجازت نہیں دیتے بلکہ صرف اس کارخانہ کے اندرونی لوگوں کے لئے اجازت ہے اس مسجد میں نماز جمعہ جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملهم الصواب

یہاں چوروں سے حفاظت مقصود ہے نمازیوں کو روکنا مقصود نہیں، نیز بیرونی لوگ دوسری مساجد میں جمعہ پڑھ سکتے ہیں، لہٰذا اذن عام نہ ہونا صحت جمعہ میں مخل نہیں، اس مسجد میں نماز جمعہ صحیح ہے، قال في الدر تحت شروط الجمعة والسابع الاذن العام من الامام وهو يحصل بفتح ابواب الجامع للواردين كافي فلا يضر غلق باب القلعة لعدو أو لعادة قديمة لان الاذن العام مقرر لاهله وغلقه لمنع العدو لا المصلي نعم لو لم يغلق لكان احسن كما في مجمع الانهر، وفي الشامية تحت قوله (وغلقه) قلت وينبغي ان يكون محل النزاع ما اذا كانت لا تقام الا في محل واحد اما لو تعددت فلا لانه لا يتحقق التفويت كما افاده التعليل تأمل (رد المحتار ص ۶۰۱ ج ۱) فقط والله تعالیٰ اعلم

۵ جمادی الاولیٰ [illegible]ھ

بوقت خطبہ سنتیں پڑھنا جائز نہیں:

سوال: جمعہ کی نماز ہو رہی ہے بکر نے سنتوں کی نیت باندھ لی اس سے ایک رکعت نکل جائے یا نہ، دونوں صورتوں میں بکر گنہگار ہوگا یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملهم الصواب

ایسی حالت میں سنتیں شروع کرنا جائز نہیں بلکہ جب خطیب منبر پر جانے کے لئے نکلے اسی وقت سے ہر قسم کی نماز اور کلام ناجائز ہے، البتہ اگر اس سے قبل سنتیں شروع کر چکا ہو تو دو رکعتوں پر سلام پھیر دے اور اگر تیسری رکعت میں شروع ہو چکا ہو تو چاروں رکعات پوری کر لے۔ حالت خطبہ میں سنتیں شروع کرنا گناہ ہے، توبہ کرے اور بعد میں اعادہ کرے۔ فقط والله تعالیٰ اعلم۔

۲۳ جمادی الاولیٰ [illegible]ھ

اذان ثانی کے بعد گھر میں بھی سنتیں پڑھنا جائز نہیں:

سوال: اگر کوئی جمعہ کی اذان ثانی کے وقت اپنے گھر میں چار سنتیں پڑھ لے اور پھر خطبہ میں شریک ہو جائے تو یہ جائز ہوگا یا نہیں؟ اور اس کی یہ سنتیں ادا ہوں گی یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملهم الصواب

اذان ثانی کے بعد گھر میں بھی سنتیں پڑھنا مکروہ تحریمی ہے، یہ سنتیں بطریق غیر مشروع ادا کی گئی ہیں،

اس لئے قاعدہ کا مقتضیٰ یہ ہے کہ فرض جمعہ کے بعد کی چار رکعات پڑھنے کے بعد قبلیہ سنتیں دوبارہ پڑھے

لا یجب قضاء النفل المؤدی فی الوقت المکروہ لاداءہ کذا التزم بخلاف السنۃ المؤکدۃ فانہ مأمور باداءہا فی وقت مشروع فتسن اعادتہا، فقط واللّٰہ تعالیٰ اعلم۔

۲۳ ذی الحجہ سنہ ہجری

بوقت خطبہ گھڑی میں چابی دینا جائز نہیں:

سوال: خطبۂ جمعہ ہو رہا ہے اسی دوران گھڑی میں چابی دینا اور خطبہ سننے میں خیال رہے تو جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

جائز نہیں، قال فی التنویر وکل ما حرم فی الصلوٰۃ حرم فیہا (رد المحتار ص ج) فقط واللّٰہ تعالیٰ اعلم

۹ جمادی الاولیٰ سنہ

ایسے مقام کا حکم جس کا شہر ہونا مشتبہ ہو:

سوال: جہاں شک ہو کہ نماز جمعہ صحیح ہوتی ہے یا نہیں وہاں نماز جمعہ کے بعد چار رکعت احتیاط الظہر پڑھیں یا جمعہ چھوڑ دیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

صحت جمعہ کے لئے شہر یا قصبہ شرط ہے، جب تک وجود شرط متیقن نہ ہو جمعہ صحیح نہ ہوگا، لہٰذا ایسے موضع میں جمعہ نہ پڑھا جائے، البتہ اگر پہلے سے ایسی جگہ جمعہ جاری ہے تو شریک ہو جائے اور بعد میں احتیاط الظہر پڑھ لے مگر عوام کو نہ بتایا جائے، صرف خواص اس احتیاط پر عمل کریں۔ فقط واللّٰہ تعالیٰ اعلم

۵ ذیقعدہ سنہ

خطبہ واقامت کے درمیان مسئلہ بتانا:

سوال: بعد خطبۂ ثانیہ جمعہ قبل اقامت صلوٰۃ امام کے لئے کوئی مسئلہ بیان کرنا یا وعظ و نصیحت کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز ہے تو مع الکراہت یا بلا کراہت؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

مختصر طور پر کوئی مسئلہ بتانا امر بالمعروف ونہی عن المنکر جائز ہے، طویل وعظ جائز نہیں۔

قال فی شرح التنویر فاذا اتم اقیمت ویکرہ الفصل بامر الدنیا ذکرہ العینی، وفی الشامیۃ اما نہی عن منکر او امر بمعروف فلا (رد المحتار ص ج ۱) فقط واللّٰہ تعالیٰ اعلم۔

محرم سنہ ہجری

فناءِ مصر کی حد:

سوال: شہر سے ایک دو میل پر ایک گاؤں ہے جس کی آبادی سو دو سو آدمیوں کی ہے، یہ بستی نام سے الگ مشہور ہے، اس بستی میں عیدین کی نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ اور یہ بستی فناء میں شمار ہوگی یا نہیں؟ اور فناء کی حد کتنی دور تک ہے؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

یہ بستی فناءِ مصر میں داخل نہیں، اس لئے اس میں جمعہ و عید کی نماز جائز نہیں، فناءِ مصر وہ مقام ہے جو شہر کی ضروریات کے لئے متعین ہو، مثلاً قبرستان، کوڑا ڈالنے یا گھوڑ دوڑ یا جنگی مشق یا فوجی اجتماع وغیرہ کے لئے میدان، ہوائی اڈہ اور ریلوے اسٹیشن وغیرہ۔ فناء کا شہر سے اتصال ضروری نہیں اور نہ ہی اس کی مسافت اور وسعت کی کوئی تحدید ہے، بلکہ شہر کی حیثیت کے مطابق اس کی فناء مختلف ہوگی،
قال فی العلائیة او فناؤہ وھو ما حولہ اتصل بہ اولا کما حررہ ابن الکمال وغیرہ لاجل مصالحہ کدفن الموتی ورکض الخیل والمختار للفتوی تقدیرہ بفرسخ ذکرہ الولوالجی، وفی الشامیة والتعریف احسن من التحدید لانہ لا یوجد ذلک فی کل مصر وانما ھو بحسب کبر المصر وصغرہ الخ (ردالمحتار)
فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۱۴ ذی الحجہ ۸۵ ہجری

پہلے خطبہ میں ہاتھ باندھنا اور دوسرے میں چھوڑنا بدعت ہے:

سوال: خطبہ کے دوران مقتدیوں کو کیسی حالت پر بیٹھنا چاہئے؟ ہمارے علاقہ میں بیٹھنے کی رسم یہ ہے کہ جب خطیب پہلا خطبہ پڑھتا ہے تو مقتدی حالت تشہد میں بیٹھ کر تحت السرة ہاتھ باندھ لیتے ہیں اور دوسرا خطبہ پڑھنے کے دوران حالت تشہد میں بیٹھ کر رانوں پر ہاتھ رکھتے ہیں، کیا ایسے بیٹھنا شریعت کے مطابق ہے یا مخالف؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

اس کا شریعت میں کوئی ثبوت نہیں، لہٰذا یہ فعل بدعت ہے، دونوں خطبوں کے دوران حالت تشہد میں بیٹھنا مستحب ہے، دونوں میں ہاتھ رانوں پر ہی رکھے، یہ نشست مستحب ہے، ویسے جس طرح چاہے بیٹھ سکتا ہے۔ قال فی الھندیة اذا شھد الرجل عند الخطبة ان شاء جلس محتبیا او متربعا او کما تیسر لانہ لیس بصلوة عملا وحقیقة کذا فی المضمرات، ویستحب ان یقعد فیھا کما یقعد فی الصلوة کذا فی معراج الدرایة (عالمگیریہ) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۱۰ رجب ۸۶ھ

عرب میں عید پڑھا کر پاکستان میں بھی پڑھا سکتا ہے:

سوال: ایک صاحب کراچی کی جامع مسجد میں خطیب ہیں، وہ رمضان مبارک میں بحرین چلے جاتے ہیں اور عید بھی بحرین میں پڑھاتے ہیں لیکن پھر کراچی آتے ہیں تو رمضان شریف کے دو روزے باقی ہوتے ہیں اور عید کی نماز کراچی میں بھی پڑھاتے ہیں، کیا یہ صاحب دوبارہ کراچی میں نماز عید پڑھا سکتے ہیں یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملهم الصواب

کتب فقہ میں مسئلہ کی دو نظیریں ملتی ہیں، ایک عود الشمس بعد الغروب، دوسری هلال رمضان دیکھنے والے کی شہادت رد کر دی گئی ہو، مسئلہ اولیٰ میں عود وقت مختلف فیہ ہے، عدم عود راجح ہے اور دوسرے مسئلہ میں بالاتفاق اس شخص پر تکمیل ثلاثین کے بعد بھی دوسروں کے ساتھ روزہ وعید لازم ہے۔ نظیر اول کا مقتضی عرب سے پاکستان آنے والے کے حق میں عدم عود رمضان وعید ہے اور نظیر ثانی کے پیش نظر اس پر صوم وعید لازم ہے۔ لہٰذا مسئلہ زیر بحث کی زیادہ مناسبت نظیر ثانی کے ساتھ معلوم ہوتی ہے، اس لئے کہ غروب شمس یقینی ہے اور رؤیت ہلال ظنی، علاوہ ازیں ہر شخص کے لئے ثبوت احکام موضع اقامت کا لیا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد صومکم یوم تصومون وفطرکم یوم تفطرون (رواہ الترمذی)، بھی وجوب صوم وعید کو مقتضی ہے، اس لئے یہ شخص پاکستان میں آکر عید پڑھ سکتا ہے۔ معہذا احوط یہ ہے کہ عید کی امامت نہ کرے بلکہ بصورت اقتداء نماز عید ادا کرے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۲۲ رمضان [illegible]ھ

تکبیر تشریق بھول گیا:

سوال: منفرد اگر ذوالحجہ کی گیارہ تاریخ کو ظہر کے بعد تکبیر تشریق بھول جائے تو یاد آنے پر کہنا واجب ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملهم الصواب

واجب ہے، البتہ مانع بناء کوئی فعل کر لیا مثلاً مسجد سے نکل گیا یا کوئی بات کر لی یا عمداً وضو توڑ دیا تو تکبیر ساقط ہو گئی، اور سہواً وضو توڑا تو تکبیر کہے، قبلہ سے سینہ پھر گیا تو اس میں دونوں روایتیں ہیں، اس لئے احتیاطاً تکبیر کہہ لے۔ قال فی العلائیۃ: عقب کل فرض عینی بلا فصل یمنع البناء فلو خرج من المسجد او تکلم عامدًا او ساهیًا او احدث عامدًا سقط عنه التکبیر وفی استدبار القبلة روایتان ولو احدث ناسیا بعد السلام الاصح انه یکبر ولا یخرج للطهارة الخ (رد المحتار ص ۷۸۷ ج ۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۲۲ محرم [illegible]ھ

اذانِ خطبہ کا جواب جائز نہیں:

سوال: خطبہ کی اذان کا جواب کیسے دیا جائے گا زبان سے یا دل میں؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

خطبہ کی اذان کا جواب زبان سے دینا جائز نہیں، ہاں دل ہی دل میں جواب دیا جاسکتا ہے لقولہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا خرج الامام فلا صلوٰۃ ولا کلام، وقال العلائی رحمہ اللہ تعالیٰ وینبغی ان لا یجیب بلسانہ اتفاقاً فی الاذان بین یدی الخطیب (رد المحتار ص ۶۱۶ ج ۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۲۴ جمادی الاولیٰ سنہ … ھ

عیدگاہ میں نماز عید کی جماعت ثانیہ:

سوال: ایک عیدگاہ میں عید کی دو نمازیں ہو سکتی ہیں یا نہیں؟ دس پندرہ آدمیوں سے نماز عید امام سے فوت ہوگئی، عیدگاہ میں دیر سے پہنچے، امام نماز پڑھا چکا تھا، آیا یہ آدمی اپنی نماز دوبارہ اسی عیدگاہ میں پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

ایک عیدگاہ میں عید کی نماز دوبارہ پڑھنے سے نماز صحیح تو ہو جائے گی مگر جن وجوہ کی وجہ سے مسجد میں جماعت ثانیہ مکروہ ہے وہ یہاں بھی ہیں بلکہ ایک قباحت مزید ہے کہ اس مقام میں خلل اور عوام میں انتشار کا خطرہ ہے، اس لئے یہ لوگ عیدگاہ کی بجائے کسی دوسرے مقام میں عید کی جماعت کریں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲۴ صفر سنہ ۹۲ھ

منبر پر کھڑے ہو کر خطبہ پڑھنا سنت ہے:

سوال: منبر کی موجودگی میں خطیب منبر کے پاس کھڑا ہو کر خطبہ پڑھنے کے لئے کھڑا ہوتا ہے کیا اس میں کوئی قباحت ہے یا نہیں؟ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت مبارک میں یا اس کے بعد عید اور جمعہ کا خطبہ منبر پر پڑھا جاتا تھا؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصدق والصواب

منبر پر کھڑے ہو کر خطبہ پڑھنا سنت ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات خلفاء رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا یہی معمول تھا۔ قال ابن عابدین رحمہ اللہ تعالیٰ ومن السنۃ ان یخطب علیہ اقتداء بہ صلی اللہ علیہ وسلم بحر وان یکون علی یسار المحراب قہستانی (رد المحتار ص ۶۰۷ ج ۱)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲۴ ذی قعدہ سنہ ۹۱ھ

اذان جمعہ خطیب کے سامنے ہونا:

سوال: جمعہ کے دن خطبہ سے پہلے جو اذان کہی جاتی ہے اس کا خطیب کے سامنے ہونا ضروری ہے یا کہ دائیں بائیں بھی کہی جا سکتی ہے؟ نیز اگر پہلی صف کی بجائے صف سے آگے یا پیچھے کہی جائے تو کیا یہ صحیح ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

صف اول کی قید تو کہیں نہیں، البتہ کتب فقہ کے الفاظ "امام المنبر، عند المنبر اور بین یدی الخطیب" سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ اذان منبر کے سامنے اور قریب ہونا چاہئے، وصرح بہ القہستانی حیث قال واذا جلس الامام علی المنبر اذن ثانیا بین یدیہ ای بین الجہتین المسامتتین لیمین المنبر والامام ویسارہ قریبا منہ ووسطہما بالسکوت فیشتمل ما اذا اذن فی زاویۃ قائمۃ او حادۃ او منفرجۃ (جامع الرموز ص ۲۶۸ ج ۱) بہرحال قریب ہونا صف اول کو مستلزم نہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔ ۲۰ رمضان ۸۴ھ

جمعہ کی اذان ثانی مسجد کے اندر ہونا:

سوال: ابوداؤد میں حدیث ہے کان یؤذن بین یدی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا جلس علی المنبر یوم الجمعۃ علی باب المسجد اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جمعہ کی دوسری اذان بھی مسجد سے خارج ہونی چاہئے، نیز وہ اذان ذکر فی المسجد کی کراہت کا اطلاق بھی اس کو مقتضی ہے، اس کے باوجود یہ اذان منبر سے قریب کہنے کا عام دستور کیوں ہے؟ تحقیق سے مطلع فرمائیں۔ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

"بین یدی" بمعنی قریب استعمال ہوتا ہے، یہ معنی اس قدر معروف اور متبادر ہیں کہ اس کے لئے دلیل کی حاجت نہیں، معہذا امام لغت امام راغب رحمہ اللہ تعالیٰ کی تحقیق ملاحظہ ہو، فرماتے ہیں یقال ھذا الشئ بین یدیک ای قریبا منک (مفردات ص ۶۶ ج ۲) لہٰذا حدیث مذکور میں بین یدی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ نص ہیں کہ اذان بین یدی الخطیب کا توارث وتعامل خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہوا، اگر یہ الفاظ حدیث سے نہ بھی ثابت ہوتے تو بھی امت کا عمل متوارث ہی اس کے ثبوت پر حجت ہے۔

اس زمانہ میں مسجد نبوی زیادہ وسیع نہ تھی، عمدۃ القاری ص ۲۱۵ ج ۲ میں ہے کہ مسجد کے تین دروازے تھے، صحیح بخاری کی روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک دروازہ منبر کے سامنے تھا، عن ابی نمر انہ سمع انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ یذکر ان رجلا دخل یوم الجمعۃ من باب کان وجاہ المنبر ورسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قائم یخطب فاستقبل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الحدیث (بخاری ص ۱۳۷ ج ۱)

اور قرب باب کو علی الباب سے تعبیر کرنا معروف ہے، حاصل یہ کہ یہ اذان حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے مسجد
کے قریب ہوتی تھی، اور سامنے کی طرف مسجد کا دروازہ بھی قریب ہی تھا کیونکہ اولاً تو مسجد ہی زیادہ وسیع نہ تھی پھر یہ
دروازہ بھی صحن کا نہیں تھا بلکہ مسقف حصہ کا تھا اس لئے کہ صحن مسجد پر حائط ہی نہیں تھا جس میں دروازہ ہوتا کما
ھو ظاہر من روایۃ ابی داؤد عن ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کنت ابیت فی المسجد فی عہد رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وکنت فتی شابا عزبا وکانت الکلاب تبول وتقبل وتدبر فی المسجد فلم یکونوا
یرشون شیئا من ذلک، پس یہ مؤذن اس دروازہ سے بھی قریب ہوتا تھا یعنی منبر اور اس کے سامنے کے دروازہ
کے درمیان مسجد کے اندر اذان ہوتی تھی، وفی اعلاء السنن وفی العنایۃ وکان الطحاوی یقول المعتبر ھو
الاذان عند المنبر بعد خروج الامام فانہ ھو الاصل الذی کان للجمعۃ علی عہد رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم وکذلک فی عہد ابی بکر وعمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما (ص ۳۸ ج ۲) ونحوہ فی الکفایۃ
(ص ۳۸ ج ۲) فدل علی ان الاذان الثانی محلہ عند المنبر وھو المراد بین یدیہ وقال الشیخ واما ما
المحدث برلوی ان ھذا الاذان فہو استبعاد من الطحاوی وکونہ عند المنبر ھو نقل منہ وھو
مقصودنا بایرادہ اما اجتہادہ فلیس بحجۃ (اعلاء السنن ص ۔۔ ج ۸)

بالفرض یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ یہ اذان مسجد سے باہر ہوتی تھی تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت جمعہ
کے لئے صرف یہی ایک ہی اذان تھی اس لئے تبلیغ صوت کی خاطر مسجد سے خارج ہوتی تھی، حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ
کے زمانہ میں جب اذان اول کا اضافہ ہوا تو اذان ثانی میں غائبین تک تبلیغ صوت کی حاجت نہ رہی بلکہ اس سے
مقصد صرف تنبیہ حاضرین رہ گیا، چونکہ حاضرین مسجد کے اندر ہیں اس لئے ان کی خاطر اذان بھی مسجد کے اندر ہی
متعین کر دی گئی، فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۲۲ رمضان [illegible]ھ

خطبہ عید کی ابتداء وانتہاء میں مسلسل تکبیریں کہنا مستحب ہے:

سوال: بہشتی گوہر میں لکھا ہے کہ عیدین کے خطبہ میں پہلے تکبیر سے ابتداء کرے، اول خطبہ میں نو مرتبہ
اللہ اکبر کہے اور دوسرے میں سات مرتبہ،
مگر آج کل کہیں بھی اس کے مطابق عمل نہیں، صحیح مسئلہ کیا ہے؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

بہشتی گوہر کا مسئلہ صحیح ہے، پہلے خطبہ کی ابتداء میں نو بار اور دوسرے کی ابتداء میں سات بار اور بالکل
آخر میں چودہ بار مسلسل اللہ اکبر کہنا مستحب ہے، عام خطباء اس سے غافل ہیں، قال فی التنویر وشرحہ ویبدأ بالتکبیر فی
خطبۃ العیدین ویستحب ان یستفتح الاولی بتسع تکبیرات تتری والثانیۃ بسبع ویکبر قبل نزولہ من

المنبر اربع عشرۃ (رد المحتار ص۶۰۰ ج ۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۔ ۔ شوال سنہ ۹۸ھ

جمعہ پڑھنے کے بعد دوسری جگہ خطبہ پڑھ سکتا ہے:

سوال: ایک شخص جو کہ خود جمعہ پڑھ چکا ہو وہ دوسری جگہ خطبہ پڑھ سکتا ہے کہ نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

اس بارے میں صریح جزئیہ نہیں ملا البتہ چونکہ صحت خطبہ کے لئے یہ شرط نہیں کہ خطیب پر جمعہ فرض ہو، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسا شخص خطبہ پڑھ سکتا ہے، قال فی التنویر فلو خطب صبی باذن السلطان وصلی بالغ جاز هو المختار (رد المحتار ص۶۰۰ ج ۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۱۳ شعبان سنہ ۹۸ھ

خطبہ سے قبل وعظ کی رسم:

سوال: جمعہ کی نماز اور خطبہ سے پہلے وعظ کہنا جائز ہے یا نہیں؟ جیسا کہ عام مساجد میں ہوتا ہے۔

الجواب باسم ملہم الصواب

جائز ہے مگر اس میں ایک تو یہ قباحت ہے کہ خطبہ سے قبل وعظ کی وجہ سے پہلی اذان اور خطبہ کے درمیان بہت فصل ہوتا ہے اس لئے بہت سے لوگ اذان کے بعد بھی کاروبار میں مشغول رہتے ہیں جو حرام ہے، جمعہ کی پہلی اذان کے بعد فوراً مسجد جانے کی تیاری کرنا فرض ہے دوسرے سب کام حرام ہو جاتے ہیں، ایسے عوام کو حرام میں مبتلا کرنے کا سبب یہی وعظ کی رسم ہوئی جس کا وبال منتظمین مسجد پر ہوگا۔ دوسری قباحت یہ کہ اگر کوئی تحیۃ المسجد یا سنت کے علاوہ مسجد میں بیٹھ کر کوئی عبادت کرنا چاہے تو اس میں خلل واقع ہوتا ہے اس لئے بہتر یہ ہے کہ جمعہ کی نماز کے بعد وعظ کہا جائے جس کو سننے کی رغبت ہوگی بیٹھے گا۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲۰ صفر سنہ ۹۹ھ

عورتیں ظہر جمعہ سے قبل پڑھ سکتی ہیں:

سوال: عوام میں مشہور ہے کہ جب تک جمعہ کی نماز مسجد میں ختم نہ ہو جائے مستورات گھروں میں ظہر کی نماز نہ پڑھیں کیا شرعاً اس کی اصل ہے؟

بینوا توجروا

الجواب باسم ملهم الصواب

اس کی کوئی اصل نہیں، غلط ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

[illegible] رشوال [illegible]ھ

معذور کے لئے جمعہ سے تاخیرِ ظہر مستحب ہے:

سوال: اگر جیلیوں کو نمازِ جمعہ کی اجازت نہ ہو تو وہ ظہر کی نماز شہر میں جمعہ کی جماعت ہو جانے کے بعد پڑھیں یا پہلے بھی پڑھ سکتے ہیں؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملهم الصواب

جماعتِ جمعہ ختم ہونے کے بعد پڑھنا مستحب ہے، اس سے قبل مکروہ تنزیہی ہے، قال فی العلائیۃ: ویستحب للمریض تأخیرھا الی فراغ الامام وکرہ ان لم یؤخر ھو الصحیح، وفی الشامیۃ (قولہ ویستحب للمریض) عبارۃ القہستانی للمعذور وھی اعم (قولہ وکرہ) ظاہر قولہ ویستحب ان الکراہۃ تنزیہیۃ نہر وعلیہ فما فی شرح الدرر للشیخ اسمٰعیل عن المجتبیٰ من عدم الکراہۃ اتفاقا محمول علی نفی التحریمیۃ (رد المحتار ص [illegible] ج ۱)۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۵ر محرم ۹۱ھ

قضاء نماز کے بعد تکبیرِ تشریق کا حکم:

سوال: ایام تشریق کی قضاء شدہ نمازوں کو جب غیر تشریق میں قضاء کرے اور اسی طرح غیر ایام تشریق کی قضاء شدہ نمازوں کو ایام تشریق میں قضاء کرلے تو کیا اس پر تکبیرات واجب ہیں یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملهم الصواب

اس مسئلہ میں چار صورتیں ہیں، صرف ایک صورت میں تکبیرات تشریق واجب ہیں باقی تینوں صورتوں میں نہیں، ایام عید کی فائتہ اسی سال ایام عید میں قضاء کرے تو تکبیرات واجب ہیں، قال فی العلائیۃ: ولو قضی فیہا منہا من عامہ لقیام وقتہ کالاضحیۃ، وقال ابن عابدین رحمہ اللہ تعالیٰ: المسألۃ رباعیۃ فائتۃ غیر العید قضاھا فی ایام العید، فائتۃ ایام العید قضاھا فی غیر ایام العید، فائتۃ ایام العید قضاھا فی ایام العید من عام آخر، فائتۃ ایام العید قضاھا فی ایام العید من عامہ ذلک ولا یکبر الا فی الاخیر فقط کذا فی البحر الخ (رد المحتار ص [illegible] ج ۱)۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۱۰ر محرم [illegible]ھ

عید میں شافعی امام کی اقتدا میں بارہ تکبیریں کہے:

سوال: حج کے دنوں میں عیدین کی نماز کے موقع پر امام شافعی یا حنبلی ہوتا ہے تو بارہ تکبیریں کہتا ہے، جو مقتدی حنفی ہوں وہ امام کے خلاف چھ تکبیریں کہیں تو یہ جائز ہے؟ ان کی نماز ہو جاتی ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

حج میں عید الاضحیٰ کی نماز تو ویسے ہی نہیں ہوتی، مسئلہ صرف عید الفطر کا ہے، اس میں حنفی کو چاہیے کہ امام کے اتباع میں وہ بھی بارہ تکبیریں کہیں، بلکہ امام تیرہ تکبیریں کہے تو بھی اس کا اتباع کریں، البتہ اگر کوئی امام تیرہ سے بھی زیادہ تکبیریں کہے تو اس کا اتباع نہ کریں۔ قال فی العلائیۃ ولو زاد تابعہ الی ستۃ عشر لانہ ماثور، وفی الشامیۃ (قولہ الی ستۃ عشر) کذا فی البحر عن المحیط وفی الفتح یتابعہ الی ثلاث عشرۃ وقیل الی ستۃ عشر اھ الی قولہ لکن ہذا یؤید القول الاول ولذا اقتصر علیہ فی الفتح ونسب فی البدائع الی عامۃ المشائخ علی ان لم الخلاف الاصلیۃ الی الزوائد بسبب جمیعا لان القراءۃ فاصلۃ بینہما فافہم (رد المحتار ص [illegible] ج ۱)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲۷ صفر [illegible] ہجری

معذورین کے لئے بروز جمعہ جماعت ظہر مکروہ ہے:

سوال: جمعہ کے روز معذورین مصر میں نماز ظہر کی جماعت کر سکتے ہیں یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

مصر میں معذورین کے لئے نماز ظہر کی جماعت مکروہ تحریمی ہے، اس لئے وہ منفرداً نماز پڑھیں اور حالت انفراد میں بھی اذان واقامت نہ کہیں، قال العلائی رحمہ اللہ تعالیٰ وکرہ تحریما لمعذور ومسجون ومسافر اداء ظہر بجماعۃ فی مصر قبل الجمعۃ وبعدہا لتقلیل الجماعۃ وصورۃ المعارضۃ (رد المحتار ص [illegible] ج ۱)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۱۲ ربیع الاول [illegible]

بروز جمعہ معذور کے لئے ظہر کی اذان واقامت مکروہ ہے:

سوال: معذورین یوم الجمعۃ مصر میں ظہر کی نماز کے لئے اذان واقامت کہہ سکتے ہیں یا نہیں؟

بینوا بالبرہان توجروا عند الرحمٰن

الجواب باسم ملہم الصواب

بعض نے مستحب لکھا ہے مگر راجح یہ ہے کہ مکروہ ہے، قال ابن نجیم رحمہ اللہ تعالیٰ وفیہ

بالجماعۃ لما فی التتارخانیۃ ان المعذور یصلی الظہر باذان واقامۃ وان کان لا تستحب لہ الجماعۃ ا ھ (البحر الرائق ص ۱۵۲ ج ۲) وقال ابن عابدین رحمہ اللہ تعالیٰ (قولہ بغیر اذان واقامۃ) فالذی فی الزواجر ولا یصلی یوم الجمعۃ جماعۃ بمصر ولا یؤذن ولا یقیم فی سجن وغیرہ لصلاۃ الظہر اھ وقال فی الفتح وھذا الذی فی السراج معزیا الی جمع التفاریق من ان الاذان والاقامۃ غیر مکروھین۔ (رد المحتار ص ۷۶۰ ج ۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲۲ ربیع الاول ۹۱ھ

جوائی میں جمعہ کی تحقیق:

سوال: جواب فتوی وصول ہوا جس سے دل کو تشفی نہیں ہوئی، مزید تفصیل کی ضرورت ہے، پہلا جمعہ بحرین کے مقام جوائی میں ادا کیا گیا، اس کا شہر یا گاؤں ہونا اور کس سال میں پڑھا گیا؟ بحوالہ کتب تحریر فرمائیں۔ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

یہ خصم کا فرض ہے کہ جوائی کا قریہ صغیرہ ہونا ثابت کرے، مطلق لفظ قریہ سے استدلال صحیح نہیں، کیونکہ قرآن، حدیث اور لغت سے اس کا اطلاق مدینہ پر ثابت ہے، معہذا [illegible] نے تبرعاً جوائی کے شہر ہونے پر یہ دلائل پیش فرمائے ہیں: (۱) یہاں قلعہ تھا (۲) چار ہزار سے زیادہ آبادی تھی (۳) امرؤ القیس کے شعر سے ثابت ہوتا ہے کہ یہاں تجارتی منڈی تھی جس میں وسیع پیمانے پر تجارتی سامان کی خرید و فروخت ہوتی تھی۔

جوائی میں سن ۸ ہجری میں جمعہ قائم ہوا ہے کیونکہ تحقیق یہ ہے کہ وفد عبد القیس رضی اللہ تعالیٰ عنہ دو دفعہ آیا ہے، پہلے سنہ ۸ھ میں فتح مکہ سے قبل اور دوسری بار سنۃ الوفود یعنی سنہ ۹ھ میں (بذل المجہود ص ۱۰۵ ج ۳، لامع الدراری وغیرہما) بالفرض جوائی کا قریہ صغیرہ ہونا تسلیم بھی کر لیا جائے تو سوال یہ ہے کہ اتنی طویل مدت تک کسی اور قریہ میں جمعہ کیوں نہیں پڑھا گیا؟ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ نے فتح الباری ص ۱۷۷ ج ۸ میں جوائی سے وفد عبد القیس کی وفادۃ اولیٰ سنہ ۵ھ میں یا اس سے بھی قبل بتائی ہے، حالانکہ خود ہی اصابہ میں دو قول سنہ ۸ھ اور سنہ ۹ھ نقل فرمائے ہیں۔ فیض الباری میں وفادۃ اولیٰ سنہ ۶ھ میں اور ثانیہ سنہ ۸ھ میں تحریر ہے۔ فتح اور فیض کے ان اقوال کا کہیں ثبوت نہیں ملتا۔ بالفرض حافظ رحمہ اللہ تعالیٰ کا یہ قول جو تمام اہل سیر کے خلاف ہے تسلیم کر لیا جائے تو بھی اس اشکال سے مخلص نہیں کہ چار یا پانچ سال تک کسی اور قریہ میں جمعہ کیوں نہیں پڑھا گیا؟
فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲۰ ربیع الآخر ۹۱ھ

بوقت ہجرت قبا میں مدت قیام:

سوال: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قیام قبا میں کتب سیر میں مختلف روایتیں منقول ہیں، بخاری شریف میں دس یوم سے زیادہ اور احسن الفتاوی قدیم ص۲۷ میں چوبیس یوم منقول ہیں، الغرض علماء سیر مختلف ہیں، اصح روایت کونسی ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملهم الصواب

حافظ رحمہ اللہ تعالی نے چودہ روز کی روایت کو ترجیح دی ہے۔ فقط واللہ تعالی اعلم

۲۵ ربیع الآخر …ھ

بنی سالم میں ادائے جمعہ کی تحقیق:

سوال: کتب سیر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بنی سالم میں نماز جمعہ پڑھنا منقول ہے حضرت گنگوہی رحمہ اللہ تعالی اوثق العری میں لکھتے ہیں کہ یہ روایت صحیح نہیں بلکہ راوی کی غلطی ہے، اس کے متعلق اپنی رائے تحریر فرمائیں۔

الجواب باسم ملهم الصواب

یہ روایت اس لئے صحیح نہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بروز دوشنبہ قبا میں تشریف فرما ہوئے اور صحیح روایت کے مطابق وہاں چودہ روز قیام فرمایا تو قبا سے جمعہ کے روز مدینہ کی طرف خروج اور راستہ میں بنی سالم میں نماز جمعہ ادا فرمانا کیسے صحیح ہو سکتا ہے؟ قیام قبا سے متعلق بائیس اور چوبیس ایام کی بھی روایات ہیں، ان کے مطابق بھی یوم جمعہ میں خروج کا حساب صحیح نہیں بیٹھتا، بائیس اور چوبیس میں صورت تطبیق یہ ہے کہ یوم نزول و یوم خروج کو چھوڑ کر بائیس اور ان کو شامل کرکے چوبیس ایام ہیں، لہذا یوم جمعہ میں خروج کی تصحیح کے لئے یہ تاویل ممکن نہیں کہ چوبیس والی روایت میں یوم نزول و خروج کو شمار نہیں کیا گیا۔

علاوہ ازیں بنو سالم میں ادائے جمعہ کی روایت کے خلاف سیر کی دوسری روایت سے ثابت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بنو سالم پر گذر ہوا اور ان کے اصرار کے باوجود وہاں نزول نہیں فرمایا بلکہ اپنی اونٹنی کے متعلق فرمایا خلوا سبیلہا فانہا مأمورۃ۔ بالفرض بنی سالم میں ادائے جمعہ کی روایت صحیح تسلیم کرلی جائے تو یہ ہمارے خلاف نہیں اس لئے کہ بنی سالم مدینہ منورہ ہی کا ایک محلہ تھا۔ فقط واللہ تعالی اعلم

۲۵ ربیع الآخر …ھ

خطبہ میں ایسے تین مردوں کی حاضری شرط ہے جن سے جمعہ قائم ہوسکے:

سوال ① اگر امام نے تنہا خطبہ پڑھا یا صرف عورتوں اور بچوں کے سامنے خطبہ پڑھا تو یہ جائز ہے یا نہیں؟

② اگر ایک یا دو آدمیوں کے سامنے خطبہ پڑھے اور تین یا زیادہ آدمیوں کے ساتھ نماز پڑھے تو درست ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

① جائز نہیں، کیونکہ خطبہ جمعہ کے لئے امام کے علاوہ کم از کم تین مردوں کا ہونا ضروری ہے جن سے جماعت قائم ہوسکے، قال العلائی رحمہ اللہ تعالی: والخامس کونها قبلها لان شرط الشیء سابق علیه بحضرة جماعة تنعقد الجمعة بهم ولو کانوا صما او نیاما، فلو خطب وحده لم یجز علی الاصح کما فی البحر عن الظهیریة، وقال ابن عابدین رحمه الله تعالی: (قوله تنعقد الجمعة بهم) بان یکونوا ذکورا بالغین عاقلین ولو کانوا معذورین بسفر او مرض، وقال شارح التنویر رحمه الله تعالی بعد ورقتین: والسادس الجماعة واقلها ثلاثة رجال ولو غیر الثلاثة الذین حضروا الخطبة سوی الامام بالنص، لانه لا بد من الذاکر وهو الخطیب وثلاثة سواه بنص فاسعوا الی ذکر الله (رد المحتار ص [illegible])

② درست نہیں نماز۔ فقط واللہ تعالی اعلم

۲ جمادی الآخرة [illegible]

سوال متعلق بالا:

سوال: گزارش ہے کہ فتوی موصول ہوا، اس میں شبہ ہے تھوڑے وضاحت کی ضرورت ہے، اگر ایک یا دو آدمیوں کے سامنے خطبہ پڑھے اور تین یا زیادہ آدمیوں کے ساتھ نماز پڑھے تو درست ہے یا نہیں؟ عالمگیریہ میں خلاصہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ درست ہے، اس کا کیا جواب ہے؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

قال فی شرح التنویر وجوز فی الخلاصة بانه یکفی حضور واحد، وقال ابن العابدین رحمه الله تعالی مشی علیه فی نور الایضاح وقال فی شرحه انما اتبعناه لانه منطوق فیقدم علی المفهوم اه ای المفهوم من قولهم یشترط حضور جماعة انه لا یصح بحضور واحد وقول صاحب الخلاصة لو حضر واحد او اثنان وخطب وصلی بالثلاثة جاز منطوق، وفیه نظر فان جعل

(خانیة علی هامش الهندیة ص ۱۷۴ ج ۱) وقال ابن همام رحمه الله تعالى تصير فيها ثلاث سكك (فتح القدیر ص ۱۴ ج ۲) علامہ طحطاوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فیصلہ فرمادیا کہ بدون اقامت قریہ کا وجود نہیں ہوسکتا اور اقامت بدون چوتھی شرط معتبر نہیں، ابن ہمام رحمہ اللہ تعالیٰ کی عبارت سے معلوم ہوا کہ اجتماع سکنی جس کو معیار قرار دیا گیا ہے اس میں تین گلیاں تھیں، بلکہ ایسے مقام میں تو بالاجماع مذاہب اربعہ جمعہ صحیح نہیں، اقامت کی شرط بالاجماع ہے بلکہ ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ تعالیٰ کے ہاں تو اقامت سے بھی بڑھکر استیطان شرط ہے، قال العلامة الدردير رحمه الله تعالى: وشروطها خمسة اولها الاستيطان وهو اخص من الاقامة لانه الاقامة بقصد التابيد والاقامة اعم (الشرح الصغير ص ۱۷۳ ج ۱)۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲ جمادی الآخرۃ سنہ ۸۰ھ

نمازِ عید کے بعد تکبیر تشریق:

سوال: نمازِ عید کے بعد تکبیر تشریق کہنا جائز ہے یا نہیں؟ ایک مولوی صاحب نے عید کی نماز پڑھانے کے بعد لاؤڈ سپیکر پر تین بار اعلان کیا کہ نمازِ عید کے بعد تکبیر تشریق نہیں، کیا یہ صحیح ہے؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملهم الصواب

نماز کے بعد تکبیر تشریق بالاتفاق ثابت و جائز ہے، البتہ وجوب و استحباب میں اختلاف ہے، قول وجوب راجح ہے۔ مولوی صاحب نے اعلان سے قبل بہشتی زیور ہی کو دیکھ لیا ہوتا تو ایسی غلط بات نہ کہتے۔ قال في شرح التنوير ولا بأس به عقب العيد لان المسلمين توارثوه فوجب اتباعهم وعليه البلخيون، وقال ابن عابدين رحمه الله تعالى (قوله ولا بأس الخ) كلمة لا بأس قد تستعمل في المندوب كما في البحر من الجنائز والجهاد ومنه هذا الموضع لقوله فوجب اتباعهم (قوله فوجب) الظاهر ان المراد بالوجوب الثبوت لا الوجوب المصطلح عليه في البحر عن المجتبى والبلخيون يكبرون عقب صلاة العيد لانها تؤدى بجماعة فاشبهت الجمعة اه وهو يفيد الوجوب المصطلح عليه (رد المحتار ص ۷۸۶ ج ۱) وقال العلامة الرافعي رحمه الله تعالى (قوله الظاهر ان المراد بالوجوب الثبوت الخ) قال السندي رحمه الله تعالى عند قوله لان المسلمين توارثوه، ظاهره ان ذلك صنيع الصحابة رضي الله تعالى عنهم ومن بعدهم الى اعصارنا فقوله التكبير احد ولم يكن في عهد الصحابة رضي الله تعالى عنهم والا كانت سنة لانهم لا يبتدعون من انفسهم خلاف ظاهر عبارة الشرح وقال صاحب

قولہ فوجب اتباعہم ظاہرہ انہ یرید الوجوب المصطلح علیہ لا بمعنی الثبوت، فحاصل بالاباحۃ المستفادۃ من قولہ اولاً لا باس اھ (التحریر المختار ص ۲ ج ۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۱۵ ذی الحجہ سنہ ۹۹ھ

تحقیق حدیث لا جمعۃ ولا تشریق الا فی مصر جامع :

سوال : لا جمعۃ ولا تشریق ولا صلوٰۃ الفطر ولا اضحیٰ الا فی مصر جامع او مدینۃ عظیمۃ۔ یہ حدیث ہے یا حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اپنا قول ہے؟ اور کیسی حدیث ہے اور اس کی صحت کیسی ہے؟ یہ اثر حدیث مرفوع کے حکم میں ہے یا موقوف کے حکم میں؟ اور اس کی سند حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتی ہے یا نہیں؟ اس اثر کے متعلق صاحب ہدایہ کا موقف کیا ہے؟ غیر مقلدین حضرات کو اس کی صحت میں کلام ہے۔ اس کی تصحیح مع حوالہ کتب اشد ضروری ہے۔ بینوا بیانا شافیا توجروا اجرا وافیا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

یہ حدیث مرفوع ہے اگر کسی کو اس کے حقیقۃً رفع میں اشکال ہو تو حکماً مرفوع ہے، لانہ مما لا یدرک بالقیاس، اس کی سند پر اعتراض کرنا تعصب و تعنت ہے۔ قال فی اعلاء السنن عن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ انہ قال لا جمعۃ ولا تشریق الا فی مصر جامع اخرجہ ابو عبید باسناد صحیح الیہ موقوفا ومعناہ لا صلوٰۃ جمعۃ ولا صلوٰۃ عید کذا فی فتح الباری ورواہ عبد الرزاق فی مصنفہ انبأنا الثوری عن زبید الایامی عن سعد بن عبیدۃ عن ابی عبد الرحمن السلمی عن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال لا تشریق ولا جمعۃ الا فی مصر جامع کذا فی نصب الرایۃ وفی الدرایۃ اسنادہ صحیح وروی ابن ابی شیبۃ فی مصنفہ حدثنا جریر عن منصور عن طلحۃ عن سعد بن عبیدۃ عن ابی عبد الرحمن انہ قال قال علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فذکر اللفظ الاول واسنادہ صحیح کذا فی عمدۃ القاری وذکر الامام محمد [illegible] فی مبسوطہ ان ابا یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ ذکرہ فی الاملاء مسنداً مرفوعاً الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم وابو یوسف امام الحدیث حجۃ فیہ کذا فی البنایۃ ای فیکون رفعہ حجۃ لانہ زیادۃ من ثقۃ فتقبل۔

قولہ عن علی الا وقفت هذا الاثر له طریقان آخران ذکرهما الزیلعی فی نصب الرایۃ ص ۱۹۵ ج ۲، رواه عبد الرزاق فی مصنفه اخبرنا معمر عن ابی اسحاق عن الحارث عن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال لا جمعۃ ولا تشریق الا فی مصر جامع انتہی۔ ورواه ابن ابی شیبۃ فی مصنفه حدثنا عباد بن العوام عن حجاج عن ابی اسحاق عن الحارث عن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال لا جمعۃ ولا تشریق ولا صلوٰۃ فطر ولا اضحیٰ الا فی مصر جامع او مدینۃ عظیمۃ انتہی۔ قال بعض الناس فی الاسناد انہ لا تقوم بها حجۃ فانہ با اسحاق وهو عمرو بن عبد اللہ الهمدانی السبیعی مکثر

والاحتجاج بروایته مطلقا ثم قال بعض الناس فی حجاج بن ارطاة تقدم وهو مدلس اه قلت قد وثقه وحسن حدیثه فی غیر ما موضع من کتابه واما التدلیس فانما یجعل الحدیث الصحیح مختلفا فیه لا ضعیفا بالاتفاق فقد قال الحاکم الحدیث الصحیح ینقسم عشرة اقسام خمسة متفق علیها وخمسة مختلف فیها فذکر المتفق علیها ثم ذکر المختلف فیها وقال فیها المرسل واحادیث المدلسین اذا لم یذکروا سماعهم اه کذا فی تدریب الراوی (ص۶۳) وقد ذکرنا فی المقدمة ان الحق فیه حسن لا ضعیف وانکر بعض الناس هذا الاصل فی کتابه وقد فضحه ومن والاه بقولنا الاخلاف لا یضره فکیف یضعف الحدیث بسببه فهذا فی الحق ان الاسناد من حسان ولیس بضعیفین کما زعم والحجة بها قائمة ولا سیما لان روایة ابن ارطاة علی اختصاص تکبیر التشریق بالمصر صحیح کما هو اصل المذهب فافهم وفی عمدة القاری فان قلت قال النووی حدیث علی متفق علی ضعفه وهو موقوف علیه بسند ضعیف منقطع قلت کانه لم یطلع الا علی الاثر الذی فیه الحجاج بن ارطاة ولم یطلع علی طریق جریر عن منصور فانه سند صحیح ولو اطلع لم یقل ما قاله واما قوله متفق علی ضعفه فزیادة من عنده ولا یدری من سلفه فی ذلک علی ان ابا زید ذکر فی الاسرار ان محمد بن الحسن قال رواه مرفوعا معاذ وسراقة بن مالک رضی الله عنهما اه (ص۲۲۲ ج۳) قلت وکذا قال الامام ابو بکر الجصاص فی احکامه وروی عن النبی صلی الله علیه وسلم انه قال لا جمعة ولا تشریق الا فی مصر جامع وروی عن علی مثله اه (ص۲۹۴ ج۳) ولکن المرفوع لا یثبته المحدثون فانه مع ما ذکر محمد بن الحسن رحمه الله تعالی وما ذکره ابو زید فی الاسرار کان حجة لنا لان محمدا امام مجتهد وقوله حجة وکذا الجصاص ما ذکره خواهرزاده ان ابا یوسف رحمه الله تعالی رواه فی الاملاء مرفوعا مسندا کما هو الظاهر علی ان الموقوف فی مثله مرفوع حکما لکونه خلاف القیاس المستمر فی الصلوات فانها لا تختص بمکان دون مکان فان النبی صلی الله علیه وسلم جعلت لی الارض مسجدا وطهورا وهو حدیث صحیح اخرجه البخاری (ص۴۸ ج۱) فاقتصار علی رضی الله عنه علی نفی الجمعة فی بعض الاماکن وتخصیصها بالمصر انما هو لا یکون الا عن سماع اه (اعلاء السنن ص۲ ج۸)

فقط والله تعالی اعلم

۱۰ ذی الحجہ [illegible] ہجری

احتیاط الظہر کی حقیقت:

سوال: احتیاط الظہر کی کیا حقیقت ہے؟ احتیاط الظہر کب ایجاد ہوئی اور کس نے ایجاد

کی؟ احتیاط کے کیا معنی ہیں؟ کیا صحابہؓ اور ائمہ مجتہدین کے دور مبارک میں بھی اس کا ثبوت ملتا ہے، در صورت عدم ثبوت احتیاط الظہر کو بدعت سیئہ کہنا چاہئے یا نہیں؟ کتب حنفیہ میں بعض عدم جواز کے قائل اور بعض جواز کے قائل، علامہ شامی کا رجحان بھی جواز کی طرف معلوم ہوتا ہے امید ہے کہ قول فیصل تحریر فرمائیں گے۔ بینوا بالتفصیل توجروا بالاجر الجلیل.

الجواب باسم ملهم الصواب

احتیاط کا مطلب یہ ہے کہ اداء عبادت میں شبہۂ فساد سے احتراز کیا جائے، اس کی اصل حدیث سے ثابت ہے قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فمن اتقی الشبهات استبرأ لدینه وعرضه وقال لسودة بنت زمعة رضی اللہ تعالی عنها احتجبی من ابن زمعة لما رأی من شبهه بعتبة بن ابی وقاص۔ بوقت شبہۂ فساد تکرار عبادت کی نظائر فقہ میں موجود ہیں کالجمع بین الوضوء والتیمم عند وجود الماء المشکوك وایجاب رعی الاقل عند الشك فی عدد الرکعات مع ان فیه احتمال تکرار الرکعة وغیره فی الثالثة ومنه ما هو صوابه من ندب اعادة الصلوة عند توهم الفساد. پس احتیاط الظہر کا مطلب یہ ہوا کہ جہاں صحت جمعہ میں کسی وجہ سے شبہ ہو وہاں نماز جمعہ کے بعد احتیاطاً ظہر کی نماز بھی ادا کرلی جائے تاکہ اداء فرض کا یقین ہو جائے اور شبہۂ فساد باقی نہ رہے۔ صحت جمعہ میں شبہہ کی مندرجہ ذیل وجوہ بیان کی گئی ہیں:

① کچھ غیر معروف لوگوں کا کہنا ہے کہ عند الحنفیہ صحت جمعہ کے لئے وجود سلطان شرط ہے اس لئے وہ جہاں سلطان نہ ہو وہاں احتیاط الظہر کا حکم دیتے ہیں۔ ان کا یہ خیال صحیح نہیں اس لئے کہ وجود سلطان کی شرط صرف رفع نزاع کے لئے ہے اور جماعت مسلمین کی طرف سے امام جمعہ کا تعین اس مقصد کی تحصیل کے لئے کافی ہے نیز اگر وجود سلطان کو صحت جمعہ کی شرط قرار دیا جائے تو اس کے عدم سے عدم صحت متیقن ہوگی، اس صورت میں وہاں جمعہ ادا کر کے احتیاط الظہر کا کیا مطلب؟ صرف اداء ظہر ہی کا فتوی دینا چاہئے۔

② مذہب حنفی میں ایک روایت مرجوحہ یہ ہے کہ ایک شہر میں متعدد مقامات پر نماز جمعہ صحیح نہیں جو نماز یقیناً سب سے پہلے ہوئی صرف وہی صحیح ہوگی، بعد میں ہونے والی اور بیک وقت ہونے والی اور تقدم و تاخر میں اشتباہ کی حالت میں پڑھی ہوئی نمازیں صحیح نہیں، بحر و شامیہ وغیرہ میں قنیہ سے منقول ہے کہ اس روایت مرجوحہ کی بنا پر اہل مرو نے احتیاط الظہر کی ابتداء کی۔

فقہاء احناف کا اس میں اختلاف ہے، بعض نے اہل مرو کی تائید میں احتیاط الظہر کا قول کیا اور بعض ترک ظہر میں احتیاط کے قائل ہیں، مگر یہ اختلاف مفسدہ عارضہ سے قطع نظر پر مبنی ہے، فساد عقیدہ کی صورت میں

فی التنویر ویجب السعی الیها وترک البیع بالاذان الاول، وفی الشامیۃ اراد به کل ما ینافی السعی وخصه اتباعا للآیۃ نہر (رد المحتار ص ۷۶۶ ج ۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۹ جمادی الاولیٰ ۸۳ھ

قضا نماز اور عید میں ترتیب واجب نہیں:

سوال: جس نے فجر کی نماز نہ پڑھی اور عید کی نماز ادا کی تو نماز ہو گئی؟ اور عید سے پہلے فجر کی نماز قضا کرے تو صرف فرض پڑھے یا سنت بھی؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

قضا نماز اور عید کے درمیان ترتیب واجب نہیں، اس لئے عید کی نماز ہو گئی، اور عید سے قبل فجر کی قضا پڑھے تو فرض وسنت دونوں پڑھے خواہ نماز عید سے پہلے ہو یا بعد۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۲۶ ذی الحجہ ۸۶ھ

غسل جنابت سے غسل جمعہ کی سنت ادا ہو جائیگی:

سوال: جمعہ کے دن غسل جنابت صبح کیا تو کیا غسل مسنون پھر دوبارہ کرنا ہوگا یا یہی غسل کافی ہوگا؟ غسل مسنون کا بھی ثواب مل جائے گا۔ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

یہی کافی ہے دوبارہ غسل کی ضرورت نہیں بلکہ صفائی کا مقصد جمعرات کے دن غسل کرنے سے حاصل ہو جائے تو وہ بھی کافی ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۲۳ جمادی الاولیٰ ۹۲ھ

خطیب کو لقمہ دینا جائز نہیں:

سوال: اگر خطیب خطبہ میں غلطی کرے تو فتح دینا چاہئے یا نہیں؟ بصورت اولیٰ فتح دینا لازم ہے یا غیر لازم ہے بلکہ سنت یا مستحب ہے؟ نیز فتح اس وقت دے کہ خطیب بالکل خطبہ میں بند ہو جائے یا اس وقت میں بھی فتح دینا چاہئے کہ بہت غلط پڑھے، اور یہ بھی واضح فرما دیں کہ اگر خطیب فرض خطبہ پڑھ کر بعد میں بند ہو گیا تو اب فتح دینا ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

چونکہ خطبہ میں کوئی متعین مضمون پڑھنا ضروری نہیں بلکہ ایک مضمون میں خطیب رک گیا تو دوسرا پڑھ سکتا ہے، لہذا لقمہ دینے کی ضرورت نہیں اور حالت خطبہ میں ہر قسم کا تکلم ناجائز ہے اس لئے لقمہ دینا بھی ناجائز ہو۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۱۸ ذی الحجہ ۹۳ھ

بوقت خطبہ ہاتھ میں عصا لینا :

سوال : خطبہ کے وقت خطیب کا ہاتھ میں عصا لینا کیسا ہے ؟ سنت ہے یا بدعت ؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

اس سے متعلق عبارات فقہ مختلف ہیں، صورت تطبیق یہ ہے کہ فی نفسہ سنت غیر مؤکدہ ہے مگر اس کا التزام واصرار مکروہ وبدعت ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۳ رشعبان ۸۷ھ

تکبیر تشریق ایک بار سے زیادہ کہنا :

سوال : فرض نماز کے بعد تکبیر تشریق ایک مرتبہ سے زیادہ کہنا جائز ہے یا خلاف سنت ؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

بعض خلاف سنت فرماتے ہیں اور بعض جائز، اختلاف سے بچنے کے لئے ایک بار سے زیادہ نہیں کہنا چاہیے، فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔ ۱۴ ذی الحجہ ۹۲ھ

سوال مثل بالا : تکبیر تشریق کتنی مرتبہ پڑھنا واجب ہے، ایک مرتبہ یا تین مرتبہ ؟ کنز الدقائق میں ہے کہ ایک مرتبہ پڑھنا واجب ہے لیکن اگر ایک مرتبہ سے زیادہ کہہ دے تو فضل ہے، فضل کا کیا مطلب ہے ؟ کیا اس سے تین مرتبہ کی سنیت یا استحباب یا وجوب ثابت ہوتا ہے یا نہیں ؟ اگر کوئی شخص تکبیر تشریق تین مرتبہ کہنے کو ضروری سمجھے تو عند الشرع یہ شخص گنہگار ہوگا یا نہیں ؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

کنز الدقائق میں لفظ فضل نہیں بلکہ یہ عینی کا قول ہے، راجح یہ ہے کہ ایک بار سے زیادہ کہنا خلاف سنت ہے، تین بار تکبیر کو ضروری سمجھنے والا شخص گنہگار اور مبتدع ہے، اس پر اس بدعت سے توبہ کرنا فرض ہے۔ قال فی التنویر ویجب تکبیر التشریق مرۃ وفی الشرح وان زاد علیہا یکون فضلا قالہ العینی، وفی الحاشیۃ افاد ان قولہ مرۃ بیان للواجب لکن ذکر ابو السعود ان الحموی نقل عن القراماني ان الاتیان بہ مرتین خلاف السنۃ اھ قلت فی الاحکام عن البرجندی ثم المشہور من قول علمائنا انہ یکبر مرۃ وقیل ثلاث مرات (رد المحتار ص ۷۸۶ ج ۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۷ رجب ۱۳۹۳ھ

نمازِ عید میں مسبوق تکبیرات کس وقت کہے؟

سوال: تکبیراتِ زوائد کے بعد اگر کوئی شخص نمازِ عیدین میں امام کے ساتھ رکوع میں شریک ہو تو یہ تکبیرات کس وقت کہے؟ اور اگر کوئی دوسری رکعت یا تشہد میں شریک ہوا تو وہ تکبیر کس وقت کہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

تکبیر تحریمہ کے بعد تکبیرات زوائد کہہ لے اگرچہ امام قراءت شروع کر چکا ہو اور اگر مقتدی نے امام کو رکوع میں پایا تو تکبیرات کہہ کر رکوع میں جائے، البتہ اگر امام کے ساتھ رکوع میں نہ ملنے کا خطرہ ہو تو رکوع میں بدون ہاتھ اٹھائے تکبیرات کہے، اگر تکبیرات کی تکمیل سے پہلے امام رکوع سے اٹھ گیا تو بقیہ تکبیریں ساقط ہو جائیں گی، اور اگر دوسری رکعت میں شامل ہوا تو امام کے سلام کے بعد اٹھ کر جو رکعت پڑھے گا اس میں قراءت کے بعد رکوع سے پہلے تکبیرات کہے، اور اگر تشہد میں شریک ہوا تو بعینہ اسی طرح دو رکعتیں تکبیرات کے ساتھ پڑھے جس طرح امام کے ساتھ پڑھی جاتی ہیں، قال فی العلائیۃ: ولو أدرک المؤتم الامام فی القیام بعد ما کبر کبر فی الحال برأی نفسہ لأنہ مسبوق ولو سبق برکعۃ یقرأ ثم یکبر لئلا یتوالی التکبیرات. وفی الشامیۃ: (قولہ فی القیام) أی الذی قبل الرکوع أما لو أدرکہ راکعا فإن غلب علی ظنہ إدراکہ فی الرکوع کبر قائما برأی نفسہ ثم رکع وإلا رکع وکبر فی رکوعہ خلافا لأبی یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ ولا یرفع یدیہ لأن الوضع علی الرکبتین سنۃ فی محلہ والرفع لا فی محلہ وإن رفع الامام رأسہ سقط عنہ ما بقی من التکبیر لئلا تفوتہ المتابعۃ ولو أدرکہ فی قیام الرکوع لا یقضیہا فیہ لأنہ یقضی الرکعۃ مع تکبیراتہا، فتح وبحر (ردالمحتار ص ۷۸۱ ج ۱)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۸/ محرم سنہ [illegible] ھ

صرف عورتیں جمعہ و عید نہیں پڑھ سکتیں:

سوال: صرف عورتیں جمعہ اور عیدین کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کر سکتی ہیں یا نہیں؟ نیز تراویح کا کیا حکم ہے؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

صرف عورتیں جمعہ و عید کی نماز باجماعت ادا نہیں کر سکتیں اور تراویح میں صرف

عورتوں کی جماعت مکروہ تحریمی ہے قال فی الدر المختار فی مبحث الجمعۃ والسادس الجماعۃ واقلہا ثلاثۃ رجال، وفی الشامیۃ قولہ واقلہا ثلاثۃ رجال (الی قولہ) واحترز بالرجال عن النساء والصبیان فان الجمعۃ لا تصح بہم وحدہم لعدم صلاحیتہم للامامۃ فیہا بحال بحر عن المحیط (رد المحتار ص۶۰۰ ج۱) وفی عیدین العلائیۃ تجب صلوتہما فی الاصح علی من تجب علیہ الجمعۃ بشرائطہا المتقدمۃ سوی الخطبۃ فانہا سنۃ بعدہا (رد المحتار ص۶۱۱ ج۱) وفی امامۃ العلائیۃ ویکرہ تحریما جماعۃ النساء ولو فی التراویح (رد المحتار ص۵۲۸ ج۱)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۱۲ ذی قعدہ سنہ ۸۳ھ

بحالت خطبہ تحیۃ المسجد پڑھنا جائز نہیں:

سوال: دوران خطبہ حدیث سلیک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نماز پڑھنے کا جواز معلوم ہوتا ہے دیگر احادیث کا تعارض ہے، تطبیق یا ترجیح کی کیا صورت ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

صورت تطبیق یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر تشریف لے گئے تھے مگر ابھی خطبہ شروع نہیں فرمایا تھا، خطبہ سے قبل حضرت سلیک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دو رکعت پڑھنے کا ارشاد فرمایا، علاوہ ازیں ممکن ہے کہ یہ واقعہ خطبہ میں حکم انصات سے قبل کا ہو۔

صورت ترجیح یہ کہ حدیث سلیک رضی اللہ تعالیٰ عنہ خبر واحد ہے، اور حدیث ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اذا قلت لصاحبک انصت والامام یخطب، فقد لغوت، مشہور بلکہ قریبا متواتر ہے، خبر واحد حدیث مشہور سے معارضہ کی صلاحیت نہیں رکھتی، جب حالت خطبہ میں نہی عن المنکر کا فرض ادا کرنے کی بھی اجازت نہیں تو نفل کی اجازت کیسے ہو سکتی ہے؟

اس کی مفصل تحقیق میرے رسالہ "نیل المرام بالتزام السکوت عند قراءۃ الامام" مندرجہ احسن الفتاویٰ جلد سوم" ص ۴۳ تا ص ۵۰ میں ہے، فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۸ ربیع الآخر سنہ ۱۴۰۲ھ

رائے ونڈ کے قریب تبلیغی اجتماع میں نماز جمعہ:

سوال: قصبہ رائے ونڈ کے قریب جہاں تبلیغی اجتماع ہوتا ہے وہ اندازاً ڈیڑھ دو میل کے فاصلہ پر واقع ہے، اور درمیان میں کھیت وغیرہ بھی حائل ہیں، اور وہاں نماز جمعہ

قائم کی جاتی ہے، سوال یہ ہے کہ یہ جگہ فناءِ مصر میں شمار ہوتی ہے یا کہ خود اس جگہ کو شہر سمجھا جائیگا؟ احقر کے دل میں کافی دنوں سے خلجان ہے، امید ہے کہ جواب سے تسلی ہو جائیگی، بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

تبلیغی اجتماع کے لئے ایسا میدان حوائجِ مصر میں داخل ہے، اس لئے یہ جگہ فناءِ مصر میں داخل ہے، اور فناء میں صحتِ جمعہ کے لئے مصر سے اتصال ضروری نہیں، اور فصل مزارع مانع نہیں، لہٰذا یہاں جمعہ صحیح ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

(تفصیل سوال کی بناء پر جواب مختصر ہے) یوم الجمعہ [illegible]

کراہتِ اطالۂ خطبہ کی مقدار:

سوال: الرابع عشر: تخفیف الخطبتین بقدر سورۃ من طوال المفصل (ھندیہ) اس عبارت کا کیا مطلب ہے؟ کیا ہر ایک خطبہ اتنا طویل ہو؟ یعنی اول خطبہ بھی مقدار سورت طوال ہو اور ثانی خطبہ بھی مقدار طوال ہو یا دونوں خطبے مل کر مقدار ایک سورت طوال مفصل ہوں؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

سوال میں مذکور ہندیہ کی عبارت اور علائیہ کے جزئیہ "وتکرہ زیادتہما علی قدر سورۃ من طوال المفصل" سے ثابت ہوتا ہے کہ دونوں خطبوں کی مجموعی مقدار مراد ہے، عبارت علائیہ سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ طوال مفصل میں سے سب سے چھوٹی سورت کی مقدار پر زیادتی مکروہ ہے، مگر عبارت ہندیہ سے ثابت ہوا کہ سب سے بڑی سورت مراد ہے، ویؤیدہ ما نقلہ ابن عابدین رحمہ اللہ تعالیٰ عن القہستانی و زیادۃ التطویل مکروھۃ (رد المحتار ص [illegible]) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۴ ربیع الاول ۱۴۰۲ھ

خطبہ میں ذکر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ:

سوال: حضرت مولانا دوست محمد قریشی رحمہ اللہ تعالیٰ اور حضرت مولانا عبد الستار تونسوی مدظلہ نے جو خطبات شائع کئے ہیں جن میں سیدہ فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے علاوہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بقیہ تین صاحبزادیوں کے نام بھی درج ہیں، اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں سے باقی صحابہ کے ساتھ حضرت سیدنا معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا نام بھی درج ہے، یہ خطبات جمعہ میں پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز ہے تو صرف مباح کی حد تک یا موجب ثوا

کے پیشِ نظر افضل و مؤکد ہے؟ اگر یہ جائز و افضل ہے تو ہمارے علماء دین متقدمین و متاخرین میں جو خطبات مروّج تھے اُن میں مندرجہ بالا نام کیوں درج نہیں تھے؟ نیز یہ کہ ان خطبات کے اکابر سلف صالحین مثلاً حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے مسلک سے انحراف تو لازم نہیں آئے گا؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

ہر زمانہ میں خطبہ کے مضمون کی ترتیب میں اسلام میں پیدا ہونے والے فتنوں کے مسلکِ اہلِ سنت کی حفاظت کا اہتمام کیا گیا ہے، چنانچہ حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے اسماءِ مبارکہ اور ان کے لئے دعاء، اور ان کے مناقب خطبہ میں لانے سے روافض و خوارج کی تردید اور مسلکِ اہلِ سنت کا اعلان مقصود ہے، سابق زمانہ میں جو فتنے تھے ان کی تردید کے لئے انہی صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا ذکر کافی تھا، جو مطبوعہ خطبوں میں مذکور ہیں، جدید دور کا ایک جدید فتنہ ایک ایسی جماعت کا ظہور ہے جو اہلِ سنت ہونے کی مدعی ہے اور حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے عقیدت کا دعویٰ کرتی ہے، مگر قلوب بعض صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے مسموم ہیں، بالخصوص حضرت عثمان اور حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے متعلق ان کے قلوب کی نجاست اُن کی زبان و قلم سے مسلسل اُبل رہی ہے، مسلکِ اہلِ سنت میں کسی صحابی سے متعلق ادنیٰ سے ادنیٰ بدگمانی کی بھی کوئی گنجائش نہیں، کسی بھی صحابی کے بارے میں ذرا سی بدگمانی بھی اللہ تعالیٰ کے غضب اور جہنم کی موجب ہے، اس لئے یہ لوگ اہلِ سنت سے خارج ہیں اور روافض ہی کی راہ پر چل رہے ہیں، نیز روافض کو حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے سوا دوسری بنات مکرمات سے بھی بغض ہے، اس لئے اُن فتنوں کی تردید کے پیشِ نظر خطبہ میں حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور بنات مکرمات رضی اللہ تعالیٰ عنہن کے مناقب و فضائل کا ذکر اور ان کے لئے ترضّی کا معمول بنانا چاہئے، اس سے حضرت تھانوی قدس سرہٗ اور دوسرے اکابر رحمہم اللہ تعالیٰ کے مسلک سے انحراف لازم نہیں آتا بلکہ ان کے مسلک کی تائید ہوتی ہے، اس لئے کہ اُن کے خطبات جس نظریہ پر مبنی ہیں اُن میں یہ اضافہ بھی اُسی نظریہ کے تحت کیا گیا ہے جس کی تفصیل اوپر بتائی جا چکی ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۲۹ ربیع الآخر سنہ ۱۴۰۲ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نُودِيَ لِلصَّلَاةِ مِنْ يَوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ

النخبة

في

مسألة الجمعة والخطبة

- گاؤں میں جمعہ صحیح نہیں
- خطبہ غیر عربی میں جائز نہیں
- جمعہ فی القریٰ باذن حاکم کی تحقیق
- مخدوم ٹھٹھوی رحمہ اللہ تعالیٰ اور جمعہ فی القریٰ
- مخدوم سیوستانی رحمہ اللہ تعالیٰ اور جمعہ فی القریٰ
- سندھ میں اصلاح جمعہ فی القریٰ کی ایک کوشش
- جمعہ فی القریٰ سے متعلق ایک کتاب پر تقریظ
- جمعہ فی القریٰ کے لئے مذہب غیر ترجیح
- اتباع ہوی کے لئے حیلہ اذن حاکم
- جمعہ فی القریٰ سے متعلق اثر زہری کا جواب

خطبہ غیر عربی میں اور جمعہ غیر مصر میں جائز نہیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وکفیٰ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ اما بعد یہ رسالہ مجموعہ ہے دو سوالوں کے جواب کا جو بوجہ ضروری و مفید ہونے کے شائع کیا جاتا ہے۔ سوال اول کا جواب برادرم مولانا محمد خلیل صاحب اور سوال ثانی کا جواب بندہ رشید احمد عفا اللہ عنہ کی طرف سے ہے۔ واللہ الموفق للصواب والھادی الیہ من اناب۔

سوال اول۔ کیا واقعی جمعہ کے لئے شہر خاص ہے دیہات میں جمعہ کیوں نہیں ہوتا؟

سوال ثانی۔ شریعت مطہرہ کا اس بارے میں کیا حکم ہے کہ خطبہ جمعہ عربی کے سوا دوسری کسی زبانوں میں پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو جب خطبہ کا مقصود وعظ ہے تو عربی زبان سے ناواقف لوگوں کے سامنے عربی میں پڑھنے سے کیا فائدہ؟ بینوا بالبرھان تؤجروا عند الرحمٰن۔

جواب سوال اول

حامداً ومصلیاً ومسلماً۔ سائل کا یہ کہنا کہ جمعہ دیہات میں کیوں نہیں ہوتا ایسا ہی ہے جیسے کہا جائے کہ حج کراچی میں کیوں نہیں ہوتا، جیسے شریعت مطہرہ نے حج کے لئے مکہ اور اعتکاف کے لئے مسجد کی تعیین کی ہے اسی طرح جمعہ کے لئے بھی شہر خاص ہے۔ قرآن وحدیث وفقہ حنفی ثبوت جمعہ فی القریٰ سے ساکت بلکہ نافی ہیں۔ آیت یا ایھا الذین آمنوا اذا نودی للصلوٰۃ الخ اولاً تو عموم احکام سے ساکت ہے۔ دوسرے یہ قضیہ مہملہ ہے جو حکم میں جزئیہ کے ہوا کرتا ہے۔ تیسرے اس میں موصول عہد کے لئے یا جنس کے لئے ہے استغراق نہیں۔ و ذلک لان تعریف الذی من بین الموصولات کتعریف ذی اللام فی کونہ للعہد تارۃ وللجنس اخریٰ (معانی الکشاف ج۱ ص۱۲.) مکہ ہی میں فرضیت جمعہ ہو جانا اور آیت کا مدنی ہونا، نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بوقت ہجرت (حسب روایت بخاری [illegible]) چودہ یوم یا کم از کم قباء میں قیام فرمانا اور بالاتفاق وہاں جمعہ نہ خود پڑھنا اور نہ امر فرمانا موصول کے عہدی ہونے پر قرینہ قویہ ہے جس سے مراد صرف شہری مسلمان ہیں۔ نیز بوقت نزول اگر نداء تھی تو اذ نودی کا مدلول اول اذان بین یدی الخطیب ہے۔ پہلی اذان حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں بڑھائی گئی۔ گو علماء فقہاء کرام رحمہم اللہ تعالیٰ نے اس کو بھی نودی کا مدلول قرار دیا ہے۔ تو اول مطلب یہ ہوا کہ اے مومنین جب اذان بین یدی الامام پڑھی جائے تو ذکر اللہ کی طرف آؤ تو ظاہر ہے

کہ خطبہ کی اذان سن کر دیہات کے لوگ پہنچ سکتے ہیں جو کہ مسکن میں حاضر رہتے ہوں اور یہ عادت شہریوں
کی ہے کہ بوجہ مشغلۂ تجارت وغیرہ اکثر شہر میں ہی رہ کر کام کرتے ہیں۔ بخلاف اہل دیہات کے
کہ بوجہ اکثریت پیشۂ زراعت ورعی غنم وغیرہ ان کو مسکن سے باہر نکل کر کام کرنا پڑتا ہے۔ اس
قرینہ کی تائید وذروا البیع سے بھی ہوتی ہے۔ مذکورہ بالا قرائن کی وجہ سے آئمۂ ثلاثہ میں سے کوئی
فرد بھی جمعہ کی فرضیت مثل ظہر کے تسلیم کرتے ہوئے ہر فرد (مقیم ومسافر مریض وصحیح عبد وحر) پر
قرار نہیں دیتا۔ جس مقام میں بھی آدمی مقیم ہوں وہاں بالاتفاق ان پر جمعہ فرض نہیں (فیض الباری ج ۲)
لہٰذا موصول کا عہدی ہونا اور زیادہ مؤکد ہو گیا۔ دلائل حنفیہ میں سے بخاری ص ۱۲۳ ج ۱ میں ہے عن
عائشة رضی اللہ تعالیٰ عنہا زوج النبی صلی اللہ علیہ وسلم قالت کان الناس ینتابون الجمعة
من منازلهم ومن العوالی الحدیث۔ نیز بخاری ج ۱ ص ۱۲۲ میں ہے۔ عن ابن عباس رضی اللہ
تعالیٰ عنہما انہ قال ان اول جمعة جمعت بعد جمعة فی مسجد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی مسجد عبد القیس
بجواثی من البحرین الحدیث۔ پہلی حدیث سے تعامل زمانہ نبوی کا یہی معلوم ہوتا ہے کہ دیہاتی
لوگ باری باری شہر مدینہ ہی میں آکر جمعہ پڑھا کرتے تھے اور دیہات میں موجود رہنے والے صرف
ظہر پڑھتے تھے۔ کیونکہ مسجد نبوی کے بعد پہلا جمعہ تو جواثی[عه] میں ہوا ہے کما فی الحدیث الثانی۔ علامہ
ابن حجر عسقلانی حدیث عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے تحت قرطبی کے قول کو جو مخالف حنفیہ ہے رد
کرتے ہوئے فرماتے ہیں: وفیہ نظر لانہ لو کان واجبا علی اهل العوالی ما تناوبوا ولکانوا یحضرون
جمیعا (فتح الباری ج ۲ ص ۳۰۹)

نیز قبا میں نہ خود جمعہ پڑھنا اور نہ امر فرمانا، اسی طرح حجۃ الوداع میں عرفات میں بجائے
جمعہ کے ظہر پڑھنا پڑھوانا اور منیٰ میں عیدین نہ پڑھنا بھی حنفیہ کے دلائل میں سے ہے۔ نیز صحابہ
کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا امصار میں منابر قائم کرنا اور گاؤں میں جمعہ کا ارادہ نہ فرمانا بھی اس
امر کی بیّن دلیل ہے۔ آثار السنن جلد دوم میں صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے مفصل آثار
ملاحظہ ہوں۔ کتب اصول مذہب ظاہر الروایہ میں مصرح ہے کہ امامنا الاعظم حضرت امام
ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک محل اداء جمعہ مصر جامع ہے اور جامع کی تعریف میں گو فقہاء
رحمہم اللہ کے اقوال مختلف ہیں مگر ترجیح وہ ہے جو امام ابو یوسف رحمہ اللہ سے منقول ہے اور عرف کے

عه وفی حدیث عبد القیس بیان ہے کہ مسجد میں آپ جمعہ ۔۔۔ جس سے ثابت ہوا کہ اس سے قبل سوائے مسجد نبوی کے کہیں بھی جمعہ
نہ ہوتا تھا ۱۲ رشید احمد

قریہ ہونیکے علاوہ قدر مشترک ہونے کی حیثیت سے بھی اسے حدِ مصر قرار دیا جا سکتا ہے اس لیے
کہ عدد واحد ہو اگر قی ہے اور رسوم و علامات میں تعدد بھی جائز ہے۔ لہٰذا وہ تعریف جو بنایہ میں
امام رحمہ اللہ سے منقول ہے بوجہ صلاحیت حد و قربیت الی العرف و منقولیت از امام رحمہ اللہ
ہونے کے وہی راجح ہے۔ وہ یہ ہے۔ عن ابی حنیفۃ رحمہ اللہ تعالیٰ کل بلدۃ فیہا سکک
واسواق ووال ینصف المظلوم من ظالمہ ای یقدر علی انصافہ وعالم یرجع الیہ فی الحوادث
کذا فی النہایۃ (تعلیق آثار السنن ص۹۴) شہر کا مدار اگر عرف پر رکھا جائے تو اس سے صحابہ کرام
رضوان اللہ علیہم اجمعین بلکہ خود حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تجہیل لازم آئے گی نعوذ باللہ من
ذلک مرارًا۔ اس لئے کہ آپ نے اور صحابہ کرام نے انہی مقامات کو شہر قرار دیا جن کو عرف
میں شہر کہتے تھے حالانکہ وہاں مساجد موجود نہ تھیں بلکہ خود تعمیر کی گئیں۔ فریق مخالف کی ادلہ
میں سے جواثی والی حدیث ہے۔ جواثی کا قریہ ہونا ثابت اور نہ ہی وہاں کے جمعہ کی اطلاع
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہونا ثابت۔ قریہ کا لفظ بلد پر بھی اطلاق کیا جاتا ہے کما فی قصۃ
خضر و موسیٰ علیہما السلام۔ "جمعوا حیثما کنتم" حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا فرمان
اپنے نائبین حکام کی طرف ہے۔ حکام اکثر شہروں میں ہی مقیم ہوتے ہیں تو مطلب یہ ہوا کہ
"جمعوا حیثما کنتم من الامصار" جس طرح ہم نے مرفوع حدیث سے استدلال کیا ہے مخالف
کو بھی اسی قسم کی دلیل پیش کرنا چاہیئے۔ مرفوع کے مقابلہ میں موقوف کام نہیں دے گی۔ اس
قسم کے آثار کا تفصیلی جواب ملاحظہ ہو (۱) عینی شرح بخاری طبع استنبول ج۳ ص ۲۳۶،
(۲) آثار السنن طبع پٹنہ ج۲ ص ۸۳ (۳) بذل المجہود طبع نامی میرٹھ ج۲ ص ۱۷۰۔ فقط

حررہ احقر محمد عقیل غفرلہ

ابن مولانا محمد حکیم صاحب لدھیانوی ثم السندی

جواب سوال ثانی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خطبہ جمعہ وعیدین وغیرہ کا عربی میں ہونا سنت اور اس کے خلاف دوسری زبانوں میں
پڑھنا بدعت ہے (مصفی شرح موطا للشاہ ولی اللہ و کتاب الاذکار للنووی و در مختار باب

عہ مکہ مکرمہ کو ام القریٰ فرمایا گیا اور مکہ و طائف کو "رجل من القریتین عظیم" میں قریہ کا اطلاق کیا گیا، قریہ کے
معنی بھی مطلق اجتماع کے ہیں، بخلاف تعریف الامام رحمہ اللہ تعالیٰ ۱۲ رشید احمد

مستزاد الصلوٰۃ وشرح الاحیاء للزبیدی، غیر عربی میں خطبہ جائز رکھنے والوں کی بڑی بنا عقلی یہ ہے کہ خطبہ تذکیر ہے اور تذکیر مخاطبین کی زبان میں ہونا چاہیئے ورنہ عبث ہے۔ اسکا ایک تحقیقی جواب ہے اور ایک الزامی۔

تحقیقی جواب ۔ اس کا تذکیر ہونا مسلم نہیں۔ خود قرآن وحدیث میں اس کو ذکر فرمایا گیا ہے فاسعوا الی ذکر اللہ وذروا البیع۔ حدیث میں ہے فاذا خرج الامام حضرت الملائکۃ یستمعون الذکر (بخاری ج ۱ ص ۱۲۱) فاذا خرج الامام طووا صحفہم ویستمعون الذکر (بخاری ج ۱ ص ۱۲۷) اور شمس الائمہ سرخسی فرماتے ہیں وھذا لان الخطبۃ ذکر ونحوہ (کتاب المبسوط للسرخسی ج ۲ ص ۲۹) ولا ینبغی للامام ان یتکلم فی خطبتہ بشیء من حدیث الناس لانہ ذکر منظوم (المبسوط للسرخسی مصری ج ۲ ص ۲۷) مذکورہ بالا آیت اور روایات وعبارات سے معلوم ہوا کہ خطبہ ذکر ہے تذکیر نہیں الا تبعاً۔ علاوہ ازیں مختلف قرائن خطبہ کے صرف ذکر ہونے پر صریح دال ہیں۔

① امام صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک خطبہ میں صرف تحمیدہ واحدہ یا تسبیحہ واحدہ کافی ہے (مبسوط مصری ج ۲ ص ۳۰) حالانکہ تحمیدہ واحدہ یا تسبیحہ واحدہ سے تذکیر حاصل نہیں ہوتی۔

② خطبہ باتفاق فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ شرائط جمعہ میں سے شمار کیا گیا ہے۔ نقل العلامۃ ابن الہمام فی فتح القدیر الاجماع علی اشتراط نفس الخطبۃ (بحر ج ۲ ص ۱۵۵) اگر خطبہ کا مقصد وعظ و تبلیغ ہی ہوتا تو جمعہ کے شرائط میں داخل کرنے کے کوئی معنے نہ تھے کہ ادائے جمعہ اس پر موقوف ہو جائے

③ خطبۂ جمعہ کے لئے وقت ظہر ہونا شرط ہے کما فی عامۃ الکتب والفاظ البحر لانہ (ای وقت الظہر) شرط حتی لو خطب قبلہ وصلی فیہ (ای فی وقت الظہر) لم تصح (بحر ص ۱۵۵) اگر خطبہ کا مقصد ذکر محض نہیں بلکہ وعظ و تبلیغ مقصود ہے تو وقت ظہر کی کیا تخصیص؟ اگر زوال سے پہلے کوئی خطبہ پڑھ لے اور نماز بعد زوال پڑھے تو کیا مقصود وعظ حاصل نہ ہوگا؟ حالانکہ فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ اس صورت میں جمعہ ہی کو غیر صحیح قرار دیتے ہیں۔

④ صحت خطبہ کے لئے صرف پڑھ دینا کافی ہے کسی کا سننا ضروری نہیں۔ اگر چند بہرے آدمیوں کے سامنے یا سوئے ہوئے لوگوں کے سامنے خطبہ پڑھ دیا گیا اور پھر نماز جمعہ پڑھی تو خطبہ ادا ہو گیا اور نماز جمعہ صحیح ہو گئی کما فی البحر والدر ولو کانوا صماً او نیاماً۔ اگر مقصود خطبہ وعظ و

تذکیر ہے تو صورت مذکورہ کے جواز کی کوئی صورت نہیں ہو سکتی۔

⑤ اگر پڑھنے کے بعد امام کسی کام میں مشغول ہو گیا اور خطبہ و نماز میں کوئی معتد بہ فصل ہو گیا تو خطبہ کا اعادہ ضروری ہے۔ اگرچہ دوبارہ سننے والے بھی وہی لوگ ہوں گے جو پہلے سن چکے ہیں کما ذکرہ فی البحر عن الخلاصۃ فلو قرأ فی بیتہ صرح فی السراج الوهاج بلزوم الاستیناف وبطلان الخطبۃ هذا هو الظاهر (بحر ج ۲ ص ۱۵۹) اگر وعظ و پند ہی خطبہ کا مقصود ہوتا تو اس اعادہ سے کیا فائدہ مقصود ہے؟

⑥ فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ نے خطبہ جمعہ کو دو رکعت کے قائم مقام قرار دیا ہے (بحر ج ۲ ص ۱۶۰)

⑦ خطبہ کا سننا اور اس میں خاموش رہنا واجب ہے۔ اور زبان سے درود شریف پڑھنا، تسبیح و تکبیر کہنا اور سلام کا جواب دینا ناجائز ہے۔ اگر مقصود وعظ ہے تو جواب سلام اور ایسے اذکار سے کیوں منع کیا گیا جو سننے کے منافی نہیں، نیز اگرچہ خطبہ کے مضامین پہلے سے معلوم ہوں تب بھی ان کا سماع واجب کیوں قرار دیا گیا؟

امور مذکورہ سے یہ بات اچھی طرح روشن ہو گئی کہ خطبہ جمعہ کا مقصد اصلی شریعت کی نظر میں صرف ذکر اللہ ہے۔ وعظ و تذکیر اس کی حقیقت و مقصد کا جزء نہیں۔ بعض لوگ یہ شبہ پیش کرتے ہیں کہ خطبہ کے معنی ہی وعظ کے ہیں۔ لہٰذا واضح ہو کہ خطبہ کا لفظ صرف تکلم بغیر وعظ کے لیے بھی مستعمل ہے۔ ملاحظہ ہو۔ مجمع البحار میں ہے خطب خطبۃ بالکسر والاسم الخطبۃ بالکسر واما بالضم فہو القول والکلام۔ دوسری جگہ لکھتے ہیں وانا خطیبہم اذا انصتوا ای انا المتکلم عن الناس حین سکتوا من الاعتذار فاعتذر عنہم ولم یؤذن لغیری فی التکلم اھ

الزامی جواب: قرآن مجید بھی تو آنی تذکیر ہے۔ قال تعالیٰ ان ھو الا ذکری للعالمین تو چاہیے کہ اس کو بھی نماز میں حاضرین کی زبان میں پڑھا کریں۔ پس جس طرح کہ اسے غیر عربی زبان میں پڑھنا امر تعبدی ہے اسی طرح خطبہ کا غیر عربی زبان میں پڑھنا۔

غیر عربی میں خطبہ جائز رکھنے والوں کی سب سے بڑی نقلی بنا یہ ہے کہ امام صاحب رحمہ اللہ نے نماز میں قراءت کو فارسی میں جائز فرمایا ہے۔ اس کا ایک جواب نقلی ہے اور ایک عقلی۔

نقلی جواب: امام صاحب رحمہ اللہ نے اس سے رجوع فرما لیا ہے۔ اصول الامام رحمہ اللہ کان اولاً یقول ان قراءۃ القرآن بالفارسیۃ تجوز ثم رجع عنہ الی عدم الجواز وھو قولہما فان فی الاصل روی ابوبکر الرازی ان ابا حنیفۃ رحمہ اللہ تعالیٰ رجع الی

قولهما وعليه الاعتماد فنزل منزلة الاجماع اه وهو تصحيح كناية وعليه الاعتماد فهذا آية

(اللآلي المصنوعة في الروايات المرجوحة ص ۱۸)

عقلی جواب:- امام صاحب رحمہ اللہ کے اس مرجوع عنہ قول کی بناء یہ نہ تھی کہ قرآن و تکبیر وغیرہ کو غیر عربی میں پڑھنا جائز ہے۔ اگر یہ بناء ہوتی تو دلائل مذکورہ بالا اس سے متعارض ہوتے ہیں، وجہ باطل ہے۔ پس اس سے استدلال کرنا تاویل القول بما لا یرضی بہ قائلہ کے قبیل سے ہے۔ امام صاحب رحمہ اللہ کا قول مرجوع عنہ اس شخص کے بارے میں تھا جو قراءت عربی پر قادر نہ ہو۔ جو شخص عربی قراءت پر قادر ہو اس کے متعلق امام صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے غیر عربی میں جواز قراءت کا قول نہیں فرمایا تو معلوم ہوا کہ خطبہ کے متعلق بھی امام صاحب رحمہ اللہ کا قول مرجوع عنہ اس صورت میں ہے جب کہ خطیب عربی خطبہ پڑھنے سے عاجز ہو۔ کیونکہ خطبہ جمعہ اور قراءت کا امام صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک ہی حکم ہے۔ در مختار شروط الصلوٰۃ کے بیان میں ہے وعلی ھذا الاختلاف الخطبۃ وجمیع الاذکار۔ اس سے اچھی طرح روشن ہوگیا کہ قول مرجوع عنہ بھی اس شخص کے ساتھ خاص تھا جو عربیت سے عاجز ہو۔ اب بعد از رجوع خطبہ غیر عربی میں عاجز عن العربیۃ کے لئے بھی جائز نہیں جیسے قراءت اور اذان غیر عربی میں جائز نہیں۔ باقی رہا یہ اعتراض کہ جب لوگ خطبہ سمجھتے ہی نہیں تو پڑھنے سے کیا فائدہ؟ تو یہ اعتراض قراءت اور اذان میں بھی وارد ہوگا۔ اذان بھی اپنی ملکی زبان میں ہونا چاہئے اور "حی علی الصلوٰۃ" کی جگہ "نماز کی طرف آؤ" کہنا چاہئے۔ اگر کہا جائے کہ اذان اعلان کے لئے ہے اور ہر شخص جانتا ہے کہ اس سے مقصود نماز کا اعلان ہے تو جواب یہ ہے کہ اعلان تو صرف دو تین کلمات سے حاصل ہو جاتا ہے اتنی لمبی اذان کی کیا ضرورت تھی؟ خصوصاً فجر کی اذان میں "الصلوٰۃ خیر من النوم" کیوں کہا جاتا ہے؟ حالانکہ اس کا ترجمہ کوئی نہیں سمجھتا۔

کسی دوسری زبان میں خطبہ کا ترجمہ کرنا بھی جائز نہیں۔ کیونکہ اس سے خطبہ اور جمعہ کے درمیان فصل ہو جائے گا اور فصل ہو جانے سے خطبہ کا اعادہ ضروری ہے کما صرح۔ نیز کتب فقہ میں ہے کہ خطبہ کا دس چیزوں (مثل تحمید، صلوٰۃ، دعا وغیرہ) پر مشتمل ہونا سنت ہے اور اس کے ساتھ ہی خطبہ کا اختصار بھی سنت ہے۔ اب اگر پوری دس اشیاء جو خطبہ میں سنت ہیں سب ذکر کرے اور ترجمہ بھی کرے تو اختصار ختم ہو جائے گا بلکہ خطبہ دوگنا سے بھی زیادہ ہو جائے گا۔ اور اگر پوری دس اشیاء ذکر نہ کرے تو بھی خلاف سنت ہوا۔ غرضیکہ ذکر

سنتوں میں سے ایک کا ترک ضرور لازم آتا ہے۔

اختصار کو مدنظر رکھتے ہوئے اسی پر اکتفاء کرتا ہوں۔ وهذا فيكم من استحكام الجلية والمستلزمات العلية والآثار البهية في ترويج السنة السنية واتباع ما مضت عليه الأئمة المرضية (عليهم الرضوان) فعليكم بالعربية وإياكم والبدعات العجمية۔ واسمعوا وعوا ومن الله فاتقوا۔

فقط واللہ اعلم بالصواب

فقہ بستانہ نے جواب رشید احمد صاحب مولانا المحدث ... مفتی

بروایت ... غفرلہ ... لکھنؤ

جمعہ فی القری باذن الحاکم کی تحقیق

سوال (۱) عند الاحناف قری کبیرہ میں صحت جمعہ مطلق ہے یا کہ اذن حاکم پر موقوف ہے؟

(۲) اذن حاکم سے ہر قریہ میں جمعہ جائز ہے یا کہ اس میں کچھ تحدید ہے؟

(۳) اذن الحاکم بخلاف مذہب صحیح ہے یا نہیں؟

(۴) جواز جمعہ فی القری کیلئے اذن حاکم کافی ہے یا کہ حکم وقضاء فی ضمن حادثہ ضروری ہے؟

(۵) جیسے مصر میں جماعۃ المسلمین امیر کے قائم مقام ہو جاتی ہے ویسے ہی قری میں جماعۃ المسلمین کے اتفاق سے جمعہ ادا کرنا صحیح ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

(۱) قال في التنوير ويشترط لصحتها المصر وقال الدر: وفي القهستاني إذن الحاكم ببناء الجامع في الرستاق إذن بالجمعة اتفاقا على ما قاله السرخسي وإذا اتصل به الحكم صار مجمعا عليه فليحفظ وفي الشامية (قوله وفي القهستاني إلخ) تأييد للمتن وعبارة القهستاني وتقع فرضا في القصبات والقرى الكبيرة التي فيها أسواق قال أبو القاسم هذا بلا خلاف إذا أذن الوالي أو القاضي ببناء المسجد الجامع وأداء الجمعة لأن هذا مجتهد فيه فإذا اتصل به الحكم صار مجمعا عليه وفيما ذكرنا إشارة إلى أنه لا تجوز في الصغيرة التي ليس فيها قاض ومنبر وخطيب كما في المضمرات (إلى أن قال) وفي الجواهر لو صلوا في القرى لزمهم أداء الظهر وهذا إذا لم يتصل به حكم فإن في فتاوى الديناري إذا بني مسجد في الرستاق بأمر الإمام فهو أمر بالجمعة اتفاقا على ما قال السرخسي (رد المحتار ص ۵۴۹ ج ۱)

قہستانی کی عبارت مذکورہ کا خلاصہ یہ ہے کہ قری تین قسم کے ہیں۔

(۱) اتنا بڑا اور ایسی وضع و صفت کا گاؤں کہ جسے عرف میں شہر کہا جا سکتا ہو یعنی اگرچہ لوگ اسے گاؤں کہتے ہوں مگر کوئی شخص اسے شہر کہے تو اس کی تکذیب اور اس پر انکار نہ کیا جاتا ہو ایسا گاؤں حقیقت میں مصر ہے لہٰذا اس میں جواز جمعہ اذن حاکم پر موقوف نہیں۔ قہستانی کی عبارت میں قصبات پر قری کبیرہ کا عطف تفسیری ہے یا اختلاف اسم مع اتحاد المسمی کی بنا پر ہے۔

(۲) ایسا گاؤں کہ اس پر عرفاً مصر کا اطلاق صحیح نہ ہو اسے شہر کہنے والے پر انکار کیا جاتا ہو اس میں اذن حاکم سے جمعہ جائز ہوگا بشرطیکہ یہ موضع اقامت جمعہ کے لئے مجتہد فیہ بین الائمۃ ہو۔

(۳) اتنا چھوٹا گاؤں کہ مذاہب اربعہ میں سے کسی مذہب میں بھی وہاں جمعہ جائز نہ ہو، اس میں اذن حاکم سے بھی جمعہ صحیح نہ ہوگا۔ وفیما ذکرنا اشارۃ الی انہ لا تجوز فی الصغیرۃ التی لیس فیہا قاض ومنبر وخطیب سے اسی قسم کا گاؤں مراد ہے۔

④ جواز الجمعۃ فی القری باذن الحاکم کی بنا یہ ہے کہ موضع مجتہد فیہ میں حکم حاکم رافع اختلاف ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جس قریہ میں کسی امام کے نزدیک بھی جمعہ جائز نہ ہو وہاں اذن حاکم سے بھی جمعہ صحیح نہ ہوگا۔ کما ذکرنا فی الجواب عن السؤال الاول۔ قال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ تعالیٰ ان الحکم بصحۃ الجمعۃ مبنی علی کون ذلک الموضع محلا لاقامتہا فیہ (رد المحتار صفحہ ۵۴۲ ج ۱)

شروط صحت جمعہ سے متعلق اقوال ائمہ رحمہم اللہ تعالیٰ ملاحظہ ہوں۔ قال الحافظ رحمہ اللہ تعالیٰ وجملۃ ما للعلماء فیہ (عدد من تقوم بہم الجمعۃ) خمسۃ عشر قولا (الی قولہ) التاسع، عشرون فی روایۃ ابن حبیب عن مالک، العاشر، ثلاثون کذلک الحادی عشر، اربعون بالامام عند الشافعی، الثانی عشر، غیر الامام عنہ، الثالث عشر خمسون عن احمد فی روایۃ (فتح الباری صفحہ ۳۴۲ ج ۲) وکذا نقل الشوکانی عن الحافظ رحمہ اللہ تعالیٰ (نیل الاوطار صفحہ ۲۶۳ ج ۳) وقال ابن رشد القرطبی رحمہ اللہ تعالیٰ ومنہم من اشترط الاربعین وہو قول الشافعی واحمد وقال قوم ثلاثین ومنہم من لم یشترط عددا ولکن رای انہ یجوز بما دون الاربعین ولا یجوز بالثلاثۃ والاربعۃ وہو مذہب مالک وحدہم بانہم الذین یمکن ان تتقرری بہم قریۃ (بدایۃ المجتہد صفحہ ۱۲۰ ج ۱) قال العلامۃ ابو البرکات

قال احمد بن محمد بن احمد الدردير في الشرح الصغير على اقرب المسالك الى مذهب الامام مالك وشروط صحتها خمسة: اولها الاستيطان وهو اخص من الاقامة لانه الاقامة بقصد التأبيد، والاقامة اعم واليه اشار بقوله (باستيطان بلد) مبنية بالطوب او الحجر او غيرها او استيطان (اخصاص) من قصب او اعواد شجر بحشيش (لا) استيطان (خيم) من شعر او قماش لان الغالب على اهلها الارتحال فاشبهوا المسافرين نعم ان اقاموا على كفرسخ من بلدها وجبت عليهم تبعا لاهلها كما تقدم ومعنى كون الاستيطان شرط صحة انه لولاه ما صحت الجمعة لاحد وكما انه شرط صحة هو شرط وجوب ايضا اذ لولاه لما وجبت على احد جمعة ويشترط لهذا الشرط شرطان الاول كونه ببلد او اخصاص كما قدمنا الثاني كونه (بجماعة تتقرى) اي تستقر (بهم القرية) عادة بالامن على انفسهم والاستغناء في معاشهم العرفي عن غيرهم ولا يحدون بحد كمائة او اقل او اكثر فلو كانوا لا تتقرى بهم قرية بان كانوا مستندين في معاشهم لغيرهم فان كانوا على كفرسخ من قرية الجمعة وجبت عليهم تبعا لاهلها وان كانوا احادا بعيدين عن كفرسخ لم تجب عليهم كاهل الخيم۔

ولو حضرت جماعة تتقرى بهم قرية بلدا على كفرسخ من بلد الجمعة لوجبت عليهم الجمعة استقلالا۔

الشرط الثاني: حضور اثني عشر رجلا لصلاتها وسماع الخطبتين واليه اشار بقوله (وحضور اثني عشر) رجلا للصلاة والخطبة ويشترط لهذا الشرط شرطان ايضا الاول ان يكونوا (منهم) اي من اهل البلد فلا تصح من المقيمين به لنحو تجارة او زرع بالبلد ان لم يكونوا من المستوطنين بالبلد، الثاني ان يكونوا (باقين) مع الامام من اول الخطبة (لسلامها) اي الى السلام من صلاتها اي سلام جميعهم فلو فسدت صلاة واحد منهم ولو بعد سلام الامام بطلت الجمعة۔

وفي الحاشية (قوله وحضور اثني عشر رجلا) اي غير الامام، وان يكونوا مالكيين او حنفيين او شافعيين قلدوا واحدا منهما لا ان لم يقلدوا فلا تصح جمعة المالكي مع اثني عشر شافعيين لم يقلدوا، لانه يشترط في صحتها عندهم اربعون يحفظون الفاتحة بشداتها اهـ۔

ثم قال المؤلف رحمه الله تعالى الشرط الثالث: الامام واليه اشار بقوله

(و) امام مقیم (فلا تصح افذاذا) ویشترط فیہ الاقامۃ ولو لم یکن متوطنا کما قدمنا له بالوصف وان یکون هو الخاطب فلو صلی بهم غیر الخاطب لم تصح الا لعذر یبیح کرعاف ونقض وضوء، ووجب انتظاره ان قرب زوال العذر (ثم قال) الشرط الخامس الجامع والیه اشار بقوله (بجامع) فلا تصح فی البیوت ولا فی براح من الارض ولا فی خان ولا فی رحبة دار۔

وله شروط اربعة، ان یکون مبنیا، وان یکون بناؤه علی عادتهم، وان یکون متحدا، ومتصلا بالبلد والیه اشار بقوله (مبنی) فلا تصح فیما حوط علیه بزرب او احجار او طوب من غیر بناء (علی عادتهم) ای اهل البلد فیشمل بناءه من بوص لاهل الاخصاص لا لغیرهم (متحد) بالبلد (فان تعدد) فالعتیق هو الذی تصح فیه الجمعة دون غیره والمراد بالعتیق ما اقیمت فیه الجمعة ابتداء ولو تأخر بناؤه عن غیره فالجمعة له (وان تأخر اداء) ای وان تأخر اداء الجمعة فیه عن الجدید فالصلوة فی الجدید وان سبقت فاسدة ما لم یهجر العتیق فالجمعة لا تکون الا صحیحة فی البلد متی اقیمت لا تصلی بجماعة لا فی العتیق ولا فی غیره فان صلیت فی غیره قبله فباطلة (متصل ببلد ها) حقیقة او حکما بان انفصل عنها انفصالا یسیرا عرفیا (لا ان انفصل کثیرا) فلا تصح به الجمعة (او خف بناؤه) عن عادة اهل البلد فلا تصح فیه وهذا مفهوم قوله علی عادتهم۔

وفی الحاشیة (قوله او خف بناؤه) ای بان کان اهل البلد یبنون بالاحجار او بالطوب المحروق وبناؤه بالنیئ، او کان اهل البلد یبنون بالنیئ وبناؤه بالبوص (الشرح الصغیر ص۴۹۵ الی ص۵۰۴ ج۱) وقریب من ذلک فی الفقه علی المذاهب الاربعة (ص۳۸۳ ج۱)

صحت جمعہ کے لئے امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں پچاس یا چالیس افراد، امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں چالیس، امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں تیس یا بیس اور کم از کم بارہ افراد کا وجود شرط ہے۔ چونکہ ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ تعالیٰ میں سے امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں سب سے زیادہ تسہیل ہے اس لئے ہم نے صرف شروط مالکیہ میں سے صرف چند شرائط ذکر کی ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے۔

شرائط مالکیہ کا خلاصہ :

(۱) اتنا بڑا گاؤں ہو جو اپنی ضروریات میں دوسری آبادی کا محتاج نہ ہو۔

(۲) اگر گاؤں اس نوعیت کا نہ ہو تو اس قسم کے گاؤں سے تین میل شرعی کے اندر ہو۔

(۳) گاؤں اہل خیمہ کا نہ ہو بلکہ مکان ہوں یا لکڑی وغیرہ کی جھگیاں ہوں۔

(۴) امام کے علاوہ اس گاؤں کے مستقل باشندوں میں سے کم از کم بارہ افراد ابتداء خطبہ سے لیکر سلام پھیرنے تک شریک رہیں حتی کہ انہیں سے کسی کی نماز سلام امام کے بعد بھی فاسد ہو گئی تو جمعہ باطل ہو گیا۔ انہیں توطن کی شرط سے ثابت ہوتا ہے کہ حریت ذکورۃ، بلوغ، عقل اور فرضیت جمعہ کے لائق صحت وغیرہ امور بھی ضروری ہیں۔

(۵) یہ بارہ افراد مالکی یا حنفی ہوں۔

(۶) امام مسافر نہ ہو۔

(۷) جو خطبہ پڑھے وہی امامت کرے۔

(۸) ایک آبادی میں جمعہ ایک ہی جگہ ہو۔

(۹) جمعہ مسجد میں پڑھا جائے۔

(۱۰) مسجد کی عمارت گاؤں کی عام عمارات کی بنسبت گھٹیا نہ ہو۔

عمل بمذہب غیر کی بنا پر جواز جمعہ فی القری کے قائلین اندازہ لگائیں کہ صحت جمعہ کے لئے بعض مذاہب میں کسقدر قیود و شروط ہیں۔ حالانکہ ہم نے سب شرائط نقل نہیں کیں بلکہ نمونہ کے طور پر صرف چند شرائط نقل کی ہیں۔ مذہب شافعی وحنبلی میں تو بجائے بارہ کے چالیس افراد کی شرط کے ساتھ قراءۃ فاتحہ خلف الامام جیسی اور بھی کئی شرائط ہیں۔ اگر کسی مذہب کی جملہ شرائط کا لحاظ نہ کیا گیا تو بالاتفاق جمعہ صحیح نہ ہوگا۔ کیونکہ تلفیق بالاتفاق حرام ہے۔

(۳) حاکم مقلد کا حکم بخلاف المذہب بالاتفاق نافذ نہیں ہوتا۔ البحر الرائق میں امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ سے ایک روایت منقول ہے کہ اگر قاضی مقلد نے غلطی سے خلاف مذہب فیصلہ کر دیا تو نافذ ہو جائے گا مگر یہ روایت مرجوح ہے۔

حاکم مجتہد کے حکم بخلاف مذہبہ کے عدم جواز پر تو اتفاق ہے مگر نفاذ مختلف فیہ ہے۔ عند الامام نافذ ہو جاتا ہے عند الصاحبین نہیں۔ فتوی صاحبین کے قول پر ہے۔ قال فی شرح التنویر وان الخلاف خاص بالقاضی المجتھد واما المقلد فلا ینفذ قضاؤہ بخلاف مذھبہ اصلا کما فی القنیۃ قلت ولا سیما فی زماننا فان السلطان ینص فی منشورہ علی نھیہ عن

القضاء بالاقوال الضعيفة فكيف بخلاف مذهبه. وفي الشامية ان الفتوى على قولهما بعدم النفاذ في العمد والنسيان.

وايضا فيها عن التحرير ان قول الامام بالنفاذ لا يوجب حله لان المرجح عدم القضاء بالمحدود ثم في بعض نسخه ذكر الخلاف في الحل وجه ترجيح رواية عدم الحل اه (رد المحتار ج ۱)

پس بقول مفتی بہ حاکم مجتہد کے امر بخلاف المذہب کی بھی صحیح نہیں، چہ جائیکہ جب آجکل مجتہد ہی مفقود ہے لہٰذا جمعہ فی القری کے جواز کی کوئی صورت نہیں، بلکہ اگر کہیں یہ ثابت ہو جائے کہ اس علاقہ میں کسی وقت میں حاکم مجتہد نے جمعہ فی القری کا حکم دیا تھا تو بھی اس وقت وہاں جمعہ جائز نہیں کیونکہ اس قول کے غیر مفتی بہ ہونے کے علاوہ عدم جواز کی یہ وجہ بھی ہے کہ حاکم آمر کی وفات سے اس کا امر ختم ہو جاتا ہے۔ قال في الشامية لا يبقى في اليوم الاذن بعد موت السلطان الآذن بذلك الا اذا اذن به ايضا سلطان زماننا نصره الله (ج ۱) وايضا فيها في باب العيدين. ان امر الخليفة لا يبقى بعد موته وعزله كما صرح في الفتاوى الخيرية ردا على من افتى عليه انه لو نهى عن سماع الدعوى بعد خمس عشرة سنة لا يبقى نهيه بعد موته والله اعلم

(رد المحتار ج ۱)

البتہ اگر حاکم شافعی اپنے مذہب کے مطابق اقامت جمعہ فی القری کا امر کرے تو وہاں احناف کا جمعہ بھی صحیح ہو جائے گا بشرطیکہ سلطان نے اس سے منع نہ کیا ہو۔ پھر اس حاکم کی موت یا معزولی یا تبدیلی کے بعد عدم صحت کا حکم عود کر آئے گا۔

(۴) اذن سے مراد امر ہے صرف اجازت کافی نہیں، البتہ قضاء فی ضمن حادثہ ضروری نہیں۔ قال في الشامية وظاهر ما مر عن القهستاني ان مجرد امر السلطان او القاضي ببناء المسجد واداء الجمعة فيه حكم رافع للخلاف بلا دعوى وحادثة وفي قضاء الاشباه امر القاضي حكم كقوله سلم المحدود الى المدعي والامر بدفع الدين والامر بحبسه اه وافتى ابن نجيم بان تزويج القاضي الصغيرة حكم رافع للخلاف ليس لغيره نقضه (قوله واذا اتصل به الحكم) قد علمت ان عبارة القهستاني صريحة في ان مجرد الامر رافع للخلاف بناء على ان مجرد الامر حكم (رد المحتار ج ۱)

(۵) جماعت مسلمین صرف امور انتظامیہ میں حاکم کے قائم مقام ہوتی ہے چونکہ صحت جمعہ کے لئے امیر منصوب شرط نہیں بلکہ صرف تقدیم وتقدم میں دفع نزاع کیلئے ہے جو کہ امر انتظامی ہے

لہٰذا اس میں جماعۃ المسلمین امیر کے قائم مقام ہو جائے گی۔ بخلاف صاحب جمعہ فی القری کے کہ اس میں امر حاکم ہے یک مسئلہ مجتہد فیہا ہیں مقلد پر اپنے امام کی تقلید سے خروج ضروری ہو جاتا ہے اور جماعۃ المسلمین کے امر سے ترک تقلید جائز نہیں۔ لہٰذا اس میں جماعۃ المسلمین امیر کے قائم مقام نہ ہوگی۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

رشید احمد

۲۸ ذی قعدہ سنہ ۹۵ ہجری

تحریر مخدوم محمد ہاشم ٹھٹھوی رحمہ اللہ تعالیٰ

چوں دریں زمان توانی در تنفیذ احکام شرع و اقامت حدود بمرتبہ غایت رسیدہ بلکہ قدرت آں از قضاۃ غالباً مفقود گشتہ ازیں سبب اگر بموجب روایات اصل مذہب فتوی دادہ شود بجواز صلاۃ جمعہ کہ از اعظم شعائر دین ست در تمامی بلاد سندھ در زیادہ از دو صد جا متحقق نشود بلکہ دراں ہم مشکل پیش آمدہ ست کہ دریں باب عمل بروایات دیگر نمودہ شود تا ظہور شعار دین از دست نرود و چوں قاضی اجازت داد بموجب روایۃ امام محمد یا بر قول امام شافعی و یا مالک آں نماز باتفاق جائز گردد و اختلاف ست دراں کہ نفاذ قضا در مجتہدات دصیر ورۃ آنہا مجمع علیہ مخصوص ست بحکم قاضی مجتہد کما فی فتح القدیر یا عام ست کہ شامل باشد ہر قاضی مقلد را کما اختارہ صاحب البحر ولفظہ ان القاضی المقلد اذا قضی بمذہب غیرہ فانہ ینفذ وکذا اذا قضی بروایۃ ضعیفۃ او بقول ضعیف انتہی و در مثل ما نحن فیہ کہ محل تہمت در قاضی نیست باید کہ فتوی دادہ شود بروایۃ بحر اظہاراً لشعائر الاسلام و لازم نیاید ازیں شبہہ لزوم در تقلید شافعی لازم ست کہ جمیع شرائط مذہب شافعی را رعایت کردہ شود زیرا کہ ایں باب از تقلید نیست اصلاً بلکہ صحیح می شود ایں نماز بر جمیع مذاہب از حنفیہ و غیرہم و لازم نیاید ازیں شبہہ کہ نفاذ قضا در مجتہدات مشروط ست بوجود تقدم دعوی صحیحہ و تقضی لہ و مقضی علیہ والا فتوی باشد نہ قضا زیرا کہ ایں شرط در معاملات و دعوی ست نہ در عبادات ولہٰذا در مضمرات و فتاوی حجۃ و تاتارخانیہ و ابی المکارم ایں را قضا نام نہادہ اند و حکم بصیرورۃ آں مجمع علیہ کردہ اند و لازم نیست کہ اہل آں قریات کہ درہیوت و ابنیہ سکونت دارند قصد دوام اقامۃ داشتہ باشند بدلیل آنکہ متفق است کلام حنفیہ برایں کہ در منی جمعہ جائز ست در ایام موسم فقط زیرا کہ منی مصری مشود

سندھ میں بالعموم جواز جمعہ فی القری کے لئے مخدوم ٹھٹھوی رحمہ اللہ تعالیٰ کی تحریر کو سند بنایا جاتا ہے مگر غالباً خواہش نفس کے خلاف ہونے کی وجہ سے مخدوم سیوستانی رحمہ اللہ تعالیٰ کے جواب سے صرف نظر کیا جاتا ہے حالانکہ یہ جواب نصوص مذہب کے عین مطابق ہے۔ البتہ اس میں مصر کی تعریف ما لا یسع اکبر مساجدہ اھلہ جانبین بلکہ مرجوح ہے۔ مصر کی حد یہ ہے کہ اس میں سکک و اسواق اور ضروریات زندگی مہیا ہونے کی وجہ سے اس کو عرف میں شہر سمجھا جاتا ہو۔

مخدوم سیوستانی کے جواب سے بھی زیادہ مفصل جواب بندہ کی تحریر بعنوان "جمعہ فی القری باذن الحاکم" میں ہے۔ اس میں مخدوم ٹھٹھوی کی تحریر کے ایک ایک جزء کا جواب موجود ہے۔ مزید یہ کہ اس تحریر میں یہ نہیں بتایا گیا کہ سندھ کے کس حاکم نے کس قریہ میں اقامت جمعہ کا امر کیا تھا۔ ثانیاً اگر کسی قریہ میں کسی حاکم کی طرف سے اقامت جمعہ کا امر ثابت ہو جائے تو اسکا تعدیہ دوسرے قری کی طرف کیونکر صحیح ہوگا؟ ثالثاً اگر سب قری میں اقامت جمعہ کا امر ہو تو اسکا ثبوت چاہئے۔ نیز ایسے امر کی صحت و نفاذ کے لئے کوئی صریح دلیل درکار ہے، عبارات فقہ تو خاص قریہ سے متعلق ہیں۔ رابعاً حاکم آمر کی موت کے بعد اسکا امر ختم ہو گیا کما حررنا فی موضعہ۔

پھر اس تحریر کے اس مضمون پر کہ "اصل مذہب کے مطابق سندھ میں کہیں بھی جمعہ جائز نہ ہوگا" جتنا بھی تعجب کیا جائے کم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بعض حضرات نے اصل مذہب حنفی میں تعریف مصر میں تنفیذ الاحکام واقامۃ الحدود کی شرط لگائی، مگر محققین حضرات نے رد کیا ہے کہ اصل مذہب میں قدرۃ علی تنفیذ الاحکام شرط ہے نہ کہ خود تنفیذ الاحکام، پھر قدرت بھی اکثر احکام کی تنفیذ پر نہ کہ کل احکام کی تنفیذ پر۔ آخر میں ترجیح اسکو دی گئی ہے کہ کسی ایک حکم کی تنفیذ پر بھی قدرت شرط نہیں صرف ایسا مصر ہونا شرط ہے جس کو عرف میں شہر سمجھا جاتا ہو۔ قال فی شرح التنویر (ویشترط لصحتہا سبعۃ اشیاء الاول المصر وھو ما لا یسع اکبر مساجدہ اھلہ المکلفین بہا) وعلیہ فتوی اکثر الفقہاء مجتبی لظہور التوانی فی الاحکام وظاہر المذہب انہ کل موضع لہ امیر وقاض یقدر علی اقامۃ الحدود کما حررناہ فیما علقناہ علی الملتقی وفی الشامیۃ (قولہ وعلیہ فتوی اکثر الفقہاء الخ) وقال ابو شجاع ھذا احسن ما قیل فیہ وفی الولوالجیۃ وھو الصحیح بحر وعلیہ مشی فی الوقایۃ ومتن المختار وشرحہ وقدمہ فی متن الدرر علی القول الآخر وظاہرہ ترجیحہ وایدہ صدر الشریعۃ بقولہ لظہور التوانی فی احکام الشرع سیما فی اقامۃ الحدود فی الامصار (قولہ وظاہر المذہب الخ) قال فی شرح المنیۃ والحد الصحیح ما اختارہ صاحب الہدایۃ انہ الذی لہ امیر وقاض ینفذ الاحکام ویقیم الحدود وترکہ صدر الشریعۃ لعدم اختیارہ حیث اختار تعریف الوقایۃ

الخ ـــــــ ـ ۱۹

حيث اختار الحمل المتقدم لظهور التواني في الأحكام مؤيد بأن المراد القدرة على إقامتها على ما
صرح به في التحفة عن أبي حنيفة أنه بلدة كبيرة فيها سكك وأسواق ولها رساتيق وفيها وال يقدر
على إنصاف المظلوم من الظالم بحشمته وعلمه أو علم غيره يرجع الناس إليه فيما يقع من الحوادث وهذا
هو الأصح اهـ إلا أن صاحب الهداية ترك ذكر السكك والرساتيق لأن الغالب أن الأمير والقاضي
الذي شأنه القدرة على تنفيذ الأحكام وإقامة الحدود لا يكون إلا في بلد كذلك اهـ (قوله يعتد بها)
أقول فهم منه أن المراد تحوده طرأ على الأمير لأن ذلك وظيفته بخلاف الأمير فيعود إلى التعزير بعيد
ورد على صدر الشريعة كما في شرح الشيخ إسماعيل عن الدهلوي بأنه لو كان تنفيذ جميع الأحكام
بالفعل شرطاً لإقامة الجمعة لما أقيمت في عهد أظلم الناس وهو الحجاج وإنه ما كان ينفذ جميع الأحكام بل المراد
والله أعلم اقتداره على ذلك اهـ ونقل مثله في حاشية أبي السعود عن رسالة العلامة نوح أفندي
أقول ويؤيده أنه لو كان الإخلال بتنفيذ بعض الأحكام مخلاً بكونه لم يبق مصر على هذا القول
الذي هو ظاهر الرواية ولزم أن لا تصح جمعة في بلدة من بلاد الإسلام في هذا الزمان بل فيما قبله
من أزمان فتعين كون المراد الاقتدار على تنفيذ الأحكام ولكن ينبغي إرادة الأكثر وإلا فقد
يعجز الحاكم لا اقتدار على تنفيذ الحكم على بعض الولاة كما يقع في أيام الفتنة من تغلب
سفهاء البلد بعضهم على بعض أو على الأمير حيث لا يقدر على تنفيذ الأحكام فيهم لأنه قادر على
تنفيذها في غيرهم وفي عسكره على أن هذا عارض فلا يعتبر ولذا لو مات الوالي أو لم يحضر لفتنة
ولم يوجد أحد ممن له حق إقامة الجمعة نصب العامة لهم خطيباً للضرورة كما سيأتي مع أنه لا
أمير ولا قاضي ثمة أصلاً وبهذا ظهر جهل من يقول لا تصح الجمعة في أيام الفتنة مع أنها تصح
في البلاد التي استولى عليها الكفار كما سنذكره فتأمل (رد المحتار ص ۷۴۴ ج ۱)

صحیح بات تو یہ ہے ایسی ساقط تحریر کو دیکھ کر یہی باور کرنا مشکل ہے کہ یہ واقعۃً مخدوم ٹھٹھوی
رحمہ اللہ تعالیٰ ہی کی تحریر ہے، آپ کی بلند پایہ تحقیقات شاہد صدق ہیں کہ اس تحریر کو آپ کے مقام تفقہ
سے دور کی بھی نسبت نہیں۔ علاوہ ازیں تفحص و تتبع کے باوجود حضرت ٹھٹھوی رحمہ اللہ تعالیٰ کی کسی تصنیف
میں اس تحریر کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

رشید احمد

۱۵ر شوال سنہ ۹۴ ہجری یوم الجمعہ

سندھ میں اصلاح جمعہ فی القریٰ کی ایک کوشش

سندھ میں حنفی کہلانے والے عوام بلکہ علماء بھی دیہاتوں میں جمعہ پڑھتے ہیں پھر ستم بالائے ستم یہ کہ ایسے مقامات میں بھی جمعہ پڑھا جاتا ہے جہاں مذاہب اربعہ میں سے کسی مذہب میں بھی جمعہ پڑھنے کی کوئی گنجائش نہیں، اس کی اصلاح کے لئے میرے خیال میں یہ تجویز آئی کہ سندھ کے مشہور علماء و مشائخ کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کو اس مسئلہ سے متعلق اجتماعی غور کے بعد متفقہ فیصلہ کے اعلان پر آمادہ کروں، چنانچہ میں نے اوائل شعبان ۱۳۹۸ھ میں سندھ کے مختلف علاقوں میں مشہور علماء و مشائخ کی خدمت میں حاضری کے لئے ان کو خطوط لکھے، مگر ان میں سے کسی نے بھی میرے خط کا جواب تک نہیں دیا بلکہ بعض تو خوف سے سہم گئے اور بعض میرا خط پڑھ کر بلبلا اٹھے اور برادر محترم مولانا محمد خلیل اللہ صاحب کے پاس "بچاؤ بچاؤ" کی فریادیں شروع کر دیں، بالآخر ان سے مایوس ہو کر مجھے ان کے آستانہ پر حاضری کا ارادہ منسوخ کرنا پڑا۔ اس قصہ کی پوری روئیداد درج ذیل ہے۔

مکتوب بنام علماء سندھ

دار الافتاء والارشاد ناظم آباد کراچی

۱۰/شعبان ۹۸ھ بسم اللہ الرحمن الرحیم

مکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

یہ امر مسلّم اور کتب مذہب میں مصرّح ہے کہ مذہب حنفی میں جمعہ فی القریٰ جائز نہیں، مگر سندھ کے اکابر علماء بھی دیہاتوں میں جمعہ پڑھتے ہیں اور ان میں یہ تعامل اباً عن جدٍّ چلا آتا ہے۔ اس کے برعکس علماء ہند اس مسئلہ میں مذہب حنفی کے اس حد تک پابند ہیں کہ کسی کو بیعت کرنے اور اپنے سلسلہ میں داخل کرنے کے لئے جمعہ فی القریٰ سے توبہ کی شرط لگاتے ہیں۔ حدود شرعیہ کی حفاظت کا مقتضیٰ بھی یہی ہے۔

مسئلہ کی اہمیت کے پیش نظر بندہ کا خیال ہے کہ سندھ کے علماء اور مفتیان کرام سے باضابطہ بات کر کے ان کا موقف معلوم کیا جائے، اگر وہ جواز کے قائل ہیں تو ان کے دلائل پر اجتماعی غور کر کے فیصلہ کیا جائے، اگر مذہب حنفی کے مطابق عدم جواز ثابت ہو

تو سندھ سے اس منکر کے ازالہ کی تدابیر پر غور کیا جائے۔

لہذا بندہ اس سلسلہ میں ۱۰ ذی قعدہ ۱۳۹۵ھ میں سندھ کے دینی مدارس کا دورہ کرنے کا خیال رکھتا ہے، جناب کی خدمت میں بھی ان شاء اللہ تعالیٰ حاضری ہوگی، جناب سے گزارش ہے کہ جوازِ الجمعۃ فی القریٰ کے بارے میں جناب کے علم میں کوئی دلیل ہو یا آپ کے پاس اکابر کی کوئی تحریر ہو تو ارسال فرمائیں تاکہ بوقتِ ملاقات اس پر بحث کی غور میں سہولت ہو، عریضہ ہذا کی رسید سے بہرکیف مطلع فرمائیں، وفقنا اللہ الجمیع لما یحبہ ویرضیٰ، آمین، والسلام علیکم

رشید احمد

مکتوب برادرم مولانا محمد خلیل اللہ صاحب

۱۰ شوال المکرم ۱۳۹۵ھ

برادرم مولوی رشید احمد صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، مزاج عزیز بخیر باد

سندھ کے بعض مدارس سے فریادیں موصول ہوئیں کہ آپ جمعہ فی القریٰ کے موضوع پر مناظرہ کرنے کے لئے سفر کریں گے۔

ان حضرات نے اس فعل پر شدید نفرت کا اظہار کیا ہے اور لکھا ہے کہ آپ کو زنا، شراب، سود وغیرہ فواحش کی روک تھام کے لئے کام کرنا چاہئے۔ آپ کی نظر میں بڑی برائی بس جمعہ فی القریٰ ہے؟

جواب:

رشید احمد بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۴ شوال ۹۵ھ اخی المکرم زیدت معالیکم

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، نامۂ گرامی موصول ہوا، میں نے سندھ کے مشہور مدارس کی طرف جو خط ارسال کیا تھا اس کی فوٹو کاپی بھیج رہا ہوں آپ اس کو ملاحظہ فرمائیں، میں نے اس میں جمعہ فی القریٰ کے مسئلہ پر اجتماعی غور کے بارے میں لکھا ہے، مجھے یہ خیال تھا کہ کوئی محقق عالم اس کے جواز کا قائل نہ ہوگا، ایک رسم پڑ گئی ہے بس اس کو نباہ رہے ہیں

اس لئے میرے دورے کا اصل مقصد یہ تھا کہ خلافِ مذہب اس رسم کو ختم کرنے کی تجاویز
پر اجتماعی غور کیا جائے شاید کوئی ایسی سبیل نکل آئے کہ عوام میں فتنہ و انتشار بھی نہ پھیلے
سے بچتے ہوئے اس رسم کا علاج ہو جائے، میرے خیال میں اس کا طریقہ یہ تھا کہ سندھ
کے مشہور علماء کی طرف سے متفقہ طور پر یہ مضمون شائع کیا جائے "مذہب حنفی میں
جمعہ فی القری جائز نہیں، اور مذہب اہل حدیث میں جائز ہے، فریقین کو عالی ظرفی اور وسعت
نظر سے کام لینا چاہئے اور آپس میں فتنہ و فساد سے احتراز چاہئے، لہٰذا اہل حدیث
حضرات گاؤں میں جمعہ پڑھیں تو احناف ان پر اعتراض نہ کریں اور احناف نہ پڑھیں تو
اہل حدیث ان پر اعتراض نہ کریں، اگر کوئی حنفی جمعہ پڑھتا ہے تو اس کو تلطف و ملاطفت
سے مذہب حنفی بتا دیا جائے، سمجھا اگر وہ پڑھنے ہی پر بضد ہو تو اس سے تعرض نہ کیا جائے"
اس قسم کے مضمون کی اشاعت میں دو فائدے ملحوظ تھے ایک یہ کہ عوام کو مذہب
حنفی معلوم ہو جاتے، دوسرا یہ کہ اگر کوئی حنفی گاؤں میں جمعہ نہیں پڑھتا تو لوگ اس پر
لعن و طعن نہ کریں۔
مگر مولانا عبد الغفاری صاحب کے خط سے معلوم ہوا کہ وہ اس سلسلہ میں علماء سندھ
کے تعاون سے مایوس ہیں اس لئے کہ یہ علماء جوازِ جمعہ کے قائل ہیں اور اجتماعی غور سے
بھی کترائیں گے، لہٰذا میں نے آپ کا گرامی نامہ موصول ہونے سے قبل ہی اس کارِ خیر
اور بزعمِ یارانِ طریقت کارِ شر کا ارادہ چھوڑ دیا تھا۔
آپ کے خط سے مزید تعجب اس بات پر ہوا کہ یہ حضرات کسی دینی مسئلہ پر اجتماعی
غور و خوض کو مناظرہ سمجھتے ہیں، غالباً ان کو یہ مغالطہ اس لئے ہوا کہ ان کے ہاں مسائل
شرعیہ پر اجتماعی غور کا نہ کوئی دستور ہے اور نہ ہی ان کے قلوب میں اس کی کوئی اہمیت
ہے، اس کے برعکس ہمارے ماحول میں اس کی بہت اہمیت اور سخت ضرورت محسوس
کی جا رہی ہے اور اس ضرورت کا احساس روز بروز بڑھ رہا ہے، دار الافتاء دار الارشاد،
دار العلوم کراچی اور مدرسہ نیو ٹاؤن کراچی کی مشترک مجلس تحقیق اجتماعی طور پر کئی اہم
مسائل کا متفقہ فیصلہ کر کے کتابی شکل میں شائع کر چکی ہے، جن مسائل میں اختلاف رائے
ختم نہ ہوا ان میں بھی آخر تک نہایت محبت و خلوص سے بات ہوتی رہی اور ان کی تحریر
بھی اس انداز سے کی گئی کہ اس کے پڑھنے والوں کو بھی اس مجلس کے ارکان کے اخلاص

اور آپس میں محبت وتعاون کا یقین ہو جائے، اس کی نظائر ماہنامہ البلاغ اور حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی کتاب جواہر الفقہ میں موجود ہیں۔ ہمارے اجتماعی غور کا سلسلہ صرف مذکورہ تین اداروں تک محدود نہیں بلکہ اس سلسلہ میں ملک اور بیرون ملک کے اور بھی بہت سے ادارے شامل ہیں اور اب اس سلسلہ کو اور زیادہ وسعت دینے کے طریق پر غور ہو رہا ہے۔

دینی مسئلہ پر اجتماعی غور کو مناظرہ سمجھنے والے حضرات اپنے مدارس کی مجلس شوریٰ کو اور سیاسی جماعتوں کے اجتماع کو مناظرہ کا نام دے کر اس سے نفرت اور بیزاری کا اظہار کیوں نہیں کرتے؟

ان حضرات کا یہ فرمانا کہ مسئلہ جمعہ فی القریٰ کی بجائے زنا، شراب، سود وغیرہ فواحش کی روک تھام کے لئے کام کرنا چاہیے، اس سے متعلق گزارش ہے کہ "الاہم فالاہم" کا اصول واقعۃً مسلّم ہے مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ جب تک بڑے منکر کا بالکلیہ ازالہ ہو جائے اس وقت تک چھوٹے منکر کی اصلاح کی فکر کرنا گناہ ہے، اگر اس کا یہی مفہوم ہے تو سب سے بڑا منکر کفر ہے لہٰذا جب تک دنیا بھر سے کفر کا بالکلیہ قلع قمع نہیں ہو جاتا اس وقت تک زنا، شراب وغیرہ جیسے منکرات کی اصلاح جائز نہ ہو گی۔

بہرکیف آپ فریا دیوں کو مطمئن فرما دیں کہ میں نے ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا ارادہ ترک کر دیا ہے اس لئے وہ پریشان نہ ہوں، دراصل میں نے ان کو اپنے ماحول پر قیاس کر لیا، اگر مجھے پہلے سے اس کا اندازہ ہوتا کہ ان میں اجتماعی غور کی صلاحیت نہیں اور وہ اس کو مناظرہ سمجھتے ہیں تو میں ان کی طرف عریضہ بھیجکر ہرگز ان کی وحشت کا سبب نہ بنتا وفقنا اللّٰہ الجمیع لما یحب ویرضیٰ، آمین، فقط والسلام علیکم

الحق

جمعہ فی القریٰ سے متعلق ایک کتاب پر تقریظ

اس تقریظ میں بھی بعض کام کی باتیں آگئی ہیں اس لئے اس کا رسالۃ التنبیہ سے الحاق مناسب ہے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۲ یہ امر مسلّم اور متفق علیہ ہے کہ مذہب حنفی میں چھوٹے دیہاتوں میں جمعہ جائز نہیں، مگر جب

اور سخت افسوس کا مقام ہے کہ مسند حدیث فنفی کہلانے والے عوام بلکہ علماء بھی دیہاتوں میں جمعہ پڑھتے ہیں بلکہ ستم بالائے ستم یہ کہ ایسے مقامات میں بھی جمعہ پڑھا جاتا ہے جہاں مذاہب اربعہ میں سے کسی مذہب میں بھی جمعہ پڑھنے کی کوئی گنجائش نہیں، مزید برآں بمصداق "عذر گناہ بدتر از گناہ" یہ کہا جاتا ہے کہ مسئلہ مجتہد فیہا ہے اس لئے اس کی گنجائش ہے، حالانکہ اس میں مندرجہ ذیل قباحتیں ہیں۔

(۱) عمل بمذہب غیر بضرورت جائز ہے اور وہ بھی بشرائط معروفہ، جمعہ فی القریٰ میں کونسی ضرورت داعیہ ہے کہ اپنا مذہب چھوڑ کر مذہب غیر پر عمل کیا جائے؟ اگر یہ ضرورت بیان کی جائے کہ جمعہ نہ پڑھنے میں فتنہ ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس فتنہ کا وبال ان علماء کی گردن پر ہے جنہوں نے عوام تک صحیح مذہب پہنچانے میں غفلت کی بلکہ مداہنت سے کام لیا ہے، اگر علماء مذہب حنفی پر قائم رہتے اور عوام کو بھی صحیح مذہب بتاتے رہتے تو فتنہ کا کوئی امکان نہ تھا۔

اب بھی اگر علماء احناف بلا خوف لومۃ لائم متفقہ طور پر عدم جواز کا فتویٰ دیدیں اور خود بھی مذہب حنفی پر عمل کے پابند ہو جائیں تو فتنہ نہیں ہو سکتا، بحمد اللہ تعالیٰ اب تک بھی عوام علماء کے تابع ہیں، ہاں اگر کہیں غیر مقلد لوگ جمعہ پڑھیں تو ان کو نہ روکا جائے، احناف نہ پڑھیں اور غیر مقلد پڑھتے رہیں تو اس میں کیا فتنہ ہے؟ آخر رفع یدین، آمین بالجہر اور قراءۃ فاتحہ خلف الامام وغیرہ میں بھی تو احناف اور غیر مقلدین میں اختلاف ہے، یہ اختلاف باعث فتنہ کیوں نہیں؟ اور اس کے خوف سے احناف اپنا مذہب چھوڑ کر غیر مقلدین کا مذہب کیوں نہیں اختیار کرتے؟

(۲) جمعہ فی القریٰ کے موجودہ دستور سے مذہب حنفی کی تحریف، صاحب مذہب رحمہ اللہ تعالیٰ پر افتراء اور عوام میں تلبیس مذہب لازم آتی ہے اس لئے کہ علماء کے اس طرز عمل سے عوام یہی سمجھتے ہیں کہ ان کا عمل مذہب حنفی کے مطابق ہے۔ اور امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ کا یہی مذہب ہے۔

(۳) علماء کی اس مداہنت سے عوام کو ایسی کھلی چھٹی مل گئی ہے کہ سب قیود و شروط سے آزاد ہو کر ایسے مقامات میں بھی جمعہ پڑھ رہے ہیں جہاں کسی مذہب میں بھی جمعہ جائز نہیں بلکہ بہت سے علماء بھی اس میں مبتلا ہیں۔

(۴) جمعہ فی القریٰ کے گناہ کے علاوہ دوسرا بڑا عذاب یہ ہے کہ ظہر کی نمازیں غارت ہو رہی ہیں اور وہ بھی جمعہ جیسے مقدس دن کی۔

اس لئے علماء پر فرض ہے کہ عوام کو صحیح مذہب حنفی سے آگاہ کریں اور خلاف مذہب عمل سے روکنے کی ہر ممکن سعی کریں، اللہ تعالیٰ مولانا محمد رضا صاحب کو جزاء خیر دیں انہوں نے اس اہم فرض کو محسوس فرمایا، اس سے متعلق زیر نظر مفصل کتاب تحریر فرمائی، اللہ تعالیٰ ان کی اس محنت کو قبول فرمائیں اور امت کے لئے باعث ہدایت بنائیں اور دوسرے علماء احناف کے لئے سبق آموز بنائیں کہ وہ بھی اپنے فرض کی ادائیگی کے لئے پوری کوشش کریں،

بالخصوص ان علماء سے درد مندانہ گزارش ہے جنہوں نے مداہنت اور جمعہ فی القریٰ کے عمل سے عام حنفیوں کو دھوکہ دے رکھا ہے اور مذہب میں تلبیس و تحریف کے مرتکب ہیں کہ خدارا وہ احناف کو حنفی مذہب بتائیں اور تلبیس و دھوکہ دہی کے جرم عظیم سے توبہ کا اعلان کریں، اگر خدانخواستہ یہ علماء اس جرم سے توبہ نہیں کرتے تو حنفی عوام پر فرض ہے کہ ایسے علماء کا شدت سے محاسبہ کریں، اور ان سے جمعہ فی القریٰ سے متعلق حنفی مذہب کے اظہار کا مطالبہ کریں اور ان کو مجبور کریں کہ وہ یا تو مذہب حنفی پر عمل کریں ورنہ حنفیت چھوڑ کر غیر مقلدیت کا اعلان کریں کہ آدھا تیتر آدھا بٹیر ٹھیک نہیں۔

اللہ تعالیٰ یوم الحساب سے قبل رجوع و توبہ کی توفیق عنایت فرمائیں اور فکر آخرت و خوف حساب کا وہ درجہ عطا فرمائیں جو دنیوی تعلقات اور خود ساختہ مصالح کو مسالے کی طرح پیس ڈالے، واللہ الموفق وھو المستعان ولا حول ولا قوۃ الا بہ۔

رشید احمد

دار الافتاء والارشاد ناظم آباد کراچی

۲۰ صفر ۱۴۱۲ھ

جمعہ فی القریٰ کے لئے مذہب سے خروج

بخدمت اقدس محترم المقام حضرت مفتی صاحب مدظلہ العالی، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، فتویٰ جمعہ فی القریٰ ارسال خدمت ہے، فاضل محترم نے مذہب احناف کی پرزور مخالفت کی ہے، اپنے خیال کی تائید میں چند حوالجات بھی پیش کئے ہیں، احناف کے

مسلّمہ اور متفقہ اصول کے خلاف فتویٰ دیا ہے، امید ہے کہ جواب فتویٰ قدرے تفصیل سے تحریر فرمائیں گے تاکہ اس کو کتاب میں درج کیا جائے۔

سوال - کیا فرماتے ہیں علماء دین اس بات کے بارے میں کہ احناف کے نزدیک قریہ صغیرہ میں نماز جمعہ درست ہے یا نہیں؟ قریہ صغیرہ میں نماز جمعہ ادا کرنے سے نماز ظہر ذمہ سے ساقط ہو جائے گی یا نہیں، درصورت عدم جواز پڑھانے والا اور پڑھنے والا گنہگار ہوں گے یا نہیں؟

(۲) قریہ کبیرہ اور قریہ صغیرہ کی کیا تعریف ہے؟

(۳) آیۂ کریمہ اذا نودی للصلوٰۃ من یوم الجمعۃ فاسعوا الی ذکر اللہ وذروا البیع کا حکم خاص ہے یا عام؟ حوالۂ کتب تحریر کریں۔ فقط والسلام

الجواب وھو الموفق للصدق والصواب

(۱) اولاً - احناف کے نزدیک جمعہ فی القریٰ جائز نہیں، اس لئے کہ جمعہ کے وجوب کے لئے مصر کا ہونا شرط ہے، تمام متون کی کتب میں یہ مسئلہ صراحت کے ساتھ مذکور ہے۔

قال فی الھدایۃ لا تصح الجمعۃ الا فی مصر جامع او فی مصلی المصر ولا تجوز فی القری الخ (ھدایۃ ص ۱۴۸ ج ۱) وکذا لا تصح اداء الجمعۃ الا فی المصر وتوابعہ فلا تجب علی اھل القری التی لیست من توابع المصر ولا یصح اداؤھا فیھا الخ (بدائع ص ۲۵۹ ج ۱) عبارات مذکورہ سے معلوم ہوا کہ جو مقام خود مصر یا توابع مصر سے نہ ہو اس میں جمعہ جائز نہیں۔ لیکن علماء متقدمین میں سے ہندوستان میں حضرت امام شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ اور سندھ میں حضرت مولانا مخدوم محمد ہاشم ٹھٹھوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے جمعہ فی القریٰ کے جواز کے ساتھ نہ قائم کرنے والوں کو آثم اور گنہگار بھی کہا ہے۔ چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ حجۃ اللہ البالغہ میں بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں: اقول وذلک لانہ لما کان حقیقۃ الجمعۃ اشاعۃ الدین فی البلد وجب ان ینظر الی تمدن وجمع، والاصح عندی انہ یکفی اقل ما یقال فیہ قریۃ لما روی من طرق شتی یقوی بعضھا بعضاً خمسۃ لا جمعۃ علیھم وعد منھم اھل البادیۃ وقال صلی اللہ علیہ وسلم الجمعۃ علی الخمسین رجلاً اقول الخمسون تتقرر بھم قریۃ وقال صلی اللہ علیہ وسلم الجمعۃ واجبۃ علی کل قریۃ واقل ما یقال فیہ جماعۃ الخمسین لا یتحصل من الا بعضاً من الا قاھر فلو لم یجوزوا واللہ اعلم فاذا تحصل ذلک وجبت الجمعۃ ومن تخلف عنھا فھو الآثم ولا یشترط الوحی الخ

(حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ ص ۳) اسی طرح مخدوم محمد ہاشم رحمہ اللہ تعالیٰ اپنے فتوے میں جمعہ فی القریٰ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ پس اقامت کنندگان وراں قریہا ماجور ومثاب عند اللہ باشند وبافعال نماز جمعہ در قریہا آثم وبزہ گار نشوند وہو سبحانہ وتعالیٰ اعلم بحقیقۃ الحال نیز اس فتوے پر اس وقت کے علماء میں سے مفتی ضیاء الدین، مفتی عزت اللہ، مفتی محمد مقیم، قاضی ابو الحسن، قاضی عبد الرحمن، عبد اللہ عفی عنہ کے دستخط ہیں۔ تفصیل ملاحظہ ہو فتاوی واحدی ص ۳۲

ثانیاً فتاوی رشیدیہ میں ہے البتہ حسب مذہب شوافع وبعض محدثین کے جمعہ ادا ہوگیا اور ظہر ساقط ہوگئی۔ اور قانون ہے کہ مجتہد فیہ مسئلہ میں جب قاضی ایک طرف فیصلہ دیدے تو اس مسئلہ میں دوسرے مذاہب پر بھی عمل کرنا جائز ہے جیسے فتاوی واحدی میں ہے۔

بعد لواذن الوالی او القاضی ان یبنی الجمعۃ وبناء الجامع فی القریۃ الکبیرۃ فیہا سوق جاز لما فی المتانۃ لواذن الوالی او القاضی ان یعقد الجمعۃ وبناء الجامع فی قریۃ کبیرۃ فیہا سوق جاز بالاتفاق لان عند الشافعی رحمہ اللہ یصلی الجمعۃ بالقریۃ التی فیہا اربعون حرا بالغا عاقلا مقیما فکان ہذا فصلا مجتہدا فیہ فاذا اتصل بہ الحکم والقضاء صار مجمعا علیہ ونحوہ فی شرح المکارم الخ (فتاوی واحدی ص ۲۳)

مذکورہ عبارت سے معلوم ہوا کہ مجتہد فیہ مسئلہ میں قضاء قاضی کے بعد بالاتفاق عمل کرنا جائز ہے۔ تو جب جمعہ فی القریٰ مختلف فیہ مسئلہ بین الاحناف والشوافع ہے تو مخدوم صاحب اور شاہ ولی رحمہما اللہ تعالیٰ کے فتوے کے بعد اس پر بالاتفاق عمل کرنا صحیح ہے خصوصاً جبکہ پورے ملک میں جمعہ فی القریٰ عملاً نافذ ہے اب اس کو ترک کرنا مفاسد عظیمہ کا حامل ہو سکتا ہے، لہٰذا جہاں جمعہ پہلے سے جاری ہے اس کو بند نہ کرنا چاہیے اور جہاں گاؤں میں جمعہ جاری نہیں وہاں جاری نہیں کرنا چاہیے۔ چنانچہ کفایۃ المفتی میں سوال کیا گیا ہے کہ چھوٹے گاؤں میں جمعہ نہیں ہوتا مگر ہو رہا ہے تو اس صورت میں جو لوگ جمعہ پڑھیں گے ان کا فرض ادا ہو جائے گا یا نہیں، اگر نہیں ہوگا تو کیا ہوگا؟ جس جگہ جمعہ فرض نہیں وہاں جمعہ پڑھنے سے اپنے مذہب کے لحاظ سے چند مکروہات کا ارتکاب لازم آتا ہے۔ اول، نفل کی جماعت، دوم، نفل نہار میں جہر۔ سوم، غیر لازم کا التزام۔ چہارم، ترک جماعت فرض ظہر۔ پنجم، اگر کوئی ظہر نہ پڑھے تو ترک فریضہ کہ حرام وفسق ہے۔

الجواب: گاؤں میں جمعہ کا ہونا مجتہدین میں مختلف فیہ ہے، احناف کے نزدیک

جواز جمعہ کے لئے مصر ہونا شرط ہے لیکن مصر کی تعریف میں اختلاف عظیم ہے تاہم جن مقامات میں
زمانہ قدیم سے جمعہ قائم ہے وہاں جمعہ کو ترک کرانے میں جو مفاسد ہیں وہ ان مفاسد سے بدرجہا زائد
ہوتے ہیں جو سائل نے جمعہ پڑھنے کی صورت میں ذکر کئے ہیں جو لوگ جمعہ کو جائز سمجھ کر پڑھتے ہیں
ان کا فرض ادا ہو جاتا ہے نفل کی جماعت یا جہر بالقراءۃ در نفل نہار یا ترک فرض ظہر لازم
نہیں آتا (کفایۃ المفتی ص ۲۵۴ ج ۳) اس فتویٰ سے ظاہر ہوا کہ جمعہ فی القریٰ کے مسئلہ میں بضرورت
دفع فتنہ دوسرے مذاہب پر عمل کرنا جائز ہے خصوصاً جبکہ یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے اور اختلاف
مجتہدین سے تخفیف پیدا ہوتی ہے چنانچہ ہدایہ ص ۱ ج ۱ میں ہے لمکان الاختلاف۔ قال فی
العنایۃ فان اختلاف العلماء یورث تخفیفا [illegible]۔ پس اس فتنہ و فساد کے دور میں
جہاں جہاں جمعہ پہلے سے قائم ہے اس کو بند نہ کرنا چاہئے۔ اسی طرح علماء دیوبند سے بھی حضرت
مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا محمد یعقوب نانوتوی اور حضرت شیخ الہند اور علامہ عبد العلی
بحر العلوم رحمہم اللہ تعالیٰ جمعہ فی القریٰ پڑھتے تھے (کفایۃ المفتی ص ۲۵۵ ج ۳) آگے چل کر مفتی
کفایت اللہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں قلت وھذا وان کان غیر موافق لما علیہ الحنفیۃ
والحکمۃ اشد موافقۃ للمصالح الاسلامیۃ الاجتماعیۃ خصوصا فی ھذا العصر وفی ھذا
الزمان فان اعداء الاسلام یظفرون بمقاصدھم المشؤمۃ فی قری لا تقام فیہا الجمعۃ
ویخیبون فی مواضع اقامۃ الجمعۃ والتوفیق من اللہ عزوجل وحفاظۃ الاسلام
خیر من الاصرار علی ترکھا والمسألۃ مجتہد فیہا (کفایۃ المفتی ص ۲۵۶ ج ۳)

مذکورہ بالا حوالوں سے ثابت ہوا کہ وہ گاؤں جہاں پہلے سے جمعہ قائم ہے وہاں جمعہ
پڑھنے سے ظہر اس کے ذمہ سے ساقط ہو جائے گی اور جمعہ فی القریٰ پڑھنے والے
گنہگار نہیں،

(۲) مصر یا قصبہ جس کو قصبہ کبیرہ کہا جاتا ہے کی تعریفیں مختلف کی گئی ہیں۔ ایک تعریف
امام اعظم رحمہ اللہ سے منقول ہے وہ یہ ہے وروی عن ابی حنیفۃ انہ بلدۃ کبیرۃ
فیہا سکک واسواق ولہا رساتیق وفیہا وال یقدر علی انصاف المظلوم من
الظالم بحشمہ وعلمہ او علم غیرہ والناس یرجعون الیہ فی الحوادث وھو الاصح
(بدائع ص ۲۵۹ ج ۱)

دوسری تعریف یہ ہے وفی العالمگیریۃ ولاداؤھا (الجمعۃ) شرائط فی غیر المصلی منہا

المصر کذا فی الکافی والمصر فی ظاہر الروایۃ الموضع الذی یکون فیہ مفت او قاض یقیم الحدود وینفذ الاحکام وبلغت ابنیتہ ابنیۃ منی ھکذا فی الظہیریۃ وفتاوی قاضی خان وفی الخلاصۃ وعلیہ الاعتماد کذا فی التتارخانیۃ ومعنی اقامۃ الحدود القدرۃ علیہا ھکذا فی الغیاثیۃ ص ۱۴۵ ج ۱ ۔

تیسری تعریف۔ قال سفیان الثوری المصر الجامع ما یعدہ الناس مصرا عند ذکر الامصار المطلقۃ وعن عبد اللہ البلخی انہ قال احسن ما سمعت انہ اذا اجتمعوا فی اکبر مساجدھم لم یسعوالہم فھو مصر جامع وعن ابی حنیفۃ رحمہ اللہ ھو ما یجتمع فیہ مرافق اھلہ (ھدایۃ ص ۱۴۸ ج ۱) یہ کل پانچ تعریفیں ہیں تو مصر کی شرائط میں فقہاء نے بہت تنزل کیا حتیٰ کہ آخری تعریف تک اتر آئے اور اس تعریف پر غالباً کافر حکومت کے شہر مثلاً لندن وغیرہ بھی مصر میں داخل ہو جاتے ہیں، نیز بہت سے دیہات بھی مصر کی اس تعریف میں داخل ہو جاتے ہیں اور اس تعریف پر بہت سے مشائخ حنفیہ نے فتویٰ بھی دیا ہے۔ اور تنفیذ احکام و اقامت حدود والی تعریف آجکل کسی شہر پر بھی صادق نہیں ہے اور قدرۃ علی التنفیذ کی تاویل بھی اقامت حدود میں صحیح نہیں کیونکہ حدود شرعیہ قانون مروج کے ماتحت ممتنع الاقامۃ ہیں حتیٰ کہ والیانِ ریاست بھی رجم پر قدرت نہیں رکھتا اس لئے اس کو جواز جمعہ کے لئے مدارِ حکم ٹھہرانا کسی طرح بھی درست نہیں کذا فی کفایۃ المفتی لمولانا کفایۃ اللہ رحمہ اللہ تعالیٰ والتفصیل فلیتطالعہ ثمہ۔

(۴) آیت کریمہ احناف کے نزدیک خاص ان اماکن سے ہے جہاں جمعہ واجب ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

الجواب باسم ملہم الصواب

اس تحریر میں تسلیم کر لیا گیا ہے کہ مذہب حنفی میں جمعہ فی القریٰ کا کوئی جواز نہیں، اس کے بعد خلافِ نصوص مذہب چند اقوال کا سہارا لے کر جواز کا قول کیا گیا ہے جو کسی اہل علم کے لئے ہرگز زیبا نہیں، تتبع و تفتیش سے ہر مسئلہ میں ہر قسم کے اقوال ملیں گے مگر ان کی بنا پر خروج عن المذہب ہرگز جائز نہیں، ورنہ مذہب صرف بازیچۂ اطفال بن کر رہ جائے گا ہر بوالہوس اپنی ہوس کے مطابق کوئی نہ کوئی قول کھود کرید کر نکال لائے گا اور گلستانِ مذہب میں اس کا پیوند لگانے کی کوشش کرے گا جو مذہب پرستی نہیں بلکہ ہویٰ پرستی ہے اور قولہ تعالیٰ افرأیت من اتخذ

ارأیت من اتخذ الٰھہ ھواہ افانت تکون علیہ وکیلا (الفرقان) ومن اضل ممن اتبع ھواہ بغیر ھدی من اللہ (القصص)

افرأیت من اتخذ الٰھہ ھواہ واضلہ اللہ علی علم (الآیۃ) (الجاثیہ) کا مصداق ہے۔

الغرض مذہب کا قلادہ گلے سے نکال پھینکنے کے بعد ایسے بے مہار ہو جاتے ہیں کہ اس کے سامنے بڑے سے بڑے فتنے میں مبتلا ہونا بھی کوئی بڑی بات نہیں اس لئے امن وسلامتی کی راہ یہی ہے کہ بدون ضرورت شدیدہ قول امام سے ہرگز ہرگز انحراف نہ کیا جائے، ضرورت شدیدہ کی تفصیل اور جواز فتوی بمذہب غیر کی شرائط حیلہ ناجزہ اور جدہ کے رسالہ السبک الفرید مندرجہ احسن الفتاوی جدید جلدوں میں ملاحظہ ہوں تحریر مذکور کے جواب کے لئے یہ سطور کافی ہیں مزید تشفی کے لئے اس کا تجزیہ بھی کیا جاتا ہے۔

قولہ: ہندوستان میں حضرت امام شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ الخ

اقول: حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے جواز جمعہ کے لئے کم از کم پچاس نفر کا قریہ ہونا شرط قرار دیا ہے اور آپ اس سے مطلقاً جواز ثابت کر رہے ہیں، بلکہ سندھ کے ایسے قری میں بھی جمعہ پڑھا جاتا ہے جہاں باجماع ائمہ اربعہ جمعہ صحیح نہیں، اس پر بھی سندھ کا کوئی عالم نکیر نہیں کرتا۔

قولہ: اور سندھ میں حضرت مولانا مخدوم محمد ہاشم ٹھٹھوی رحمہ اللہ تعالیٰ الخ

اقول: اس کا مفصل جواب میں پہلے لکھ چکا ہوں جو میرے رسالہ التنبیہ کا جزء بن کر احسن الفتاوی جدید جلد چہارم میں عنقریب طبع ہونے والا ہے، ان شاء اللہ تعالیٰ، اس کے آخر میں یہ بھی ہے کہ حضرت مخدوم رحمہ اللہ تعالیٰ کی مطبوعہ یا مخطوطہ تصانیف میں اس تحریر کا کوئی سراغ نہیں ملتا اور استدلال کے لحاظ سے ایسی ساقط تحریر سے مقام مخدوم بہت بلند ہے۔

قولہ: فتاوی رشیدیہ میں ہے الخ

اقول: فتاوی رشیدیہ میں خروج عن المذہب کا جواز کہیں مذکور نہیں۔

قولہ: اور قانون ہے کہ مجتہد فیہ مسئلہ میں جب قاضی ایک طرف فیصلہ دیدے الخ

اقول: کس قریہ میں کس قاضی نے اقامت جمعہ کا فیصلہ دیا ہے؟ نیز آپ تو ہر قریہ میں جواز کے قائل ہیں، جواز جمعہ باذن حاکم کی مفصل بحث کا بھی رسالہ التنبیہ میں اضافہ کر دیا گیا ہے۔

قولہ: تو جب جمعہ فی القری مختلف فیہ بین الاحناف والشوافع ہے تو مخدوم صاحب اور شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے فتوے کے بعد اس پر بلاتفاق عمل کرنا صحیح ہے۔

اقول: من لا یعرف الفرق بین الافتاء والقضاء لا یجوز لہ الاقتحام فی ھذا المقام، علاوہ ازیں سندھ

میں تو ایسے قریٰ میں بھی جمعہ ہو رہا ہے جہاں بالاجماع المذاہب الاربعہ کوئی گنجائش نہیں، آپ نے اس کا کیا تدارک کیا؟

قولہ: جبکہ پورے ملک میں جمعہ فی القریٰ نافذ ہے اب اس کو ترک کرنا مفاسد عظیمہ کا حامل ہو سکتا ہے الخ

اقول: یہ علماء کی مداہنت اور عوام سے کتمانِ حق و تلبیسِ مذہب کا ثمرہ ہے، اگر اب بھی دعوت بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ پر عمل کیا جائے اور والآمرون بالمعروف والناھون عن المنکر والحافظون لحدود اللہ کے تحت امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں حفظِ حدود کا اہتمام کیا جائے تو فساد کا کوئی خطرہ نہیں، اس کا طریقہ یہ ہے کہ حنفی علماء کرام و مشائخ عظام متفقہ طور پر فیصلہ لکھیں کہ "جمعہ فی القریٰ مذہب حنفی میں جائز نہیں، اور بعض قری میں بالاجماع باطل ہے، گاؤں میں جمعہ پڑھنے سے ظہر کا فرض ساقط نہ ہوگا، مزید برآں مذہب کی تحریف، مذہب میں تلبیس، نوافل کی جماعت، دن کے نوافل میں جہراً قراءت اور جماعتِ ظہر کے ترک کا گناہ الگ ہوگا، نیز اقتداء قراءت کا وجوب عمداً ترک کرنے کی وجہ سے یہ دوگانہ نفل واجب الاعادہ ہوگا، لہٰذا احناف گاؤں میں جمعہ نہ پڑھیں، اگر اہلِ حدیث پڑھیں یا کوئی حنفی خلافِ مذہب پڑھنے پر مصر ہو تو اس سے تعرض نہ کریں، اسی طرح جمعہ پڑھنے والے لوگ مذہب حنفی کے مطابق جمعہ نہ پڑھنے والوں پر کوئی اعتراض اور طعن و تشنیع نہ کریں"

پھر علماء و مشائخ اس فیصلہ کا اعلان کریں اور خود اس کی پابندی کریں، کم از کم اس کا اتنا فائدہ تو ضرور ہوگا کہ کتمانِ حق اور مذہب میں تلبیس و تحریف کے جرم کا تدارک ہو جائے گا اور اظہارِ حق کا فرض ادا ہو جائے گا، عوام مذہب حنفی کے بارے میں غلط فہمی میں نہ رہیں گے اس سے بھی بڑھ کر ظنِ غالب بلکہ یقین ہے کہ مسلمانوں کی اکثریت علماء کے متفقہ فیصلہ سے انحراف نہ کرے گی۔

جمعہ فی القریٰ بند کرنے کے مفاسد موہومہ سے ڈرایا جا رہا ہے اور اجازتِ جمعہ کے مفاسد موجودہ سے اعراض کیا جا رہا ہے، کیا یہ صریح تضاد نہیں ہے؟ جمعہ فی القریٰ کی اجازت کا ایک بڑا فتنہ یہ ہے کہ اس بنا پر ایسے مقامات میں بھی جمعہ پڑھا جا رہا ہے جہاں عدمِ صحتِ جمعہ پر ائمہ اربعہ کا اجماع ہے، سندھ میں بکثرت ایسے مقامات ملیں گے، کیا ان کا وبال و عذاب مداہن علماء کی گردن پر نہیں ہوگا؟

قولہ: علماء دیوبند سے بھی حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا محمد یعقوب نانوتوی اور حضرت شیخ الہند اور علامہ عبد العلی بحر العلوم رحمہم اللہ تعالیٰ جمعہ فی القریٰ پڑھتے تھے۔
(کفایۃ المفتی ص۲۱۱ ج۳)

اقول: میرے پاس کفایۃ المفتی نہیں، اس لئے میں نے دار العلوم ٹیلیفون کیا، مفتی عبد الرؤف صاحب نے کفایۃ المفتی کی کچھ عبارت ٹیلیفون پر مجھے سنائی، جس کا حاصل یہ تھا کہ کسی نے موضع پھلت کے ایسے کوائف بیان کئے ہیں جن سے اس کا قصبہ ہونا ثابت ہوتا ہے اور اس میں علماء مذکورہ کا جمعہ ادا کرنا لکھا ہے، اس کے جواب میں حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ خود سوال میں مذکورہ کوائف کے پیش نظر اس موضع میں جمعہ صحیح ہے، میں یہ باور نہ کر سکا کہ کوئی عالم نقل میں ایسی صریح خیانت کی جرأت کر سکتا ہے اس لئے میں نے مفتی عبد الرؤف صاحب سے کہا کہ کفایۃ المفتی کی عبارت نقل کرکے بھیجیں تاکہ میں اس پر غور کر سکوں، چنانچہ مرسلہ عبارت مندرجہ ذیل ہے:

> ضلع مظفر نگر میں ایک جگہ پھلت ہے جس میں کل تعداد اکیس سو آدمیوں کی ہے، اشیاء ضروری دستیاب ہو جاتی ہیں، چھ دکانیں پرچون کی ہیں، دو بزاز کی، دو عطار کی، تین درزی کی، پانچ چھ جولاہے اور متفرق ہیں، دس گیارہ دکانیں قصابوں کی ہیں، پانچ چھ حکیم ہیں، حافظ پندرہ بیس کے قریب ہیں، مولوی پندرہ بیس کے قریب ہیں، ایک بازار ہفتہ وار ہوتا ہے، چار مسجدیں ہیں ایک ان میں سے جامع مسجد کے نام سے مشہور ہے ایک مدرسہ اسلامیہ ہے جو فیض الاسلام کے نام سے موسوم ہے، چونکہ ترویج کی کوئی دکان نہیں، تھانہ، ڈاکخانہ، شفاخانہ، مدرسہ سرکاری ان میں سے کوئی چیز بھی نہیں الخ، جواب: پھلت کی یہ حیثیت جو سوال میں مذکور ہے اس کو قریہ کبیرہ بنانے کے لئے کافی ہے اس لئے اس میں اقامت جمعہ جائز ہے الخ۔“

میں نے بہت غور کیا کہ کفایۃ المفتی کی مذکورہ عبارت سے تحریر پیش نظر کے استخراج کی کوئی صورت اور محرر کی طرف نسبت خیانت سے حفاظت کے لئے کسی بعید سے بعید تاویل کی کوئی گنجائش نکل آئے مگر اب تک میرے ذہن میں ایسی کوئی صورت نہیں آرہی، واللہ اعلم،

[illegible] ـــ ۳۰

علاوہ ازیں یہ امر مسلّم ہے کہ کوئی کتنا ہی بڑا محقق جمہور کے خلاف قول کرے تو اس کا اتباع جائز نہیں، مسلک جمہور ہی واجب الاتباع ہے، جب دائرۂ مذہب کے اندر بھی جمہور کے خلاف قول کا اتباع ممنوع ہے تو خلاف مذہب قول کا اتباع بطریق اولیٰ ناجائز ہوگا چنانچہ محقق ابن الہمام رحمہ اللہ تعالیٰ مجتہد فی المذہب ہیں، آپ کا مقام تفقہ صرف مشائخ احناف ہی میں نہیں بلکہ پورے عالم اسلام میں مسلّم ہے، معہذا یہ بھی مسلّمات میں سے ہے کہ آپ کی جو تحقیقات خلاف مذہب ہیں ان کا اتباع جائز نہیں۔ (شرح عقود رسم المفتی ص ۲۵)

قولہ: مصر یا قصبہ جس کو قریہ کبیرہ کہا جاتا ہے کی تعریفیں مختلف کی گئی ہیں۔

اقول: مصر کی اصل تعریف یعنی حد تام یہ ہے کہ اس کو عرف عام میں مصر شمار کیا جاتا ہو، کما نقلہ الخوارزمی عن الامام الثوری رحمہ اللہ تعالیٰ، اور عرف عام میں مصریت کے لئے یہ لازم ہے کہ گلی کوچے ہوں، بازار میں دو رویہ آپس میں متصل دکانیں ہوں، عمارتیں پختہ ہوں اور ضرورت کی کثر اشیاء مل سکتی ہوں۔ حضرت امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ سے منقول تعریف "انہ بلدۃ کبیرۃ فیھا سکک واسواق ولھا رساتیق الخ" سے بھی اصل مقصود یہی ہے، اس تعریف میں مذکور دوسرے امور اور دوسری تعریفیں مصر کی حد تام نہیں بلکہ رسوم ہیں جو ہر زمان و مکان میں بدلتی رہتی ہیں، روایۃً بھی ظاہر اور مسلّم ہے کہ جن الفاظ کے شریعت نے خود کوئی مخصوص معنی متعین نہیں کئے وہ اصل لغت اور عرف عام پر ہی محمول ہوتے ہیں، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عرف عام سے الگ مصر کے کوئی خاص معنی متعین نہیں فرمائے اس لئے یہ لفظ عرف عام پر ہی رہیگا حضرات فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ نے اپنے اپنے زمانہ میں مصر کی علامات کے مطابق مختلف تعریفیں بیان فرمائی ہیں اس لئے نہ ان تعریفوں میں کوئی تضاد ہے اور نہ ہی ان کے وجود و عدم پر مصریت کا مدار۔

قولہ: اس تعریف پر خالص کافر حکومت کے شہر مثلاً لندن وغیرہ بھی مصر میں داخل ہو جاتے ہیں۔

اقول: حیرت ہے کہ آج کی دنیا میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جن کو لندن کے شہر ہونے میں شبہ ہے۔

قولہ: نیز بہت سے دیہات بھی اس تعریف میں داخل ہو جاتے ہیں۔

اقول: ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ والی، مفتی، قاضی، قدرت علی اقامۃ الحدود، عدم الوسعۃ فی اکبر المساجد، اجتماع مرافق الاہل وغیرہ مصر کی حد تام نہیں بلکہ رسوم ہیں اس لئے مصریت کا وجود و عدم

ان سوالات کے وجود و عدم پر موقوف نہیں، رسوم و علامات مختلف ازمنہ و امکنہ و حالات میں تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔

قولہ: آیت کریمہ احناف کے نزدیک عام ہے اور ائمہ کے ہاں جواز جمعہ واجب ہے۔

اقول: آیت کی تخصیص کے صرف احناف ہی قائل نہیں بلکہ اس کے عدم عموم پر اجماع ہے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم من قبل اتباع الہوٰی

رشید احمد

۲۸ جمادی الآخرۃ ۷۷ھ

اتباع ہوٰی کے لئے حیلۂ اذن حاکم

سوال: جمعہ فی القریٰ کے مسئلہ پر ہمارے شہر سنگان واقع زیرائی بلوچستان میں کافی اختلاف پیدا ہوا ہے۔ اس وقت وہاں صف اول کے مختلف علماء کرام کے درمیان اختلاف ہے، ایک فریق کے نزدیک کسی بھی قریہ صغیرہ میں استاندار یا فرمانداریعنی صوبے کے گورنر یا علاقے کے کمشنر یا ڈپٹی کمشنر کی تحریری اجازت سے ہر قسم کے گاؤں میں جمعہ و عیدین جائز ہے کیونکہ مجتہد فیہ مسائل میں حکم حاکم رافع اختلاف ہے، اور دوسرا فریق اس کے برخلاف عدم جواز کا قائل ہے، فریقین کی تحریریں ارسال خدمت ہیں، براہ کرم ان پر نظر فرما کر فیصلہ تحریر فرمائیں۔ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

اس حیلہ سے خروج عن المذہب ہرگز جائز نہیں، اس فریق کے قول میں مندرجہ ذیل اغلاط ہیں:

(۱) صحت جمعہ فی القریٰ کے لئے حاکم سے اجازت حاصل کرلینا کافی نہیں بلکہ حاکم کی طرف سے اقامت جمعہ کا امر لازم ہے۔

(۲) امر حاکم سے ہر قریہ میں جمعہ جائز نہیں بلکہ صرف ایسے قریٰ میں جائز ہے جہاں مذاہب اربعہ میں سے کسی مذہب میں جمعہ صحیح ہو، جہاں باتفاق مذاہب اربعہ جمعہ باطل ہو وہاں امر حاکم سے بھی جائز نہیں،

(۳) حکم بخلاف مذہب نافذ نہیں ہوتا، اس لئے اقامت جمعہ فی القریٰ کا حکم ایسے

حاکم کی طرف سے ہونا ضروری ہے جس کے منصب میں اس کا جواز ہو، حقیقی حاکم کا تصریحی نہیں،

(۴) امر حاکم صرف اس کی حدود ولایت تک محدود ہوگا، اس کی حدود سے باہر قریٰ میں جمعہ جائز نہیں۔

(۵) حاکم آمر کے عزل یا موت سے اس کا امر ختم ہو جائے گا، اس کے بعد بدون امر حاکم جدید جمعہ فی القریٰ جائز نہ ہوگا۔

ان امور پر دلائل کی تفصیل میرے رسالہ "الحسنیٰ فی مسئلۃ الجمعۃ والخطبۃ" میں ہے۔

اس زمانے میں ایسے حکام معدوم ہیں جو دینی جذبہ کے تحت اقامت جمعہ کا حکم دیں، بلوچستان ہی کا ایک واقعہ ہے کہ کسی حاکم کے پاس مولویوں کی ایک جماعت جمعہ فی القریٰ کی اجازت کے لئے حاضر ہوئی، اس نے کہا کہ آپ کتنے دنوں کے بعد جمعہ پڑھتے ہیں؟ انھوں نے جواب دیا ہفتہ میں ایک بار، حاکم بولا روزانہ پانچ بار پڑھا کرو۔ کیا شعائر دین کے ساتھ اس تلعب واستہزاء کا عذاب ان مولویوں پر نہیں ہوگا؟ ایسا حاکم ملنا مشکل ہے جو مسلمان ہو، شیعہ نہ ہو، دین کا مذاق اڑانے والا نہ ہو، غیر حنفی ہو، پھر اقامت جمعہ فی القریٰ کا حکم صادر کرنے میں اس کو کوئی تردد نہ ہو، اس میں صرف اجازت نہیں بلکہ واجب التعمیل سرکاری حکم جاری کرے۔

علاوہ ازیں اگر حکم حاکم سے جمعہ فی القریٰ رائج ہو گیا تو عوام اس کو سند بنا کر شرائط مذکورہ کی رعایت کئے بغیر ہر جگہ جمعہ پڑھنے لگیں گے، عوام کی اس گمراہی اور ان کی نمازوں کی بربادی کا وبال وعذاب ان مولویوں پر ہوگا جو اتباع ہوی کے لئے اذن حاکم کا بہانہ تلاش کر رہے ہیں۔

سوال میں لکھا گیا ہے کہ اس مسئلہ میں وہاں صف اول کے علماء میں اختلاف ہے، اس پر بہت تعجب ہوا، ایسی بدیہی اغلاط اور مذہب کے ساتھ تلاعب کسی معمولی صاحب علم سے بھی بہت بعید ہے چہ جائیکہ صف اول کے کسی عالم سے ایسی جہالت کا ظہور، اگر خدانخواستہ واقعۃً وہاں کے صف اول کے علماء کی یہ حالت ہے تو ایسی قوم کا خدا ہی حافظ۔ فقط وقانا اللہ وایاہم من فتن الجہالۃ فی زمن العلم۔

رشید احمد

۲ر ذی الحجہ ۸۸ھ

جمعہ فی القریٰ سے متعلق اثر زہری کا جواب

سوال: کیا مجوزین جمعہ فی القریٰ کا یہ استدلال صحیح ہے جو بخاری شریف باب الجمعہ میں مذکور ہے مروی ہے کہ رزیق بن حکیم نے ابن شہاب زہری رحمہ اللہ تعالیٰ کو خط لکھا کہ کیا میں یہاں زمین ایلہ میں جمعہ پڑھ لیا کروں جہاں چند سوڈانی مسلمان وغیرہ رہتے ہیں، انہوں نے جواب دیا کہ ضرور پڑھو، مجوزین جمعہ نے اس حدیث سے جو نتیجہ نکالا کہ محمد بن شہاب زہری رحمہ اللہ تعالیٰ نے رزیق کو ایک چھوٹے گاؤں ایلہ میں جمعہ پڑھنے کا حکم دیا۔ اس سے متعلق چند سوالات دریافت طلب ہیں:

(۱) جہاں امام زہری رحمہ اللہ تعالیٰ نے جمعہ کی اجازت دی تھی وہ جگہ گاؤں یا قصبہ یا شہر سے تھی؟

(۲) اگر یہ جگہ گاؤں ہی تھی تو امام زہری رحمہ اللہ تعالیٰ نے یہ فتویٰ کیا اپنے اجتہاد سے دیا تھا؟ کیا احناف کے لئے قابل قبول ہے جبکہ عدم جواز جمعہ فی القریٰ کے سلسلہ میں حدیث صریح صحت کے ساتھ موجود ہے!

(۳) ایلہ میں امام زہری نے حاکم ہونے کی صورت میں جمعہ کا حکم دیا تھا؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

اس میں مختلف احتمالات ہیں:-

(۱) اس مقام کا قریہ ہونا ثابت نہیں، وجود والی واجتماع ناس سے قصبہ ہونا راجح ہے۔

(۲) ممکن ہے کہ یہ جگہ فنائے ایلہ میں ہو، جو مصر کبیر تھا۔

(۳) رزیق کا استیذان اپنی قیامگاہ پر اقامت جمعہ سے متعلق نہیں بلکہ ایلہ میں حضور جمعہ سے متعلق ہو۔

(۴) رزیق کا استفتاء جمعہ فی القریٰ سے متعلق نہیں بلکہ اذن امیر کے بارے میں ہے، اگر امیر عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایلہ میں اذن اقامت جمعہ ہے تو اس صورت میں حوالی ایلہ میں اذن ثابت ہوگا یا نہیں؟ امام زہری رحمہ اللہ تعالیٰ کے جواب کا حاصل یہ ہے کہ جس طرح آپ کی ایلہ پر ولایت اس کے حوالی پر بھی شامل ہے اسی طرح اذن اقامت جمعہ بھی حوالی ایلہ کو شامل ہے۔

(۵) یہ اثر زہری رحمہ اللہ تعالیٰ ہے جو حجت نہیں۔

مندرجہ بالا جوابات تبرعاً لکھدئے ہیں، ورنہ قریٰ میں عدم جواز جمعہ پر قرآن وحدیث کے مقابلہ میں اس قسم کے اقوال کوئی حیثیت نہیں رکھتے، ان کی طرف التفات اور جواب کی کاوش تضییع اوقات ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

رشید احمد
۱۹ رجب سنہ ۱۴۰۱ھ

(ضمیمہ تتمہ میں ہے)

باب الجنائز

حیاۃ الانبیاء علیہم السلام

سوال: ما قولکم رحمکم اللہ فی حیاۃ الانبیاء علیہم السلام اھی برزخیۃ او دنیویۃ بینوا توجروا

الجواب ومنہ الصدق والصواب

حیاۃ الانبیاء علیہم السلام برزخیۃ ولکن بلغت حد الکمال فلذا یترتب علیہا بعض الاحکام الحیاۃ الدنیویۃ من تحریم نکاح الازواج المطہرات وعدم اکل الارض اجسادہم وعدم جریان الارث فی اموالہم۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۵ر جمادی الاولیٰ ۸۵ھ

سوال مثل بالا:

سوال: حیاۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقت پر روشنی ڈال کر ممنون فرمائیں۔

الجواب ومنہ الصدق والصواب

بقاء روح تو ظاہر ہے اس میں کوئی شک نہیں بجمیع مسلمانوں بلکہ جملہ اہل مذاہب کی ارواح بالاتفاق باقی رہتی ہیں فنا نہیں ہوتیں پس انبیاء علیہم السلام یا شہداء پر احیاء کا اطلاق خصوصیت سے اس لئے ہوتا ہے کہ حیات سے مراد عدم تعطل اور موت بمعنی تعطل ہے۔ عام محاورات میں بھی تعطل پر موت کا لفظ اطلاق کیا جاتا ہے۔ ارواح انبیاء علیہم السلام چونکہ قبروں میں معطل نہیں بلکہ عبادات مثل اذان، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ اعمال میں مشغول ہیں لہٰذا ان پر حیات کا لفظ اطلاق کیا گیا اور جو لوگ دنیا میں اعمال خیر سے معطل تھے برزخ میں بھی ان کی ارواح خیر سے معطل رہتی ہیں اس تعطل پر موت کا لفظ اطلاق کیا جاتا ہے، نفوس سعیدہ کے لئے بڑی لذت عبادت ہی میں ہے۔ اگر یہی نعمت ان سے قبروں میں سلب کر لی جائے تو ان کے لئے عذاب ثابت ہوگا کیونکہ لذت اور عبادت کا سلب ہو جانا بھی ایک بڑا عذاب ہے بس بموجب ارشاد نبوی "قرۃ عینی فی الصلوٰۃ" ان ارواح سعیدہ کو قبروں میں بھی عبادات کی نعمت عطا کر دی گئی

آنکھیں ٹھنڈی کی جاتی ہیں، جیسے دنیوی حیات میں اعمالِ خیر کے مدارج و مراتب ہیں۔ ایسے ہی دنیا میں تفاوتِ اعمال کی وجہ سے برزخی زندگی میں بھی تعطل اور اشتغال فی اعمال الخیر کے مختلف مراتب ہیں، اسی تقریر سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا مطلب بھی واضح ہو جاتا ہے کہ جب کوئی شخص مجھ پر سلام کہتا ہے اس وقت اللہ تعالیٰ مجھ پر میری روح کو رد کر دیتے ہیں تو میں سلام کا جواب دیتا ہوں، اس کا مقصد یہی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہر وقت معارفِ الٰہیہ میں مستغرق رہتے ہیں، جب کوئی سلام کہتا ہے اس کی طرف توجہ فرماتے ہیں، اسی توجہ کو عالمِ دنیا کی طرف توجہ کرنے کو ردِ روح سے تعبیر کیا گیا، جیسا کہ حضرات کے بروقت نہ جاگنے کے سلسلہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ان اللہ قبض ارواحکم حین شاء وردھا علیکم حین شاء، قبض روح سے مراد ہے کہ نوم کی وجہ سے دنیوی افعال سے معطل ہو جاتی ہیں اور رد سے مراد ہے افعالِ دنیا میں اشتغال و عدمِ تعطل۔ غرضیکہ انبیاء، شہداء، علماء و اولیاء چونکہ قبور میں اعمالِ خیر سے معطل نہیں، اس لئے ان پر احیاء کا اطلاق کیا گیا۔ باقی یہ اعتراض فضول ہے کہ قبور سے اذان وغیرہ کی آواز کیوں سنائی نہیں دیتی یا اولیاء قبور سے نکل کر نماز وغیرہ کرتے دکھائی کیوں نہیں دیتے، اس لئے کہ عالمِ برزخ کی مشابہت عالمِ رؤیا کے ساتھ ہے۔ وجودِ عینی اور وجودِ ذہنی کی طرح وجودِ مثالی اور وجودِ برزخی بھی ایک مستقل وجود ہے، جیسا کہ نائم کے پاس بیٹھنے والے کو کوئی علم نہیں ہوتا کہ اس وقت نائم رؤیا میں کیا دیکھ رہا ہے حالانکہ اسے رؤیا میں کبھی عذاب ہو رہا ہے سانپ کاٹ رہا ہے یا کوئی قتل کر رہا ہے یا خواب میں جماع کر رہا ہے یا پھل وغیرہ عمدہ عمدہ طرح طرح کے کھانے کھا رہا ہے، یا خواب میں حج، زکوٰۃ، اذان، صلوٰۃ و صوم وغیرہ افعال ادا کر رہا ہے مگر پاس بیٹھنے والے کو اس کا ذرہ برابر بھی احساس نہیں ہوتا۔ ایسے ہی عالمِ برزخ کے افعال و احوال اور عذابِ قبر وغیرہ تفصیلات اسی عالم کے رہنے والوں پر کھلتی ہیں۔ ھکذا افاد مولانا الشاہ محمد انور الکشمیری قدس اللہ سرہ العزیز۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۲ رصفر سنہ ۹۳ھ

سوال مثل بالا:

سوال: آجکل پنجاب میں مسئلہ حیاۃ النبی کا بہت چرچا ہے، ہر جگہ اسی سے متعلق سرگوشیاں نظر آرہی ہیں، امید ہے کہ اس میں قولِ محقق و فیصل تحریر فرما کر رہنمائی فرمائیں گے۔ واجرکم عند اللہ کریم۔

الجواب ومنہ الصدق والصواب

بندہ کے خیال میں اس مسئلہ کو جانبین نے اہمیت دیکر اتنا غلو کیا ہے کہ حدود سے بہت تجاوز کر گئے ہیں، مسئلہ کی ایسی اہمیت نہ تھی کہ اس پر اختلاف و افتراق تک نوبت آئے اور اگر کچھ اختلاف کرنا ہی تھا تو صرف علماء تک محدود رکھنا ضروری تھا، ہزاروں مسائل میں علماء کا اختلاف ہوتا رہے

مگر ایسے مسائل کو عام سطح پر لا کر عامۃ المؤمنین کے اذہان کو مشوش کرنا، مناظروں کے چیلنج دینا، ایک دوسرے کے خلاف اشتہار بازی اور پمفلٹ شائع کرنا، اور اسی موضوع پر جلسے قائم کر کے امت کے شیرازہ کو اس طرح منتشر کرنا کوئی جواز نہیں رکھتا۔ علماء کا افتراق ان کی علمی برتری کا نتیجہ ہوتا ہے کہ عوام علماء دین سے متنفر ہو کر دین کی رہی سہی رغبت و محبت سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں، ان حالات کے پیش نظر اس مسئلہ کو اٹھانے پر زور دینا سخت گناہ ہے، حیات مطلق حیات جسم قرآن سے ثابت ہے، بس اس اجمال پر ایمان رکھنا فرض ہے، اس کی تفصیل منصوص نہیں، نہ اس پر ایمان رکھنا ضروری اور نہ ہی اس کی تحقیق و تدقیق کے ہم مکلف ہیں، مجھے تو خطرہ ہے اس کی تحقیق میں پڑنا کسی فتنہ کا سبب نہ ہو ورنہ کم از کم غیر ضروری امر میں اوقات و قوی کی تضییع کے وبال سے تو خالی نہیں۔ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من حسن اسلام المرء ترکہ مالا یعنیہ، وقال صلی اللہ علیہ وسلم علامۃ اعراض اللہ تعالی عن العبد اشتغالہ بمالا یعنیہ، وقال صلی اللہ علیہ وسلم اللھم انی اعوذبک من علم لا ینفع وقلب لا یخشع ومن دعوۃ لا یستجاب لھا، تعوذ کے ان تینوں جملوں کی ترتیب سے ثابت ہوتا ہے کہ علم غیر نافع میں شغل سلب خشوع قلب کا سبب ہے اور سلب خشوع قلب عدم اجابت دعا کا سبب ہے۔
فقط واللہ تعالی اعلم

۳۰ ذی قعدہ [illegible]

مسجد میں نماز جنازہ مکروہ ہے:

سوال: مسجد میں نماز جنازہ پڑھنا کیسا ہے؟ اگر جائز نہیں تو حرمین شریفین میں کیوں پڑھتے ہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب ومنہ الصدق والصواب

بلا عذر مسجد میں نماز جنازہ پڑھنا مکروہ تحریمی ہے[1]، خواہ جنازہ مسجد کے اندر ہو یا باہر، البتہ اگر نماز کے لئے کوئی دوسری جگہ نہ ہو تو عذر کی وجہ سے مسجد میں کراہت نہیں، قال فی العلائیۃ وکرھت تحریما وقیل تنزیھا فی مسجد جماعۃ ھو ای المیت فیہ (الی ان قال) والمختار الکراھۃ مطلقا، وفی الشامیۃ انما تکرہ فی المسجد بلا عذر فان کان فلا اھ (رد المحتار ص ۵۹۴ ج ۱) حرمین شریفین میں نماز جنازہ سے استدلال اس لئے صحیح نہیں کہ یہ ان کا مسلک ہے۔
فقط واللہ تعالی اعلم

۲۲ ذی قعدہ [illegible]

---

[1] کراہت تنزیہیہ کا قول راجح ہے تفصیل تتمہ میں ہے۔

سوال مثل بالا:

سوال: امام اور بعض قوم مسجد کے باہر ہوں اور باقی مقتدی مسجد میں تو یہ نماز جنازہ ہو جائے گی یا نہیں؟ حاشیہ ہدایہ میں ہے کہ یہ صورت بالاتفاق جائز ہے، اذا كانت الجنازة في المسجد فالصلوٰة عليها مكروهة باتفاق اصحابنا وان كانت الجنازة والامام وبعض القوم خارج المسجد والباقي فيه لم تكره باتفاق اصحابنا وان كانت الجنازة وحدها خارج المسجد ففيه اختلاف المشائخ رحمهم الله تعالى قال بعضهم يكره منهم السيد ابو شجاع لان المسجد بني لاداء المكتوبات وقال بعضهم لا يكره لان المعنى الموجب للكراهة وهو احتمال تلويث المسجد مفقود (هامش الهداية اولين باب الجنائز ص ۱۸۱) اس صورت کو اصلاحات فتاویٰ دار العلوم دیوبند مطبوعہ دار العلوم کراچی میں بھی بلا کراہت جائز قرار دیا ہے، اور دیگر مذکورہ بالا عبارت کی روشنی میں جواب مطلع فرمائیں، بینوا توجروا

الجواب باسم ملهم الصواب

حاشیہ ہدایہ کی یہ عبارت ماخوذ ہے، دوسرے تمام فقہاء کرام رحمہم اللہ تعالیٰ نے اس کو غلط قرار دیا ہے، اور اس صورت میں جواز بالاتفاق کے قول کی تردید فرمائی ہے، قال العلامة ابن نجيم رحمه الله تعالى: (قوله ولا في مسجد جماعة) لحديث ابي داود مرفوعا من صلى على ميت في المسجد فلا اجر له وفي رواية فلا شيء له اطلقه فشمل ما اذا كان الميت والقوم في المسجد او كان الميت خارج المسجد والقوم في المسجد او كان الامام مع بعض القوم خارج المسجد والقوم الباقون في المسجد او الميت في المسجد والامام والقوم خارج المسجد وهو المختار خلافا لما اورده النسفي كذا في الخلاصة وهذا الاطلاق في الكراهة بناء على ان المسجد انما بني للصلوٰة المكتوبة وتوابعها من النوافل والذكر وتدريس العلم وقيل لا يكره وهو مبني على ان الكراهة لاحتمال تلويث المسجد والاول هو الاوفق لاطلاق الحديث كذا في فتح القدير فما في غاية البيان والعناية من ان الميت وبعض القوم اذا كانا خارج المسجد والباقون فيه لا كراهة اتفاقا ممنوع (البحر الرائق ص ۱۸۶ ج ۲)

کتب ذیل میں بھی یہی فیصلہ تحریر ہے:

فتح القدیر ص ۴۶۲ ج ۲، تبیین الحقائق مع حاشیۃ الشلبی ص ۲۴۳ ج ۱، نور الایضاح ص ۱۲۸، مراقی الفلاح ص ۳۲۶، الکبیری ص ۵۶۵، البدائع ص ۱۵۲ ج ۱، الدر المختار ورد المحتار ص ۸۲۴ ج ۱، بذل المجہود ص ۲۰۰ ج ۵، عمدۃ القاری ص ۱۴۱ ج ۴، الکوکب الدری ص ۳۰۵، العرف الشذی ص ۳۰۵، کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعۃ ص ۵۳۶ ج ۱، فتاویٰ رشیدیہ ص ۳۵۴، امداد الفتاویٰ ص ۳۶۵ ج ۱، فتاویٰ دار العلوم دیوبند ص ۲۶۵ ج ۱

بہشتی گوہر ص ۴۲۴ وغیرہا من کتب المذہب فی الفقہ والحدیث۔

خوشیکہ میت، امام اور بعض مقتدیوں کے مسجد سے خارج ہونے کی صورت میں علماء نے بالاتفاق بلا کراہت جواز کا قول بالاتفاق صحیح نہیں، سب نے بالاتفاق اس کو ذکر کیا ہے، اور علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ نے رد المحتار اور منحۃ الخالق میں نہر سے صورت تطبیق نقل فرمائی ہے، کہ عدم کراہت بالاتفاق کا قول صرف اُن لوگوں کے حق میں ہے جو مسجد سے خارج ہیں، جو نمازی مسجد کے اندر ہیں اُن کی نماز کے بارے میں اختلاف ہے اور کراہت راجح ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۹ ذی قعدہ سنہ ۱۴۰۲ھ

نماز جنازہ کا سلام آہستہ کہنا :

سوال : ایک مولوی صاحب کہتے ہیں کہ نماز جنازہ کا سلام آہستہ کہنا افضل ہے، کیا یہ صحیح ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

اس میں تین قول ہیں :

(۱) دونوں سلام آہستہ کہے۔

(۲) ایک سلام بلند آواز سے کہے دوسرا آہستہ۔

(۳) دونوں بلند آواز سے کہے۔

فی نفسہ پہلی صورت افضل ہے، مگر تیسری صورت پر عام تعامل ہونے کی وجہ سے اس کو فضیلت ہے، پہلی صورت اختیار کرنا عوام میں فتنہ و انتشار کا موجب ہے، اس لئے اس سے احتراز کیا جائے، قال فی العلائیۃ ولیس الا التکبیر لکن فی البدائع العمل فی زماننا علی الجہر بالتسلیم وفی جواہر الفتاوی یجہر بواحدۃ، وقال ابن عابدین رحمہ اللہ تعالیٰ والذی فی البدائع ولا یجہر بما یقرأ عقب کل تکبیرۃ لانہ ذکر والسنۃ فیہ المخافتۃ وہل یرفع صوتہ بالتسلیم لم یتعرض لہ فی ظاہر الروایۃ وذکر الحسن بن زیاد رحمہ اللہ تعالیٰ انہ لا یرفع لانہ للاعلام ولا حاجۃ لہ لان التسلیم مشروع عقب التکبیر بلا فصل ولکن العمل فی زماننا علی خلافہ اھ (رد المحتار ص ۸۱۴ ج ۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۲۰ ذی قعدہ سنہ ۱۴۰۲ھ

عورتوں کو قبرستان جانا منع ہے:

سوال: عورتوں کے لئے قبرستان میں جانا جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب ومنہ الصدق والصواب

جائز نہیں، حدیث میں ایسی عورت پر لعنت وارد ہوئی ہے خصوصاً اس زمانہ میں خرافات پر نظر کرتے ہوئے کسی حالت میں بھی اجازت کی گنجائش نہیں، سداً للذرائع وحسماً لمادۃ الفساد کلیۃً منع کرنا ضروری ہے۔ قال الخیر الرملی ان کان ذلک لتجدید الحزن والبکاء والندب علی ما جرت به عادتهن فلا تجوز وعليه حمل حديث لعن الله زائرات القبور وان كان للاعتبار والترحم من غير بكاء والتبرك بزيارة قبور الصالحين فلا بأس اذا كن عجائز ويكره اذا كن شواب كحضور الجماعة فی المساجد اهـ وهو توفيق حسن (ردالمحتار ص ۶۶۳ ج ۱) ويؤيده المعنى الحادث باختلاف الزمان الذی اشارت اليه عائشة رضی الله تعالیٰ عنها بقولها لو ان رسول الله صلی الله عليه وسلم رأی ما احدث النساء بعده لمنعهن كما منعت نساء بنی اسرائيل وهذا فی نساء زمانها فما ظنك بنساء زماننا۔ فقط والله تعالیٰ اعلم۔

۱۳؍محرم [illegible]ھ

قبر پر قرآن پڑھنا:

سوال: قبر پر قرآن مجید پڑھ کر میت کو ثواب بخشنا جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب ومنہ الصدق والصواب

جائز ہے۔ البتہ اجرت پر قرآن مجید پڑھنا اور پڑھوانا جائز نہیں۔ (قوله ويقرأ يٰس) لما ورد من دخل المقابر فقرأ سورة يٰس خفف الله عنهم يومئذ وكان له بعدد من فيها حسنات بحر وفی شرح اللباب ويقرأ من القرآن ما تيسر له من الفاتحة واول البقرة الی المفلحون وآية الكرسی وآمن الرسول وسورة يٰس وتبارك الملك وسورة التكاثر والاخلاص اثنی عشر مرة او احدی عشر او سبعا او ثلاثا ثم يقول اللهم اوصل ثواب ما قرأناه الی فلان او اليهم (ردالمحتار ص ۶۶۳ ج ۱) فقط والله تعالیٰ اعلم۔

۱۴؍محرم [illegible]ھ

پختہ قبر بنانا:

سوال: علماء یا سادات کی قبور کی تجصیص بالآجر جائز ہے یا نہیں؟ شامیہ میں بحوالۂ الاحکام

عن جامع الفتاوی وقیل لا یکرہ اذا کان المیت من المشائخ والعلماء والسادات۔

الجواب ومنہ الصدق والصواب

قبر پر اینٹ اور چونہ لگانا جائز نہیں، البتہ گارے سے لیپنا جائز ہے، قال فی شرح التنویر ولا یجصص للنہی عنہ ولا یطین ولا یرفع علیہ بناء وقیل لا بأس بہ وھو المختار، وفی الشامیۃ (قولہ وقیل لا بأس بہ) ای بالمناسب ذکرہ عقب قولہ ولا یطین لأن عبارۃ السراجیۃ کما نقلہ الرحمتی ذکر فی تجرید ابی الفضل ان تطیین القبور مکروہ والمختار انہ لا یکرہ اھ وعزاہ الیہ المصنف فی المنح ایضا واما البناء علیہ فلم ار من اختار جوازہ (الشامیۃ) اس کے متعلق جو جزئیہ تنویر کے حاشیہ میں ذکر کیا ہے وہ ضعیف ہے اور صحیح حدیث و روایت عن الامام کے خلاف ہے۔ عن ابی حنیفۃ رحمہ اللہ یکرہ ان یبنی علیہ بناء من بیت او قبۃ او نحو ذلک لما روی جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن تجصیص القبور وان یکتب علیہا وان یبنی علیہا رواہ مسلم (شامیۃ ج ۱) بالخصوص بدعت و خرافات کے اس پرفتن زمانہ میں اس قسم کے اسباب ضلالت سے احتراز نہایت ضروری ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۲۸ رجمادی الاولیٰ

قبر میں اینٹ، پتھر، لوہا وغیرہ لگانا:

سوال: قبر میں بوقت ضرورت سیمنٹ یا سیمنٹ اور بجری کی بنی ہوئی اینٹ یا پتھر استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں؟ سیمنٹ کی اینٹ اور مٹی کی پختہ اینٹ میں کچھ فرق ہے یا کہ دونوں کا ایک ہی حکم ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

قال شارح التنویر رحمہ اللہ تعالیٰ ولا بأس باتخاذ تابوت ولو من حجر او حدید لہ عند الحاجۃ کرخاوۃ الارض، وقال ابن عابدین رحمہ اللہ تعالیٰ (قولہ ولا بأس باتخاذ تابوت الخ) ای یرخص ذلک عند الحاجۃ والا کرہ کما قدمناہ آنفا، قال فی الحلیۃ نقل غیر واحد عن الامام ابن الفضل انہ جوزہ فی اراضیہم لرخاوتہا وقال لکن ینبغی ان یفرش التراب وتطین الطبقۃ العلیا مما یلی المیت ویجعل اللبن الخفیف علی یمین المیت ویسارہ لیصیر بمنزلۃ اللحد، والمراد بقولہ ینبغی یسن کما افصح بہ فخر الاسلام وغیرہ بل فی الینابیع والسنۃ ان یفرش فی القبر التراب، ثم لم یتعقب الرخصۃ فی اتخاذہ من حدید بشیء ولا شک فی کراہتہ کما ہو ظاہر الوجہ اھ ای لانہ لا یعمل الا بالنار فیکون کالآجر المطبوخ بہا کما

بأن (رد المحتار ص ۲۳۸ ج ۱) وفی شرح التنویر ویسوّی اللبن علیه والقصب لا الآجر المطبوخ والخشب لو حوله اما فوقه فلا یکره ابن ملک. وجاز ذلک حوله بارض رخوة کالتابوت ولو من حدید (قوله لو حوله الخ) قال فی الحلیة وکرهوا الآجر والواح الخشب وقال الامام التمرتاشی هذا اذا کان حول المیت. فلو فوقه لا یکره لانه یکون عصمة من السبع وقال مشایخ بخاری لا یکره الآجر فی بلدتنا للحاجة الیه لضعف الاراضی (قوله وجاز ذلک) ای الآجر والخشب (رد المحتار ص ۲۳۸ ج ۱) وفی العالمگیریة ولا یجصص القبر ولا یطین ولا یرفع علیه بناء وقیل لا بأس به وهو المختار، وفی الشامیة (قوله وقیل لا بأس به الخ) المناسب ذکره عقب قوله ولا یطین لان عبارة السراجیة کما نقله الرحمتی ذکر فی تجرید ابی الفضل ان تطیین القبور مکروه والمختار انه لا یکره اه وعزاه الیها المصنف فی المنح ایضا واما البناء علیه فلم ار من اختار جوازه وفی شرح المنیة عن منیة المفتی المختار انه لا یکره التطیین وعن ابی حنیفة رحمه الله تعالی یکره ان یبنی علیه بناء من بیت او قبة او نحو ذلک لما روی جابر رضی الله تعالی عنه نهی رسول الله صلی الله علیه وسلم عن تجصیص القبور وان یکتب علیها وان یبنی علیها رواه مسلم وغیره نعم فی الامداد عن الکبری والیوم اعتادوا التسنیم باللبن صیانة للقبر عن النبش ورأوا ذلک حسنا وقال صلی الله تعالی علیه وسلم ما رآه المسلمون حسنا فهو عند الله حسن اه (رد المحتار ص ۲۳۷ ج ۱)

عبارات بالا سے امور ذیل ثابت ہوئے:

(۱) قبر کے اندر میت کے اطراف میں بلا ضرورت لکڑی کے تختے، پتھر، سیمنٹ کی اینٹ، لوہا اور بھٹی میں پکی ہوئی اینٹ لگانا مکروہ تحریمی ہے۔

(۲) اگر زمین بہت نرم ہو یا اس میں پانی ہو اور قبر گرنے کا خطرہ ہو تو بقدر ضرورت مذکورہ اشیاء لگانے کی اجازت ہے، اگر لکڑی، پتھر، سیمنٹ کی اینٹ سے ضرورت پوری ہو جائے تو بھٹی کی پختہ اینٹ اور لوہے سے احتراز کیا جائے اس لئے کہ ان میں آگ کا اثر ہے، پتھر اور سیمنٹ کی اینٹ میں یہ قباحت نہیں، ایسی ضرورت کے وقت لکڑی، پتھر اور لوہے کے تابوت میں رکھ کر دفن کرنے کی بھی گنجائش ہے۔ البتہ لوہے کے تابوت سے حتی الامکان احتراز لازم ہے، ہر قسم کے تابوت میں بہتر یہ ہے کہ نیچے مٹی بچھا دی جائے اور میت کی دونوں طرف کچی اینٹیں لگا دی جائیں اور ڈھکنے کے اندر کی طرف مٹی سے لیپ دی جائے۔

(۳) میت کے اوپر کی طرف یعنی قبر کو ڈھانپنے میں بلا ضرورت بھی لکڑی، پتھر، سیمنٹ کے سلیب اور

قبرستان پر چار دیواری سے حدود قبرستان کی تعیین وحفاظت مقصود ہوتی ہے اس لئے جائز ہے، علاوہ ازیں قبر پر چار دیواری کی رسم قبہ سازی کا ذریعہ بن رہی ہے۔ چنانچہ ایک مشہور عالم کی قبر پر بعض حیلہ سازوں کی تجویز ایسی گنبد نما بلند چار دیواری کی ہے جو چاروں طرف سے بند ہو اور صرف قبر کے اوپر کا حصہ کھلا ہو، مزید بریں چار دیواری میں دوسروں کی حق تلفی کا گناہ بھی ہے، احاطہ خواہ کتنا ہی چھوٹا ہو تو بھی دیواروں کے نیچے آنے والی زمین کو بلا ضرورت مشغول کرنے میں دوسروں کی حق تلفی ظاہر ہے۔

تزئین کے لئے بغرض صفائی چبوترہ بنانا کوئی مقصد شرعی نہیں، اور سیلاب کا خطرہ ہو تو قبر کے اندر اینٹیں لگا کر سیمنٹ کے پلستر سے قبر کا تختہ پاٹ کر حفاظت کا انتظام کیا جا سکتا ہے، اس ذریعہ قبر بیٹھنے سے محفوظ ہو جائے گی اور نشان باقی رکھنے کے لئے قبر کے سرہانے کوئی پتھر گاڑ دینا یا کتبہ وغیرہ لگا دینا کافی ہے۔ اگر سیلاب سے قبر کی مٹی بہہ گئی تو اس نشان پر دوبارہ مٹی ڈال کر قبر درست کی جا سکتی ہے۔ معہذا اگر قبر پر زیادہ مٹی کی واقعۃً ضرورت ہو تو چبوترہ کے بجائے قبر کے چوگرد ڈھلان کی صورت میں مٹی ڈال کر اس مقام کو بقدر ضرورت اونچا کر دیا جائے۔ نیز حفاظت قبر کی ضرورت صرف اس وقت تک ہے جب تک میت خاک نہیں ہو جاتی اس کے بعد حفاظت کی ضرورت نہیں، اس لئے قبر کی مضبوطی کا زیادہ اہتمام درست نہیں، قال ابن نجیم رحمہ اللہ تعالیٰ لانہما (الآجر والخشب) لاحکام البناء والقبر موضع البلاء (البحر الرائق ص۱۸۸ ج۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۲۵ رجب [illegible]ھ

نماز جنازہ میں مسبوق کا حکم:

سوال: اگر کوئی شخص نماز جنازہ میں دیر سے پہنچا تو فوت شدہ تکبیریں کیسے ادا کرے؟ بینوا توجروا۔

الجواب ومنه الصدق والصواب

مقتدی کو چاہئے کہ جس وقت بھی پہنچے تکبیر کہہ کر امام کے ساتھ شریک ہو جائے اگرچہ امام چوتھی تکبیر بھی کہہ چکا ہو مگر سلام نہ پھیرا ہو، باقی تکبیریں امام کے فارغ ہونے کے بعد کہے۔ اگر شریک ہوتے وقت یہ علم ہو کہ یہ کونسی تکبیر ہے تو وہی دعاء پڑھے جو امام پڑھ رہا ہو اور فوت شدہ تکبیروں میں باقی دعائیں بالترتیب پڑھے۔ اگر یہ علم نہ ہو کہ امام کس تکبیر میں ہے تو پہلی تکبیر والی دعاء یعنی ثناء پڑھے اس کے بعد اسی ترتیب سے دعائیں پڑھتا جائے، فوت شدہ تکبیروں میں دعاء پڑھنے سے اگر جنازہ اٹھ جانے کا خوف ہو تو دعائیں نہ پڑھے، فقط تکبیریں کہہ لے۔ اگر جنازہ اٹھا لیا گیا مگر تا حال زمین سے قریب ہے تو تکبیر کہہ لے

اور اگر اٹھانے والوں کے کندھوں کے قریب پہنچ چکا ہے تو تکبیر کہے نماز صحیح نہیں ہوگی۔ قال فی شرح التنویر:

والمسبوق ببعض التکبیرات لا یکبر فی الحال بل ینتظر تکبیر الامام لیکبر معہ للافتتاح لما مر ان کل تکبیرۃ کرکعۃ والمسبوق لا یبدأ بما فاتہ وقال ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ یکبر حین یحضر کما لا ینتظر الحاضر فی حال التحریمۃ بل یکبر اتفاقا للتحریمۃ لانہ کالمدرک ثم یکبران ما فاتہما بعد الفراغ نسقا بلا دعاء ان خشیا رفع المیت علی الاعناق وفی المجتبی یکبر الکل للحال فتاوی نہر فلو جاء المسبوق بعد تکبیرۃ الامام الرابعۃ فاتتہ الصلوٰۃ لتعذر الدخول فی تکبیرۃ الامام وعند ابی یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ یدخل لبقاء التحریمۃ فاذا سلم الامام کبر ثلاثا کما فی الحاضر وعلیہ الفتوی ذکرہ الحلبی اھ والتفصیل فی الشامیۃ۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۱۲ ذی الحجہ ۹۳ھ

سوال متعلق بالا:

سوال: آپ نے تمام جزئیات میں مسبوق کے سب احکام میں امام ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ کے قول پر فتویٰ دیا ہے، حالانکہ درمختار میں قول ابی یوسف کو صرف اس صورت میں مفتی بہ لکھا ہے جب تکبیر رابعہ کے بعد شریک ہو، اور بہشتی زیور میں بھی اسی طرح ہے لہذا اس پر تفصیل فرما کر تحریر فرمائیں۔ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

نماز جنازہ میں مسبوق کی جملہ تفصیل میں قول ابی یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ مفتی بہ ہے جس پر مندرجہ ذیل شواہد ہیں:

① درمختار کی عبارت کے سیاق بالخصوص فلو جاء بعد تکبیرۃ الامام الرابعۃ میں فاء تفریعیہ سے ثابت ہوتا ہے کہ شرکت بعد رابعہ کوئی مستقل مسئلہ نہیں بلکہ مسبوق کے حکم سابق پر تفریع ہے۔

② قال فی الشامیۃ (قولہ فلو جاء الخ) ہذہ ثمرۃ الخلاف بینہما وبین ابی یوسف وصرحوا بھا کما فی النہر۔ اس میں تصریح ہے کہ شرکت بعد رابعہ مستقل مسئلہ خلافیہ نہیں بلکہ خلاف سابق کا ثمرہ ہے۔

③ وفیہا (قولہ لتعذر الدخول الخ) لما مر ان المسبوق ینتظر الامام لیکبر معہ وبعد الرابعۃ لم یبق علی الامام تکبیر حتی ینتظرہ لیتابعہ فیہ۔ تأمل۔ قال فی البدائع: والاصل فی الباب عندہما ان المقتدی یدخل فی تکبیرۃ الامام فاذا فرغ الامام من الرابعۃ تعذر علیہ الدخول وعند ابی یوسف یدخل اذا بقیت التحریمۃ کذا فی البدائع اھ۔ اس میں بھی تصریح ہے کہ شرکت بعد رابعہ کا حکم قاعدہ سابقہ پر متفرع ہے۔

④ وفیہا (قولہ وعلیہ الفتوی) ای علی قول ابی یوسف فی مسألۃ المسبوق خلافا لما مشی علیہ فی المتن (رد المحتار ص ۸۲۳ ج ۱) اس میں مسبوق عام ہے جو سب صورتوں کو شامل ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۳۰ ذی الحجہ سنہ ۱۴۰۰ھ

جوتے پر پاؤں رکھ کر نماز جنازہ پڑھنا:

سوال: اگر جوتے کا تلا پلید ہو اور اس کا حصہ اوپر پاک ہو تو جوتے اتار کر اوپر پاؤں رکھ کر نماز جنازہ پڑھنا کیسا ہے؟
بینوا توجروا

الجواب ومنه الصدق والصواب

جائز ہے، ہر ایسی چیز جس پر ایک طرف نجاست لگی ہے دوسری طرف سرایت نہ کی ہو اس کی پاک جانب پر نماز پڑھنا جائز ہے، البتہ ایسا جوتا پہن کر نماز پڑھنا درست نہیں کیونکہ مصلی کی حرکت سے جانب نجس کی حرکت بھی ہوگی جو مانع صحت ہے، مزید اگر نیچے سے تلا بھی پاک ہو تو پہن کر بھی نماز درست ہے۔ قال في شرح التنوير في مفسدات الصلوٰة وصلاته على مصلی مضرب نجس البطانة، وفي الشامية تحت هذا قول ابي يوسف وعن محمد يجوز (الى قوله) وعلى هذا لو صلى على حجر الرحى او باب او بساط غليظ او مكعب اعلاه طاهر وباطنه نجس عند ابي يوسف لا يجوز نظرا الى اتحاد المحل فاستوى ظاهره وباطنه كالثوب الصفيق وعند محمد يجوز لانه صلى في موضع طاهر كثوب طاهر تحته ثوب نجس بخلاف الثوب الصفيق لان الظاهر نفاذ الرطوبة الى الوجه الآخر اه وظاهره ترجيح قول محمد وهو الاشبه ورجح في الخانية في مسألة الثوب قول ابي يوسف بانه اقرب الى الاحتياط وتمامه في الحلية وذكر في المنية وشرحها اذا كانت النجاسة على باطن اللبنة او الآجرة وصلى على ظاهرها جاز وكذا الخشبة اذا كانت غليظة بحيث يمكن ان تنشر نصفين فيما بين الوجه الذي فيه النجاسة والوجه الآخر والا فلا اه وذكر في الحلية ان مسألة اللبنة والآجرة على الاختلاف المار بينهما وانه في الخانية جزم بالجواز وهو اشارة الى اختياره وهو حسن كما لا يخفى وكذا مسألة الخشبة على الاختلاف وان الاشبه الجواز عليها مطلقا ثم ايده باوجه فراجعه (رد المحتار ج ۱) وفي الهندية ولو خلع نعليه وقام عليهما جاز سواء كان ما يلي الارض منه نجسا او طاهرا اذا كان ما يلي القدم طاهرا (عالمگیریۃ ج ۱ ص ۶۲)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲۵ ربیع الآخر سنہ ۸۳ھ

وقف علی المسجد میں قبر بنانا:

سوال: ایک حجرہ وقف علی المسجد میں متولی نے اپنے باپ کو دفن کر دیا ہے، کیا یہ فعل شرعاً جائز ہے؟ اور ایسے متولی کے لئے کیا حکم ہے؟

بینوا توجروا

کتب صحاح سے ثابت نہیں اگرچہ غیر معروف کتب کی روایات میں ہے جن کی اسناد میں کلام ہے، صحاح کی روایات
میں صرف السلام علیکم کہنے کا حکم ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ مردہ اگرچہ سنتا ہے اور نہ ہی جواب دے سکتا ہے
مگر قبر پر یہ الفاظ محض زائر کے لئے عبرت ہونے کی وجہ سے مشروع ہیں، چنانچہ انتم لنا سلف ونحن
لکم خلف وفی بعض الروایات قد یتم اولادکم وتزوجت ازواجکم وقسمت اموالکم وقول النبی صلی اللہ
علیہ وسلم کنت نہیتکم عن زیارۃ القبور الا فزوروها فانها تذکر الآخرۃ یہ جملے اسی کے مشعر ہیں
کہ مقصد اعتبار للزائر ہے فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔ ۸ رمضان ۸۸ھ

جسم بلا روح کو عذاب کیسے ہوگا؟

سوال: قبر میں انسان کا صرف ڈھانچہ باقی رہ جاتا ہے تو عذاب قبر کس چیز پر ہوتا ہے؟ بینوا توجروا

الجواب ومنہ الصدق والصواب

بعض علماء کا خیال ہے کہ عذاب قبر فقط روح کو ہوتا ہے اور روح کا تعلق قبر سے رہتا ہے، مگر صحیح
یہ ہے کہ عذاب روح وجسد دونوں پر ہوتا ہے، کیونکہ مردہ کا قبر میں جاکر زندہ ہونا قرآن سے ثابت ہے۔
قال اللہ تعالیٰ حکایۃ عن قولهم ربنا امتنا اثنتین واحییتنا اثنتین" قال اللہ تعالیٰ
ذکر الموتۃ مرتین وهما لا تتحققان الا ان یکون فی القبر حیاۃ وموت حتی تکون احدی الموتتین
ما یحصل عقیب الحیاۃ فی الدنیا والاخری ما یحصل عقیب الحیاۃ التی فی القبر (عمدۃ القاری ج ۴ ص ۱۶۱)
روایات میں نکیرین کے بارہ میں یقعدانہ کا لفظ وغیرہ اسی طرح روایات بھی اعادۂ روح پر دال ہیں۔

باقی رہا یہ سوال کہ جسم پر وقوع عذاب کیوں معلوم نہیں ہوتا، جسم کے اجزاء متفرق ہوجاتے ہیں اور بعض
مٹی بھی کھا جاتی ہے، سو اس کے حل کے لئے صوفیاء نے یہ قول کیا ہے کہ اعادۂ روح جسم مادی میں نہیں بلکہ
جسم مثالی میں ہوتا ہے، مگر صحیح یہ ہے کہ جسم مادی ہی میں روح کا اعادہ ہوتا ہے مگر ہمیں معلوم نہیں ہوتا جیسے
جیسا کہ خواب میں کسی کو تکلیف پہنچ رہی ہو، بلکہ انتقال کو ثواب ونعمت کی وجہ سے سرور یا غم لاحق ہو بیٹھا پاس
کا کوئی علم نہیں ہوتا۔

جسم اگرچہ مٹی ہوجائے تب بھی احادیث سے ثابت ہے کہ ریڑھ کی ہڈی مٹی نہیں ہوتی، تو اس کا احیاء
ہوسکتا ہے۔ بالفرض سارا جسم ہی مٹی ہوجائے تب بھی جسم کی حیثیت وصورت بدل گئی اس کا اصل مادہ
تو باقی ہے، پس مٹی ہوجانے کے بعد بھی ان اجزاء میں ایسے طریق سے اعادۂ روح کہ ہم کو معلوم نہ ہوسکے
قدرت باری تعالیٰ سے خارج نہیں۔ قال السیوطی رحمہ اللہ تعالیٰ فی شرح الصدور عذاب القبر هو عذاب
البرزخ (الی قوله) ومحله الروح والبدن باتفاق اهل السنۃ، وفی فیض الباری قیل العذاب علی الروح

فقط، وقیل علی الروح والجسد معا، ومال الی الاول الحافظ ابن قیم رحمہ اللہ تعالیٰ، والاقرب عندی هو الثانی، وذهب الصوفیة الی انه علی الجسد المثالی الخ (فیض الباری جلد ۲ ص ۴۶۷) وایضا فیه بعد بحث بدیع ثم لا حاجة الی اثبات عذاب القبر الی ما قاله الصوفیة ان العذاب علی البدن المثالی دون المادی وحینئذ لا بعد ان لم نشاهده احدنا بعد حفر قبره الخ (فیض الباری ج ۲ ص ۴۶۷) وفی عمدة القاری ان المصلوب لا بعد فی الاحیاء والمسئلة منه مع عدم المشاهدة کما فی صاحب السکر فانه حی مع انا لا نشاهد حیاته کما فی رؤیة النبی صلی اللہ علیہ وسلم جبریل علیه الصلوة والسلام وهو بین اظهر اصحابه مع ستره عنهم ولا بعد فی رد الحیاة الی بعض اجزاء البدن فیختص بالاحیاء بالمسألة والعذاب وان لم یکن ذلک مشاهدا لنا (عمدة القاری ج ۴ ص ۱۹۲) وکذا حقق جبل الحدیث الحافظ ابن الحجر رحمه اللہ تعالیٰ ایضا فی الفتح فراجعه (فتح الباری ج ۳ ص ۱۸۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۴ صفر ۸۹ھ

حشر میں اولاد اور بیوی سے ملاقات ہوگی:

سوال: حشر میں اولاد اور بیوی سے ملاقات ہوگی یا نہیں؟ اور اگر ملاقات ہوگی تو کس وقت تک باقی رہے گی؟ بینوا توجروا۔

الجواب ومنه الصدق والصواب

قال اللہ تعالیٰ اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِیْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْا الخ وقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم المرء مع من احب۔ اس قسم کی آیات و احادیث سے ثابت ہے کہ آپس میں ملاقات ہوگی، بلکہ مخاصمہ بھی ہوگا، جب وہ اگر جانبین اہل جنت سے ہیں تو ملاقات دائمی ہوگی ورنہ فلا۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۵ صفر ۸۹ھ

تلاوت کے ایصال ثواب سے عذاب میں تخفیف ہوتی ہے:

سوال: قرآن پڑھ کر ثواب مردہ کو بخشا جائے تو عذاب میں تخفیف ہوتی ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب ومنه الصدق والصواب

قرآن پڑھ کر بخشنے سے عذاب میں کمی ہوتی ہے، قال العینی فیه دلیل علی استحباب تلاوة الکتاب العزیز علی القبور لانه اذا کان یرجی عن المیت التخفیف بتسبیح الشجر فتلاوة القرآن العظیم اعظم رجاء وبرکة (عمدة القاری ج ۲ ص ۵۹۴) وایضا عن انس رضی اللہ تعالیٰ عنه یرفعه من دخل المقابر فقرأ یٰس خفف اللہ عنهم یومئذ ومن زار قبر والدیه او احدهما فقرأ عنده او عندها یٰس

غفر لہ (عمدۃ القاری ج ۱ ص ۸۰۵) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۲۷ صفر ۸۴ھ

مردے کو صدقات کا ثواب ملتا ہے:

سوال: مردہ کو صدقات وخیرات کا ثواب بخش دیا جائے تو ثواب پہنچتا ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب ومنہ الصدق والصواب

ثواب پہنچتا ہے، کما فی شرح الصدور بتخریج الطبرانی عن ابن عمرو قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا تصدق احدکم بصدقۃ تطوعا فلیجعلھا عن ابویہ فیکون لھما اجرھا ولا ینقص من اجرہ شیئا وان شئت الاطلاع علی الروایات الواردۃ فی ھذا الباب فعلیک بعمدۃ القاری ص ۵۰۸ وص ۸۲۹ ج ۱، فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۸ رمضان ۸۵ھ

خودکشی کرنے والے پر نماز جنازہ:

سوال: خودکشی کرنے والے کو مسلمان سمجھا جائے گا یا کافر؟ اس کی نماز جنازہ جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

اگرچہ خودکشی بہت بڑا گناہ ہے مگر اس کا مرتکب کافر نہیں اس لئے اس پر نماز جنازہ پڑھنا فرض ہے قال فی شرح التنویر من قتل نفسہ ولو عمدا یغسل ویصلی علیہ بہ یفتی وان کان اعظم وزرا من قاتل غیرہ (رد المحتار ص ۸۱۵ ج ۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۲۳ ذی قعدہ ۸۳ھ

خودکشی کرنے والے کو ایصال ثواب:

سوال: خودکشی کرنے والے کو ایصال ثواب ودعاء مغفرت جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

خودکشی کرنے والا فاسق ہے کافر نہیں، لہٰذا اس کے لئے دعاء مغفرت وایصال ثواب جائز ہے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲ ذی قعدہ ۸۳ھ

بعد تکفین خروجِ نجاست مضر نہیں:

سوال: کیا فرماتے ہیں بزرگانِ دین کہ اگر میت کو کفن وغسل دینے کے بعد کوئی نجاست خارج ہو تو کیا اسے دوبارہ غسل دیا جائے گا یا صرف اتنا کافی ہے کہ صرف نجاست کو دھو دیا جائے؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

غسل کا اعادہ نہیں، البتہ تکفین سے قبل نجاست نکلی تو اس کو دھونا ضروری ہے اور تکفین کے بعد نکلی تو دھونا ضروری نہیں خواہ میت کے بدن پر ہو یا کفن پر، بدون دھوئے نماز جنازہ درست ہے، بلکہ خود میت سے نکلنے والی نجاست کے سوا خارجی نجاست کا دھونا ضروری ہے بلا دھوئے نماز نہ ہوگی۔ قال فی الشامیۃ: علم من هذا انه اذا تنجس الكفن بنجاسة الميت لا يضر دفعا للحرج بخلاف الكفن المتنجس ابتداء وكذا لو تنجس بدنه بما خرج منه ان كان قبل ان يكفن غسل وبعده لا كما قدمه الشارح في الغسل فيقيد ما في القنية بغير النجاسة الخارجة من الميت (رد المحتار ص [illegible] ج ۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۲ ربیع الآخر ۸۲ھ

رمضان میں موت سے عذابِ قبر سے امن:

سوال: زید: رمضان میں مسلمان عاصی وفات پائے تو عذابِ قبر قیامت تک اس سے معاف ہے یا صرف بعد رمضان تک؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

کافر سے صرف رمضان تک عذاب قبر مرتفع ہوتا ہے اور مسلمان عاصی کو قیامت تک امن ہو جاتا ہے، غیر رمضان میں مرنے والوں کا بھی یہی حکم ہے کہ کافر کو جمعہ کے دن اور رمضان میں عذاب نہیں ہوتا اور عاصی مومن پر جب روز جمعہ یا رمضان آ جاتا ہے تو پھر تا قیامت عذاب مرتفع ہو جاتا ہے۔ قال ابن عابدین رحمہ اللہ تعالیٰ فی آخر باب الجمعۃ: قال اهل السنة والجماعة عذاب القبر حق وسؤال منكر ونكير وضغطة القبر حق ثم ان كان كافرا فعذابه يدوم الى يوم القيامة ويرفع عنه يوم الجمعة وشهر رمضان فيعذب اللحم متصلا بالروح والروح متصلا بالجسم فيتألم الروح مع الجسد وان كان خارجا عنه والمؤمن المطيع لا يعذب بل له ضغطة يجد هول ذلك وخوفه والعاصي يعذب ويضغط لكن ينقطع عنه العذاب يوم الجمعة وليلتها ثم لا يعود وان مات يومها او ليلتها يكون العذاب ساعة واحدة وضغطة القبر ثم ينقطع كذا في المعتقدات للشيخ ابي المعين النسفي الحنفي من حاشية الحموي ملخصا (رد المحتار ص [illegible] ج ۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۹ شوال ۸۲ھ

جمعہ کی موت سے قیامت تک عذاب قبر معاف:

سوال: جمعہ کے دن مرنے والے کو صرف اسی دن عذاب نہیں ہوتا یا کہ قیامت تک معاف ہے؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

مؤمن کو قیامت تک معاف ہو جاتا ہے البتہ کافر سے صرف جمعہ اور رمضان میں عذاب مرتفع ہوتا ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

[illegible] شوال [illegible]

جمعہ ورمضان میں کافر کو بھی عذاب قبر نہیں ہوتا:

سوال: مشہور ہے کہ ماہ رمضان المبارک وجمعہ میں کافر سے سوالات نکیرین اور عذاب قبر میں تخفیف ہو جاتی ہے، کیا یہ صحیح ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

جمعہ ورمضان میں کافر سے عذاب قبر مرتفع ہو جاتا ہے، اس کے بعد پھر شروع ہو جاتا ہے۔ کذا فی الشامیۃ فی آخر باب الجمعۃ۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

[illegible] رمضان [illegible]

رمضان میں موت کی فضیلت کا حوالہ:

سوال: شامی باب الجنائز میں من لا یسئل فی قبرہم کی تفصیل ہے اس میں رمضان میں موت کا ذکر نہیں لہٰذا اس کا حوالہ تحریر فرمائیں۔

الجواب باسم ملہم الصواب

شامیہ میں باب الجمعہ کے آخر میں رمضان میں مؤمن سے تا قیامت اور کافر سے اختتام رمضان تک ارتفاع عذاب منقول ہے جو رمضان میں موت کو بھی شامل ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

[illegible] رمضان [illegible]

جمعہ کی موت سے عذاب قبر ہونے پر اشکال کا جواب:

سوال: جو مسلمان جمعہ کے دن مر جائے اس کو عذاب قبر معاف ہے، اور حدیث ہے کہ قبر پہلی منزل ہے جو اس سے نجات پا گیا اس کے لئے آئندہ منزلیں آسان ہوں گی، سوال یہ ہے کہ جو کوئی سود خور، شرابی، بدکار بھی مر گئے ہیں کیا ان کی بھی مغفرت ہو جائے گی؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

اس کے مندرجہ ذیل جواب ہو سکتے ہیں،

① دوسری نصوص کے پیش نظر اس حدیث میں اجتناب عن الکبائر کی قید ہے۔

② بعض عصاۃ بلا حساب بھی جنت میں جائیں گے، جن کے لئے یہ سعادت مقدر ہے جمعہ کے روز صرف انہی کی موت واقع ہوتی ہے۔

③ جمعہ کے روز موت سے صرف عذاب قبر معاف ہے عذاب آخرت نہیں، اور حدیث کا مطلب یہ ہے کہ برکت جمعہ کے سوال کی بدولت عذاب قبر سے بچ گیا تو آئندہ منازل زیادہ سہل ہوں گی، فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۱۹ جمادی الاولیٰ ۹۵ھ

شب جمعہ میں دفن کی فضیلت:

سوال: اگر کوئی شخص جمعرات کے دن فوت ہو مگر اس کو دفن جمعہ کی شب کو کیا گیا تو کیا اس کو عذاب قبر معاف ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

یہ وعدہ جمعہ کے دن اور جمعہ کی رات میں موت پر ہے، دفن پر نہیں، البتہ عذاب قبر چونکہ دفن کے بعد شروع ہوتا ہے اور مسلم میت پر شب جمعہ سے حشر تک عذاب مرتفع ہو جاتا ہے اس لئے ایسا شخص عذاب قبر سے محفوظ رہے گا، قال ابن البزاز رحمہ اللہ تعالیٰ السؤال فیما یستقر فیہ المیت حتی لو اکلہ سبع فالسؤال فی بطنہ فان جعل فی تابوت ایاما لنقلہ الی مکان آخر لا یسأل ما لم یدفن (بزازیہ علی هامش الهندیۃ [illegible])

فقط واللہ تعالیٰ اعلم ۲۰ شعبان سنہ [illegible]ھ

قبر پر کتبہ لگانا:

سوال: قبر پر کتبہ لگانا نام اور تاریخ وفات تحریر کرنا تاکہ میت کی قبر معلوم رہے اور بے نشان نہ ہو جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

علامت کے طور پر نام اور تاریخ وفات لکھا جاتا ہے۔ حدیث میں قبر پر کتابت سے ممانعت وارد ہوئی ہے اور علامت کے لئے پتھر رکھنا ثابت ہے، اس لئے حضرات فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ نے حدیث نہی کو غیر ضرورت پر محمول فرمایا ہے اور بضرورت علامت کتابت کی اجازت دی ہے، معہذا احتیاط اسی میں ہے کہ کتبہ قبر کے سرہانے سے کچھ ہٹا کر لگایا جائے تاکہ ظاہر حدیث کی مخالفت نہ ہو، قرآن کی آیت، اشعار، میت کی مدح لکھنا ہرگز جائز نہیں، والتفصیل الکامل فی الشامیۃ، فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۲۵ ذی الحجہ سنہ [illegible]ھ

غائبانہ نماز جنازہ:

سوال: غائبانہ نماز جنازہ جائز ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو کہا جاتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نجاشی یا دوسروں کی نماز جنازہ غائبانہ ادا کی، یہ کہاں تک صحیح ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

عن عمران بن حصین رضی اللہ تعالی عنہ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال ان اخاکم النجاشی توفی فقوموا صلوا علیہ فقام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وصفوا خلفہ فکبر اربعا وہم لا یظنون الا ان جنازتہ بین یدیہ رواہ ابن حبان فی صحیحہ کذا فی نصب الرایۃ وفی فتح الباری بعد نقلہ ما نصہ اخرجہ من طریق الاوزاعی عن یحیی بن ابی کثیر عن ابی قلابۃ عن ابی المہلب عنہ و لابی عوانۃ (فی صحیحہ) من طریق ابان وغیرہ عن یحیی فصلینا خلفہ ونحن لا نری الا ان الجنازۃ قدامنا

قال العلامۃ العثمانی ویعارضہ ما اخرجہ الطبرانی واصلہ فی ابن ماجۃ من حدیث مجمع بن جاریۃ فی قصۃ الصلوۃ علی النجاشی قال فصففنا خلفہ صفین وما نری شیئا ذکرہ فی فتح الباری ص ۱۵۱ ج ۳ والتوفیق کما قالہ الشیخ بانہ کشف لبعض دون بعض انتہی قال وقد اخرج الطبرانی وابن الضریس فی فضائل القرآن وسمویہ فی فوائدہ وابن مندۃ والبیہقی فی الدلائل کلہم من طریق محبوب بن ہلال عن عطاء بن ابی میمونۃ عن انس بن مالک رضی اللہ تعالی عنہ قال نزل جبریل علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال یا محمد مات معاویۃ بن معاویۃ المزنی اتحب ان تصلی علیہ قال نعم فضرب بجناحیہ فلم تبق اکمۃ ولا شجرۃ الا تضعضعت فرفع سریرہ حتی نظر الیہ فصلی علیہ وخلفہ صفان من الملائکۃ کل صف سبعون الف ملک فقال یا جبریل بم نال معاویۃ ہذہ المنزلۃ قال بحب قل ہو اللہ احد وقراءتہ ایاہا جائیا وذاہبا وقائما وقاعدا وعلی کل حال و محبوب قال ابو حاتم لیس بالمشہور وقد ذکرہ ابن حبان فی الثقات وفی روایۃ قال جبریل فہل لک ان تصلی علیہ فاقبض لک الارض قال نعم فصلی علیہ وفی روایۃ فوضع جبریل جناحہ الایمن علی الجبال فتواضعت حتی نظرنا الی المدینۃ ذکر الروایات کلہا الحافظ فی الاصابۃ ثم قال قد یحتج بہ من یجیز الصلوۃ علی الغائب ویدفعہ ما ورد انہ رفعت الحجب حتی شاہد جنازتہ اھ (ص ۱۴۶ ج ۱) قلت ولو کانت الصلوۃ علی الغائب مشروعۃ لم یکن لسؤال جبریل اتحب ان تصلی علیہ وضربہ بجناحیہ بعد قولہ نعم معنی لامکان الصلوۃ علیہ بغیر ذلک البتۃ وکذا لم یکن لقولہ فہل لک ان تصلی علیہ فاقبض لک الارض معنی لعدم الاحتیاج الی ذلک للصلوۃ علیہ فالحدیث ان ثبت کما زعمہ الی ذلک فہو حجۃ لنا

لا علینا فافہم (اعلاء السنن ص۲۸۲ ج۸)

ان احادیث سے ثابت ہوا کہ حضرت نجاشی اور معاویہ بن معاویہ مزنی رضی اللہ تعالیٰ عنہا پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز جنازہ اس طور پر پڑھی کہ دونوں بطور معجزہ ان کے جنازے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کر دیئے گئے تھے اس لئے ان دو واقعات سے غائبانہ نماز جنازہ کی صحت پر استدلال باطل ہے۔

بالفرض یہ معجزہ حدیث سے ثابت نہ ہوتا تو بھی ان واقعات کو معجزہ یا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت پر محمول کرنا ضروری ہے اس لئے کہ دعائی جعلتہم ان صلوتی لہم کے مطابق آپ ہر صحابی پر نماز جنازہ پڑھنے پر حریص تھے، حتی کہ اگر کسی کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز جنازہ کے بغیر دفنا دیا گیا تو آپ نے اس پر تنبیہ فرمائی اور اس کی قبر پر تشریف لے جا کر نماز جنازہ پڑھی، معہذا آپ سے دوسرے کئی معروف صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور قراء رضی اللہ تعالیٰ عنہم جیسے مخصوصین حضرات پر آپ نے نماز جنازہ نہیں پڑھی، یہ واضح دلیل ہے کہ غائبانہ نماز جنازہ صحیح نہیں اور حضرت نجاشی و معاویہ بن معاویہ مزنی رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی نماز جنازہ بطور معجزہ یا بنا بر خصوصیت کے ادا فرمائی گئی تھی۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

[illegible] ربیع الآخر [illegible]

ملبے میں دبنے والے کی نماز جنازہ:

سوال: کوئی شخص ملبے کے نیچے دب کر مر جائے اور بڑی کوشش کے بعد وہاں سے نہ نکالا جا سکے تو اس کی نماز جنازہ کس طرح پڑھی جائے، ایک صاحب کہتے ہیں کہ ملبے کے قریب کھڑے ہو کر نماز جنازہ پڑھنے سے ادا ہو جائے گی۔ کیا ان کا یہ کہنا درست ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

ایسے شخص پر صحت نماز جنازہ میں اختلاف ہے، عدم غسل کی وجہ سے قیاس عدم صحت کو مقتضی ہے مگر استحسانا جواز کا قول کیا گیا ہے بشرطیکہ میت کے عدم تفسخ کا ظن غالب ہو، حالت تفسخ میں بالاتفاق اس پر نماز صحیح نہیں، قال فی الدر: وان دفن واہیل علیہ التراب بغیر صلوٰۃ او بہا بلا غسل او ممن لا ولایۃ لہ صلی علی قبرہ استحسانا ما لم یغلب علی الظن تفسخہ من غیر تقدیر ہو الاصح وظاہرہ انہ لو شک فی تفسخہ صلی علیہ لکن فی النہر عن محمد رحمہ اللہ تعالیٰ لا کانہ تقدیم المانع، وفی الشامیۃ (قولہ او بہا بلا غسل) ہذہ روایۃ ابن سماعۃ والصحیح انہ لا یصلی علی قبرہ فی ہذہ الحالۃ لانہا بلا غسل غیر مشروعۃ کذا فی غایۃ البیان۔ لکن فی السراج وغیرہ قیل لا یصلی علی قبرہ، قال الکرخی

یصلی وهو الاستحسان لان الاولیٰ لم یعتد بها لترك الشرط مع الامکان والآن زال الامکان فسقطت فرضیة الغسل وهذا یقتضی ترجیح الاطلاق وهو الاولی نهر.

(تنبیه) ینبغی ان یکون فی حکم من دفن بلا صلوٰة من تردی فی نحو بئر او وقع علیه بنیان ولم یمکن اخراجه بخلاف ما لو غرق فی بحر لعدم تحقق وجوده امام المصلی تأمل (قوله کأنه تقدیما للمانع) الخبر محذوف ای کأنه قال ذلك تقدیما ای لانه دار الامر بین التفسخ المقتضی عدم الصلوٰة وبین عدمه الموجب لها، فاعتبرنا المانع وهو التفسخ ط اقول وقد علمت نص الاصحاب علی انه یصلی علیه مع الشك فی ذلك ذکره فی المفید والمزید وجوامع الفقه وعامة الکتب وعلله فی المحیط بوقوع الشك فی احوال اه وتمامه فیها (رد المحتار ص ۸۳ ج ۱) فقط والله تعالیٰ اعلم.

۳ شوال سنہ ۸۸ھ

خنثیٰ نابالغ پر نماز جنازہ کی دعا:

سوال: ایک بچہ پیدا ہوا، اس کی شناخت نہیں ہو سکتی کہ لڑکا ہے یا لڑکی، اگر یہ اسی حالت میں مرجائے تو اس کی نماز جنازہ میں لڑکے والی دعا پڑھیں یا لڑکی والی؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملهم الصواب

احتیاط یہ ہے کہ لڑکے والی دعا پڑھیں یا لڑکی والی، البتہ ضمیر تاویل المیت والنسمۃ بتاویل النفس۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۱۰ محرم سنہ ۸۹ھ

مسلم وکافر مخلوط اموات پر نماز جنازہ:

سوال: اگر دو شخص ایک ہی جگہ جل جائیں، ان میں سے ایک کافر ہو اور دوسرا مسلمان، ان کی شناخت نہیں ہو سکتی کہ مسلمان کون ہے اور کافر کون، تو مسلمان کی نماز جنازہ کے متعلق کیا حکم ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملهم الصواب

دونوں میتوں کو سامنے رکھ کر نماز جنازہ پڑھیں اور نیت یہ کریں کہ ان میں سے مسلمان پر پڑھ رہے ہیں۔ کذا فی الشامیۃ۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۱۰ محرم سنہ ۸۹ھ

قبر بیٹھ جائے تو کھود کر درست کرنا جائز نہیں:

سوال: اگر پرانی قبر بیٹھ جائے اور مٹی ڈالنے سے قبل ہی پتھر اور اینٹوں سے قبر کو ڈھکا جا

ہے وہ نیچے گر جائیں تو کیا ان اینٹوں کو قبر میں سے نکال کر دوبارہ درست کیا جا سکتا ہے؟ اور کیا ایسی صورت میں میت کو نکال کر دوسری قبر میں دفن کر سکتے ہیں؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

قبر کے اوپر مٹی ڈال کر درست کر دیجئے، قبر اکھاڑ کر اندر سے پتھر وغیرہ درست کرنا یا میت کو نکال کر دوسری قبر میں دفن کرنا جائز نہیں، قال فی العلائیة ولا یخرج منه بعد اهالة التراب الا لحق آدمی، وفی الشامیة احترز عن حق الله تعالیٰ کما اذا دفن بلا غسل او صلوٰة او وضع علی غیر یمینه او الی غیر القبلة فانه لا ینبش علیه بعد اهالة التراب کما مر (رد المحتار ص [illegible] ج ۱)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۳ ربیع الآخر سنہ [illegible] ھ

بوقت دفن قبر گر جانے کا حکم:

سوال: میت کو قبر میں رکھ کر اوپر پتھر لگا کر مٹی ڈال رہے تھے کہ پتھر نیچے گر گئے، اب ان کو نکال کر دوبارہ درست کرنا یا میت کو دوسری قبر میں منتقل کرنا جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

اگر مٹی سے پتھر چھپ گئے تھے تو نکالنا جائز نہیں ویسے ہی مٹی ڈال دی جائے، البتہ پتھر چھپنے سے قبل پتھر اکھاڑ کر درست کرنا جائز ہے اور یہ قبر مرمت کے قابل نہ رہے تو بضرورت دوسری قبر بنانا جائز ہے، لان کون المیت [illegible] سنة والنبش حرام [illegible]، قال فی العلائیة ولا ینبش لیوجه الیها، وفی الشامیة ای لو دفن مستدبرًا لها واهالوا التراب لا ینبش لان التوجه الی القبلة سنة والنبش حرام بخلاف ما اذا کان بعد اقامة اللبن قبل اهالة التراب فانه یزال ویوجه الی القبلة عن یمینه، حلیة عن التتمة (رد المحتار ص [illegible] ج ۱)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم ۳ ربیع الآخر سنہ [illegible] ھ

اہل میت کو کھانا پہنچانا:

سوال: اہل میت کو تین دن تک کھانا پہنچانا مستحب ہے اگر ایک روز تک پہنچا کر ختم کرے تو قباحت تو نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

میت کے پڑوسیوں اور اعزہ واقارب کے لئے اہل میت کو صرف ایک روز کا کھانا پہنچانا جو دن

اور رات کے لئے کافی ہو جائے مستحب ہے۔ قال ابن عابدین رحمه الله تعالیٰ قال فی الفتح ویستحب لجیران اهل المیت والاقرباء الاباعد تهیئة طعام لهم یشبعهم یومهم ولیلتهم لقوله صلی الله علیه وسلم اصنعوا لآل جعفر طعاما فقد جاءهم ما یشغلهم حسنه الترمذی وصححه الحاکم ولانه بر ومعروف ویلح علیهم فی الاکل لان الحزن یمنعهم من ذلک فیضعفون اھ (رد المحتار)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۱۹ ذی الحجہ

سوال مثل بالا

سوال: ہمارے ملک میں ایک رسم مدت مدید سے چلی آرہی ہے وہ یہ کہ جب کوئی آدمی فوت ہو جائے تو کئی دنوں تک بلکہ کبھی تین یا پانچ مہینوں تک اہل میت کے لئے دوست، رشتہ دار مثلاً سسرال وغیرہ کھانا تیار کرتے ہیں۔ کیا اس طرح کھانا تیار کرنے کا ثبوت کتب حدیث یا کتب فقہ میں ملتا ہے یا نہیں۔ کتب فقہ سے اس کی کراہت معلوم ہوتی ہے، قاضی خان میں ہے ولا بأس بان یکون حمل الطعام الی اهل المصیبة وحمل الطعام فی الیوم الاول غیر مکروه لشغلهم بجهاز المیت وفی الیوم الثانی مکروه اذا اجتمعت النیاحة لانه اعانة لهم علی الاثم والعدوان (قاضی خان کتاب الحظر والاباحة ج ۳) اور عزیز الفتاوی ص ۲۲۲ پر بھی لکھا ہے کہ ایک وقت میت کے لئے کھانا دیگر قرابت دار بھیجیں۔ اور عالمگیریہ میں لکھا ہے حمل الطعام الی صاحب المصیبة والاکل معهم فی الیوم الاول جائز لشغلهم بالجهاز وبعده یکره کذا فی التتارخانیة (عالمگیریہ ص ۳۴۴ ج ۵ کتاب الکراهیة) ترمذی میں بھی جو حدیث نقل کی گئی ہے اس میں بھی پہلے ہی دن کے لئے اہل مصیبت کے لئے کھانا تیار کرنے کا جواز معلوم ہوتا ہے۔ فتح القدیر میں بھی اسی کے قریب قریب الفاظ ہیں ویستحب لجیران اهل المیت والاقرباء الاباعد تهیئة طعام لهم یشبعهم یومهم ولیلتهم (فتح القدیر ج ۲) ان لوگوں کا اس طرح کھانا تیار کرنے سے مقصد صرف اہل میت کی تسلی ہے۔ اس کھانے میں شرعی محرمات نہیں ہوتے ہیں۔

بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملهم الصواب

ایک دن سے زیادہ کھانا بھیجنا مکروہ ہے، اس رسم میں غیر مستحق حرج اور تکلیف مالا یطاق کے علاوہ یہ قباحت بھی ہے کہ عوام اس کو حکم شرعی سمجھنے لگے ہیں یا سمجھنے لگیں گے جو شریعت پر زیادتی اور بدعت ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۳ رمضان ۹۹ھ

مردہ پیدا ہونے والا بچہ بھی سفارش کرے گا :

سوال : جو بچہ ماں کے پیٹ سے مردہ پیدا ہو جائے آیا قیامت کے دن وہ اپنے والدین کیلئے سفارش کرتا ہے یا نہیں یا سفارش صرف اس بچہ کے لیے مخصوص ہے جو زندہ پیدا ہو کر مر جائے۔ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

مردہ پیدا ہونے والا بچہ بھی والدین کی سفارش کرے گا۔ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان السقط لیراغم ربہ اذا ادخل ابویہ النار فیقال ایہا السقط المراغم ربہ ادخل ابویک الجنۃ فیجرہما بسررہ حتی یدخلہما الجنۃ وفی حدیث اخر والذی نفسی بیدہ ان السقط لیجر امہ بسررہ الی الجنۃ اذا احتسبتہ (ابن ماجۃ ص ۱۱۶) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۱۲ رجب سنہ ۸۸ھ

نابالغ کو ایصال ثواب :

سوال : نابالغ کو ثواب پہنچانے میں نابالغ کے درجات بلند ہوں گے یا نہیں؟ جبکہ نابالغ غیر مکلف ہے۔ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

نابالغ کو اپنی حسنات کا ثواب ملتا ہے، اس سے ثابت ہوا کہ اس کو غیر بھی اپنی حسنات کا ایصال ثواب کر سکتا ہے، نیز اس پر نماز جنازہ کی دعاء بھی اس کے لئے مفید ہے اس سے بھی ایصال ثواب کا افادہ ثابت ہوا۔ قال العلائی فی دعاء جنازۃ الصبی وھو دعاء لہ ایضا بتقدمہ فی الخیر لاسیما وقد قالوا حسنات الصبی لہ لا لابویہ بل لہما ثواب التعلیم (رد المحتار ص ۱۱۳ ج ۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۱۶ رجب سنہ ۸۸ھ

قبرستان سے الگ دفن کرنا مکروہ ہے :

سوال : عام مسلمانوں کے مدفن سے علیحدہ کسی کو دفن کر دیا جائے تو جائز ہے یا نہیں، ایک صاحب عدم جواز کے قائل ہیں، کیا وہ ٹھیک کہتے ہیں؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

مسلمانوں کے عام قبرستان میں دفن کرنا مسنون ہے، اس کے خلاف کسی خاص مقام میں دفن کرنا مکروہ ہے۔ عالم اور بزرگ کو کسی مدرسہ یا مسجد یا اور کسی خاص مقام میں دفن کرنے کی رسم عام ہو گئی ہے، حضرات فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ نے اس پر خصوصیت سے نکیر فرمائی ہے ایسے مقتدا حضرات پر یہ وصیت کرنا

واجب ہے کہ ان کو مرنے کے بعد عام قبرستان میں دفن کیا جائے، قال فی شرح التنویر ولا ینبغی ان یدفن المیت فی الدار ولو کان صغیرا لاختصاص هذه السنة بالانبیاء، وفی الشامیة (قوله فی الدار) كذا فی الحلية عن منية المفتی وغيرها وهو اعم من قول الفتح ولا يدفن صغير ولا كبير فی البيت الذی مات فيه فان ذلك خاص بالانبياء بل ينقل الى مقابر المسلمين اه ومقتضاه انه لا يدفن فی مدفن خاص كما يفعله من يبنی مدرسة ونحوها ويبنی له بقربها مدفنا. تأمل (رد المحتار ص ۸۳۴ ج ۱)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم — ۲۳ شوال سنہ ۸۸ھ

مُردہ پیدا ہونے والے بچے کے غسل وغیرہ کا حکم:

سوال: اگر بچہ پیدائش سے پہلے ہی مر گیا یا اسقاط ہو گیا تو عام طور پر اسے کہیں گڑھا کھود کر گاڑ دیتے ہیں کیا یہ طریقہ صحیح ہے یا کہ اس کو غسل اور کفن دے کر قبرستان میں دفن کرنا چاہیے، بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

اسقاط کی صورت میں اگر کوئی عضو بن گیا ہو مگر پورا جسم نہ بنا ہو تو اس پر پانی بہا کر کپڑے میں لپیٹ کر کہیں بھی دفن کر کے زمین ہموار کر دی جائے، غسل اور کفن و دفن میں طریق مسنون کی رعایت نہیں کی جائے گی اور پورا جسم بن چکا ہو تو غسل اور کفن و دفن بطریق مسنون میں اختلاف ہے، بطریق مسنون کا قول احوط اور دوسرا ایسر ہے۔ نام رکھنا دونوں صورتوں میں مختلف فیہ ہے، رکھنا احوط ہے۔ نماز جنازہ نہ پڑھی جائے البتہ پیدا ہونے کے بعد مرا تو نماز جنازہ بھی پڑھی جائے گی اور سنت کے مطابق قبرستان میں دفن کیا جائے گا۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم — ۱۰ محرم سنہ ۸۸ھ

عالم میت کے سر پر عمامہ باندھنا مکروہ ہے:

سوال: میت کے سر پر عمامہ باندھنا جائز ہے یا نہیں؟ ایک مولوی صاحب کہتے ہیں کہ متأخرین فقہاء نے میت عالم کے عمامہ باندھنا بھی بہتر لکھا ہے، کیا یہ صحیح ہے؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

میت خواہ عالم ہو یا عامی بہرحال عمامہ باندھنا مکروہ و بدعت ہے، نقل ابن عابدین رحمہ اللہ تعالیٰ عن القہستانی والاظهر انه تكره العمامة بكل حال كما فی الزاهدی اه (رد المحتار ص ۸۰۴ ج ۱)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم — ۱۰ محرم سنہ ۸۸ھ

متعدد اموات پر دفعۃً نماز جنازہ:

سوال: جب ایک ساتھ بہت جنازے جمع ہو جائیں تو کس طریقے سے نماز جنازہ پڑھی جائے گی؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

افضل یہ ہے کہ ہر ایک پر الگ نماز پڑھی جائے، سب پر ایک ساتھ بھی جائز ہے، اس کی تین صورتیں ہیں: ایک یہ کہ ایک میت امام کے سامنے رکھی ہو، اس کے پاؤں کی طرف دوسری کا سر اور اس کے پاؤں کی طرف تیسری کا سر، دوسری صورت یہ کہ جو میت امام کے سامنے ہے اس کی قبلہ کی طرف دوسری اور اس سے قبلہ کی طرف تیسری، سب کا سینہ امام کے سامنے ہو، تیسری صورت یہ کہ پہلی میت کے قبلہ کی طرف دوسری میت اس طرح رکھی جائے کہ پہلی کے کندھوں کے برابر دوسری کا سر ہو، اسی طرح دوسری کے کندھوں کے برابر تیسری کا سر ہو، تینوں صورتوں میں امام کے قریب افضل میت ہو، پھر لڑکا پھر عورت۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۱۹ صفر سنہ ۸۹ھ

میت کو مقام موت سے دوسرے مقام کی طرف منتقل کرنا:

سوال: میت کو جائے موت سے دوسرے شہر کی طرف منتقل کرنے میں کیا تحقیق ہے؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

میت کو دوسرے شہر کی طرف نقل کرنا مکروہ تحریمی ہے، قال فی الشامیۃ (قولہ ولا بأس بنقلہ قبل دفنہ) قیل مطلقا وقیل الی ما دون مدۃ السفر وقیدہ محمد رحمہ اللہ تعالیٰ بقدر میل او میلین لان مقابر البلد ربما بلغت ہذہ المسافۃ فیکرہ فیما زاد قال فی النہر عن عقد الفرائد وہو الظاہر اہ (رد المحتار ص ۸۳۷ ج ۱) وقال فی المراقی ویکرہ نقلہ لاکثر منہ ای اکثر من المیلین کما فی الظہیریۃ وقال شمس الائمۃ السرخسی وقول محمد رحمہ اللہ تعالیٰ فی الکتاب لا بأس ان ینقل المیت قدر میل او میلین بیان ان النقل من بلد الی بلد مکروہ قالہ قاضی خان وقال العلامۃ الطحطاوی رحمہ اللہ تعالیٰ مکروہ ای تحریما [illegible] (ص ۳۳۲) وفی الفتح [illegible] فی الحاجۃ [illegible] وذکر [illegible] فی بلدۃ یکرہ نقلہ الی اخری لانہ اشتغال بما لا یفید فیہ تاخیر دفنہ وکفی بذلک کراہۃ (البحر الرائق ص ۲۰۹ ج ۲) نقل میت میں تاخیر دفن و خطرۂ

فساد عقیدت کے علاوہ آجکل مزید مندرجہ ذیل مفاسد پیدا ہو گئے ہیں:
① اس کا التزام ہونے لگا ہے ② مصارف کثیرہ و مشقت شدیدہ کا تحمل ③ آبائی قبرستان میں دفن کرنے کے التزام اور اس پر اصرار سے یہ عقیدہ ثابت ہوتا ہے کہ ایک مقام میں دفن ہونے والے اموات کی آپس میں ملاقات ہوتی ہے، حالانکہ یہ عقیدہ غلط ہے ④ جنازے کو نقل کرنا عموماً نماز جنازہ کے تکرار کا سبب بنتا ہے جو ناجائز ہے۔ فقط واللہ تعالی اعلم

۲۳ ربیع الآخر سنہ ۱۴۰۰ھ

سوال مثل بالا:

سوال: بہشتی زیور میں میت کو دوسرے شہر کی طرف لے جانے کو ناجائز لکھا ہے، امداد الفتاوی میں بھی اسی طرح ہے مگر ایک عالم فرماتے ہیں کہ ان کی تحقیق کے مطابق مقام موت میں دفن کرنا صرف مستحب ہے اور دوسرے شہر کی طرف منتقل کرنے میں کسی قسم کی کوئی کراہت نہیں۔ امید ہے کہ اس بارے میں مدلل جواب عنایت فرمائیں گے۔ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

قال ابن نجیم رحمه الله تعالی: ولم یتکلم المصنف علی نقل المیت من مکان الی آخر قبل دفنه، قال فی الواقعات والتجنیس: القتیل والمیت یستحب ان یدفنا فی المکان الذی قتل او مات فیه فی مقابر اولئک القوم لما روی عن عائشة رضی الله تعالی عنها انها زارت قبر اخیها عبد الرحمن بن ابی بکر رضی الله تعالی عنهما وکان مات بالشام[1] وحمل من هناک فقالت لو کان الامر فیک الیَّ ما نقلتک ولدفنتک حیث مت. ثم مع هذا اذا نقل میلا او میلین او نحو ذلک فلا باس، وان نقل من بلد الی بلد فلا اثم فیه لانه روی ان یعقوب صلوات الله علیه مات بمصر فحمل الی ارض الشام من مصر لیکون مع عظام آبائه، وسعد بن ابی وقاص رضی الله تعالی عنه مات فی ضیعة علی اربعة فراسخ من المدینة فحمل علی اعناق الرجال الی المدینة اهـ وقال ابن عابدین رحمه الله تعالی فی حاشیته علی البحر (قوله لانه روی ان یعقوب صلوات الله تعالی علیه الخ) لا یخفی ان هذا شرع من قبلنا ولم تتوفر فیه شروط کونه شرعا لنا کذا فی شرح العلامة المقدسی ومثله فی شرح الشیخ اسمعیل عن الفتح واوضح بان من شرط کونه شریعة لنا ان یقصه الله تعالی او رسوله صلی الله تعالی علیه وسلم ولم یوجد ذلک مع ان ما نقل من نقل سعد رضی الله تعالی عنه یحتمل انه لم یرد من انکره لکن ورد ما عن عائشة رضی الله تعالی عنها من نقل اخیها الا ان یقال ذلک من بلد الی بلد ونقل سعد دونه

---

[1] وفی روایة الترمذی بحُبشی وهو موضع قریب من مکة ۔ رشید احمد

لكن ما استدل له به هو من بلد الى بلد فيتأمل، قال وقد جزم في الواجية بالكراهة وفي التجنيس وذكر انه اذا مات في بلدة يكره نقله الى اخرى لانه اشتغال بما لا يفيد وفيه تأخير دفنه وكفى بذلك كراهة (البحر الرائق ص ۱۹۳ ج ۲) وقال في حاشية الدر (قوله ولا بأس بنقله قبل دفنه) قيل مطلقا وقيل الى ما دون مدة السفر وقيده محمد رحمه الله تعالى بقدر ميل او ميلين لان مقابر البلد ربما بلغت هذه المسافة فيكره فيما زاد، قال في النهر عن عقد الفرائد وهو الظاهر اه واما نقله بعد دفنه فلا مطلقا قال في الفتح واتفقت كلمة المشائخ في امرأة دفن ابنها وهي غائبة في غير بلدها فلم تصبر وارادت نقله على انه لا يسعها ذلك فتجويز شواذ بعض المتأخرين لا يلتفت اليه واما نقل يعقوب ويوسف عليهما السلام من مصر الى الشام ليكونا مع آبائهما الكرام فهو شرع من قبلنا ولم يتوفر فيه شروط كونه شرعا لنا اه ملخصا وتمامه فيه (رد المحتار ص ۸۴۰ ج ۱) وقال العلامة الشرنبلالي رحمه الله تعالى ويكره نقله لاكثر منه اي اكثر من الميلين كذا في الظهيرية وقال شمس الائمة السرخسي رحمه الله تعالى وقول محمد رحمه الله تعالى في الكتاب لا بأس ان ينقل الميت قدر ميل او ميلين بيان ان النقل من بلد الى بلد مكروه وقد قال قاضي خان لو مات في غير بلده يستحب تركه فان نقل الى مصر آخر لا بأس به لما روي ان يعقوب صلوات الله عليه مات بمصر ونقل الى الشام وسعد بن ابي وقاص رضي الله تعالى عنه مات في ضيعة على اربعة فراسخ من المدينة ونقل على اعناق الرجال الى المدينة قلت يمكن الجمع بان الزيادة مكروهة في تغير الرائحة او خشيتها وتنتفي بانتفائها لمن هو مثل يعقوب عليه السلام او سعد رضي الله تعالى عنه لانهما من احياء الدارين، وقال الطحطاوي رحمه الله تعالى (قوله اه) [illegible] قال في رد كلام صاحب الهداية في التجنيس انه لا اثم في النقل من بلد الى بلد لما نقل ان يعقوب ما نقله الى وذلك شرع من قبلنا ولم تتوفر فيه شروط كونه شرعا لنا ولان اجساد الانبياء عليهم السلام الطيب لا يكون حال الموت كالحياة والشهداء كسعد رضي الله تعالى عنه ليس اكثرهم ممن جيفتهم اشد نتنا من جيفة البهائم فلا يلحق بهم اه (الطحطاوي على مراقي الفلاح ص ۳۴۲)

تحقیق بالا سے ثابت ہوا کہ نقل میت کا عدم جواز امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ سے ثابت ہے اور یہی ظاہر المذہب ہے۔ فقہاء حنفیہ امام ابن ہمام، شرنبلالی، طحطاوی، علامہ شامی وغیرہم رحمہم اللہ تعالیٰ اسی کے قائل ہیں، اس کے بعد کسی حنفی کے لئے قول جواز اور اس پر ملفق واقعات سے استدلال کی کوئی گنجائش نہیں بالخصوص امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے قول عدم جواز کے بعد مقلد کے لئے کسی دلیل کی طرف التفات جائز نہیں کیونکہ یہ وظیفہ مجتہد کا ہے اس لئے ان واقعات کے جواب کی ضرورت نہیں جن سے جواز کا شبہ ہوتا ہے مع ہذا تحقیق

بالا میں ان دو واقعات کے جواب بھی مذکور ہیں، نقل میت کے باب میں کل چار حضرات کے واقعات منقول ہیں حضرت یعقوب علیہ السلام، حضرت یوسف علیہ السلام، حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت عبدالرحمن بن ابی بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہما۔ ان چاروں واقعات کے جوابات بالترتیب درج ذیل ہیں۔

حضرت یعقوب وحضرت یوسف علیہما السلام:

① ان واقعات کی صحت ہی میں کلام ہے، کسی حدیث سے ثابت نہیں۔

② شرائع من قبلنا جب تک قرآن یا حدیث میں منقول نہ ہو حجت نہیں۔ قرآن یا حدیث میں منقول ہونے کے باوجود ان کی حجت کے لئے یہ شرط ہے کہ ہماری شریعت میں اس کے خلاف حکم نہ ہو اور مسئلہ زیر بحث میں تو تعجیل کا حکم اس قدر مؤکد ہے کہ اوقات مکروہہ میں بھی نماز جنازہ ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور جمع عظیم کے انتظار کے لئے نماز میں تاخیر کی اجازت نہیں دی گئی، اسراع جنازہ کا حکم احادیث صحیحہ میں وارد ہے۔

③ یہ واقعات نقل بعد دفن سے متعلق ہیں جو باتفاق مشائخ رحمہم اللہ تعالیٰ ناجائز ہے۔

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ:

اس میں ایک شہر سے دوسرے شہر کی طرف نقل نہیں پایا گیا، آپ کا انتقال مدینہ منورہ سے باہر بارہ میل کے فاصلہ پر زرعی زمین میں ہوا، تو قوی احتمال بلکہ ظن غالب ہے کہ وہاں کوئی قبرستان نہیں ہوگا اس لئے دفن مدینہ میں لائے گئے۔

حضرت عبدالرحمن بن ابی بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہما:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فقہاء صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین میں سے ہیں، اس نقل مکانی پر آپ کا انکار فرمانا اس کے عدم جواز پر قوی دلیل ہے۔

بعض نے چاروں واقعات کا مشترک جواب یوں دیا ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام اور صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے جنازہ میں فساد میت کا اندیشہ نہیں تھا، اس لئے جب فساد میت کا خطرہ نہ ہو تو نقل مکانی جائز ہے، اس کو صورت تطبیق قرار دیا ہے مگر یہ اس لئے صحیح نہیں کہ احادیث اسراع، قول محمد رحمہ اللہ تعالیٰ و اقوال مشائخ رحمہم اللہ تعالیٰ کے اطلاق کے خلاف ہے اور انکار عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا تو صراحۃً اس تطبیق کو باطل کر رہا ہے، وقت مکروہ میں بھی ادائے نماز جنازہ کا حکم ہے حالانکہ چار پانچ منٹ کی تاخیر میں فساد میت کا کوئی احتمال نہیں۔ علاوہ ازیں بقاء میت کا فی نفسہ کوئی جواز ہو تو بھی اس زمانہ میں اس کا جس قدر اہتمام ہونے لگا ہے اور اس میں جو مفاسد پیدا ہوگئے ہیں ان کے پیش نظر اس کا کوئی جواز نہیں، ان مفاسد کی تفصیل جواب سابق کے آخر میں ہے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۳۰ رجب [illegible]

نابالغ کو غسل موت میں وضو کرایا جائے:

سوال: آیا نابالغ بچے کے مرنے کے بعد اس کو غسل میں وضو کرایا جائے گا یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

نابالغ کو بھی وضو کرانا چاہئے، قال فی الشامیة (قوله ویوضأ من یؤمر بالصلوة) خرج الصبی الذی لم یعقل لانه لم یکن بحیث یصلی قاله الحلوانی وهذا التوجیه لیس بقوی اذ یقال ان هذا الوضوء سنة الغسل المفروض للمیت لا تعلق بکون المیت بحیث یصلی اولا کالمجنون ثم المیت ومقتضاه انه لا یختلف فی ان المجنون یوضأ وان الصبی الذی لا یعقل الصلوة یوضأ ایضا علی خلاف ما یقتضیه توجیه الحلوانی من انهما لا یوضأان (رد المحتار ص [illegible] ج ۱) والله تعالیٰ اعلم

۲ ربیع الآخر سنہ ۹۱ھ

زیارت قبور کا مسنون طریقہ:

سوال: قبرستان ہر کس روز جانا افضل ہے اور قبرستان میں جا کر مردے کے لئے دعا، مغفرت اور ایصال ثواب کا مسنون طریقہ کیا ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

ہفتہ میں ایک روز قبرستان جانا چاہئے، جمعہ، جمعرات اور پیر کا دن افضل ہے۔ قبرستان میں داخل ہو کر یوں سلام کہے: السلام علیکم دار قوم مؤمنین وانا ان شاء الله بکم لاحقون ونسأل الله لنا ولکم العافیة، پھر میت کے پاؤں کی طرف سے چہرے کے سامنے کھڑا ہو کر دیر تک دعا کرے، اگر بیٹھنا چاہے تو زندگی میں میت کے ساتھ تعلق کے مطابق قریب یا دور بیٹھے، جس قدر میسر ہو تلاوت کرے بالخصوص سورۂ بقرہ کا اول مفلحون تک، آیۃ الکرسی، آمن الرسول، سورۂ یٰس، سورۂ ملک، التکاثر اور سورۂ اخلاص بارہ یا گیارہ یا سات یا تین بار پڑھ کر ایصال ثواب کرے۔ فقط والله تعالیٰ اعلم۔

۸ ربیع الآخر سنہ ۹۸ھ

نابالغ کو بوقت نزع یٰس سنانا:

سوال: نابالغ بچے کو سورۂ یٰس نزع کے وقت سنانا کیسا ہے باعث ثواب ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

میت خواہ بالغ ہو یا نابالغ بہرصورت بوقت نزع یٰس سنانا مستحب ہے، قال فی الشامیة

(قوله ويندب قراءة يس) لقوله صلى الله عليه وسلم اقرءوا على موتاكم يس صححه ابن حبان وقال المراد به من حضره الموت (رد المحتار ص۵۹۱ ج۱) فقط والله تعالى اعلم۔

۲ ربیع الآخر [illegible]ھ

نماز جنازہ کا تکرار جائز نہیں:

سوال: تعدد نماز جنازہ جائز ہے یا نہیں؟ بعض لوگ حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نماز جنازہ سے جواز پر استدلال کرتے ہیں ان کا یہ استدلال صحیح ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملهم الصواب

نماز جنازہ میں تکرار جائز نہیں، البتہ بدون اذن ولی پڑھی گئی ہو تو ولی کو اعادہ کا حق ہے، اس صورت میں بھی جو لوگ پہلے پڑھ چکے ہوں ان کو ولی کے ساتھ دوبارہ پڑھنا جائز نہیں، قال فی العلائية ليس لمن صلى عليها ان يعيد مع الولى لان تكرارها غير مشروع (رد المحتار ص۸۲۳ ج۱) وقال العلامة العثمانی رحمه الله تعالى كان ابن عمر رضى الله تعالى عنهما اذا انتهى الى جنازة قد صلى عليها دعا وانصرف ولم يعد الصلوة، قال ابو عمر فى التمهيد هذا هو الصحيح المعروف من مذهب ابن عمر من غير ما وجه من نافع وقد يحتمل ان يكون معنى رواية من روى انه صلى عليها انه دعا له لان الصلوة دعاء وقال مالك وابو حنيفة واصحابهما لا تعاد الصلوة على الجنازة ولا يصلى على القبر وهو قول الثورى والاوزاعى والحسن بن حى والليث (اعلاء السنن ص۲۱۹ ج۸)

حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر تکرار نماز حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خصوصیت تھی یا بار بار دوسرے شہداء رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے ساتھ رکھنے سے آپ پر نماز مقصود نہ تھی بلکہ موضع صلوٰۃ دوسرے صالحین کی برکت کے لیے ہر بار ساتھ رکھے جاتے تھے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۲۳ ربیع الآخر [illegible]ھ

میت گھر میں ہوتے ہوئے کھانا جائز ہے:

سوال: سنا ہے کہ ہمسایہ کے مکان میں جب تک میت رکھی رہے اس وقت تک کھانا کھانا درست نہیں خواہ کتنی ہی بھوک لگے، شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملهم الصواب

اس کا کوئی ثبوت نہیں، بلکہ خود اہل میت کے لیے بھی کھانے سے پرہیز کا شرعاً کوئی حکم نہیں، صدمہ اور غم کی وجہ سے کھانا نہ کھا سکیں تو اور بات ہے، آجکل یہ رسم بن گئی ہے، اور اس کا بہت اہتمام

ہونے لگا ہے کہ میت کے گھر میں ہونے ہونے تک کھانا کھانا ناگوار سمجھتے ہیں، اس لئے اس رسم کا ترک واجب ہے، بلکہ کچھ نہ کچھ کھانا چاہئے، عزیز و اقارب اور پڑوسیوں پر لازم ہے کہ اہل میت کو ترغیب و اصرار سے کھانا کھلائیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲ صفر سنہ ۸۶ھ

قبر میں کوئی سامان رہ جائے تو کھود کر نکالنا جائز ہے:

سوال:- اگر کسی شخص کی قبر میں دفن کرتے وقت کچھ رقم یا سامان رہ جائے تو قبر کو دوبارہ کھود کر رقم وغیرہ نکالنا جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

جائز ہے، قال ابن عابدین رحمہ اللہ تعالیٰ: ولو بقی فیہ متاع لانسان فلا بأس بالنبش، ظہیریۃ (رد المحتار ص ۸۳۶ ج ۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲۴ صفر سنہ ۸۶ھ

صالح میت کے جنازہ کے ساتھ جانا نوافل سے افضل ہے:

سوال:- کیا مرد پرہیزگار آدمی کے جنازہ کے ساتھ جانا نفل نماز سے افضل ہے یا کہ ہر مسلمان کے جنازہ کا یہی حکم ہے؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

میت کا پڑوسی ہو یا اس سے قرابت ہو یا میت صالح ہو تو اس کے جنازہ کے ساتھ قبرستان تک جانا نوافل سے افضل ہے، قال فی العلائیۃ: الاتباع افضل من النوافل لو لقرابۃ او جوار او فیہ صلاح معروف (رد المحتار ص ۸۲۴ ج ۱) واللہ تعالیٰ اعلم

۲۳ شوال سنہ ۸۸ھ

دفن سے قبل لوٹنے کے لئے ولی میت سے اجازت لینا:

سوال:- کیا نماز جنازہ کے بعد کوئی لوٹنا چاہے تو میت کے رشتہ داروں سے اجازت کی ضرورت ہے؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

مستحب ہے، قال قاضی خان رحمہ اللہ تعالیٰ: ولا یرجع عن الجنازۃ قبل الدفن بغیر اذن اہلہا (خانیۃ ص ۹۲ ج ۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۱۳ شوال سنہ ۸۸ھ

میاں بیوی میں سے ایک کا دوسرے کی میت کو دیکھنا یا نہلانا:

سوال:۔ اگر شوہر یا بیوی میں سے کسی ایک زوج کا انتقال ہو جائے تو دوسرا زوج اسے دیکھ سکتا ہے یا چھو سکتا ہے یا اس کا جنازہ اٹھا سکتا ہے یا قبر میں اتار سکتا ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملهم الصواب

بیوی سب کچھ کر سکتی ہے، مگر شوہر دیکھ سکتا ہے نہلا نہیں سکتا، اور ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا، جنازہ اٹھا سکتا اور قبر میں اتار سکتا ہے، قال فی التنویر ویمنع زوجها من غسلها ومسها لا من النظر الیها علی الاصح وهی لا تمنع من ذلک (رد المحتار ص ۸۰۲ ج ۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۲۰ جمادی الآخرہ سنہ ۹۲ھ

کفار کی نابالغ اولاد کا حکم:

سوال:۔ کافروں کے نابالغ بچے جنت میں جائیں گے یا نہیں؟ اور ان سے قبر میں سوال ہوگا یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملهم الصواب

ان دونوں امور میں اختلاف ہے، حضرت امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ نے دونوں میں توقف فرمایا ہے، اور یہی اسلم ہے کما فی الشامیۃ۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۹ ربیع الاول سنہ ۸۸ھ

قبر پر دعاء کے لئے ہاتھ اٹھانا:

سوال:۔ میت کو ثواب پہنچانے کے لئے قبر پر ہاتھ اٹھا کر دعاء کرنا درست ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملهم الصواب

جائز ہے، کما ورد فی الحدیث، مسلم، البتہ بزرگوں کے مزار پر ہاتھ نہ اٹھائے، تاکہ اہل قبر سے مانگنے کا ایہام نہ ہو۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۹ ذی الحجہ سنہ ۸۵ھ

نماز جنازہ میں قبر سامنے ہو تو مکروہ نہیں:

سوال:۔ نماز جنازہ کسی مزار کے برابر یا آگے پیچھے رکھ کر ادا کرنا جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملهم الصواب

جائز ہے، حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے خود قبر پر نماز جنازہ پڑھی ہے، فقہ میں بھی یہ حکم مذکور ہے کہ کوئی بدون نماز دفن کر دیا گیا ہو تو میت کے پھٹنے سے پہلے اس کی قبر پر نماز پڑھی جائے،

دوسری نمازوں میں قبر کا سامنے یا دائیں بائیں ہونا اس لئے مکروہ ہے کہ اس میں غیر اللہ یعنی میت کی عبادت کا احتمال ہے، فیکرہ التوجہ والتیامن والتیاسر لہا صورۃ۔ نماز جنازہ میں جب خود میت ہی سامنے رکھی جاتی ہے تو قبر کا سامنے ہونا بطریق اولیٰ جائز ہوگا، فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲۲ ربیع الاول سنہ ۹۰ھ

نماز جنازہ میں رکنیت دعا کی تفصیل:

سوال: جو شخص نماز جنازہ کی دعا نہ جانتا ہو اور صرف نیت کرکے یونہی امام کے پیچھے کھڑا ہو گیا کیا اس کی نماز جنازہ ہوگئی اور میت کو ثواب ملے گا؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

نماز ہوگئی اور میت کو ثواب ملے گا، نماز جنازہ میں دعا کی رکنیت مختلف فیہ ہے، علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ نے رکنیت کو ترجیح دی ہے مگر بوقت عذر یہ رکن بالاتفاق ساقط ہو جاتا ہے، فقط واللہ تعالیٰ اعلم

غرۂ ربیع الآخر سنہ ۹۱ھ

عیدگاہ میں نماز جنازہ جائز ہے:

سوال: جس جگہ نہ پنج وقتہ نماز پڑھی جاتی ہو نہ جمعہ پڑھا جاتا ہو، بلکہ صرف عیدین کی نماز پڑھی جاتی ہو یعنی عیدگاہ میں نماز جنازہ ہو سکتی ہے؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

جائز ہے، فقط واللہ تعالیٰ اعلم

غرۂ ربیع الآخر سنہ ۹۱ھ

نماز جنازہ میں عورت کی محاذات مفسد نہیں:

سوال: اگر جنازہ کی نماز میں عورت کسی مرد کے ساتھ کھڑی ہوگئی تو مرد کی نماز جنازہ صحیح ہوگی یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

نماز جنازہ میں عورت کی محاذات مفسد نہیں، نماز ہوگئی، فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲۶ شعبان سنہ ۹۱ھ

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نماز جنازہ کس طرح پڑھی گئی؟:

سوال: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز جنازہ جماعت کی صورت میں ہوئی یا انفرادی صورت میں، اگر جماعت کے ساتھ ہوئی تو نماز کس نے پڑھائی؟ اگر انفرادی طور پر ہوئی تو اس میں کیا

نکتہ ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے نماز جنازہ انفراداً پڑھی، ایک جماعت حجرۂ شریفہ میں داخل ہوتی اور انفراداً نماز پڑھتی جب یہ فارغ ہو کر نکلتی تو دوسری جماعت داخل ہوتی۔ روی الترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ عن سالم بن عبید رضی اللہ تعالیٰ عنہ فی حدیث طویل قالوا لابی بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ یا صاحب رسول اللہ انصلی علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال نعم قالوا وکیف، قال یدخل قوم فیکبرون ویدعون ویصلون ثم یخرجون ثم یدخل قوم فیکبرون ویصلون ویدعون ثم یخرجون حتی یدخل الناس الحدیث (شمائل مع السنن ص ۲۰۰) قال القاضی عیاض الصحیح الذی علیہ الجمہور ان الصلوٰۃ علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم کانت صلوٰۃ حقیقیۃ لا مجرد الدعاء فقط واجیب عما اعتل بہ الاولون بان المقصود من الصلوٰۃ علیہ عود التشریف علی المسلمین مع ان الکامل یقبل زیادۃ التکمیل نعم لا خلاف انہ لم یؤمھم احد علیہ کما مر لقول علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ھو امامکم حیا ومیتا فلا یقوم علیہ احد الحدیث رواہ ابن سعد (زرقانی ص ۲۹۲ ج ۸)

بلا جماعت پڑھنے کی علماء نے کئی وجوہ بیان فرمائی ہیں:۔

① زرقانی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حالتِ حیات کی طرح بعد الممات بھی خود امام ہیں۔

② امامت خلیفہ کا حق ہے اور اس وقت تک کوئی خلیفہ مقرر نہیں ہوا تھا۔

③ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وصیت فرمائی تھی کہ تجہیز وتکفین کے بعد مختلف گروہوں کی صورت میں حجرہ میں داخل ہو کر بلا جماعت نماز پڑھیں، وقد ورد فی بعض الروایات انہ صلی اللہ علیہ وسلم کان اوصی علی الوجہ المذکور ولذا وقع التاخیر فی دفنہ۔ (حاشیۃ الشمائل لابی الطیب السندی) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۳ ربیع الآخر سنہ ۱۳۸۲ھ

نماز جنازہ سنتوں کے بعد پڑھی جائے:

سوال:۔ دن کے فرض کے بعد سنتوں سے پہلے نماز جنازہ پڑھی جائے یا سنتوں سے

فارغ ہوکر؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

اس میں اختلاف ہے کہ نماز جنازہ سنتوں سے قبل پڑھی جائے یا بعد؟ اس زمانہ میں سنتوں کے بعد پڑھنا مناسب ہے اس لئے کہ دین سے غفلت کا غلبہ ہے، فرضوں کے بعد نماز جنازہ کے لئے لوگ مسجد سے نکلیں گے تو سنت مؤکدہ کے ترک کا خطرہ ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲۹ ربیع الآخر ۱۳۹۳ھ

نماز جنازہ میں ایک سلام پر اکتفاء جائز نہیں:

سوال: کیا نماز جنازہ میں دوسری طرف سلام پھیرنا واجب ہے؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

نماز جنازہ میں دونوں سلام واجب ہیں، لہٰذا ایک پر اکتفاء جائز نہیں، قال الشرنبلالی رحمہ اللہ تعالیٰ ویسلم وجوبا بعد التکبیرۃ الرابعۃ (مراقی الفلاح مع حاشیۃ الطحطاوی ص۳۲۰) وقال الطحطاوی رحمہ اللہ تعالیٰ (قولہ وسننہا اربع الخ) الاولی ان یذکر الواجب قبل السنن وہو التسلیم مرتین بعد الرابعۃ کما ذکرہ بعد (طحطاوی علی المراقی ص۳۲۰)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲۲ جمادی الآخرہ ۱۳۹۲ھ

میت کو اس کے رشتہ دار خود نہلائیں:

سوال: میت کو نہلانے کی اجرت لینا جائز ہے یا نہیں؟ جبکہ بغیر اجرت لئے کوئی غسل نہ دے، بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

اگر سوائے ایک شخص کے دوسرا کوئی بھی نہلانے والا نہ ہو تو اس کو اجرت لینا جائز نہیں اس لئے کہ اس پر نہلانا فرض عین ہے، اور اگر دوسرے بھی نہلانے والے ہوں تو اجرت جائز ہے، لکن لا ینبغی لانہ مکروہ ثم ینبغی لان یعطیہ غیر الاولیاء۔ مگر یہ فریضہ میت کے رشتہ داروں کو ادا کرنا چاہئے، اپنے عزیز کو خود غسل نہ دینا اور دوسروں کے سپرد کرنا انتہائی بے مروتی، بے غیرتی اور دلیل کبر ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۱۷ شعبان ۱۳۹۳ھ

نہلانے اور دفنانے کی اُجرت:

سوال :- مردہ کو نہلانے اور دفن کرنے والوں کو اجرت دینا جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

جائز ہے، البتہ اگر دوسرا کوئی نہ ہو تو چونکہ اسی فرد واحد پر غسل دینا اور دفن کرنا فرض عین ہو اس لئے اجرت جائز نہیں، قال فی شرح التنویر والافضل ان یغسل المیت مجاناً، فان ابتغی الغاسل الاجرۃ جاز ان کان ثمہ غیرہ والا لا لتعینہ علیہ، وینبغی ان یکون حکم الحمال والحفار کذلک (رد المحتار ص ۲۰۴ ج ۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۳۰ ربیع الآخر سنہ ۱۳۸۵ھ

میت کا منہ دکھلانے کی رسم:

سوال :- میت کو کفنانے کے بعد اس کا منہ دکھانے کی رسم کا شرعاً کیا حکم ہے؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

اس رسم میں مندرجہ ذیل مفاسد ہیں، اس لئے واجب الترک ہے:-

(۱) بعض علاقوں میں میت کا منہ دیکھنے کو باعث اجر و ثواب سمجھا جاتا ہے، حالانکہ شریعت میں اس کی کوئی اصل نہیں، لہٰذا اس میں ثواب سمجھنا بدعت ہے، اور اگر ثواب نہ بھی سمجھے تو اس سے بدعت کی ترویج و تائید ہوتی ہے۔

(۲) شرعی حکم یہ ہے کہ میت کو غسل دینے وقت اور کفناتے وقت کم سے کم آدمی ہوں اور وہ میت کے اقارب و احباب میں سے ہوں، تاکہ میت میں خدانخواستہ کوئی عیب یا تغیر پیدا ہو جائے تو اس کا افشاء نہ ہو، منہ دکھلانے کی رسم شریعت کے اس حکم و حکمت کے خلاف ہے۔

(۳) اگر میت کوئی مشہور شخصیت ہو تو اس کی منہ دکھائی کی رسم میں کئی گھنٹے صرف کئے جاتے ہیں، حالانکہ میت کے دفن میں تاخیر جائز نہیں۔

(۴) رونمائی کی رسم کا نتیجہ یہ ہے کہ میت کی تصویریں لے کر اخبارات میں شائع کی جاتی ہیں جس میں تصویر کی لعنت و عذاب کے علاوہ میت کے چہرے میں تغیر کی اشاعت ہے، جو حرام ہے۔

آجکل یہ قبیح رسم خواص علماء و مشائخ میں بھی عام رائج ہو گئی ہے، اس لئے اس سے احتراز

کی وصیت کرنا واجب ہے، وصیت نہ کرنے کی صورت میں اس کا وبال و عذاب میت پر بھی ہوگا۔ واللہ الحفیظ، فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۲۲ ربیع الآخر سنہ ۹۳ھ

شیعہ کے جنازہ میں شرکت جائز نہیں:

سوال: شیعہ کی نماز جنازہ یا جنازہ میں سُنی کی شرکت از روئے شرع کیسی ہے؟ جبکہ روزنامہ جنگ کراچی میں ہمارے بعض علماء کرام کی شرکت کی خبر شائع ہو چکی ہے، اگر شیعہ کی نماز جنازہ میں شرکت جائز ہے تو خیر ورنہ ان علماء کی شرکت کا کیا مطلب؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ الآیۃ (۹ - ۸۴)

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ الآیۃ (۹ - ۱۱۳) شیعہ کا کفر ظاہر ہے، اور مذکورہ آیات میں صراحۃً کفار کی نماز جنازہ پڑھنے، ان کی قبر پر جانے اور ان کے لئے طلب مغفرت سے منع کیا گیا ہے، اگر شیعہ کی نماز جنازہ میں کسی عالم کی شرکت کی خبر شائع ہوئی ہے تو اس عالم سے وضاحت طلب کی جائے، اخبار کی خبر معتبر نہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۳ محرم سنہ ۹۳ھ

جنازہ کے لئے کھڑا ہونا جائز نہیں:

سوال: میت کی تعظیم کے لئے کھڑا ہونا جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

جائز نہیں، قال فی شرح التنویر ولا یقوم من فی المصلی لها اذا رآها قبل وضعها ولا من مرت علیه هو المختار وما ورد فیه منسوخ زیلعی (رد المحتار ص ۶۴۳ ج ۱)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۱۳ ذوالقعدہ سنہ ۹۳ھ

جنازہ کی چادر پر آیات قرآنیہ لکھنا جائز نہیں:

سوال: آجکل جنازہ کے اوپر ایسی چادریں ڈالی جاتی ہیں جن پر قرآنی آیات اور کلمات لکھے ہوتے ہیں، کیا ایسی چادریں ڈالنا درست ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

اس کا کوئی ثبوت نہیں، اور بے ادبی کا خطرہ ہے، اس لئے جائز نہیں، نقل ابن عابدین

رحمہ اللہ تعالیٰ عن الفتح انہ تکرہ کتابۃ القرآن واسماء اللہ تعالیٰ علی الدراہم والمحاریب والجدران وما یفرش وما ذاک الا لاحترامہ وخشیۃ وطئہ ونحوہ مما فیہ اہانۃ فالمنع ہنا بالاولیٰ مالم یثبت عن المجتہد او ینقل فیہ حدیث ثابت فتأمل (رد المحتار ص ۲۰۲ ج ۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۶ محرم سنہ ۸۹ھ

خنثیٰ میت کے غسل کی تفصیل:

سوال: اگر خنثیٰ مشکل مر جائے تو اس کو مرد غسل دے یا عورت؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

جہاں تک ہو سکے خنثیٰ کو سب احکام میں مرد یا عورت کے حکم میں شمار کیا جائے گا، اگر اس میں علامات مرد کی زیادہ ہوں مثلاً داڑھی نکل آئے، یا مرد کی پیشاب گاہ سے پیشاب کرتا ہو یا اس سے کسی عورت کو حمل ہو گیا ہو تو اس کو مرد سمجھا جائے گا، اور عورت کی علامات زیادہ ہوں مثلاً حاملہ ہو گئی یا پستان ظاہر ہو گئے یا حیض آنے لگے یا عورت کی پیشاب گاہ سے پیشاب کرتی ہو تو اس کو عورت شمار کریں گے، اگر دونوں جگہ سے پیشاب کرتا ہو تو جہاں سے پہلے نکلتا ہو اسی کا اعتبار ہوگا، اگر علامات ایسی مشتبہ ہوں کہ کسی وجہ سے مرد یا عورت ہونے کو ترجیح نہ دے سکیں تو اس کو خنثیٰ مشکل کہتے ہیں، اگر خنثیٰ مشکل چار سال یا اس سے کم عمر کا ہو تو اس کو عورت بھی غسل دے سکتی ہے اور مرد بھی، چار سال سے زائد ہو تو اس کو تیمم کرایا جائے گا، قال فی شرح التنویر ویتیمم الخنثی المشکل لو مراہقا والا فکصغیر فیغسلہ الرجال والنساء، وفی الشامیۃ (قولہ والا فکصغیر) ای من الصغار والصغائر قال فی الفتح الصغیر والصغیرۃ اذا لم یبلغا حد الشہوۃ یغسلہما الرجال والنساء وقدرہ فی الاصل بان یکون قبل ان یتکلم اھ (رد المحتار ص ۶۰۲ ج ۱) وفی شروط الصلوٰۃ من العلائیۃ عن السراج لا عورۃ للصغیر جدا ثم مادام لم یشتہ فقبل ودبر ثم تغلظ الی عشر سنین ثم کبالغ، وفی الشامیۃ (قولہ لا عورۃ للصغیر جدا) وکذا الصغیرۃ کما فی السراج فیباح النظر والمس کما فی المعراج قال ح وفسرہ شیخنا بابن اربع فما دونہا ولم ادر لمن عزاہ اقول قد یؤخذ مما فی جنائز الشرنبلالیۃ ونصہ واذا لم یبلغ الصغیر والصغیرۃ حد الشہوۃ یغسلہما الرجال والنساء وقدرہ فی الاصل بان یکون قبل ان یتکلم اھ (رد المحتار ص ۳۷۳ ج ۱) واللہ تعالیٰ اعلم

جمادی الآخرہ سنہ ۹۵ھ

رات میں دفن کرنا:

سوال:۔ رات کو جنازہ دفن کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ ایک مولوی کہتا ہے کہ جائز نہیں، اپنی دلیل میں یہ حدیث پیش کرتا ہے: لا تدفنوا موتاکم باللیل الا ان تضطروا (ابن ماجۃ ص۱۱۰ باب ماجاء فی الاوقات التی لا یصلی فیہا علی المیت ولا یدفن) تو کیا اس مولوی کا کہنا صحیح ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

رات میں دفن کرنا بلاشبہہ جائز ہے، قال فی العلائیۃ لا یکرہ الدفن لیلاً (رد المحتار ص۸۴۰ ج۱) وقال النووی رحمہ اللہ تعالیٰ قال جماھیر العلماء من السلف والخلف لا یکرہ (الدفن لیلاً) واستدلوا بان ابابکر الصدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ وجماعۃ من السلف دفنوا لیلاً من غیر انکار وبحدیث المرأۃ السوداء او الرجل الذی کان یقم المسجد فتوفی باللیل فدفنوہ لیلاً الخ (نووی علی صحیح مسلم ص۳۰۹ ج۱) وروی الترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ عن ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم دخل قبراً لیلاً فاسرج لہ السراج فاخذہ من قبل القبلۃ وقال رحمک اللہ ان کنت لاواھا تلاء للقرآن (ترمذی ص۱۲۱ ج۱) وروی ابن ماجۃ رحمہ اللہ تعالیٰ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ادخل رجلاً قبرہ لیلاً واسرج فی قبرہ (ابن ماجۃ ص۱۰۹) وفی جمع الفوائد عن القرطبی انہ دفن صلی اللہ علیہ وسلم وسط اللیل من لیلۃ الاربعاء، روایات بالا کے علاوہ کراہت تاخیر جنازہ کی روایات بھی جواز دفن باللیل پر دلیل ہیں، اس لئے محدثین نے روایت نہی کے متعلق جوابات دیئے ہیں:۔

① اس روایت میں ابراہیم بن یزید ضعیف ہے، مگر یہ جواب اس لئے کافی نہیں کہ نہی سے متعلق صحیح مسلم میں بھی ایک حدیث ہے: عن جابر بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم خطب یوماً فذکر رجلاً من اصحابہ قبض فکفن فی کفن غیر طائل وقبر لیلاً فزجر النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان یقبر الرجل باللیل حتی یصلی علیہ الا ان یضطر انسان الی ذلک، وقال النبی صلی اللہ علیہ اذا کفن احدکم اخاہ فلیحسن کفنہ (صحیح مسلم ص۳۰۶ ج۱) صحیح مسلم کی اس روایت میں چونکہ

زیادہ تفصیل ہے اس لئے ابن ماجہ کی روایت کو اگر صحیح بھی تسلیم کرلیا جائے تو اسی تفصیل پر محمول کی جائے گی اور اس کے بھی وہی جوابات ہوں گے جو روایت مسلم کے ہیں۔

(۲) بعض لوگ میت کو کفن ناپسندیدہ دیتے تھے، اور اس حرکت کی پردہ پوشی کے لئے رات میں دفن کرتے تھے اس سے منع فرمایا، حدیث کے الفاظ فکفن فی کفن غیر طائل اور اذا کفن احدکم اخاہ فلیحسن کفنہ اس توجیہ پر کافی دلیل ہے۔

(۳) رات کے وقت نماز جنازہ میں کم لوگ شریک ہوں گے، یہ جواب بھی حتی یصلی علیہ سے اخذ کیا گیا ہے، ای یصلی علیہ جمع کثیر، اس کا یہ مطلب نہیں کہ جمع کثیر کی خاطر دن کا انتظار کرو بلکہ یہ مطلب ہے کہ حتی الامکان رات آنے سے قبل فارغ ہو جانا چاہئے، اگر کوشش کے باوجود رات ہو گئی تو صبح کا انتظار نہ کیا جائے، الا ان تضطروا کا یہی مطلب ہے۔

(۴) حتی یصلی علیہ صیغہ معروف ہے، اور ضمیر فاعل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف راجع ہے، بعض مرتبہ ایسا ہوا کہ بعض لوگ کو رات میں دفن کر دیا گیا اور تکلیف کے خیال سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع نہ دی گئی، اس بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا کہ دن میں دفن کرنے کی کوشش کیا کرو تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس پر نماز جنازہ پڑھ سکیں، اس لئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز خاص رحمت کا سبب ہے۔

(۵) بندہ کے خیال میں یہ نہی شفقت کی بنا پر بھی ہو سکتی ہے کہ رات کو دفن کرنے میں مشقت کے علاوہ قبر سے کوئی موذی جانور نکلنے کا احتمال ہے جس سے خطرہ بھی ہے، اور میت کے لئے بدفالی کہ لوگوں کے گناہ میں مبتلا ہونے کا اندیشہ بھی ہے۔

بہر کیف حاصل یہ ہے کہ رات سے قبل دفن کرنے کی کوشش کرنا چاہئے، معہذا اگر رات ہو جائے تو صبح کا انتظار جائز نہیں، فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۱۹ جمادی الاولیٰ ۱۳۹۰ھ

دفن کے بعد دعاء میں ہاتھ اٹھانا مستحب ہے:

سوال: میت کو دفن کرنے کے بعد قبر پر کچھ دیر ٹھہرنا اور دعاء کرنا ثابت ہے مگر اس دعاء میں رفع یدین کی تصریح کہیں نظر سے نہیں گزری، لہٰذا اس بارے میں تحقیق عالی سے مستفید فرمائیں کہ اس وقت دعاء میں رفع یدین ثابت ہے یا نہیں؟ اگر ثابت نہیں تو رفع یدین جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

بمقتضائے قاعدۂ رفع یدین مستحب ہے، اور روایات وقت زیارۃ القبور میں ثبوت رفع یدین سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، مگر کتاب کے تعامل عدم رفع کے پیش نظر رفع یدین کے قول و عمل کی ہمت نہ ہوتی تھی، اسی بناء پر احسن الفتاویٰ جدید جلد اول باب ردّ البدعات میں عدم رفع کا فتویٰ تحریر ہے، اس کے بعد حدیث میں رفع یدین کی تصریح مل گئی، قال الحافظ رحمہ اللہ تعالیٰ وفی حدیث ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ رأیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی قبر عبد اللہ ذی البجادین الحدیث، وفیہ فلما فرغ من دفنہ استقبل القبلۃ رافعا یدیہ، اخرجہ ابو عوانۃ فی صحیحہ (فتح الباری ص ۱۲۲ ج ۱۱) اب استحباب رفع یدین میں کوئی تامل نہیں رہا، اس لئے عدم رفع کے فتویٰ سے رجوع کرتا ہوں، البتہ اس سے اجتماعی دعاء کا ثبوت نہیں ملتا۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۱۰ ربیع الاول سنہ ۱۴۰۳ھ

قبر پر پانی چھڑکنا:

سوال:۔ قبر میں جب مُردے کو دفن کرتے ہیں تو سب کاموں سے فارغ ہوکر اخیر میں چلتے وقت قبر پر پانی چھڑکتے ہیں اور سب طرف مٹی پھر ڈالتے ہیں، یا جب بھی کوئی قبر پر فاتحہ پڑھنے جاتا ہے تو پانی ضرور ڈالتا ہے، کیا یہ درست ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

قبر کی مٹی جمنے کی غرض سے پانی چھڑکنا مندوب ہے، اس کو ضروری سمجھنا یا مستقل کار ثواب سمجھنا بدعت اور گناہ ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۱۶ رشوال سنہ ۹۹ھ

میت کو قبر میں دائیں پہلو پر لٹانا سنت ہے:

سوال:۔ آپ نے وصیت نامہ میں تحریر فرمایا ہے کہ قبر میں سنت کے مطابق دائیں کروٹ پر لٹایا جائے، چت لٹا کر صرف چہرہ قبلہ کی طرف کرنے کا دستور غلط ہے، ایک مولوی صاحب فرماتے ہیں کہ عام دستور کے مطابق چت لٹا کر صرف چہرہ قبلہ کی طرف جھکا دینے سے بھی سنت ادا ہو جاتی ہے، دائیں کروٹ پر لٹانا مستحب ہے سنت نہیں، درمختار کا حوالہ دیتے ہیں کہ اس میں ینبغی کونہ علی شقہ الایمن ہے، اس بارے میں تحریر فرمائیں؟

بینوا توجروا

الجواب باسم ملهم الصواب

درمختار کے جملہ "ینبغی کونہ علی شقہ الایمن" عبارت تنویر "ویوجہ الیہا" کی شرح وتفسیر ہے، مقصد یہ ہے کہ استقبال قبلہ کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں: دائیں پہلو پر، بائیں پہلو پر، چت لٹا کر قبلہ کی طرف پاؤں کر کے سر ذرا اونچا کر دیا جائے جیسے کہ مسلمان مریض اور غسل میت میں بیان کیا جاتا ہے، ان تین صورتوں کے سوا استقبال قبلہ کی اور کوئی صورت نہیں، پس مردہ دفن ہونے میں استقبال قبلہ نہیں پایا جاتا، اسی لئے حدیث و فقہ میں اس سے ممانعت آئی ہے کما سیأتی، بوقت دفن ان تینوں صورتوں میں سے صرف پہلی صورت مسنون ہے، تنویر کی عبارت چونکہ تینوں صورتوں کو شامل تھی، اس لئے شارح کو اس وضاحت کی ضرورت پیش آئی، لفظ ینبغی صرف استحباب ہی کے لئے مخصوص نہیں بلکہ عبارات فقہاء میں وجوب کے لئے بھی مستعمل ہے، کما صرح بہ، متن، شرح اور حاشیہ ابن عابدین رحمہ اللہ تعالیٰ تینوں کی مجموعی عبارت کا مطلب یہ ہے کہ قبر میں دائیں پہلو پر لٹانے میں قول وجوب بھی ہے، مگر قول راجح کے مطابق مسنون ہے، یہی مفہوم دوسری کتابوں کی عبارات میں بہت واضح ہے، قال فی الهندية: ويوضع في اللحد على جنبه الايمن مستقبل القبلة كذا في الخلاصة (عالمگیریة ص ۱۶۶ ج ۱) وقال العلامة الحلبي رحمه الله تعالى: ويوجه الميت في القبر الى القبلة على جنبه الايمن ولا يلقى على ظهره (غنية المستملي ص ۵۹۵) وقال الشرنبلالي رحمه الله تعالى: ويوجه الى القبلة على جنبه الايمن بذلك امر النبي صلى الله عليه وسلم في حديث قال البيت الحرام قبلتكم احياء وامواتا، وقال الطحطاوي رحمه الله تعالى: بذلك امر النبي صلى الله عليه وسلم عليا رضي الله تعالى عنه لما مات رجل من بني عبد المطلب فقال يا علي استقبل به القبلة استقبالا وقولوا جميعا بسم الله وعلى ملة رسول الله وضعوه لجنبه ولا تكبوه على وجهه ولا تلقوه على ظهره كذا في البرهان، وفي الحلبي ويسند الميت من ورائه بنحو تراب لئلا ينقلب (طحطاوي على مراقي الفلاح ص ۳۳۲) وقال الامام ابن الهمام رحمه الله تعالى: لحديث علي رضي الله تعالى عنه غريب واستؤنس له بحديث ابي داؤد والنسائي ان رجلا قال يا رسول الله ما الكبائر؟ قال هي تسع فذكر منها استحلال البيت الحرام قبلتكم احياء وامواتا والله اعلم (فتح القدير ص ۱۰۲ ج ۲)، وقال ابن نجيم رحمه الله تعالى: ويوجه الى القبلة

بذلک امر النبی صلی اللہ علیہ وسلم ویکون علی شقہ الایمن کما فی شامیۃ (بحر ص ۱۹۲ ج ۲)۔

وقال الامام الکاسانی رحمہ اللہ تعالی ویوضع علی شقہ الایمن متوجہا الی القبلۃ لما روی عن علی رضی اللہ تعالی عنہ انہ قال شہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جنازۃ رجل فقال یا علی استقبل بہ استقبالا (الی قولہ) ولا تلقوہ لوجہہ (بدائع ص ۳۱۹ ج ۱)

فقط واللہ تعالی اعلم

غرہ شعبان سنہ ۸۳ھ

ایسی میت کا حکم جس کا اسلام یا کفر معلوم نہ ہو:

سوال: حالیہ بارش کے سیلاب میں جو لاشیں پائی گئیں ان میں سے بعض لاشوں میں شبہ ہے کہ وہ کافروں کی ہیں یا مسلمانوں کی؟ اس لئے کہ برساتی نالہ اور ندی کے کنارے ہندو بھی آباد تھے، کیا ان مشکوک لوگوں کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

اگر میت میں مسلمان کی کوئی علامت پائی جائے تو اس کو مسلمان سمجھا جائے گا، اور اگر کوئی علامت نہ ہو تو دار الاسلام میں ہونے کی وجہ سے اس کو مسلمان قرار دیا جائے گا، اس لئے غسل دے کر نماز جنازہ پڑھی جائے گی، احتیاط اس میں ہے کہ یقینی مسلم اور مشکوک اموات کو یکجا رکھ کر ان پر نماز جنازہ اس طرح پڑھی جائے کہ ان میں سے صرف مسلمانوں پر نماز کی نیت ہو، قال فی شرح التنویر لو لم یدر امسلم ام کافر ولا علامۃ فان فی دارنا غسل وصلی علیہ والا لا، اختلط موتانا بکفار ولا علامۃ اعتبر الاکثر فان استووا غسلوا واختلف فی الصلوۃ علیہم ومحل دفنہم، وفی الشامیۃ وقیل یصلی وینوی المسلمین لانہ ان عجز عن التعیین لا یعجز عن القصد کما فی البدائع قال فی الحلیۃ فعلی ہذا ینبغی ان یصلی علیہم فی الحالۃ الثانیۃ ایضا الی حالۃ ما اذا کانت الکفار اکثر الی قولہ کما قالت بہ الائمۃ الثلاثۃ وہو اوجہ تحصیلا للمسلمین بلا ارتکاب منہی عنہ اھ ملخصا (رد المحتار ص ۵۸۰ ج ۱) فقط واللہ تعالی اعلم

۱۷ رجب سنہ ۸۳ھ

سیلاب میں مرنے والے کو غسل دینا فرض ہے:

سوال: سیلاب سے جو لاشیں مسلمانوں کی ملیں ان کو دوبارہ غسل دیا جائے گا یا

سیلاب کا غسل کافی ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

اس کو غسل دینا فرض ہے، بدون غسل بھی نماز جنازہ صحیح ہو جائے گی، مگر غسل نہ دینے والے گنہگار ہوں گے، صحت نماز کے لئے سیلاب کا غسل کافی ہو گا کذا فی الهندیة والشامیة۔
فقط واللہ تعالیٰ اعلم
۱۷ رجب سنہ ۸۸ھ

ناخن پالش چھڑائے بغیر غسل اور نماز جنازہ صحیح نہیں:

سوال:- فرض کریں کسی بہن کو ناخن پالش لگانے کی عادت تھی، اور اس کا انتقال ہو گیا جب عورتوں نے اسے غسل دیا تو اس کا خیال نہ کیا اور نہلانے کے بعد پتہ چلا کہ ناخن پالش لگی تو دوبارہ غسل دینا چاہئے یا نہیں؟ ایک جگہ کسی کا انتقال ہو گیا، غسل دیتے وقت کسی نے توجہ نہ دی، بعد میں دیکھا گیا تو بتایا گیا کہ اب اسی طرح رہے گی، اب کچھ نہیں ہو سکتا، لہٰذا اسی طرح دفنا یا گیا، تو شریعت کی رُو سے کیا کیا جائے؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

پالش چھڑا کر صرف ناخن دھو دینا کافی ہے، پورے غسل کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔
پالش چھڑا کر ناخن دھونا فرض تھا، بدون چھڑائے غسل صحیح نہیں ہوا، اس لئے نماز جنازہ بھی نہ ہوئی، جس جاہل نے یہ مسئلہ بتایا کہ اب دھونے کی ضرورت نہیں، وہ سخت مجرم ہے، اس پر توبہ فرض ہے، فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔
۲۰ شعبان سنہ ۸۸ھ

نماز جنازہ میں سلام سے قبل ہاتھ چھوڑ دے:

سوال:- جنازہ کی نماز میں آخری تکبیر کے بعد سلام سے پہلے ہاتھ چھوڑ دیے جائیں یا کہ سلام پھیرنے کے بعد چھوڑے جائیں؟ عام دستور تو سلام پھیرنے کے بعد ہاتھ چھوڑنے کا ہے مگر ایک عالم فرماتے ہیں کہ چوتھی تکبیر کے بعد ہاتھ چھوڑ کر سلام پھیرا جائے، کیا یہ صحیح ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

تکبیرات ختم ہونے پر سلام سے قبل ہاتھ چھوڑ دیئے جائیں، فی صفة الصلوٰة من التنویر وهو سنة قیام له قرار فیه ذکر مسنون وفی الشرح فیضع حالة الثناء وفی القنوت وتکبیرات الجنازة (رد المحتار ص ۴۵۵ ج ۱) اس کلیے

ثابت ہوتا ہے کہ سلام سے قبل ہاتھ چھوڑ دیئے جائیں، علاوہ ازیں تکبیرات الجنازۃ
کی تخصیص سے بھی یہی مفہوم ہوتا ہے، دوسری جزئیات ذیل میں اس کی تصریح ہے، فی خلاصۃ
الفتاوی ولا یعقد بعد التکبیر الرابع لانہ لا یبقی ذکر مسنون حتی یعقد فالصحیح
انہ یحل الیدین ثم یسلم تسلیمتین (عزیز الفتاوی ص ۲۴۳ ج ۱) وقال العلامۃ
اللکنوی رحمہ اللہ تعالی ومن ھھنا یخرج الجواب عما سئلت فی سنۃ ست و
ثمانین بمشامن انہ ھل یضع مصلی الجنازۃ بعد التکبیر الاخیر من تکبیراتہ
ثم یسلم ام یرسل ثم یسلم وھو انہ لیس بعد التکبیر الاخیر ذکر مسنون
فیسن فیہ الارسال (سعایۃ ص ۱۵۹ ج ۲)

[illegible] کے ایک معروف مفتی مولانا [illegible] کے فتاوی محمدیہ قلمی میں یہ جزئیہ
ملا: ولا یعقد بعد التکبیر الرابعۃ فالصحیح ان یحل الیدین ثم یسلم کذا فی
الظہیریۃ والخانیۃ والذخیرۃ او جواہر القلوب ویرسل بعد الرابعۃ یدیہ
لانہ لیس بعدھا ذکر کما فی الجلالین او روح البیان ولا یعقد بعد التکبیر الرابعۃ
لانہ لا یبقی ذکر مسنون فالصحیح ان یحل الیدین ثم یسلم تسلیمتین کذا فی
فتاوی العتابی والوجیز او رسالۃ مستقلۃ، فتاوی محمدیہ کے ان حوالجات میں سے خانیہ
میں سرسری تلاش سے صریح جزئیہ نہیں ملا اور دوسری کتب دستیاب نہیں، واما ما وجد
فی عزیز الفتاوی بقولہ لکن قد یقال ان التسلیمتین بعد التکبیر الرابع ذکر مسنون
فجوابہ ان الوضع سنۃ قیام لہ قرار ولذا لا وضع فی القومۃ مع اشتمالہا علی
ذکر مسنون. فقط واللہ تعالی اعلم   ۵ر رمضان ۸۲ھ

غسل میت میں کلوخ کا استعمال:

سوال: بہشتی زیور میں ہے کہ میت کو غسل دیتے وقت پہلے ڈھیلے سے استنجاء کرایا جائے
پھر پانی سے دھویا جائے، مگر امداد الفتاوی میں ہے کہ میت کے لئے ڈھیلے کا استعمال ثابت
نہیں، دونوں میں سے کونسا فتوی صحیح ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

کتب فقہ میں میت کے لئے استنجاء کا حکم تو مصرح ہے، مگر ڈھیلے کے استعمال کی
صراحت اگر کہیں نہ ملے تو بھی چونکہ استنجاء کا مسنون طریقہ یہی ہے کہ ڈھیلے کے بعد پانی استعمال

دلیل ہے اور اس اطلاق میں میت بھی داخل ہے، بنابریں اس کے لئے بھی ذبیحہ کا مستقبل قبلہ ہونا مسنون ہوگا۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۲۵ رمضان سنہ ۹۸ھ

میت کا سر بائیں جانب ہو تو نماز جنازہ صحیح ہے:

سوال:- جنازہ کی نماز کے لئے میت کو غلطی سے الٹا رکھ دیا گیا یعنی سر بائیں طرف اور پاؤں دائیں طرف، نماز سے فارغ ہونے کے بعد اس غلطی کا علم ہوا تو کیا نماز جنازہ دوبارہ پڑھی جائے؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملهم الصواب

نماز جنازہ صحیح ہوگئی، لوٹانے کی حاجت نہیں، البتہ عمداً میت کو اس طرح رکھنا خلاف سنت ہونے کی وجہ سے مکروہ ہے، غلطی سے ہوگیا تو کوئی کراہت نہیں، قال فی شرح التنویر وصحت لو وضعوا الرأس موضع الرجلین واساؤا ان تعمدوا (رد المحتار ص ۸۲۳ ج ۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۱۹ رمضان سنہ ۹۰ھ

نماز جنازہ پڑھنے والے کے سامنے سے گزرنا:

سوال:- جنازہ کی نماز ہو رہی ہو اور سامنے کوئی سترہ بھی نہ ہو تو سامنے سے گزرنا جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملهم الصواب

سامنے سے گزرنے کی ممانعت عام نمازوں کے لئے ہے، نماز جنازہ میں جائز ہے، نیز امام کے سامنے جنازہ کا سترہ ہے، اور امام کا سترہ مقتدیوں کو بھی کافی ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۱۹ رمضان سنہ ۹۰ھ

نماز جنازہ میں سلام بھول گیا تو نماز ہوگئی:

سوال:- جنازہ کی نماز میں امام چوتھی تکبیر کے بعد سلام پھیرنا بھول گیا، تو نماز ہوگئی یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملهم الصواب

نماز جنازہ میں سلام فرض نہیں، بلکہ واجب ہے، عام نمازوں میں ترک واجب موجب سجدہ سہو ہوتا ہے، مگر نماز جنازہ میں سجدہ سہو مشروع نہیں، لہٰذا نماز صحیح ہوگئی، اعادہ واجب نہیں، قال الشرنبلالی رحمہ اللہ تعالیٰ ویسلم وجوبا بعد التکبیرۃ الرابعۃ (مراقی الفلاح مع حاشیۃ الطحطاوی ص ۳۲۱) وقال الطحطاوی رحمہ اللہ تعالیٰ علی (قولہ ویسلم

اربع فالاولیٰ ان یذکر الواجب قبل السنن وھو التسلیم مرتین بعد الرابعۃ کما ذکر بعد (طحطاوی علی المراقی ص ۳۲۰) وفی المراقی ولو سلم الامام بعد الثلاثۃ ناسیاً کبر الرابعۃ ویسلم وفی الحاشیۃ ولم یبینوا ھل یجب علیہ سجود السھو (طحطاوی ص۳۲۰) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲ شوال ۹۰ھ

نمازِ جنازہ میں چوتھی تکبیر بھول گیا :

سوال :۔ امام نے جنازہ کی نماز میں تین تکبیروں کے بعد بھول کر سلام پھیر دیا، لقمہ دینے پر چوتھی تکبیر کہی اور پھر سلام پھیرا تو کیا نماز صحیح ہو گئی ؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

صورتِ مذکورہ میں نماز صحیح ہو گئی، قال الشرنبلالی رحمہ اللہ تعالیٰ ولو سلم الامام بعد الثلاثۃ ناسیاً کبر الرابعۃ ویسلم وقال الطحطاوی رحمہ اللہ تعالیٰ ولم یبینوا ھل یجب علیہ سجود السھو (حاشیۃ الطحطاوی علی المراقی ص۳۲۰) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲ ربیع الاول ۹۱ھ

نمازِ جنازہ میں نظر کہاں رکھے ؟ :

سوال :۔ جنازہ کی نماز میں نظر کہاں رہنی چاہئے ؟ سجدہ کے مقام پر یا کہ ہاتھوں پر ؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

اس سے متعلق صریح جزئیہ نظر سے نہیں گزرا، قواعد کا مقتضیٰ یہ ہے کہ دوسری نمازوں کی طرح نمازِ جنازہ میں بھی مقامِ سجدہ پر نظر رکھنا چاہئے، نماز کے مختلف ارکان میں نظر کے لئے مختلف مقامات کی تعیین سے اصل مقصد خشوع و خضوع پیدا کرنا ہے، ایک مقام پر نظر کو مرکوز کرنے سے یکسوئی پیدا ہوتی ہے جو خشوع میں معین ہے، تیام، رکوع، سجود اور قعود میں سے ہر رکن میں جس مقام پر نظر رکھنا طبعاً سہل تھا بلکہ طبعی حالت کے موافق تھا اس کی تعیین کر دی گئی۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۸ ذی الحجہ ۹۰ھ

شیعہ کو غسل و کفن دینے کا حکم :

سوال :۔ اگر شیعہ مر جائے اور کوئی شیعہ نہ ہو تو کیا مسلمان اس کو غسل دے سکتا ہے ؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

اس کو مسلمان غسل دے کر دفن کر دے، مگر غسل، کفن اور دفن سنت کے مطابق نہ دیں،

بلکہ اس پر پانی بہا کر کپڑے میں لپیٹ کر گڑھے میں ڈال کر مٹی ڈال دیں، فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۷؍ربیع الاول ۱۳۹۰ھ

قبر کے سرہانے آیت قرآنیہ لکھنا جائز نہیں :

سوال :- قبر کے سرہانے لوح پر میت کا نام اور آیت قرآنی لکھنا جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

نام لکھنا جائز ہے، آیت قرآنیہ لکھنے میں بے ادبی ہے، اس لئے جائز نہیں،

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۷؍ربیع الاول ۱۳۹۰ھ

میت پر مروجہ منکرات سے احتراز کی وصیت واجب ہے :-

سوال :- آجکل کسی کے انتقال پر جو خرافات ورسوم کرتے ہیں مثلاً رونمائی کی رسم وغیرہ کیا میت پر بھی اس کا گناہ ہوگا؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

موت پر بہت سے منکرات کا عام رواج ہو گیا ہے، مثلاً :-

(۱) رونمائی کی رسم،

(۲) رونمائی کے لئے جنازہ کئی گھنٹے رکھے رکھنا،

(۳) اعزہ واقارب کی خاطر نماز جنازہ میں تاخیر،

(۴) کثرتِ اجتماع کی غرض سے مسجد میں جماعت ثانیہ کا انتظار،

(۵) میت کی تصویر لینا،

(۶) تصویر کی اخبارات میں اشاعت،

(۷) جنازہ ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف منتقل کرنا،

(۸) نماز جنازہ متعدد بار پڑھنا،

(۹) غائبانہ نماز جنازہ ادا کرنا،

(۱۰) عام قبرستان سے الگ مخصوص مکان میں دفن کرنا،

(۱۱) قبر کے گرد چار دیواری یا حجرہ بنانا،

۱۶ (۱۲) ایصال ثواب کے لئے خلاف سنت اجتماعات،

(۱۳) تعزیتی جلسے کرنا۔

(۱۴) میت کے مناقب میں غیر واقعی حالات کی اشاعت وغیرہ۔

آجکل ان منکرات کی وبا اس حد تک پھیل گئی ہے کہ علماء و صلحاء تک اس میں مبتلا ہیں، بلکہ مشہور مذہبی رہنماؤں کے جنازوں میں ان منکرات کا ارتکاب کچھ زیادہ ہوتا ہے، ان حالات میں جس شخص کو یہ خطرہ ہو کہ اس کے انتقال پر اس کے نادان احباب، اقرباء، فکر آخرت سے غافل، دنیوی نام و نمود کے بھوکے پسماندگان، نالائق معتقدین، ناخلف خلفاء، اور دین کے روپ میں بے دین عناصر اس پر ایسے مظالم کریں گے اور مرنے کے بعد اس کو اس طرح رسوا کریں گے، اس پر یہ وصیت کرنا واجب ہے کہ اس کے انتقال پر ایسے محظورات و ممنوعات شرعیہ ہرگز ہرگز نہ ہونے دیے جائیں، بلکہ تجہیز و تکفین، نماز جنازہ، دفن، اور ایصال ثواب وغیرہ جملہ امور سنت کے مطابق ادا کیے جائیں، اگر ایسی وصیت نہ کی تو سخت گنہگار اور مستحق عذاب ہوگا، صحیح بخاری کی حدیث متعلق تعذیب المیت ببکاء اھلہ علیہ کی مشہور توجیہ یہ ہے کہ مرنے پر ارتکاب معصیت نوحہ کا علم ہوتے ہوئے جس نے اس سے نہ روکا، اور ایسی وصیت نہ کی اس کو عذاب ہوگا، وصیت میں ان منکرات کی تفصیل لکھ کر ان سے روکا جائے، بالخصوص دینی رہنماؤں اور مقتدا حضرات پر اس وصیت کا وجوب اور زیادہ مؤکد ہے، فقط واللہ المستعان وھو الموفق ولا حول ولا قوۃ الا بہ۔

۱۵ صفر سنہ ۹۹ھ

شافعی امام کے پیچھے نماز جنازہ میں پانچویں تکبیر کہے؟

سوال: زید حنفی ہے، اس نے نماز جنازہ میں شافعی المسلک امام کی اقتداء کی، شوافع کے نزدیک جنازہ میں پانچ تکبیریں ہیں، تو کیا حنفی کو پانچویں تکبیر میں بھی اقتداء کرنی ہوگی یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

حنفی کی شافعی کے پیچھے اقتداء تو صحیح ہے، لیکن پانچویں تکبیر میں متابعت نہ کرے، بلکہ خاموش کھڑا رہے، اور امام کے ساتھ سلام پھیرے، قال فی الشامیۃ اوبعین یزید تکبیرات الجنازۃ خمسا لم یتبعہ لظہور خطئہ بیقین لان ذلک منسوخ بدائع (رد المحتار ص ۸۷ ج ۱) وفی العلائیۃ ولو کبر امامہ خمسا لم یتبع لانہ منسوخ فیمکث المؤتم حتی یسلم معہ اذا سلم بہ یفتی (رد المحتار ص ۵۸۸ ج ۱) فقط واللہ تعالی اعلم۔

۲۸ صفر سنہ ۹۹ھ

شافعی امام کے پیچھے تکبیراتِ جنازہ میں رفع یدین مستحب ہے:

سوال: زید حنفی ہے، اس نے نمازِ جنازہ میں شافعی المسلک کی اقتداء کی، شوافع کے نزدیک نمازِ جنازہ میں رفع یدین ہے، تو کیا حنفی رفع یدین میں متابعت کرے؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملهم الصواب

حنفی کو تکبیراتِ جنازہ میں شافعی امام کی متابعت کرنا مستحب ہے، قال ابن عابدین رحمه الله تعالیٰ أقول یؤخذ منه ان الحنفی اذا اقتدی بشافعی فی صلوة الجنازة یرفع یدیه لانه مجتهد فیه فهو غیر منسوخ لانه قد قال به ائمة بلخ من الحنفیة (رد المحتار ص ۸۲۰ ج ۱) وفی شرح التنویر یرفع یدیه فی الاولیٰ فقط وقال ائمة بلخ فی کلها، قال ابن عابدین رحمه الله تعالیٰ (قوله وقال ائمة بلخ فی کلها) وهو قول الائمة الثلاثة وروایة عن ابی حنیفة رحمه الله تعالیٰ کما فی شرح درر البحار والاول ظاهر الروایة کما فی البحر وفی حاشیته للرملی ربما یستفاد منه ان الحنفی اذا اقتدی بالشافعی فالاولیٰ متابعته فی الرفع ولم اره اقول ولم یقل یجب لان المتابعة انما تجب فی الواجب او الفرض وهذا الرفع غیر واجب عند الشافعی رحمه الله تعالیٰ (رد المحتار ص ۸۲۱ ج ۱) فقط والله تعالیٰ اعلم

۱۴ ربیع الاول سنہ ۹۹ھ

غیر مسلم کی مسلم کے جنازہ میں شرکت:

سوال: محلہ میں کوئی غیر مسلم رہتا ہو تو وہ مسلمانوں کی میت کے ساتھ قبرستان میں جا سکتا ہے یا نہیں اور مٹی دے سکتا ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملهم الصواب

جائز نہیں، فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۱۴ ربیع الاول سنہ ۹۹ھ

مسلم کی غیر مسلم کے جنازہ میں شرکت:

سوال: غیر مسلم کی میت کے ساتھ ان کے مرگھٹ تک مسلمانوں کو جانا جائز ہے یا نہیں؟ جبکہ یہ غیر مسلم محلہ کا ہو یا غیر محلہ کا بھی ہو اور اس کا کاروبار ہو، شرعاً کیا حکم ہے؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملهم الصواب

جائز نہیں، معصیت کی شرکت ہے، فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۱۴ ربیع الاول سنہ ۹۹ھ

جنازہ دوسرے مکان میں رکھکر نماز پڑھنا:

سوال:- آجکل دستور ہے کہ مساجد میں قبلہ کی جانب محراب کے باہر جنازہ رکھنے کے لئے چبوترہ بنالیتے ہیں، اور محراب میں اس طرف کھڑکی یا دروازہ رکھتے ہیں، امام محراب کے اندر کھڑا ہوکر نماز جنازہ پڑھاتا ہے، کیا اس طرح نماز میں کوئی کراہت تو نہیں کہ جنازہ باہر ہوا اور امام مسجد کے اندر؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

مسجد میں نماز جنازہ بہرحال مکروہ ہے، خواہ جنازہ مسجد کے اندر ہو یا باہر، البتہ بارش وغیرہ جیسا عذر ہو یا باہر جگہ نہ ہو تو مسجد میں نماز جائز ہے،

ایسی صورت میں اگر جنازہ باہر ہے تو بہتر یہ ہے کہ امام اور چند مقتدی بھی مسجد سے باہر چبوترہ پر کھڑے ہوں، کیونکہ جنازہ من وجہ بحکم امام ہے، اور صرف امام کا الگ مکان میں کھڑا ہونا مکروہ تنزیہی ہے، قال ابن عابدین رحمہ اللہ تعالیٰ (قولہ لانہ کالامام من وجہ) لاشتراط هذه الشروط وعدم صحتها بفقدها او فقد بعضها (ردالمحتار ص ج۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۲۰ صفر سنہ ۷۲ھ

تعزیت کا مسنون طریقہ:

سوال:- تعزیت کا صحیح طریقہ کیا ہے؟ اس میں دنوں کی تعیین اور زیادتی خلاف سنت ہوگا کہ نہیں؟ چند ساتھی اہل محلہ وغیرہ جماعت کی شکل میں آجائیں تو ایک کی دعاء سب کے قائم مقام ہو سکتی ہے کہ نہیں؟ یا سب اہل مجلس کی طرف سے کافی ہے کہ نہیں؟ تعزیت کی دعاء میں ہاتھ اٹھانا کیسا ہے؟ تعزیت کا اعلیٰ یا اول طریقہ جو سید الانبیاء علیہ اعظم التحیۃ والسلام سے ثابت ہو اگر بیان فرمادیں تو کئی افراد کے لئے مشعل راہ بن جائیگا انشاء اللہ تعالیٰ کیونکہ بندہ تبلیغی جماعت والوں کی طرح دین کی ضروری اور اہم بات کو ہر مجلس میں بیان کرتا ہے، صرف منبر اور سٹیج کا منتظر نہیں ہوتا۔ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

تعزیت تین روز کے بعد جائز نہیں، البتہ غائب تین روز کے بعد آئے تو بھی کر سکتا ہے، جماعت کی شکل میں آنے کا اہتمام درست نہیں، اتفاقاً ایک ساتھ ہوگئے تو حرج نہیں، ہر ایک کے لئے مستقلاً تعزیت مسنون ہے، البتہ اگر ایک گھرانے کا کوئی بڑا

ہے، اور اس کے ساتھ اس کے ماتحت لوگ بھی ہیں تو صرف بڑے ہی کی تعزیت کافی ہے تعزیت کی دعاء یہ ہے، اعظم اللہ اجرک واحسن عزاءک وغفر لمیتک، اس کے علاوہ بھی ایسا مضمون بیان کیا جا سکتا ہے جس سے غم ہلکا ہو، تسکین اور فکر آخرت پیدا ہو، تعزیت کی دعاء میں ہاتھ اٹھانا بدعت ہے، فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۲۸ ربیع الآخر سنہ ۱۳۸۷ھ (اس پر اشکال وجواب تتمہ میں ہے)

نماز جنازہ میں قراءت فاتحہ:

سوال: کیا فرماتے ہیں اللہ تبارک وتعالیٰ اور اس کے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایک مسلم کی نماز جنازہ میں سورۂ فاتحہ کے بارے میں کہ اگر وہ پڑھی جائے تو مکمل دلائل کیا ہیں؟ نیز صحیح بخاری شریف کی یہ دونوں روایتیں بھی ملحوظ خاطر رہیں:

① عن عبادة بن الصامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ أن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لا صلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحة الکتاب۔

② عن ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ انہ صلی علی جنازۃ فقرأ بفاتحة الکتاب قال لیعلموا انہا سنة۔ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

نماز جنازہ میں اصل مقصود اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود اور میت کے لئے دعاء ہے، اس لئے اگر سورۂ فاتحہ بہ نیت حمد وثناء ودعاء پڑھی جائے تو درست ہے، بہ نیت تلاوت نہ پڑھی جائے۔

سوال میں مذکورہ روایات میں سے پہلی روایت مطلق نماز سے متعلق ہے، نماز جنازہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں، نماز جنازہ کے احکام مثلاً رکوع، سجود اور تشہد وغیرہ میں عام نماز سے مختلف ہے، اس لئے عام نمازوں پر اس کا قیاس صحیح نہیں، اس حدیث پر مفصل بحث میرے رسالہ "نیل المرام بانتزام السکوت عند قراءۃ الامام" میں ہے، دوسری روایت میں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے سورۂ فاتحہ پڑھنا منقول ہے، آپ نے سورۂ فاتحہ بقصد ثناء ودعاء پڑھی تھی، اسی طرح آپ کا سنت فرمانا بھی اسی معنی سے ہے کہ اس میں حمد وثناء ہے اور نماز جنازہ میں حمد وثناء سنت ہے، اس پر مندرجہ ذیل شواہد ہیں:

① عن سعید بن ابی سعید المقبری عن ابیہ انہ سأل ابا ہریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

کیف تصلی علی الجنازة فقال ابو هریرة رضی اللہ تعالیٰ عنہ انا لعمر اللہ اخبرک اتبعها من اهلها فاذا وضعت کبرت وحمدت اللہ وصلیت علی نبیه ثم اقول اللهم انه عبدک وابن عبدک وابن امتک الحدیث (موطا مالک ص ۷۹) اس حدیث کے رجال صحاح ستہ کے رجال ہیں، البتہ سعید کے حافظہ میں ان کے انتقال سے چار سال قبل کچھ تغیر آگیا تھا (تقریب ص ۱۰۰) مگر امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ جیسی شخصیت سے بہت بعید ہے کہ تغیر کے بعد ان سے روایت کریں۔

اس روایت میں تکبیر کے بعد تحمید وثناء کا ذکر ہے، سورۂ فاتحہ کا کوئی ذکر نہیں، اس سے ثابت ہوا کہ اثر ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما میں سورۂ فاتحہ بقصد دعاء پڑھنا مقصود ہے، ورنہ روایات میں تعارض لازم آئے گا۔

③ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی نیت قراءت کی ہوتی تو ہر تکبیر کے بعد فاتحہ پڑھتے، کیونکہ نماز جنازہ کی ہر تکبیر بمنزلہ رکعت ہے، اور سورۂ فاتحہ نماز کی ہر رکعت میں پڑھی جاتی ہے۔

④ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے بسند صحیح یہ بھی مروی ہے کہ آپ نے فاتحہ کے بعد سورت بھی پڑھی (اعلاء السنن ص ۲۰۵ ج ۸) اس سے ثابت ہوا کہ آپ نے فاتحہ اور سورت دونوں بنیت ثناء ودعاء پڑھی تھیں، اس لئے کہ نماز جنازہ میں بغرض قراءت فاتحہ کے ساتھ سورت ملانے کا کوئی بھی قائل نہیں۔

④ حضرت عمر، حضرت علی، عبد اللہ بن عمر، فضالہ بن عبید، ابو ہریرہ، جابر بن عبد اللہ، واثلہ بن اسقع وغیرہم رضی اللہ تعالیٰ عنہم نماز جنازہ میں قراءت فاتحہ نہیں فرماتے تھے (المدونۃ الکبریٰ) جب یہ اجلۂ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم قراءت نہیں فرماتے تھے حالانکہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے انہی حضرات سے علم حاصل کیا ہے، تو ان کے فعل وقول میں لازماً فاتحہ بنیت دعاء ہی مراد ہوگی۔

⑤ قال ابن وهب وقال مالک لیس ذلک بمعمول به فی بلدنا انما هو الدعاء ادرکت اهل بلدنا علی ذلک (المدونۃ الکبریٰ ص ۱۵۹ ج ۱) مدونہ کبریٰ میں یہ بھی منقول ہے کہ قاسم بن محمد، سالم بن عبد اللہ، ابن المسیب، ربیعہ، عطاء بن ابی رباح اور یحییٰ بن سعید رحمہم اللہ جیسے جبال علم بھی نماز جنازہ میں قراءت نہیں فرماتے تھے، پس قول ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما میں اگر سنت سے بعینہٖ فاتحہ کی سنیت مراد لی جائے تو امام مالک اور دوسرے اجلۂ صحابہ وتابعین پر اس کا مخفی رہنا بعید از قیاس ہے۔

ایک اور روایت ابن ماجہ میں ام شریک انصاریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے ہیں الفاظ ہیں
امرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان نقرأ علی الجنازۃ بفاتحۃ الکتاب اس روایت کے مختلف جواب ہیں:۔

① اس کی سند مختلف فیہ ہے، (اعلاء السنن ص ۱۵۵ ج ۸)

② ام شریک انصاریہ کی تعیین میں بہت اختلاف ہے (اصابہ ص ۲۲۳ ج ۸) اگرچہ صحابی کی جہالت مضر نہیں، مگر اجلۂ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے مقابلہ میں قول مجہول قابل قبول نہیں، بالخصوص جبکہ نماز جنازہ کے امور عورتوں کی بنسبت مردوں پر زیادہ واضح ہوتے ہیں۔

③ صیغۂ امر کی دلالت علی الوجوب مسلّم ہے، مگر لفظ امر کی دلالت وجوب پر مسلّم نہیں، اثر ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما اس سے قوی ہے، اور اس میں لفظ سنت ہی ہے لہٰذا اس روایت میں لفظ امر ندب پر محمول ہوگا، ورنہ یہ حدیث اثر ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے معارضہ کی وجہ سے غیر معتبر ہوگی، فان الضعیف لا یصلح لمعارضۃ القوی، پھر امر ندب بھی بقصد دعا ہے، کما حررنا، فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۲۵ / جمادی الآخرہ سنہ ۱۳۸۲ھ

مُردہ عورت کو نہلانے میں ستر کی حد:

سوال:۔ مُردہ عورت کو نہلاتے وقت اس کے پورے بدن پر کپڑا ڈالنا ضروری ہے یا مرد کی طرح صرف ناف سے گھٹنوں تک چھپانا کافی ہے، بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

عورت کو عورت سے اس قدر پردہ ہے جتنا مرد کو مرد سے، اس لئے عورت کو نہلاتے وقت صرف ناف سے زانو تک کپڑا ڈالنا کافی ہے، قال فی الدر ویستر عورتہ الغلیظۃ فقط علی الظاهر من الروایۃ وقیل مطلقاً الغلیظۃ والخفیفۃ وصححہ الزیلعی وغیرہ، وقال ابن عابدین رحمہ اللہ تعالیٰ تحت قولہ صححہ الزیلعی وغیرہ وفی الشرنبلالیۃ وهذا شامل للمرأۃ والرجل لان عورۃ المرأۃ للمرأۃ کالرجل للرجل (رد المحتار ص ۵۷۴ ج ۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۳ / رجب سنہ ۱۳۸۲ھ

حائضہ کے غسل موت میں منہ میں پانی نہ ڈالا جائے:

سوال:۔ حالت حیض یا نفاس میں وفات پانے والی کو غسل دیتے وقت منہ اور

ناک میں پانی ڈالنا ضروری ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

حالتِ جنابت یا حیض یا نفاس میں موت واقع ہو تو بھی غسل دیتے وقت منہ اور ناک میں پانی ڈالنا درست نہیں، البتہ دانتوں اور ناک میں تر کپڑا پھیر دیا جائے تو بہتر ہے مگر ضروری نہیں، قال فی شرح التنویر ویوضأ من یؤمر بالصلوٰۃ بلا مضمضۃ واستنشاق للحرج، وقیل یفعلان بخرقۃ، وعلیہ العمل الیوم، ولو کان جنبا او حائضا او نفساء فعلا اتفاقا تتمیما للطہارۃ کما فی امداد الفتاح مستمدا من شرح المقدسی وقال ابن عابدین رحمہ اللہ تعالیٰ (قولہ ولو کان جنبا الخ) نقل ابو السعود عن شرح الکنز للشلبی ان ما ذکرہ الخلخالی ای فی شرح القدوری من ان الجنب یمضمض ویستنشق غریب مخالف لعامۃ الکتب اھ قلت وقال الرملی ایضا فی حاشیۃ البحر اطلاق المتون والشروح والفتاوی یشمل من مات جنبا ولم ار من صرح بہ لکن الاطلاق یدخلہ والعلۃ تقتضیہ اھ وما نقلہ ابو السعود عن الزیلعی من قولہ بلا مضمضۃ واستنشاق ولو جنبا صریح فی ذلک لکنی لم ارہ فی الزیلعی (قولہ تتمیما للطہارۃ) الخ وفی شرح المقدسی (رد المحتار) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۵ رجب سنہ [illegible]ھ

مرد نہ ہوں تو عورتیں نمازِ جنازہ پڑھیں:

سوال: اگر کوئی مرد موجود نہیں تو کیا عورتیں جنازہ کی نماز پڑھ سکتی ہیں؟ اگر ان کی نماز صحیح ہے تو عورت امامت کیسے کرے؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

عورتیں انفراداً نمازِ جنازہ پڑھیں، نمازِ جنازہ میں جماعت واجب نہیں، اس لئے بہتر یہ ہے کہ عورتیں جماعت نہ کریں بلکہ الگ نماز پڑھیں، مگر سب بیک وقت پڑھیں، ایک کی فراغت کے بعد دوسری شروع نہ کرے، اور جماعت بھی بلا کراہت جائز ہے، اس صورت میں امام عورت وسطِ صف میں کھڑی ہو، مرد امام کی طرح صف سے آگے نہ بڑھے، قال فی العلائیۃ ویکرہ تحریما جماعۃ النساء ولو فی التراویح فی غیر صلوٰۃ الجنازۃ لانہا لم تشرع مکررۃ، فلو انفردن تفوتہن بفراغ احداہن اھ وفی الشامیۃ (قولہ لانہا لم تشرع مکررۃ) اھ، قال فی الفتح واعلم ان جماعتہن لا تکرہ فی صلوٰۃ

الجنازة لانها فريضة وترك التقدم مكروه فدار الامر بين فعل المكروه لفعل الفرض او ترك الفرض لتركه فوجب الاول، بخلاف جماعتهن فی غيرها، ولو صلين فرادى فقد تسبق احداهن فتكون صلوة الباقيات نفلا والتنفل بها مكروه، فيكون فراغ تلك مرجحا لفساد الفريضة لصلوة الباقيات كتقييد الخامسة بالسجدة لمن ترك القعدة الاخيرة اھ ومثله فی البحر وغيره، ومفاده ان جماعتهن فی صلوة الجنازة واجبة حيث لم يكن غيرهن، ولعل وجهه الاحتراز عن فساد فرضية صلوة الباقيات اذا سبقت احداهن وفيه ان الرجال لو صلوا منفردين يلزم فيها مثل ذلك، فيلزم عليه وجوب جماعتهم فيها مع ان المصرح به ان الجماعة فيها غير واجبة فتأمل (رد المحتار ص ٥٢٠ ج ١) وقال الرافعی رحمه الله تعالى (قوله ومفاده ان جماعتهن فی صلوة الجنازة واجبة الخ) انما يتم بارجاع ضمير لانها فريضة للجماعة كما نقل فی حاشية البحر وهو خلاف الظاهر بل هو راجع لصلوة الجنازة فانها فرض كفاية على كل منهن قال السندی نقلا عن شرح المنية ويستحب ان يصلين منفردات وتجوز جماعتهن اھ فمراد الفتح وغيره من الوجوب معناه اللغوی ای ثبت الاول ويكون معنى ما علل به الترك لاجل الانفراد المستحب (التحرير المختار ص ١٢٣ ج ١) قلت ويمكن الجواب عن اشكال ابن عابدين رحمه الله تعالى بان يشرعن فی الصلوة معا ولا اعتبار للفراغ متعاقبا لان الانفراد ليس له حكم الابتداء بل يظهر بعد التأمل انه لو شرعت الاخرى قبل فراغ الاولى فلا اشكال فيه ايضا. فقط والله تعالى اعلم.

۱۱ رجب سنہ ۱۳۹۳ھ

بحری جہاز میں فوت ہونے والے کا حکم:

سوال: کوئی شخص بحری جہاز میں فوت ہوگیا، تو اس کو فوراً سمندر میں ڈال دیا جائے یا کنارے تک لے جانے کی کوشش کی جائے اور خشکی میں دفن کیا جائے؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

اگر کنارے تک میت میں کسی قسم کے تغیر کا کوئی اندیشہ نہ ہو تو خشکی میں دفن کیا جائے، ورنہ سمندر میں ڈال دیا جائے، سمندر میں ڈالتے وقت کوئی وزنی پتھر وغیرہ ساتھ باندھ دیا

بہتر ہے تاکہ میت نیچے بیٹھ جائے تیرنے نہیں، قال فی العلائیۃ مات فی سفینۃ غسل وکفن وصلی علیہ والقی فی البحر ان لم یکن قریبا من البر وفی الشامیۃ (قولہ والقی فی البحر) قال فی الفتح وعن الحسن رحمہ اللہ تعالی یثقل لیرسب وعن الشافعیۃ کذلک ان کان قریبا من دار الحرب والا شد بین لوحین لیقذفہ البحر فیدفن (قولہ ان لم یکن قریبا من البر) الظاہر تقدیرہ بان یکون بینہم وبین البر مدۃ یتغیر المیت فیہا ثم رأیت فی نور الایضاح التعبیر بخوف الضرر بہ (رد المحتار ص۶۰۴ ج۱)
فقط واللہ تعالی اعلم

۲۵ رجب سنہ ۷۲ھ

میت خاک ہوجائے تو اسی قبر میں دوسرے کو دفن کیا جائے:

سوال: حرمین شریفین میں دستور ہے کہ پرانی قبروں میں ہی نئے مردے گاڑے جاتے ہیں، کیا یہ طریقہ جائز ہے؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

جب میت اول خاک ہوجائے تو اس کی قبر میں دوسرے کو دفن کرنا جائز ہے، قال فی الشامیۃ قال الزیلعی ولو بلی المیت وصار ترابا جاز دفن غیرہ فی قبرہ وزرعہ والبناء علیہ اھ قال فی الامداد ویخالفہ ما فی التاتارخانیۃ اذا صار المیت ترابا فی القبر یکرہ دفن غیرہ فی قبرہ لان الحرمۃ باقیۃ، وان جمعوا عظامہ فی ناحیۃ ثم دفن غیرہ فیہ تبرکا بالجیران الصالحین ویوجد موضع فارغ یکرہ ذلک اھ قلت لکن فی ہذا مشقۃ عظیمۃ، فالاولی اناطۃ الجواز بالبلاء اذ لا یمکن ان یعد لکل میت قبر لا یدفن فیہ غیرہ وان صار الاول ترابا لا سیما فی الامصار الکبیرۃ الجامعۃ، والا لزم ان تعم القبور السہل والوعر علی ان المنع من الحفر الی ان لا یبقی عظم عسر جدا وان امکن ذلک لبعض الناس لکن الکلام فی جعلہ حکما عاما لکل احد فتامل (رد المحتار ص۶۰۴ ج۱) فقط واللہ تعالی اعلم

۲۶ رجب سنہ ۱۴ھ

میت کے منہ میں مصنوعی دانت رہ جائیں:

سوال: ایک آدمی مرگیا، مرنے کے بعد اس کے منہ میں مصنوعی دانت تھے چونکہ

غسل دینے کے وقت بغیر تکلیف کے نہیں نکل سکتے تھے، اگر وہ دانت منہ میں رہ جائیں تو اس میں کوئی شرعی قباحت تو نہیں، اور اگر دانت قیمتی ہوں اور میت کے منہ سے نہایت تکلیف کے ساتھ نکلتے ہوں تو کیا ایسے دانت کا نکالنا جائز ہے یا نہیں؟ پہلی صورت میں اگر دانت منہ میں رکھنے کی گنجائش ہے، تو کیا غسل میت اور دفن میت میں تو کچھ خرابی نہیں ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملهم الصواب

اگر دانت منہ سے نکالنا مشکل ہو اور زیادہ تکلف کرنے میں میت کی بے حرمتی ہو تو اندر ہی چھوڑ دیئے جائیں، غسل و دفن میں کوئی محذور نہیں، مال کی حرمت سے میت کی حرمت زیادہ ہے، قال فی العلائیة ولو بلع مال غیره ومات هل یشق قولان والاولیٰ نعم فتح، وفی الشامیة وان کان حرمة الآدمی اعلیٰ من صیانة المال لکنه زال احترامه بتعدیه کما فی الفتح ومفاده انه لو سقط فی جوفه بلا تعد لا یشق اتفاقاً (رد المحتار)
فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔
۲۷ رجب سنہ ۸۲ھ

حضرت عائشہ کا حضرت عمر کی قبر پر بے پردہ نہ جانا:

سوال: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے بعد روضۂ مبارکہ میں بغیر پردہ کے جایا کرتی تھیں، اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے انتقال کے بعد بھی بغیر پردہ کے جایا کرتی تھیں، اور جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ انتقال کے بعد وہاں دفن ہوئے تو یا قاعدہ جب بھی جاتی تھیں تو پردہ کرنے لگیں، ایک صاحب کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وجہ سے پردہ کرنے لگیں، اس لئے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نامحرم تھے اور مرنے کے بعد بھی وہ زندوں کی طرح دیکھ لیتے ہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملهم الصواب

اس سے صرف احترام مقصود تھا مرنے کے بعد دیکھنا ثابت نہیں، قال الطیبی فیه ان احترام المیت کاحترامه حیاً (مرقاۃ ص ۱۷۰ ج ۴) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔
۲۷ ذی الحجہ سنہ ۸۲ھ

لحد کی گہرائی:

سوال: مشہور ہے کہ فرشتے میت کو قبر میں حساب وکتاب کے لئے بٹھاتے ہیں اس لئے لحد اتنی گہری ہونی چاہئے کہ اس میں میت آسانی سے بیٹھ سکے، کیا یہ صحیح ہے؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

یہ محض جہالت ہے، فرشتے میت کو ظاہری قبر میں نہیں بلکہ عالم برزخ میں بٹھاتے ہیں، لحد یا شق کی گہرائی صرف اتنی ہونی چاہئے کہ اس میں میت کو سنت کے مطابق کروٹ پر لٹایا جاسکے، بالائی سطح میت کے جسم سے الگ مگر بالکل قریب ہو، تاکہ قبر کے گرنے اور درندوں سے حفاظت رہے، ولایمس السقف المیت (طحطاوی علی المراقی ص ۳۳۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۱۰ محرم سنہ ۱۴۰۱ھ

نماز جنازہ کے لئے جماعت مسجد کے انتظار کی رسم:

سوال: آجکل عموماً یہ دستور ہے کہ نماز جنازہ کے لئے محلہ کی مسجد میں وقتی نماز کی جماعت کا انتظار کیا جاتا ہے، نماز کے مقررہ وقت پر جنازہ مسجد کے پاس لے آتے ہیں، اور فرض نماز کی جماعت سے فارغ ہوکر جنازہ کی نماز پڑھتے ہیں، شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

یہ رسم خلاف شرع ہے، نماز جنازہ میں اس لئے تاخیر کرنا کہ زیادہ لوگ شریک ہوں مکروہ ہے، جنازہ میں تعجیل اس قدر مؤکد ہے کہ اوقات مکروہہ میں بھی نماز جنازہ ادا کرنے کی اجازت دی گئی ہے، یعنی مکروہ وقت میں جنازہ تیار ہو تو اسی وقت میں نماز پڑھ لی جائے، مکروہ وقت گزرنے تک بھی انتظار نہ کیا جائے، اس رسم کا ایک مفسدہ یہ بھی ہے کہ لوگ مسجدوں کے اندر نماز جنازہ پڑھنے لگے ہیں، جو مکروہ ہے، تحریماً او تنزیہاً قولان مصححان۔ واللہ تعالیٰ اعلم

۵ محرم سنہ ۱۴۰۱ھ

میت کے پاس تلاوت کا حکم:

سوال: میت کو نہلانے سے پہلے اس کے پاس قرآن پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

میت کو کپڑے سے ڈھانک دیا جائے تو اس کے پاس تلاوت میں کوئی حرج نہیں، ورنہ مکروہ ہے، اور نہلانے کے بعد بہرصورت کوئی کراہت نہیں، فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔ ۸ محرم سنہ ۱۴۰۱ھ

میت کو نہلانے والے کے لئے غسل مستحب ہے:

سوال: میت کو نہلانے کے بعد نہلانے والے پر غسل واجب ہے یا مسنون یا مستحب؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملهم الصواب

مستحب ہے، کذا فی الشامیۃ۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۱۰ محرم ۱۳۷۰ھ

فرض کا ایصال ثواب:

سوال: فرض کا ایصال ثواب جائز ہے یا نہیں؟ یعنی فرض بھی ادا ہو اور میت کو بھی ثواب ہو۔ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملهم الصواب

اس میں اختلاف ہے، والراجح الجواز نقل فی الشامیۃ عن البحر انہ لا فرق بین الفرض والنفل وعن جامع الفتاوی قیل لا یجوز فی الفرائض (ردالمحتار ص ۸۴۴ ج ۱)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۱۷ ربیع الآخر ۱۳۷۰ھ

تلقین بعد الموت:

سوال: بعد دفن میت عند القبر تلقین کرنا کیسا ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملهم الصواب

اس کا جواز مختلف فیہ ہے، لہٰذا احتراز اولیٰ واسلم ہے، بالخصوص اس دور فساد عقیدہ میں اجازت نہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۱۸ ربیع الآخر ۱۳۷۰ھ

فصل فی الشہید

حادثہ میں مرنے والے کا حکم:

سوال:- ریل یا موٹر سے گر کر مر جائے یا ان میں کٹ کر مر جائے یا کسی چیز سے ایکسیڈنٹ ہو جائے تو ایسا شخص شہید صغریٰ شمار ہوگا یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

شہادت صغریٰ ہے، شہداء کے احکام دنیویہ کا اجراء اس پر نہ ہوگا، لیکن آخرت میں فی الجملہ شہداء میں محسوب ہوگا، انشاء اللہ تعالیٰ۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲۵ ذی الحجہ سنہ ۸۶ھ

شیعہ شہید نہیں ہو سکتا:

سوال:- اس عشرۂ محرم میں جو مسلمان ہندوؤں کے ہاتھوں سے مارے گئے، یہ لوگ شہید ہیں یا نہیں؟ بعض کہتے ہیں کہ شہادت کبریٰ نہیں تو صغریٰ تو ہوگی۔ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

شہادت کی شرط اول اسلام ہے، شیعہ مسلمان نہیں، اس لئے ان کی موت نہ شہادت کبریٰ ہے نہ صغریٰ، بلکہ نار جہنم ہے، شیعہ مذہب کی تفصیل میرے رسالہ "تحقیق شیعہ" میں ہے، (یہ رسالہ احسن الفتاویٰ جلد اول میں شائع ہو چکا ہے، مرتب) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۱۹ محرم سنہ ۹۰ھ

بمباری سے شہید ہونے والے کا حکم:

سوال:- جنگ میں ہوائی حملوں کے دوران جو مسلمان شہید ہو جاتے ہیں اُن کو غسل دینا ضروری ہے یا نہیں؟ شہید حقیقی کس کو کہتے ہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

شہری آبادیوں پر ہوائی حملہ سے شہید ہونے والوں پر شہادت کے دنیوی احکام جاری

ہوگئے، انہیں غسل نہیں دیا جائے گا، شہادت کے دنیوی احکام جن لوگوں پر جاری ہوتے ہیں اُن کی تفصیل بہشتی زیور میں ہے، فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۲۰ ذیقعدہ سنہ ۱۳۸۱ھ

مسلمانوں کے باہم قتال میں مرنے والے کا حکم:

سوال:- دو مسلمان جماعتوں کے درمیان لڑائی ہوئی، اور ان میں سے کوئی جماعت باغی تھی اور نہ قطاع الطریق تھی اور نہ حربی تھی، بلکہ سب مسلمان تھے، اور مسلمانوں کے ایک گاؤں میں رہتے تھے، لیکن ایک جماعت بالکل ظالم تھی، دوسری جماعت مظلوم تھی، مظلوم جماعت سے دو آدمیوں کو آلہ غیر جارحہ سے قتل کیا گیا اور دونوں وہیں معرکہ میں ہلاک ہوگئے ذرا کلام کیا، اور نہ کچھ کیا، البتہ ایک آدمی کا قاتل بھی معلوم ہوا، اور دوسرے کا قاتل معلوم نہیں ہوا، بلکہ جماعت کے ہر فرد پر شبہ قتل کیا جاسکتا ہے، اب سوال یہ ہے کہ اُن ہلاک شدگان میں سے کس کو غسل دیا جائے اور کس کو غسل نہ دیا جائے؟ سب سے زیادہ وضاحت شامی میں ہے، مگر بعض عبارات میں مجھ سے تطبیق نہیں ہو سکی، شامی کی عبارت کی بھی وضاحت فرمائیں، بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملهم الصواب

دونوں کو غسل نہ دیا جائے، غسل سے متعلق شامی کی عبارت اس صورت میں ہے جبکہ ظلم متیقن نہ ہو، قال ابن عابدین رحمہ اللہ تعالیٰ ومفادہ انہ لو کانت احدی الفرقتین ظالمۃ للاخری بان علموا انہم لا یغسل من قتل من الاخری وان جہل قاتلہ عینا لکونہ من اہل عن نفسہ وجماعتہ تامل (رد المحتار ص ۶۱۲ ج ۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۲۰ شعبان سنہ ۱۳۹۱ھ

سوال متعلق بالا:

سوال:- شہید کے بارے میں شامی کی ان دو عبارتوں میں بظاہر تعارض معلوم ہوتا ہے، ان میں تطبیق کس طرح دی جا سکتی ہے، مثلاً درمختار کی عبارت (بل قصاص) کے تحت علامہ شامی لکھتے ہیں: اما اذا لم یعلم قاتلہ فسیأتی انہ یغسل، یہاں شامی نے اس صورت میں غسل دینے کا لکھا ہے، پھر اسی درمختار کی عبارت (وکذا یکون شہیدا) کی تشریح کرتے ہوئے آخر میں لکھتے ہیں: ومفادہ انہ لو کانت احدی الفرقتین ظالمۃ بان علموا انہم لا یغسل من قتل من الاخری وان جہل قاتلہ عینا (شامیہ ص ۶۱۲ ج ۱)

ایک جگہ تو ایسے مقتول کو جس کا قاتل معلوم نہ ہو غسل کا لکھا ہے، اور دوسری جگہ اسی کو عدم
غسل کا لکھا ہے، کیا تطبیق کی یہ صورت ہو سکتی ہے کہ پہلی عبارت سے وہ مقتول مراد ہے جس کا
قاتل بالکل نامعلوم ہو، اور دوسری عبارت سے مراد وہ مقتول ہے جس کا معین اور فردی قاتل
تو نامعلوم ہے مگر بحیثیت جماعت معلوم ہے، یا یہ کہ پہلا مقتول مظلوم نہیں ہے دوسرا
مظلوم ہے۔

صورت مسئلہ یہ ہے کہ دو مسلمان جماعتوں کے درمیان لڑائی ہو گئی، ان میں سے ایک
جماعت نے دوسری جماعت کے دو آدمیوں کو ظلماً قتل کیا جبکہ آلہ غیر جارحہ تھا، اور قاتل کی
جماعت ظالم تھی، مقتول کی جماعت مظلوم تھی، نیز یہ بھی معلوم ہو کہ ان دو ہلاک شدگان میں
سے ایک کا قاتل معلوم ہے، دوسرے کا نامعلوم ہے، اب ایسی صورت میں ان ہلاک شدگان
کو غسل دیا جائے گا یا نہیں؟ بالکل ایسی صورت کے جواب میں آپ نے گزشتہ فتویٰ مورخہ
۲۰ شعبان ۱۳۹۱ھ میں لکھا ہے کہ دونوں کو غسل نہ دیا جائے، اب سوال یہ ہے کہ جب لڑائی
کے طرفین مسلمان ہوں اور ایک طرف میں کسی کو ظلماً مارا جائے تو غسل اس وقت نہ دیا جائے گا
جبکہ آلہ جارحہ ہو، اور اگر ان میں سے کسی کو ظلماً آلہ جارحہ کے ساتھ قتل کیا گیا تو ایسے مقتول
کو غسل نہ دینے کا کہاں لکھا ہے؟ آپ نے شامی کی عبارت ومفادہ انہ لو کانت لعن ای
الفرقتین فانہ للاخری بان علموا حالہم الخ تحریر فرمائی ہے، مگر شرح وقایہ صفحہ ۱۷۲ ج ۱
والی عبارت واما مقتول غیر ہؤلاء وھو من قتلہ مسلم غیر باغ وغیر قاطع
الطریق فانہ یکون شہیدا عند ابی حنیفۃ رحمہ اللہ تعالیٰ اذا قتل بحدید
ظلماً کا کیا جواب ہوگا؟ اس لئے کہ اس میں تو شہید کے لئے ظلم کے علاوہ قتل بالحدید
کی شرط ہے، نیز حاشیہ فتح القدیر ص ۱۷۲ ج ۱ میں بھی لکھا ہے والتقیید بالحدید انما
ھو اذا کان القتل من المسلمین، اگر قتل بالحدید کی قید اس صورت میں نہیں تو
اس کے ذکر کا کیا فائدہ ہے؟ اور اس کا محمل کیا ہے؟ اگر یہ قید لغو ہے تو لغویت کی کیا
دلیل ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

اصل مدار اس پر ہے کہ قتل موجب دیت ہو تو غسل واجب ہے ورنہ نہیں،
اس لئے شامیہ کی عبارت اما اذا لم یعلم قاتلہ فیسأل انہ یغسل میں قتل موجب دیت

مراد ہے، یعنی یوجد فی محلۃ، چنانچہ قول ماتن "وغسل من وجد قتیلاً فی مصر فیما یجب فیہ الدیۃ ولم یعلم قاتلہ" میں اسی کا بیان ہے، اور قول ابن عابدین رحمہ اللہ تعالیٰ فسیأتی میں اسی طرف اشارہ ہے۔

شرح وقایہ کی عبارت میں مقتول غیر مدافع کا حکم ہے، جو شامیہ وغیرہ میں بھی ہے، اور شامیہ کی عبارت مذکورہ میں مقتول مدافع کا حکم ہے، فلا منافاۃ۔

قال ابن نجیم رحمہ اللہ تعالیٰ: بقی من قتل مدافعاً عن نفسہ او عن مالہ او عن اہل الذمۃ من غیر ان یکون القاتل واحداً من الثلاثۃ فی الکتاب فان المقتول شہید کما صرح بہ فی المحیط وعطفہ علی الثلاثۃ وجعلہ سبباً رابعاً ولا یمکن دخولہ تحت قولہ او قتلہ مسلم ظلماً لان المدافع المذکور شہید بای آلۃ قتل بحدیدۃ او حجر او خشب کما صرح بہ فی المحیط ومقتول المسلم ظلماً لا یکون شہیداً الا اذا قتل بحدیدۃ کما قدمناہ (البحر الرائق ص ۱۹۴ ج ۲)

وقال ابن عابدین رحمہ اللہ تعالیٰ: وقال فی النہر کونہ شہیداً وان قتل بغیر محدد مشکل جداً لوجوب الدیۃ بقتلہ، فمن ثم ساغ النظر فیہ اھ قلت یمکن حملہ علی ما اذا لم یعلم قاتلہ عیناً، کما لو خرج علیہ قطاع طریق او لصوص او نحوہم وفی البحر عن المجتبی اذا التقت سریتان من المسلمین وکل واحدۃ تری انہم مشرکون فاجلوا عن قتلی من الفریقین قال محمد رحمہ اللہ تعالیٰ لا دیۃ علی احد ولا کفارۃ لانہم دافعون عن انفسہم ولم یذکر حکم الغسل ویجب ان یغسلوا لان قاتلہم لم یظلمہم اھ ومفادہ انہ لو کانت احدی الفرقتین ظالمۃ للاخری بان علموا انہم مسلمون لا یغسل من قتل من الاخری وان جہل قاتلہ عیناً لکونہ مدافعاً عن نفسہ وجماعتہ تأمل (رد المحتار ص ۸۵۰ ج ۱) وقال فی منحۃ الخالق والجواب عن اشکالہ ان ہذا القاتل ان کان مکابراً فی المصر لیلاً فسیأتی انہ بمنزلۃ قاطع الطریق وان کان لما نزل علیہ لیلاً لیقتلہ او یأخذ مالہ فہو بمنزلتہ ایضاً کما فی النہر وعلی کل فلا دیۃ فی قاطع الطریق فقولہ لوجوب الدیۃ ممنوع وعلی کل فہو شہید ولا اشکال (منحۃ علی ہامش البحر الرائق ص ۱۹۴ ج ۲) علامہ ابن عابدین

14

رحمہ اللہ تعالیٰ کا لو کانت احدی الفرقتین ظالمۃ للاخریٰ میں عدم وجوب دیت کی توجیہ لکونہ مدافعۃ سے کرنا اور اس کا بعض المجتبیٰ کے جزئیہ لو التقت سریتان الخ سے استنباط جناب کے خیال میں محل تامل ہے، اس لئے کہ مقیس علیہ میں قاتل بھی دافع ہے لہٰذا اس پر عدم وجوب دیت ظاہر ہے، مگر مقیس میں قاتل دافع نہیں صرف مقتول دافع ہے، غالباً ابن عابدین رحمہ اللہ تعالیٰ نے آخر میں تامل سے اسی طرف اشارہ فرمایا ہے،

پس صورت زیر بحث میں عدم وجوب دیت وثبوت شہادت کی صحیح توجیہ وہی ہے جو ابن عابدین رحمہ اللہ تعالیٰ نے منحۃ الخالق میں بیان فرمائی ہے، یعنی ایسے قاتلین بحکم قطاع الطریق ہیں، اور ان کی مدافعت بحکم جہاد ہے، فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۱۲ شوال سنہ ۹۹ھ
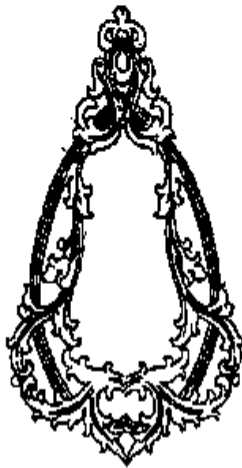
کتاب الزکوٰۃ

دوسرے شہر میں زکوٰۃ بھیجنا:

سوال: زید اپنی زکوٰۃ اور فطرانہ اپنے شہر کے مساکین کو نہیں دیتا بلکہ دور دور کے شہروں میں بھیجتا ہے، آیا یہ فعل شرعاً جائز ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب ومنہ الصدق والصواب

دوسرے شہر کی طرف زکوٰۃ بھیجنا مکروہ تحریمی ہے، مگر وہاں کوئی رشتہ دار مسکین ہو یا اپنے شہر کے مساکین سے کوئی زیادہ محتاج ہو یا زیادہ نیک ہو یا طالب علم دین ہو یا دوسری جگہ بھیجنے میں عامۃ المسلمین کا زیادہ فائدہ ہو تو کوئی کراہت نہیں، بلکہ اہل قرابت کا حق اپنے شہر کے مساکین سے زیادہ ہے۔ ویکرہ نقلہا الا الی قرابۃ بل فی الظہیریۃ لا تقبل صدقۃ الرجل وقرابتہ محاویج حتی یبدأ بہم فیسد حاجتہم او احوج او اصلح او اورع او انفع للمسلمین او من دار الحرب الی دار الاسلام او الی طالب العلم وفی المعراج التصدق علی العالم الفقیر افضل او الی الزہاد او کانت معجلۃ قبل تمام الحول فلا یکرہ خلاصۃ (رد المحتار ص ۲۳ ج ۲)

وعن ابی ہریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ مرفوعا الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ قال یا امۃ محمد والذی بعثنی بالحق لا یقبل اللہ صدقۃ من رجل ولہ قرابۃ محتاجون الی صلتہ ویصرفہا الی غیرہم والذی نفسی بیدہ لا ینظر اللہ الیہ یوم القیامۃ اھ رحمتی والمراد بعدم القبول عدم الاثابۃ علیہا وان سقط بہا الفرض لان المقصود منہا سد خلۃ المحتاج وفی القریب جمع بین الصلۃ والصدقۃ (رد المحتار کتاب الزکوٰۃ ص ۳۲ ج ۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۳ر ذیقعدہ [illegible]ھ

مسکین کو قرض معاف کرنے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی:

سوال: ایک شخص کا کسی فقیر پر قرض ہے، اس نے مقروض سے کہا کہ میں نے تجھے اپنا قرض زکوٰۃ میں معاف کیا تو زکوٰۃ ادا ہوگی یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب منہ الصدق والصواب

قرض معاف کرنے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی، صحیح صورت یہ ہے کہ اس شخص کو زکوٰۃ کی رقم دیکر قرض میں واپس لے لے، اگر واپس نہ کرے تو جبرًا بھی لے سکتا ہے، اگر واپس نہ کرنے کا خطرہ ہو تو اس سے کہا جائے کہ کسی کو اپنی طرف سے زکوٰۃ کی رقم وصول کرکے اس سے قرض ادا کرنے کا وکیل بنادے۔ لما فی شرح التنویر واعلم ان اداء الدین عن الدین والعین عن العین وعن الدین یجوز واداء الدین عن العین وعن دین سیقبض لا یجوز وحیلۃ الجواز ان یعطی مدیونہ الفقیر زکوٰتہ ثم یأخذھا عن دینہ ولو امتنع المدیون مد یدہ واخذھا لکونہ ظفر بجنس حقہ فان مانعہ رفعہ للقاضی وفی الشامیۃ تحت (قولہ واعلم) وفی صورتین لا یجوز الاولی اداء الدین عن العین کجعلہ مافی ذمۃ مدیونہ زکوٰۃ لمالہ الحاضر (رد المحتار ج ۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۱۵ ذیقعدہ سنہ ۸۲ھ

مد زکوٰۃ سے کسی کا قرض ادا کرنا:

سوال: ایک غریب آدمی قرضدار ہے، زکوٰۃ سے اگر اسکی مدد کی جاتی ہے تو خطرہ ہے کہ خود رکھ لے گا اور قرض ادا نہیں کرے گا کیا اس کا قرض اتارنے کے لئے زکوٰۃ کی رقم براہ راست قرضخواہ کو دیا جائز ہے؟ کیا مسکین کو یہ بتانا ضروری ہے کہ اس کا قرض زکوٰۃ کی رقم سے ادا کر رہے ہیں؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

مسکین کی اجازت سے اس کا قرض مد زکوٰۃ سے ادا کیا جائے تو جائز ہے، مسکین کو مد زکوٰۃ کا بتانا ضروری نہیں، فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۲۰ رجب سنہ ۱۴ھ

قرض سے فارغ نصاب ہو تو زکوٰۃ فرض نہیں:

سوال: جس کے پاس نصاب زکوٰۃ ہے مگر اسی قدر یا اس سے زائد اس پر قرض

بھی ہے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب ومنه الصدق والصواب

اگر قرض سے فارغ مال بقدر نصاب تک نہیں پہنچتا تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں، البتہ اگر وجوب زکوٰۃ کے بعد قرض ہو گیا تو اس سے زکوٰۃ ساقط نہ ہوگی، قال فی التنویر وسببه ملك نصاب حولی تام فارغ عن دین له مطالب من جهة العباد وقال فی الشرح سواء کان لله کزکوٰۃ وخراج او للعبد ولو کفالة او مؤجلا الخ وفی الشامیة (قوله فارغ عن دین) وهذا اذا کان الدین فی ذمته قبل وجوب الزکوٰۃ فلو لحقه بعده لم تسقط الزکوٰۃ لانها ثبتت فی ذمته فلا یسقطها ما لحق من الدین بعد ثبوتها جوهرة (شامیة ج ۲)

فقط والله تعالیٰ اعلم

غرۂ ذی حجہ ۴۲ھ

مہر مؤجل مانع وجوب زکوٰۃ ہے:

سوال: زید کے ذمہ ہندہ کا قرض مہر ہے، تحقیق طلب یہ امر ہے کہ قرض معجل یا مؤجل وجوب زکوٰۃ سے مانع ہے یا نہیں؟ ادا کرنے کی نیت ہو یا نہ ہو، دونوں صورتوں میں کچھ فرق ہوگا یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملهم الصواب

فتح القدیر، طحطاوی اور بدائع وغیرہ میں چار اقوال مذکور ہیں۔

① دین خواہ مؤجل ہو یا معجل، مہر ہو یا غیر مہر، بہر صورت مانع وجوب زکوٰۃ ہے۔

② دین مؤجل مانع نہیں، مہر ہو یا غیر مہر۔

③ صرف مہر مؤجل مانع نہیں۔

④ زوج ادائے مہر کا عزم رکھتا ہو تو مانع ہے ورنہ نہیں۔

قول اول راجح معلوم ہوتا ہے، اور علامہ حصکفی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اسی کو اختیار فرمایا ہے، ولکن نقل عن المبتغی والقهستانی تصحیح الثالث ورجح بعض الاکابر الثانی اولاً والرابع ثانیاً. فقط والله تعالیٰ اعلم

۲ صفر ۹۹ھ

مدِ زکوٰۃ سے مدرسہ کی تعمیر جائز نہیں:

سوال: مال زکوٰۃ سے مدرسۂ اسلامیہ تعمیر کرنا جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب ومنہ الصدق والصواب

جائز نہیں، قال فی شرح التنویر ولا یصرف مال الزکوۃ الی بناء نحو مسجد وفی الشامیۃ کبناء القناطیر والسقایات واصلاح الطرقات وکری الانہار والحج والجہاد وکل ما لا تملیک فیہ زیلعی (رد المحتار ج ۲ ص ۸۵) فقط واللہ تعالی اعلم

۷ ذیقعدہ سنہ ۸۲ھ

معلم زکوۃ سے تنخواہ دینا جائز نہیں:

سوال: زکوۃ کے مال سے معلم علوم اسلامیہ کو تنخواہ دینا جائز ہے یا نہیں؟ معلم صاحب نصاب نہیں، بینوا توجروا۔

الجواب ومنہ الصدق والصواب

معلم اگرچہ مسکین ہو تب بھی اسے تنخواہ میں زکوۃ کا مال دینا جائز نہیں، قال فی الہندیۃ ولو نوی الزکوۃ بما یدفع المعلم الی الخلیفۃ ولم یستأجرہ ان کان الخلیفۃ بحال لو لم یدفعہ یعلم الصبیان ایضا اجزأہ والا فلا وکذا ما یدفعہ الی الخدم من الرجال والنساء فی الاعیاد وغیرہا بنیۃ الزکوۃ کذا فی معراج الدرایۃ (عالمگیریۃ ...)

فقط واللہ تعالی اعلم

۷ ذیقعدہ سنہ ۸۳ھ

غنی طالب علم کو زکوۃ دینا جائز نہیں:

سوال: طالب علم غنی جو طلب علم کی وجہ سے عاجز عن الکسب ہو مستحق زکوۃ ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب ومنہ الصدق والصواب

ایسے طالب علم کو زکوۃ دینا درست نہیں، واما ما ذکر فی شرح التنویر من ان طالب العلم یجوز لہ اخذ الزکوۃ ولو غنیا الخ فہو غیر معتمد علیہ کما قال فی الشامیۃ معزیا الی الطحطاوی ونصہا وہذا الفرع مخالف لاطلاقہم الحرمۃ فی الغنی ولم یعتمدہ احد قلت وہو کذلک والاوجہ تقییدہ بالفقیر ویکون طلب العلم مرخصا لجواز سؤالہ من الزکوۃ وغیرہا وان کان قادرا علی الکسب اذ بدونہ لا یحل لہ السؤال کما سیأتی ومذہب الشافعیۃ والحنابلۃ ان القدرۃ علی الاکتساب

تمنع الفقر فلا یحل له الاخذ فضلا عن السؤال الا اذا اشتغل عنه بالعلم الشرعی. (رد المحتار ص ۸۱ ج ۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۳۰ جمادی الآخرة ۸۴ھ

بدائع میں فی سبیل اللہ کو عام نہیں کہا گیا:

سوال: مولانا آزاد نے "فی سبیل اللہ" کے لفظ کو عام رکھا ہے، جمیع قربات کو شامل کہتے ہیں، یعنی تملیک ضروری نہیں، لہٰذا مساجد و مدارس وغیرہ میں صرف کرنا جائز ہے، حوالہ بدائع کا دیا ہے، امین احسن اصلاحی اور جماعت اسلامی کے دیگر افراد بھی بدائع کی عبارت پیش کرتے ہیں، کیا واقعی یہ جزئیہ بدائع میں ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب منه الصدق والصواب

قال فی البدائع: واما قوله تعالیٰ "وفی سبیل اللہ" عبارة عن جمیع القرب فیدخل فیه کل من سعی فی طاعة اللہ وسبیل الخیرات اذا کان محتاجا، وقال ابو یوسف رحمه اللہ تعالیٰ المراد منه فقراء الغزاة اھ۔ اس عبارت میں ظاہر ہے کہ اس قدر عموم مقصود نہیں کہ شرط تملیک منتفی ہو جائے، بلکہ اس سے مقصود ہر ایسے فقیر کی تملیک ہے جو کسی بھی کار خیر میں لگا ہوا ہو، اور اس تعمیم سے اُن اقوال پر رد مقصود ہے جن میں بعض خاص انواع مراد لی گئی ہیں، صاحب بدائع اگر قول تملیک کے مقابلہ میں یہ قول لاتے تو اس سے استدلال ہو سکتا تھا، مگر بدائع میں ایسا نہیں، بلکہ تملیک کی چند خاص صورتوں کے مقابلہ میں یہ بھی تملیک کی ایک عام صورت بیان کی ہے، در مختار اور رد المحتار میں بھی بدائع کے جزئیہ کو تملیکات خاصہ کے مقابلہ میں بیان کیا ہے، اگر نفس تملیک کا انکار ہوتا تو کوئی تو ضرور اس کی تصریح کرتا، وما فی کتاب الخراج لابی یوسف رحمه اللہ تعالیٰ من تفسیر سبیل اللہ باصلاح طرق المسلمین فهو قول لا نقل عنه لائمة الثلثة رحمهم اللہ تعالیٰ کما قدمنا من البدائع ولم ینقله صاحبه محمد رحمه اللہ تعالیٰ وهو اعلم بمذهبه، وهذا دلیل علی وقوع الغلط فی نسخة کتاب الخراج وهو کتاب غیر متداول فلا یجوز الاعتماد علی ما فیه من خلاف الکتب المتداولة، فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۱۲ ذی الحجہ ۸۴ھ

زکوٰۃ کا نصاب:

سوال: کسی کے پاس سونا ۷½ تولے سے کم ہو تو اس پر زکوٰۃ فرض ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

سونے کا نصاب ۷½ تولہ ۸۷ء۴۸۰ گرام اس شخص کے لئے ہے جس کے پاس صرف سونا ہو، چاندی، مال تجارت اور نقدی میں سے کچھ بھی نہ ہو، اسی طرح چاندی کا نصاب ۵۲½ تولہ ۶۱۲ء۳۶۰ گرام اس صورت میں ہے کہ صرف چاندی ہو سونا، مال تجارت اور نقدی بالکل نہ ہو، اگر سونے یا چاندی کے ساتھ کوئی دوسرا مال زکوٰۃ بھی ہے تو سب کی قیمت لگائی جائے گی، اگر سب کی مالیت ۸۷ء۴۸۰ گرام سونے یا ۶۱۲ء۳۶ گرام چاندی کی قیمت کے برابر ہو تو زکوٰۃ فرض ہے،

نصاب زکوٰۃ کا خلاصہ یہ ہے، سونا ۷½ تولہ ۸۷ء۴۸۰ گرام یا چاندی ۵۲½ تولہ ۶۱۲ء۳۶۰ گرام یا مال تجارت یا نقدی یا ان چاروں اشیاء یا ان میں سے بعض کا مجموعہ سونے یا چاندی کے وزن مذکور کی قیمت کے برابر ہو، مال تجارت سے وہ چیز مراد ہے جو تجارت کی نیت سے خریدی ہو اور یہی نیت باقی ہو، اگر بوقت خرید تجارت کی نیت نہ تھی یا بعد میں تجارت کی نیت نہ رہی یا خریدنے کی بجائے کسی دوسرے ذریعہ سے کوئی چیز ملی اگرچہ لیتے وقت تجارت کی نیت ہو، ان سب صورتوں میں زکوٰۃ نہیں،

تنبیہ: بندہ کی تحقیق منضبط رسالۃ "بسط الباع لتحقیق الصاع" کے مطابق چاندی کا نصاب ۶۱۴ء۴۰ گرام اور سونے کا ۸۷ء۷۷ گرام بنتا ہے، صدقۃ الفطر کے لئے یہی تحقیق ارجح ہونے کے علاوہ احوط بھی ہے، مگر نصاب زکوٰۃ میں کم وزن لینے میں احتیاط ہے، اس لئے یہاں عام مشہور وزن لکھا گیا ہے، فقط واللہ تعالیٰ اعلم،

۱۱ ذیقعدہ سنہ ۱۳۸۳ھ

زکوٰۃ کا مصرف:

سوال: کتنی مالیت رکھنے والے پر زکوٰۃ نہیں لگ سکتی؟ بینوا توجروا،

الجواب باسم ملہم الصواب

سونے، چاندی، مال تجارت اور گھر میں روزمرہ استعمال کی چیزوں سے زائد سامان کی قیمت لگا کر اس میں نقدی جمع کی جائے، ان پانچوں کا مجموعہ یا ان میں سے بعض ۸۷ء۴۸۰ گرام سونے یا ۶۱۲ء۳۶ گرام چاندی کے برابر ہو جائے تو زکوٰۃ نہیں لے سکتا، تین جوڑے کپڑے سے زائد لباس اور ریڈیو اور ٹیلیویژن جیسی خرافات انسانی حاجات میں داخل نہیں اس لئے ان کی قیمت بھی حساب میں لگائی جائے گی، فی الاضحیۃ الشامیۃ وصاحب الثیاب

الاربعة لو ساوى الرابع نصابا اغنى وثلاثة فلا، لان احدها للبذلة والآخر للمهنة والثالث للجمع والوفد والاعياد (رد المحتار ص ۳۹ ج ۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲۰ ذیقعدہ سنہ ۸۳ھ

نصابِ زکوٰۃ پر سال گزرنے کا مطلب:

سوال: میں رمضان کی پہلی تاریخ کو زکوٰۃ نکالتی ہوں، اگر شعبان کے آخر میں کچھ رقم آجائے تو کیا اس پر بھی زکوٰۃ ہے؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

آپ قمری ماہ کی جس تاریخ میں صاحبِ نصاب ہوئے تھے ہمیشہ وہی تاریخ آپ کی زکوٰۃ کے حساب کے لئے متعین ہے، اس تاریخ میں آپ کے پاس سونا، چاندی، مالِ تجارت اور نقدی جو کچھ بھی ہو خواہ ایک ہی روز قبل ملا ہو سب پر زکوٰۃ فرض ہوگی، زکوٰۃ کا حساب ہمیشہ اسی تاریخ میں ہوگا، اداء جب چاہیں کریں، اگر درمیان سال میں بقدرِ نصاب مال نہیں رہا مگر متعین تاریخ میں نصاب پورا ہوگیا تو بھی زکوٰۃ فرض ہے، البتہ اگر درمیان میں مال بالکل نہ رہا تو اب پھر جس تاریخ میں صاحبِ نصاب ہوں گے وہ متعین ہوگی، اگر صاحبِ نصاب بننے کی قمری تاریخ یاد نہ ہو تو غور و فکر کے بعد جس تاریخ کا ظنِ غالب ہو وہ متعین ہوگی، اگر کسی تاریخ کا بھی ظنِ غالب نہ ہو تو خود کوئی قمری تاریخ متعین کرلیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۱۱ ذیقعدہ سنہ ۸۳ھ

زوجۂ معسر کی زمین حوائجِ اصلیہ سے ہے:

سوال: ہمارے ملک میں بیوی کو مہر میں گھریلو سامان اور کپڑوں کے علاوہ زمین اور کھجور کے درخت بھی دیتے ہیں، اور یہ زمین اور درخت شوہر کے تصرف میں رہتے ہیں، وہ ان کی پیداوار بیوی اور اولاد پر خرچ کرتا ہے، کیا اس صورت میں بیوی غنیہ شمار ہوگی؟ زوج معسر ہو یا موسر دونوں صورتوں میں فرق ہوگا یا نہیں؟ شامی میں ہے: سئلت عن المرأة هل تصير غنية بالجهاز الذي تزف به الى بيت زوجها والذي يظهر مما مر ان ما كان من اثاث المنزل وثياب البدن واواني الاستعمال مما لا بد لامثالها منه فهو من الحاجة الاصلية وما زاد على ذلك من الحلي والاواني والامتعة التي يقصد بها الزينة اذا بلغ نصابا تصير به غنية (ص ۳۴۷ ج ۲) اس میں یہ اشکال ہے کہ ثیاب بدن زوج پر نفقات

واجب میں سے تو عورت کی حوائج اصلیہ میں کیوں شمار کئے گئے؟ اگر ثیاب حوائج اصلیہ میں داخل ہیں تو عورت کی غذا بھی زوج پر نفقہ واجب ہونے کے باوجود عورت کی حوائج اصلیہ میں داخل ہوگی یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

زوجہ کا نفقہ اگرچہ شوہر پر واجب ہے مگر اس میں احتمال سقوط ہے، چنانچہ زوج کے معسر ہونے یا زوجہ کے طلب نہ کرنے یا طلب کے باوجود بعض صورت سے نفقہ ساقط ہوجاتا ہے، اس لئے اعسار زوج کی حالت میں عورت کی زمین اگر اس کے مصارف سے زائد پیداوار نہ دیتی ہو تو وہ عورت کی حوائج اصلیہ میں داخل ہوگی، اسی طرح عورت کا مکان بھی اعسار زوج کی حالت میں اس کی حوائج اصلیہ میں داخل ہے حالانکہ یہ بھی نفقات واجبہ میں سے ہے کما فی الاضحیۃ الشامیۃ والمرأۃ موسرۃ بالمعجل لو الزوج ملیا وبالمؤجل لا وبدار تسکنها مع الزوج ان قدر علی الاسکان (رد المحتار ص۲۱۹ ج۵) سوال میں اثاث المنزل وثیاب البدن وغیرہ سے متعلق شامیہ کے جزئیہ میں اعسار زوج کی قید اس لئے نہیں کہ بیوی کے پاس ان اشیاء کی موجودگی میں شوہر سے ان کا مطالبہ عرفاً نہیں کیا جاتا بلکہ اس کو معیوب سمجھا جاتا ہے، اس لئے یہ اشیاء بہرصورت عورت کی حوائج اصلیہ میں شمار ہوں گی خواہ زوج معسر ہو یا موسر۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

یوم العاشوراء ۸۵ھ

دَین مہر کی وجہ سے عورت کی غنا کی تفصیل:

سوال: عورت کا شوہر کے ذمہ مہر واجب ہے، اور کوئی چیز اس کے پاس نہیں، اس کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

اگر مہر معجل ہو اور زوج موسر ہو تو عورت غنیہ شمار ہوگی، اس کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں، اور اگر زوج معسر ہو یا مہر مؤجل ہو تو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے، فی الاضحیۃ الشامیۃ والمرأۃ موسرۃ بالمعجل لو الزوج ملیا وبالمؤجل لا (رد المحتار ص۲۱۹ ج۵) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

یوم العاشوراء ۸۵ھ

حکم ادائے زکوٰۃ بذریعہ نوٹ:

سوال: اگر زکوٰۃ میں فقیر کو نوٹ دیئے گئے تو زکوٰۃ ادا ہوجائے گی یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملهم الصواب

ایک روپیہ کا نوٹ خود مال ہے، اس سے زکوٰۃ کی صحت میں کوئی اشکال نہیں، البتہ ایک روپے سے بڑا نوٹ مال کی رسید ہے، مگر رسیدی نوٹ جب فقیر کو دیا گیا تو یہ حکومت پر حوالہ ہوا، اگر فقیر نے حکومت سے اس نوٹ کی رقم وصول کی تو اس وقت زکوٰۃ ادا ہو جائے گی قال فی الشامیۃ فی صورتین لا یجوز الاولی اداء الدین عن العین کجعلہ ما فی ذمۃ مدیونہ زکوٰۃ لمالہ الحاضر بخلاف ما اذا امر فقیرا بقبض دین لہ علی آخر عن زکوٰۃ عین فانہ یجوز لانہ عند قبض الفقیر یصیر عینا فکان عینا عن عین (رد المحتار ص ۱۳ ج ۲) اور اگر حکومت سے وصول کرنے کی بجائے کسی اور سے نوٹ کی قیمت یا مال خریدا تو اگرچہ فقیر کا دین پر قبضہ نہیں ہوا، مگر دین کے عوض پر قبضہ ہو چکا ہے، وللعوض حکم المعوض، لہٰذا زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔ اس پر اشکال ہو سکتا ہے کہ فقیر نے دین علی الحکومۃ کے عوض میں اگر کچھ خریدا تو یہ تصرف تملیک الدین من غیر من علیہ الدین بالعوض ہونے کی وجہ سے صحیح نہ ہوگا، اس کا جواب یہ ہے کہ بیع وشراء بعوض الدین علی الحکومۃ نہیں ہوتی بلکہ عقد تو مطلقاً ہوتا ہے، مگر بعد میں نوٹ دے کر ثمن کا حوالہ حکومت پر کر دیا جاتا ہے، پس نوٹ سے خریدا ہوا مال اگرچہ ابتداءً دین کا عوض نہیں مگر انتہاءً عوض دین ہونے کی وجہ سے اسے للعوض حکم المعوض کے کلیہ میں داخل کیا جا سکتا ہے۔ اگر فقیر نے وہ نوٹ کسی کو ہبہ یا اجرت یا اداء دین کے طور پر دیا تو اس نے دین زکوٰۃ حکومت سے خود وصول کرنے کی بجائے دوسرے کے حوالہ کر کے اسے مسلط علی القبض کر دیا ہے، پس اگر دوسرے شخص نے حکومت سے دین وصول کیا، تو گویا پہلے فقیر کی طرف سے وکالۃً اس پر قبض کیا، اس کے بعد اپنے لئے قبض کیا، قال فی الشامیۃ والحیلۃ اذا ارادت ذلک ای منع الفقیر عن اخذ الدین ما فی الاشباہ وھو ان یوکل المدیون خادم الدائن بقبض الزکوٰۃ ثم بقضاء دینہ فیقبض الوکیل صار ملکا للموکل ولا یسلم المال للموکل الا فی غیبۃ المدیون لاحتمال ان یعزلہ عن وکالۃ قضاء دینہ حال القبض قبل الدفع (رد المحتار ص ۱۳ ج ۲) وایضاً فی بیوع الشامیۃ (قولہ لا یجوز من غیرہ) ای لا یجوز تملیک الدین من غیر من علیہ الدین الا اذا سلطہ علیہ واستثنی فی الاشباہ من ذلک ثلاث صور الاولی اذا سلطہ علی قبضہ فیکون وکیلا قابضا للموکل ثم لنفسہ الثانیۃ الحوالۃ الثالثۃ الوصیۃ (رد المحتار ص ۱۸۵ ج ۴)

اور اگر حکومت کی بجائے کسی اور سے نوٹ تحفۃً یا بیعاً خریدا تو بقاعدہ للعوض حکم المعوض اس صورت میں بھی زکوٰۃ ادا ہو جائے گی، البتہ نوٹ گم ہو گیا یا جل گیا تو زکوٰۃ ادا نہ ہوگی لہٰذا احتیاط اس میں ہے کہ زکوٰۃ میں رسیدی نوٹ نہ دیئے جائیں، معہٰذا اگر دیدیئے تو مسئلہ پر صحت ادا کا حکم لگایا جائے گا کیونکہ گم ہونے یا جل جانے کا احتمال بہت بعید ہے، بدون ثبوت محض احتمال بعید معتبر نہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۱۲ ربیع الاول سنہ [illegible]

زکوٰۃ مانگنا اور مانگنے والے کو دینا حرام ہے:

سوال: زید ویند ایک شخص ہے مستحق صدقات واجبہ ہے، اس کو زکوٰۃ، عشر، صدقۃ الفطر وغیرہ صدقات واجبہ سے سوال کر کے لینا جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

جس شخص کے پاس ایک دن کی خوراک موجود ہو یا کمانے پر قدرت ہو اس کا خوراک کے لئے سوال کرنا حرام ہے، اور اس کو دینا بھی حرام ہے، دوسری ضروریات لباس، مکان وغیرہ کو بھی اسی پر قیاس کر لیا جائے کہ بقدر ضرورت موجود ہونے کی صورت میں سوال کرنا حرام ہے، آجکل لڑکیوں کا جہیز بنانے کے لئے زکوٰۃ مانگنے کا عام دستور ہو گیا ہے، شرعاً یہ ضرورت میں داخل نہیں، اس لئے سوال ناجائز ہے، البتہ بدون سوال از خود کوئی دیدے تو مضائقہ نہیں۔ حضرات فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ نے مسکین طالب علم دین کو سوال کی اجازت تحریر فرمائی ہے، مگر یہ اس زمانہ کی بات ہے جبکہ عوام میں علم دین سے نفرت نہیں تھی، علم دین اور اس کے پڑھنے پڑھانے والوں سے نفرت کے اس دور میں طالب علم دین کو بھی سوال کی اجازت نہیں، اس میں دین کی تذلیل و تحقیر ہے اہل ثروت سے، استغناء اور توکل علی اللہ کی برکات کی تفصیل کے لئے میرا رسالہ صیانۃ العلماء عن الذل عند الاغنیاء مندرجہ احسن الفتاوی جلد اول ملاحظہ ہو۔

قال فی العلائیۃ ولا یحل ان یسأل شیئا من القوت من لہ قوت یومہ بالفعل او بالقوۃ کالصحیح المکتسب ویأثم معطیہ ان علم بحالہ لاعانتہ علی المحرم (رد المحتار ص ۷۶ ج ۲) وفی الشامیۃ ویکون طلب العلم مرخصا لجواز سؤالہ من الزکوٰۃ وغیرہا وان کان قادرا علی الکسب اذ بدونہ لا یحل لہ السؤال کما سیأتی ومذہب الشافعیۃ والحنابلۃ ان القدرۃ علی الاکتساب تمنع الفقر فلا یحل

له الأخذ فضلاً عن السؤال، إلا إذا اشتغل عنه بالعلم الشرعي.
(رد المحتار ص ۶۱ ج ۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم
۱۸ جمادی الآخرہ سنہ ۸۶ھ

فقیر کو زکوٰۃ میں ملی ہوئی چیز کا استعمال غنی کے لئے جائز نہیں:

سوال: اگر کسی فقیر کو کوئی کتاب مثلاً زکوٰۃ سے ملی تو غنی کے لئے اس کا استعمال جائز ہے یا نہیں؟ فتاویٰ رشیدیہ کے مسئلہ ذیل سے اس کا ناجائز ہونا ثابت ہوتا ہے:

مسئلہ: طلبہ کا کھانا جو کسی جگہ مقرر ہوتا ہے اور وہاں سے لاتے ہیں صاحب نصاب کو وہ کھانا بسبب رغبت طلبہ جائز ہے یا نہیں؟

جواب: طلبہ کا کھانا جو مقرر ہوتا ہے اگر واجب مثل کفارہ اور عشر اور نذر اور زکوٰۃ نہیں ہے تو طلبہ کے ساتھ ان کی اجازت سے غنی بھی کھا سکتا ہے، اور اگر ان میں سے کسی ایک میں کھانا مقرر ہوا ہے تو جب وہ طالب علم کسی کو مالک بنا دے اس وقت غنی اس کھانے کو کھا سکتا ہے، صرف ساتھ کھلانے سے کھانا اس کا درست نہیں ہے۔ فقط (فتاویٰ رشیدیہ ص ۳۴۲ مطبوعہ قرآن محل)

اس کے خلاف دیوبند، سہارنپور، مدرسہ امینیہ دہلی، فتحپوری دہلی، دار العلوم نانک واڑہ کراچی، اور مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی دامت برکاتہم نے صورت مذکورہ کے خلاف جواز کا فتویٰ دیا ہے، یہ فتاویٰ ارسال ہیں، اپنی تحقیق سے نوازیں، والأجر عند اللہ الکریم۔

الجواب باسم ملہم الصواب

فتاویٰ رشیدیہ کا مسئلہ صحیح ہے، فقیر نے مال زکوٰۃ غنی کو باحتہ یا عاریۃً دیا تو اس کے لئے حلال نہیں، البتہ تملیک کے بعد حلال ہو جائے گا، قال فی العلائیۃ فی باب بوت المکاتب وعجزه: وطاب لسيده وإن لم يكن مصرفا للصدقة ما أدى إليه من الصدقات فعجز لتبدل الملك، وأصله حديث بريرة رضي الله تعالى عنها في اللحم هو لها صدقة ولنا هدية، كما في وارث فقير مات عن صدقة أخذها ثم ورثه الغني، وكما في ابن سبيل أخذها ثم وصل إلى ماله وهي في يده، أي الزكوة، وكفقير استغنى وهي في يده، فإنها تطيب له، بخلاف فقير أباح لغني أو هاشمي عين زكوة أخذها لا يحل لأن الملك لم يتبدل. وفي الشامية (قوله لأن الملك لم يتبدل) لأن المباح له يتناوله على ملك المبيح، ونظيره المشتري شراء فاسداً إذا أباح لغيره لا يطيب له، ولو ملكه يطيب، هداية (رد المحتار ص ۸۰ ج ۵)

وفی التبیین وتبدل الملک کتبدل العین فصار کعین اخریٰ والیہ اشار النبی صلی اللہ
علیہ وسلم فی حدیث بریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ھی لہا صدقۃ ولنا ھدیۃ (رد المحتار
علی الدر ص ۲۷ ج ۲) حدیث سے ثابت ہوا کہ علت بوجہ تبدل ملک بسبب ہدیہ ہوئی بصورت
اباحت نہیں، عبارات مذکورہ کے علاوہ ہدایہ، عنایہ، فتح القدیر، بحر، حاشیۃ الطحطاوی علی المراقی
اور زیلعی وغیرہ جملہ کتب فقہ میں یہ مسئلہ بہت وضاحت کے ساتھ مذکور ہے، مجوزین حضرات
نے فتویٰ لکھتے وقت کتب کی طرف رجوع نہیں فرمایا۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۸ر شعبان [illegible]ھ

پراویڈنٹ فنڈ پر زکوٰۃ کا حکم:

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام پراویڈنٹ فنڈ کے بارے میں کہ اس پر زکوٰۃ کب
واجب ہوگی؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

گورنمنٹ پراویڈنٹ فنڈ اور پرائیویٹ کمپنیوں کے پراویڈنٹ فنڈ کی نوعیت میں
کچھ فرق ہے، جس کی وجہ سے احکام میں بھی فرق ہوگا، گورنمنٹ پراویڈنٹ فنڈ میں حکومت
مستاجر ہے، اور ملازم اجیر ہے، فنڈ کی رقم مستاجر (حکومت) کے قبضہ میں رہتی ہے، اس لئے
اجیر کا قبضہ نہیں ہوتا، قبض نہ ہونے کی وجہ سے بدستور حکومت پر دین ہے، لہٰذا اس پر زکوٰۃ فرض
نہیں، وصول ہونے کے بعد بھی اس پر گزشتہ زمانہ کی زکوٰۃ نہیں، بلکہ آئندہ کے لئے زکوٰۃ فرض
ہوگی، لانہ دین ضعیف کدین المھر ولا یقاس علی دین اجرۃ الارض والدار والعبد
وانہ دین متوسط لان منفعۃ الدار مال من وجہ والعمل لیس بمال فدین اجرتہ
لیس بمقابل للمال الحقیقی ولا الحکمی علی ان الدین المتوسط ایضا کالدین الضعیف
فی عدم وجوب الزکوٰۃ علی الراجح، البتہ اگر اس فنڈ میں سے ملازم نے کسی انشورنس کمپنی میں
حصہ لیا تو اب بیمہ کمپنی کا قبضہ اجیر کی طرف منسوب ہوگا، اور کمپنی بمنزلہ وکیل ہوگی، اور وکیل کا قبض
موکل کا قبض شمار ہوتا ہے، لہٰذا اجیر کے قبضہ میں آجانے کی وجہ سے ہر سال اس کی زکوٰۃ ادا کرنا فرض ہے،
پرائیویٹ کمپنیوں کا پراویڈنٹ فنڈ ایک مستقل کمیٹی کی تحویل میں دیدیا جاتا ہے جس میں ملازمین
کا ایک نمائندہ ہوتا ہے، یہ کمیٹی چونکہ ملازمین کی وکیل ہے لہٰذا کمیٹی کا قبضہ ملازم کا قبضہ شمار ہوگا۔ واللہ تعالیٰ

۵ر شوال [illegible]ھ

قرض پر وجوب زکوٰۃ کی تفصیل:

سوال: ایک شخص کا کسی پر کئی سالوں سے قرض چلا آتا ہے، قرضخواہ پر اس کی زکوٰۃ فرض ہے یا نہیں؟ وصول ہونے پر گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ بھی اس پر فرض ہوگی یا کہ صرف آئندہ سالوں کی؟ براہ کرم قرض پر زکوٰۃ کے احکام بالتفصیل تحریر فرماکر ممنون فرمائیں۔ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملهم الصواب

اصطلاح شریعت میں قرض صرف اس مال کو کہا جاتا ہے جو بغرض واپسی کی شرط پر دیا گیا ہو، مگر عرف عام میں ہر واجب الذمہ رقم کو قرض کہہ دیا جاتا ہے، جو اصطلاح شریعت میں دَین کہلاتا ہے، صاحبین رحمہما اللہ تعالیٰ کے ہاں ہر قسم کے دین پر زکوٰۃ فرض ہے، مگر حضرت امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ دین کی تین قسمیں فرماتے ہیں:۔

① دین قوی: اس سے وہ رقم مراد ہے جو کسی کو نقد دی گئی ہو یا مال تجارت کے عوض میں واجب الاداء ہو یا ایسے مواشی کا عوض ہو جن پر زکوٰۃ فرض ہے، ایسے دین پر زکوٰۃ فرض ہو مگر زکوٰۃ کی ادائیگی جب فرض ہوگی کہ چالیس درہم (ایک درہم = ۳۰۶۲ گرام چاندی) کے برابر وصول ہو جائے، وقت وجوب دین سے سال پورا ہونے پر چالیس درہم میں ایک درہم زکوٰۃ واجب ہوگی۔

② دین متوسط: وہ دین جو مال کے عوض میں کسی پر واجب ہوا ہو، مگر یہ مال تجارت کا نہ ہو، اس پر وجوب زکوٰۃ سے متعلق امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ سے دو روایتیں ہیں، ایک یہ کہ دین قوی کی طرح اس پر بھی زکوٰۃ فرض ہے، مگر وجوب اداء کے لئے چالیس درہم کی بجائے دو سو درہم کی قید ہے، بقدر دو سو درہم وصول ہونے پر ان کی گزشتہ سالوں کی بھی زکوٰۃ ادا کرنا فرض ہے، دوسری روایت یہ ہے کہ دین متوسط پر زکوٰۃ فرض نہیں، بلکہ دو سو درہم وصول ہونے کے بعد سال پورا ہونے پر زکوٰۃ فرض ہوگی، گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ نہیں، یہ روایت راجح ہے۔

③ دین ضعیف: وہ دین جو مال کے عوض میں نہ ہو جیسے دین مہر، اس پر وصول سے قبل زکوٰۃ فرض نہیں، بعینہٖ وہی حکم ہے جو دین متوسط کی روایت ثانیہ میں گزرا۔

زمین اور مکان وغیرہ کی اجرت کا دین:

چونکہ مال کی منفعت بھی من وجہ مال ہے، اس لئے مکان، زمین اور دوسرے اموال کی اجرت کے دین سے متعلق امام رحمہ اللہ تعالیٰ سے تین روایتیں ہیں: ایک یہ کہ دین اجرت ضعیف ہے،

دوسری روایت دین متوسط کی ہے، تیسری روایت یہ ہے کہ مالِ تجارت کی اجرت دینِ قوی ہے، پس مالِ غیر تجارت کی اُجرت سے متعلق صرف دو روایتیں ہوئیں، ضعیف اور متوسط، ان دونوں میں سے کسی کی ترجیح منقول نہیں، مگر نتیجۃً کوئی فرق نہیں، اس لئے کہ قولِ راجح کے مطابق دینِ متوسط بھی دینِ ضعیف ہی کے حکم میں ہے، کما مر، مالِ تجارت کی اجرت کے متعلق روایاتِ ثلاثہ میں سے آخری دو روایتوں کی تصحیح میں اختلاف ہے، لہٰذا اس کو دینِ قوی قرار دینا احوط ہے اور متوسط شمار کرنا اوسع۔

ملازم کی تنخواہ کا دین:

دینِ اُجرت سے متعلق مذکورہ روایات مال کی اجرت کے بارے میں ہیں، ملازم مال نہیں، اس لئے تنخواہ کا دین مہر کی طرح دینِ ضعیف ہے۔

ورثہ میں ملنے والا دین:

اگر قرض خواہ کا انتقال ہو گیا، اور اس کا دین اس کے وارثوں کی طرف منتقل ہو گیا تو وارث کے حق میں یہ دین متوسط ہے، اگرچہ اصل میت کا دین قوی ہی کیوں نہ ہو۔

تنبیہ:

(1) وجوبِ ادا کے لئے دینِ قوی سے چالیس درہم اور دینِ متوسط و ضعیف سے دو سو درہم وصول ہونے کی شرط، نیز دینِ قوی میں وقتِ وجوبِ دین سے اور دینِ متوسط و ضعیف میں بعد القبض حولانِ حول کی شرط اس صورت میں ہے کہ اس کے پاس دین کے سوا اور کوئی مالِ زکوٰۃ نہ ہو، اگر مالِ زکوٰۃ میں سے کوئی اور چیز بھی موجود ہے جیسا کہ عموماً ہوتا ہی ہے تو اس میں یہ تفصیل ہے کہ اگر اس کے پاس دین کے سوا مالِ زکوٰۃ بقدرِ نصاب موجود ہے، تو ہر قسم کے دین سے قلیل یا کثیر جو کچھ بھی وصول ہو گا، اس سابق نصاب کے ساتھ شامل ہو جائے گا، اور اسی کے ساتھ اس وصول شدہ دین کی زکوٰۃ بھی واجب الاداء ہو گی، اور اگر مالِ زکوٰۃ بقدرِ نصاب نہیں مگر دینِ قوی کے ساتھ مل کر نصاب کامل ہو جاتا ہے تو دینِ قوی جب اتنی مقدار وصول ہو جائے کہ پہلے سے موجود مالِ زکوٰۃ سے مل کر چالیس درہم کے برابر ہو جائے تو زکوٰۃ میں ایک درہم کی ادائیگی واجب ہو گی، اور جب سے نصاب کامل ہوا ہے اس وقت سے سال کی ابتداء شمار ہو گی، اور دینِ متوسط و دینِ ضعیف میں سے جب اتنی مقدار وصول ہو جائے کہ پہلے سے موجود مالِ زکوٰۃ سے مل کر دو سو درہم کے برابر ہو جائے اُس وقت سے

صاحبِ نصاب شمار ہوگا، اس کے بعد سال پورا ہونے پر زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہے۔

(۲) دَین قوی میں چالیس درہم کی قید اس پر مبنی ہے کہ ایک نصاب کامل ہونے کے بعد زائد مال جب تک چالیس درہم کی قیمت کے برابر نہیں ہوتا اس پر امام رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں زکوٰۃ فرض نہیں، اس لئے کہ چالیس درہم سے کمی کی صورت میں درہم کی کسر سے زکوٰۃ ادا کرنے میں حرج ہے، صاحبین رحمہما اللہ تعالیٰ کے ہاں نصاب کے بعد قلیل وکثیر سب میں زکوٰۃ ہے۔ (رد المحتار ص ۹ ج ۲، بدائع ص ۱۰ ج ۲، البحر الرائق مع الحاشیۃ منحۃ الخالق ص ۲۰۸ ج ۲، مبسوط ص ۱۹۶ ج ۲) آجکل چالیس درہم سے کم مالیت کی زکوٰۃ ادا کرنے میں کوئی مشکل نہیں، بلکہ برعکس چالیس درہم کی مالیت کا اندازہ کرنے اور ہر دو سو درہم کی مالیت کے نصاب کا الگ حساب لگانے میں حرج ظاہر ہے، لہٰذا آجکل صاحبین رحمہما اللہ تعالیٰ کے قول کے مطابق عمل ہوگا، احتیاط بھی اسی میں ہے، اس لئے دَین قوی سے قلیل وکثیر جو کچھ بھی وصول ہو اس کی زکوٰۃ ادا کر دینا چاہئے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۲۳؍ محرم سنہ ۹۹ھ

جماعت اسلامی کو زکوٰۃ دینے سے ادا نہ ہوگی:

سوال: جماعت اسلامی گشتی شفاخانے کے ذریعہ جو مریضوں کو دوا دیتی ہے اور یہ ادویہ زکوٰۃ و چرم قربانی سے مہیا کی جاتی ہیں، اب سوال یہ ہے کہ ہر آدمی کے لئے ایسی دوا لے کر پینا جائز ہے یا نہیں؟ اور اگر کسی امیر نے تحمل کر لی تو زکوٰۃ دہندگان کی زکوٰۃ ادا ہوگی یا نہیں؟ اور ہر آدمی سے یہ دس پیسے وصول کرتے ہیں اور دوا زیادہ قیمت کی ہے، شرعاً کیا حکم ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

جماعت اسلامی کو زکوٰۃ دینے سے شرعاً زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی، اس لئے کہ وہ اسے شرعی مصرف میں خرچ نہیں کرتی، یہی حکم صدقۃ الفطر اور چرم قربانی کا ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۱۸؍ ربیع الاول سنہ ۹۸ھ

بنام قرض زکوٰۃ دی تو ادا ہوگئی:

سوال: زید نے بکر کو سو روپے زکوٰۃ کی نیت سے دے دیئے، اور زکوٰۃ کا نام نہ لیا، اور کہا کہ ان روپوں سے اپنا کام کر لے، جب تیرے پاس ہوں دے دینا، زکوٰۃ کا نام بالکل نہ لیا کہ

بکر زکوٰۃ لینے کو معیوب جانتا تھا اب سال دو سال کے بعد بکر نے زید کو سو روپے واپس دیئے تو زید اُن روپوں کو دوسرے مسکین کو دیدے یا کیا کرے؟ اور شرعاً اس طرح زکوٰۃ دینا جائز ہوگا یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

یہ زکوٰۃ ادا ہوگئی تھی اس لئے واپس لینا جائز نہیں، بکر کو واپس دینا لازم ہے، اگر زکوٰۃ کا اظہار مناسب نہ ہو تو بکر پر یوں ظاہر کرے کہ میں نے قرض معاف کر دیا ہے، یا ہدیہ کے نام سے دیدے، قال ابن عابدین رحمہ اللہ تعالیٰ فلو سماها هبة او قرضا تجزیه فی الاصح (ردالمحتار ص ۱۰ ج ۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۳ رجب سنہ ۸۹ھ

حج کے لئے جمع کرائی ہوئی رقم پر زکوٰۃ کا حکم:

سوال: ایک شخص ہر سال یکم رمضان میں زکوٰۃ نکالتا ہے، اس سال اس کی حج پر جانے کی نیت ہے، لہٰذا حج پر جانے کے لئے پیشگی رقم تین ہزار چھ سو چالیس روپے، جمع کرائے، اب اس کی روانگی شعبان میں متوقع ہے، لہٰذا جو رقم جمع کی گئی اس کی زکوٰۃ نکالنی ہوگی یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

آمد و رفت کے کرایہ اور معلم وغیرہ کی فیس کے لئے جو رقم دی گئی ہے اس پر زکوٰۃ نہیں، اس سے زائد رقم جو کسی کی صورت میں اس کو واپس ملے گی اس میں سے یکم رمضان تک جتنی رقم بچے گی اس پر زکوٰۃ فرض ہے، جو خرچ ہوگئی اس پر نہیں، قال فی الشامیة اذا امسکه لینفق منه کل ما یحتاجه فحال الحول وقد بقی معه منه نصاب فانه یزکی ذلك الباقی وان کان قصده الانفاق منه ایضا فی المستقبل لعدم استحقاق صرفه الی حوائجه الاصلیة وقت حولان الحول (ردالمحتار ص ۶ ج ۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

غرۂ شعبان سنہ ۹۳ھ

گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ ادا کرنے کا طریقہ:

سوال: ایک شخص نے دو تین سال کی زکوٰۃ ادا نہیں کی اب وہ دوسرے اور تیسرے سال کی زکوٰۃ ادا کرتے وقت کل سرمایہ کی زکوٰۃ ادا کرے گا یا گذشتہ پہلے سال کی زکوٰۃ نکالنے کے

بعد بقایا کی زکوٰۃ ادا کرے گا؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

پہلی زکوٰۃ شمار کرنے کے بعد جو رقم بچی دوسرے سال اس کی زکوٰۃ ادا کرے، پھر اس کے بعد جو رقم باقی ہے تیسرے سال اس کی زکوٰۃ دے۔ قال فی التنویر وسببه ملک نصاب حولی تام فارغ عن دین له مطالب من جهة العباد، وقال فی الشرح سواء کان لله کزکوٰۃ وخراج. وفی الشامیة (قوله کزکوٰۃ) فلو کان له نصاب حال علیه حولان ولم یزکه فیهما لا زکوٰۃ علیه فی الحول الثانی (رد المحتار ص ۲۰۳ ج ۲) وفی البدائع اذا کانت لرجل مائتا درهم او عشرون مثقال ذهب فلم یؤد زکوته سنتین یزکی السنة الاولی ولیس علیه للسنة الثانیة شیء عند اصحابنا الثلاثة رحمهم الله تعالی وعند زفر یؤدی زکوٰۃ سنتین (بدائع الصنائع ص ۷ ج ۲) فقط والله تعالی اعلم۔

۱۳ جمادی الاولی سنہ [illegible]

زکوٰۃ کی رقم الگ کرکے فوت ہو گیا:

سوال: زکوٰۃ کی نیت سے زکوٰۃ کی رقم الگ کر لی یا وکیل کو دیدی، اس حالت میں ادائیگی سے قبل انتقال ہو گیا تو اس رقم کا کیا حکم ہے؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

اگر میت نے اس کی وصیت بھی کی ہو تو یہ رقم زکوٰۃ میں دی جائے گی، بشرطیکہ کل ترکہ کی ایک تہائی سے زائد نہ ہو، اور اگر وصیت نہیں کی تو ترکہ میں شمار کرکے وارثوں میں تقسیم ہوگی۔ قال فی العلائیة ولا یخرج عن العهدة بالعزل بل بالاداء للفقراء، وفی الشامیة فلو ضاعت لا تسقط عنه الزکوٰۃ ولو مات کانت میراثا عنه بخلاف ما اذا ضاعت فی ید الساعی لان یده کید الفقراء [illegible] عن المحیط (رد المحتار ص ۱۲ ج ۲) وکیل زکوٰۃ کا قبضہ قائم مقام نہیں اور موت مزکی سے یہ معزول ہو گیا ہے، اس لئے اس کو یہ رقم زکوٰۃ میں صرف کرنے کا اختیار نہیں۔ فقط واللہ تعالی اعلم۔

۱۳ ذی الحجہ سنہ ۹۵ھ

قرض وصول ہونے کی امید نہ ہو تو اس پر زکوٰۃ نہیں:

سوال: زید کا لوگوں پر قرض ہے، تقریباً تین سال سے مقروض لوگ صرف وعدہ کرتے ہیں کہ یہ قرض ادا کریں گے، لیکن اب تک کسی نے کچھ بھی ادا نہیں کیا، اس قرض پر

کوئی گواہ نہیں، اور قرضداروں کی ظاہری حالت سے معلوم ہوتا ہے کہ قرض واپس نہیں کریں گے ایسی صورت میں اس رقم کی زکوٰۃ زید پر واجب ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

جو قرض وصول ہونے کی امید نہ ہو اس پر زکوٰۃ فرض نہیں، فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۵ ذی الحجہ سنہ ۹۶ھ

رقم منذور پر زکوٰۃ فرض ہے:

سوال: ایک شخص نے کسی آمدنی کا تیسرا حصہ اللہ کے نام مان لیا جب کوئی شخص قابل رحم نظر آیا تو اس کی مدد کی کیا اس رقم پر زکوٰۃ ہوگی جو اس نے غریبوں کے لئے یا اللہ کے نام رکھی ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

اگر زبان سے نذر و منت کا لفظ کہا ہو تو یہ نذر واجب ہوگئی، اس کا حکم یہ ہے کہ اس پر زکوٰۃ فرض ہے، مگر الگ سے ادا کرنا ضروری نہیں، بلکہ اسی رقم کا چالیسواں حصہ بہ نیت زکوٰۃ لے سکتا ہے، باقی بہ نیت نذر صدقہ کرے، بقدر زکوٰۃ کی نذر ساقط ہو جائے گی، اگر یہ کل رقم بدون نیت زکوٰۃ مساکین کو دیدی تو بھی اس میں سے چالیسواں حصہ زکوٰۃ میں گیا اور باقی نذر میں، یہ حکم اس صورت میں ہے کہ نذر کی رقم الگ متعین ہو، ورنہ مطلق رقم کی نذر میں یہ ساری رقم بوجہ نذر واجب التصدق ہوگی، اور اس کی زکوٰۃ الگ فرض ہوگی، اگر بدون نیت زکوٰۃ کل رقم صدقہ کردی، تو بھی زکوٰۃ ادا ہوگئی، مگر بقدر زکوٰۃ مزید بوجہ نذر صدقہ واجب ہوگا، کذا فی الشامیۃ، فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۲۳ ربیع الاول سنہ ۹۸ھ

بکری کے بچوں پر زکوٰۃ کا حکم:

سوال: بکریوں کی زکوٰۃ کے نصاب میں بکریوں کے بچے بھی شمار ہوں گے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

اگر صرف بچے ہیں تو ان پر زکوٰۃ نہیں، اور اگر ان کے ساتھ کوئی ایک سال کی یا اس سے بڑی بکری بھی ہے تو اس کے ساتھ مل کر نصاب میں بچوں کا اعتبار ہوگا، اور مجموعہ چالیس پر ایک بڑی بکری فرض ہوگی، فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۶ جمادی الاولیٰ سنہ ۹۸ھ

کوئی چیز بہ نیت تجارت خریدی پھر نیت بدل گئی پھر دوبارہ نیت کرلی تو اس پر زکوٰۃ نہیں :

سوال : زید نے تجارت کرنے کی غرض سے کوئی چیز خریدی درمیان میں ارادہ ترک کردیا اس کے بعد پھر تجارت کی نیت کی تو آیا اس پر زکوٰۃ ہوگی یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

اس چیز پر زکوٰۃ نہیں، قال فی شرح التنویر لا یبقی للتجارۃ ما ای عبد مثلا اشتراہ لہا فنوی بعد ذلک خدمتہ ثم ما نواہ للخدمۃ لا یصیر للتجارۃ وان نواہ لہا ما لم یبعہ بجنس ما فیہ الزکوٰۃ والفرق ان التجارۃ عمل فلا تتم بمجرد النیۃ (رد المحتار ص ۱۲ ج ۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۸ محرم سنہ ۹۱ھ

نابالغ کے مال میں زکوٰۃ نہیں :

سوال : نابالغ کے مال میں زکوٰۃ فرض ہے یا نہیں؟ اگر زکوٰۃ فرض نہیں تو اس حدیث کا کیا جواب ہوگا؟ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم خطب الناس فقال الا من ولی یتیما لہ مال فلیتجر فیہ ولا یترکہ حتی تاکلہ الصدقۃ (ترمذی ص ۱۱۴) صدقہ سے کیا مراد ہے؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

نابالغ کے مال میں زکوٰۃ فرض نہیں کیونکہ مکلف نہیں، عن عائشۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہا عن النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم قال رفع القلم عن ثلاثۃ عن النائم حتی یستیقظ وعن الصبی حتی یحتلم وعن المجنون حتی یعقل اخرجہ ابوداؤد والنسائی وابن ماجۃ ورواہ الحاکم فی المستدرک وقال علی شرط مسلم، علاوہ ازیں الزاین عباس وابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے تصریح ہے کہ مال صبی میں زکوٰۃ نہیں۔

حدیث حتی تاکلہ الصدقۃ کے دو جواب ہیں :

① اس حدیث کی سند میں مثنی ابن صباح راوی ضعیف ہے۔

② حدیث میں صدقہ سے انفاق علی النفس مراد ہے جیسا کہ دیگر روایات سے یہ ثابت ہے کما روی احمد بسند جید عن المقدام بن معدی کرب رضی اللہ تعالیٰ عنہ مرفوعا ما اطعمت نفسک فہو لک صدقۃ وروی مثلہ عن ابی امامۃ وجابر

رضی اللہ تعالیٰ عنہما مرفوعاً، اسی طرح ایک واضح دلیل یہ بھی ہے کہ ملک کا استعمال صرف نقدین ہی سے ہوسکتا ہے زکوٰۃ سے استعمال نہیں ہوسکتا، فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲ جمادی الآخرہ سنہ ۹۱ھ

مال زکوٰۃ میں اس مقام کی قیمت معتبر ہوگی جہاں مال ہے:

سوال: ادائیگی زکوٰۃ میں مال زکوٰۃ کی قیمت جہاں مزکی ہے وہاں کی معتبر ہوگی یا جہاں مال موجود ہو؟ اسی طرح حولان حول کے متعلق بھی وضاحت فرمائیں۔ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

جہاں مال موجود ہو وہاں کی قیمت معتبر ہوگی، قال فی شرح التنویر ویقوم فی البلد الذی المال فیہ ولو فی مفازۃ ففی اقرب الامصار الیہ فتح، وفی الشامیۃ فلو بعث عبد للتجارۃ فی بلد آخر یقوم فی البلد الذی فیہ العبد، بحر (قولہ ففی اقرب الامصار الیہ) ای الی المفازۃ وذکر الضمیر باعتبار الموضع وعبارۃ الفتح الی ذلک الموضع، قال فی البحر فی الباب الآتی وهذا اولیٰ مما فی التبیین من انہ اذا کان فی المفازۃ یقوم فی المصر الذی یصیر الیہ (رد المحتار ص ۲۴ ج ۲ باب زکوٰۃ الغنم)

حولان حول سے متعلق کوئی خاص جزئیہ نہیں ملا، رد المحتار کی عبارت ذیل سے ایک گونہ معلوم ہوا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حولان حول بھی وہاں کا معتبر ہوگا جہاں مال موجود ہو۔ (قولہ وکرہ نقلہا) ای من بلد الی بلد آخر (الی قولہ) ویعتبر فی الزکوٰۃ مکان المال فی الروایات کلها واختلف فی صدقۃ الفطر کما یأتی (رد المحتار ص ۹۴ ج ۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۱۲ صفر سنہ ۹۲ھ

سونے کی زکوٰۃ میں وقت وجوب کی قیمت معتبر ہے:

سوال: سونے کی زکوٰۃ میں کس وقت کی قیمت معتبر ہوگی؟ آیا وقت وجوب کی قیمت معتبر ہے یا وقت ادا کی؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

سونے چاندی کی زکوٰۃ اور عشر میں وقت وجوب کی قیمت معتبر ہے، البتہ زکوٰۃ سوائم میں وقت ادا کی قیمت کا اعتبار ہے، قال فی التنویر وجاز دفع القیمۃ فی زکوٰۃ وعشر وخراج وفطرۃ ونذر وکفارۃ غیر الاعتاق، وفی الشرح وتعتبر القیمۃ یوم الوجوب وقالا

یوم الاداء وفی السوائم یوم الاداء اجماعا وہو الاصح (رد المحتار ص ۲۲ ج ۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲۰ صفر سنہ ۱۳۹۱ھ

ادائے عشر کے باوجود زمین کی پیداوار سے حاصل کردہ نقدی پر زکوٰۃ فرض ہے:

سوال: ایک زمیندار اپنی سو من گندم سے عشر ادا کر دیتا ہے اور پھر بھی گندم کو فروخت کرکے رقم بنا لیتا ہے تو حولانِ حول میں دیگر سرمایہ کے ساتھ کیا گندم سے بنائی ہوئی رقم پر بھی زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟ اگر واجب ہو تو یہ دوہرا حق نہ بنے گا؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

زکوٰۃ فرض ہوگی، تبدیلِ جنس کی وجہ سے جدید حکم ہوا۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۱۰ ذیقعدہ سنہ ۱۳۹۱ھ

جن رشتہ داروں کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں:

سوال: زید نے اپنی لڑکی فاطمہ کو جائداد میں سے کوئی حصہ نہیں دیا، اس حال میں کہ اس کی شادی بھی کرادی، اب فاطمہ کی اولاد بھی ہو گئی ہے، آیا زید فاطمہ یا اس کی اولاد کو زکوٰۃ دے سکتا ہے یا نہیں؟ یا یوں فرض کرلیں کہ زید کا انتقال ہو گیا ہے، اس کے بیٹے عمرو، بکر موجود ہیں، اور بہن کا حق میراث انھوں نے بھی ادا نہیں کیا ہے، تو یہ بھی اپنی بہن مسماۃ فاطمہ یا اس کی اولاد کو زکوٰۃ دے سکتے ہیں یا نہیں؟ کن رشتہ داروں پر زکوٰۃ لگ سکتی ہے؟ تفصیل تحریر فرمائیں، بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

باپ اپنی بیٹی اور اس کی اولاد کو زکوٰۃ نہیں دے سکتا، بھائی اپنی بہن اور اس کی اولاد کو زکوٰۃ دے سکتے ہیں، زکوٰۃ سے وراثت کا کوئی تعلق نہیں، حق وراثت دیا ہو یا نہ دیا ہو، بہر صورت زکوٰۃ کا وہی حکم ہے جو بیان ہوا۔

مندرجہ ذیل رشتہ داروں کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں:

① اصول: یعنی جن سے پیدا ہوا ہے، ماں، باپ، دادا، دادی، نانا، نانی وغیرہ۔

② فروع: یعنی اولاد، بیٹا، بیٹی، پوتا، پوتی، نواسہ، نواسی وغیرہ۔

③ میاں بیوی ایک دوسرے کو زکوٰۃ نہیں دے سکتے، طلاق کے بعد بھی جب تک عدت نہیں گزر جاتی زکوٰۃ دینا جائز نہیں، قال فی التنویر ولا من بینہما ولاد او زوجیۃ ولو الشرح

ولو مبانۃ وفی العاشیۃ ای فی العدۃ ولو بثلاث نعوص معراج الدرایۃ (رد المحتار ص)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲۳ ربیع الآخر [illegible]ھ

زیور کی زکوٰۃ سے متعلق چند سوالات:

سوال: زیورات کی زکوٰۃ کے بارے میں کچھ سوالات ارسال خدمت ہیں، مفصل جواب سے نوازیں:

① مختلف اوقات میں مختلف زیور خریدے گئے اُن پر زکوٰۃ کب فرض ہوگی؟

② زیورات کی خریدکی قیمت پر لگانا ہے یا موجودہ قیمت پر؟

③ زیورات کی قیمت میں موتیوں اور نگینوں کی قیمت اور بنوائی کی اُجرت بھی لگائی جائے گی یا صرف سونے کی قیمت لگائیں گے؟

④ زیور میں سونے کے علاوہ ملاوٹ بھی ہوتی ہے، کیا اس کی زکوٰۃ بھی فرض ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

① آپ کے پاس جس روز اتنا مال ہوگیا کہ سونا، چاندی، مال تجارت اور نقدی، ان چاروں یا بعض کا مجموعہ یا ان میں سے کوئی ایک چیز ۶۱۲٫۳۵ گرام چاندی کی قیمت کے برابر ہوگئی، اُس روز آپ صاحب نصاب ہوگئے اُس دن کی قمری تاریخ یاد رکھیں، ایک سال کے بعد جب بھی قمری تاریخ آئے گی اس میں آپ کے پاس مذکورہ چاروں چیزوں میں سے جو مقدار موجود ہوگی اس پر زکوٰۃ فرض ہوگی، اگرچہ کوئی چیز تاریخ مذکور سے صرف ایک ہی روز پہلے آپ کی ملک میں آئی ہو، بشرطیکہ اس تاریخ میں نصاب پورا ہو یعنی چاروں چیزوں کا مجموعہ ۶۱۲٫۳۵ گرام چاندی کی قیمت سے کم نہ ہو۔

② جس قمری تاریخ میں سال پورا ہوا اس میں جو نرخ ہوگا وہ لگایا جائے گا۔

③ صرف سونے کی قیمت پر زکوٰۃ ہے، موتیوں اور نگینوں کی قیمت اور زیور بنوانے کی اجرت نہیں لگائی جائے گی۔

④ زیور بنانے میں جس حساب سے ملاوٹ شامل کی گئی اس قسم کے مخلوط قرالی سونے کی قیمت لگائی جائے گی۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۲ رمضان المبارک [illegible]ھ

گائے بھینس کی زکوٰۃ کا نصاب:

سوال: زید کے پاس پینتیس۳۵ بھینسیں ہیں، دودھ نہیں دیتیں، ان کا بچہ نہیں، مگر زمینداروں کے پاس ہیں، کسی کے پاس چار بھینسیں، کسی کے پاس دو، کسی کے پاس آٹھ، اس طرح کل ملا کر پینتیس ہو گئیں، اور یہ جنگل میں اپنے منہ سے چر کر اکتفاء کرتی ہیں، اور کسی کا پالا ہوا کسی پر نہیں، اور جب یہ بچہ دینے کے قریب ہو جاتی ہیں تو ان کو لے کر آتے ہیں، ان کو ان کی محنت دینی پڑتی ہے، یعنی غلہ جو کچھ طے ہو جائے، تو شرعاً ان پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟ اگر واجب ہے تو کتنی؟ اور اس سے زیادہ ہو جائیں تو زکوٰۃ کا کیا حساب ہوگا؟ اور گائے کی زکوٰۃ کا کیا حساب ہے؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

اگر ان میں سے تیس بھینسوں پر پورا سال گزر گیا تو ان پر زکوٰۃ واجب ہوگی، تیس بھینسوں پر ایک سال کی بھینس یا بھینسا، پھر چالیس پر دو سالہ، پھر ساٹھ پر دو عدد یک سالہ، پھر ستر پر ایک یک سالہ اور ایک دو سالہ، اسی طرح ہر تیس پر ایک یکسالہ اور ہر چالیس پر ایک دو سالہ واجب ہے، اور جو عدد تیس اور چالیس دونوں پر تقسیم ہو جائے اس میں اختیار ہے کہ تیس کے حساب سے زکوٰۃ دے یا چالیس کے حساب سے، مثلاً ایک سو بیس پر چاہے چار یکسالہ دے یا تین دو سالہ۔ گائے کی زکوٰۃ میں بھی یہی تفصیل ہے، قال فی التنویر وشرحہ نصاب البقر والجاموس ثلاثون سائمۃ غیر مشترکۃ وفیہا تبیع ذو سنۃ کاملۃ او تبیعۃ وفی اربعین مسن ذو سنتین او مسنۃ وفیما زاد علی الاربعین بحسابہ فی ظاہر الروایۃ عن الامام رحمہ اللہ تعالیٰ وعنہ لا شیء فیما زاد الی ستین ففیہا ضعف ما فی ثلاثین وہو قولہما والثلاثۃ رحمہم اللہ تعالیٰ وعلیہ الفتویٰ بحر عن الینابیع وتصحیح القدوری ثم فی کل ثلاثین تبیع وفی کل اربعین مسنۃ الا اذا تداخلا کمائۃ وعشرین فیخیر بین اربع اتبعۃ وثلاث مسنات وہکذا (رد المحتار ص ۲۰ ج ۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲۵ رشوال ۸۲ھ

بکریوں کی زکوٰۃ کا نصاب:

سوال: جو بکریاں باہر چرتی ہیں اور تجارت کے لئے نہیں، ان کی زکوٰۃ کا کیا حساب ہے؟ کتنی بکریوں پر ایک بکری واجب ہے؟ بکری اور بھیڑ کا حکم ایک ہے یا دونوں میں فرق ہے؟

تفصیل سے تحریر فرمائیں، بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملهم الصواب

چالیس بکریوں پر ایک سال کی ایک بکری یا بکرا واجب ہے، چالیس سے ایک سو بیس تک یہی واجب ہے، پھر ایک سو اکیس سے دو سو تک دو بکریاں، پھر دو سو ایک سے تین سو ننانوے تک تین بکریاں، پھر چار سو پر چار بکریاں، اس کے بعد ہر سو پر ایک بکری واجب ہے، بھیڑوں کا بھی یہی حکم ہے، بھیڑ اور بکری مخلوط ہوں تو بھی یہی نصاب ہے، البتہ زکوٰۃ کی ادائیگی میں یہ فرق ہے کہ بھیڑ اور بکری میں سے جو زیادہ ہوں زکوٰۃ میں وہی جانور دیا جائے، اور اگر دونوں برابر ہوں تو اختیار ہے کہ اعلیٰ قسم سے ادنیٰ قیمت کا جانور دے یا ادنیٰ قسم سے اعلیٰ قیمت کا دے، قال فی التنویر نصاب الغنم ضأنا او معزا اربعون وفیہا شاۃ وفی مائۃ واحدی وعشرین شاتان وفی مائتین وواحدۃ ثلاث شیاہ وفی اربعمائۃ اربع شیاہ ثم فی کل مائۃ شاۃ ویؤخذ فی زکوتہا الثنی وہو ما تمت لہ سنۃ، وقال ابن عابدین رحمہ اللہ تعالیٰ (قولہ لا فی اداء الواجب) لان النصاب اذا کان ضأنا یؤخذ الواجب من الضأن ولو معزا فمن المعز ولو منہما فمن الغالب ولو سواء فمن ایہما شاء جوہرۃ ای فیعطی ادنی الاعلی او اعلی الادنی کما فی ملتقی الباب السابق (رد المحتار ج۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۲۵ شوال سنہ

اونٹوں کی زکوٰۃ کا نصاب:

سوال: زکوٰۃ میں اونٹوں کا نصاب اور ان پر زکوٰۃ کا حساب بہت مشکل ہے، آپ ایسے واضح طریقہ سے تحریر فرمائیں کہ بسہولت سمجھ میں آجائے، بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملهم الصواب

ایک اونٹ سے چار اونٹوں تک معاف ہے، ان پر زکوٰۃ نہیں، اس کے بعد بحساب ذیل زکوٰۃ فرض ہے:-

۵ سے	۹	تک	یکسالہ ایک بکری یا بکرا،
۱۰ سے	۱۴	تک	دو بکریاں یا بکرے،
۱۵ سے	۱۹	تک	تین بکریاں یا بکرے،
۲۰ سے	۲۴	تک	چار بکریاں یا بکرے،

۲۵ سے ۳۵ تک یکسالہ اونٹنی (بنت مخاض)
۳۶ سے ۴۵ تک دو سالہ اونٹنی (بنت لبون)
۴۶ سے ۶۰ تک سہ سالہ اونٹنی (حقہ)
۶۱ سے ۷۵ تک چار سالہ اونٹنی (جذعہ)
۷۶ سے ۹۰ تک دو سالہ دو اونٹنیں
۹۱ سے ۱۲۴ تک سہ سالہ دو اونٹنیاں
۱۲۵ سے ۱۲۹ تک سہ سالہ دو اونٹنیاں اور ایک بکری
۱۳۰ سے ۱۳۴ تک سہ سالہ دو اونٹنیاں اور دو بکریاں
۱۳۵ سے ۱۳۹ تک سہ سالہ دو اونٹنیاں اور تین بکریاں
۱۴۰ سے ۱۴۴ تک سہ سالہ دو اونٹنیاں اور چار بکریاں
۱۴۵ سے ۱۴۹ تک سہ سالہ دو اونٹنیاں اور یکسالہ ایک اونٹنی
۱۵۰ سے ۱۵۴ تک سہ سالہ تین اونٹنیاں
۱۵۵ سے ۱۵۹ تک سہ سالہ تین اونٹنیاں اور ایک بکری
۱۶۰ سے ۱۶۴ تک سہ سالہ تین اونٹنیاں اور دو بکریاں
۱۶۵ سے ۱۶۹ تک سہ سالہ تین اونٹنیاں اور تین بکریاں
۱۷۰ سے ۱۷۴ تک سہ سالہ تین اونٹنیاں اور چار بکریاں
۱۷۵ سے ۱۸۵ تک سہ سالہ تین اونٹنیاں اور یکسالہ ایک اونٹنی
۱۸۶ سے ۱۹۵ تک سہ سالہ تین اونٹنیاں اور دو سالہ ایک اونٹنی
۱۹۶ سے ۲۰۴ تک سہ سالہ چار اونٹنیاں یا دو سالہ پانچ اونٹنیاں
۲۰۵ سے ۲۰۹ تک سہ سالہ چار اونٹنیاں اور ایک بکری
۲۱۰ سے ۲۱۴ تک سہ سالہ چار اونٹنیاں اور دو بکریاں
۲۱۵ سے ۲۱۹ تک سہ سالہ چار اونٹنیاں اور تین بکریاں
۲۲۰ سے ۲۲۴ تک سہ سالہ چار اونٹنیاں اور چار بکریاں
۲۲۵ سے ۲۳۵ تک سہ سالہ چار اونٹنیاں اور یکسالہ ایک اونٹنی
۲۳۰ سے ۲۴۵ تک سہ سالہ چار اونٹنیاں اور دو سالہ ایک اونٹنی

۲۴۶	سے	۲۵۴	تک	سہ سالہ پانچ اونٹنیاں
۲۵۵	سے	۲۵۹	تک	سہ سالہ پانچ اونٹنیاں اور ایک بکری
۲۶۰	سے	۲۶۴	تک	سہ سالہ پانچ اونٹنیاں اور دو بکریاں
۲۶۵	سے	۲۶۹	تک	سہ سالہ پانچ اونٹنیاں اور تین بکریاں
۲۷۰	سے	۲۷۴	تک	سہ سالہ پانچ اونٹنیاں اور چار بکریاں
۲۷۵	سے	۲۸۵	تک	سہ سالہ پانچ اونٹنیاں اور یکسالہ ایک اونٹنی
۲۸۶	سے	۲۹۵	تک	سہ سالہ پانچ اونٹنیاں اور دو سالہ ایک اونٹنی
۲۹۶	سے	۳۰۴	تک	سہ سالہ چھ اونٹنیاں

اس نقشہ میں ۱۵۰ سے آخر تک دیئے گئے اعداد سے ایک کلیہ حاصل ہوا، اس کے مطابق جہاں تک چاہیں ہزاروں لاکھوں اونٹوں کی زکوٰۃ کا حساب لگا سکتے ہیں، اس کلیہ کا حاصل یہ ہے کہ ۱۵۰ کے بعد ہر پانچ اونٹوں پر ایک بکری، پھر ۲۵ سے ۳۵ تک یکسالہ اونٹنی، پھر ۳۶ سے ۴۵ تک دو سالہ اونٹنی، پھر ۴۶ سے ۵۰ تک سالہ اونٹنی، اس کے بعد پھر نئے سرے سے ہر پانچ پر ایک بکری، ۲۵ پر یکسالہ اونٹنی، ۳۶ پر دو سالہ، ۴۶ سے ۵۰ تک سالہ،

ہدایات:

(۱) جہاں بکری واجب ہے اس میں ایک سال کی عمر لازم ہے، اور مذکر و مؤنث میں اختیار ہے، چاہے بکری دے یا بکرا دے، مگر اونٹنی مؤنث ہی دینا لازم ہے، اونٹ دینا جائز نہیں، البتہ اونٹنی کی قیمت لگا کر اس قیمت کے برابر یا اس سے زائد قیمت کا اونٹ دینا جائز ہے،

(۲) جہاں سالہ چار اونٹنیاں واجب ہیں وہاں اختیار ہے کہ اُن کی بجائے دو سالہ پانچ اونٹنیاں دیدے،

(۳) زکوٰۃ کا حساب مذکور اس صورت میں ہے کہ اونٹ تجارت کے لئے نہ ہوں اور ان کا غالب چارہ باہر چرنا ہو، گھر میں چارہ نہ دیا جاتا ہو یا باہر چرنے کی بنسبت گھر کا چارہ کم ہو، اگر گھر کا چارہ زیادہ ہو یا دونوں برابر ہوں تو زکوٰۃ نہیں،

(۴) اگر اونٹ تجارت کے لئے ہوں تو اُن پر حساب مذکور کے مطابق بکری یا اونٹنی واجب نہیں بلکہ دوسرے اموالِ تجارت کی طرح اُن کی قیمت پر زکوٰۃ فرض ہوگی خواہ باہر چرتے ہوں یا گھر میں چارہ دیا جاتا ہو، تجارت کے لئے ہونے کا مطلب یہ ہے کہ خریدتے وقت اُن کو فروخت کرنے کی

نیت ہو، اگر خریدنے کے بعد بیچنے کی نیت کی، یا اصل کو برقرار رکھتے ہوئے ان کی نسل کو بیچنے کی نیت ہو خواہ اصل کو خریدتے وقت یہ نیت ہو یا بعد میں، ان سب صورتوں میں یہ مال تجارت نہیں۔

⑤ جو اونٹ سواری یا باربرداری کے لئے ہوں ان پر کسی قسم کی زکوٰۃ نہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۵ ذی الحجہ سنہ ۱۴۰۳ھ

گائے بھینس کا مجموعہ بقدر نصاب ہو جائے تو زکوٰۃ فرض ہے:

سوال: اگر کسی کے پاس کچھ گائے ہیں اور کچھ بھینسیں، دونوں میں سے کسی کا بھی نصاب کامل نہیں، البتہ دونوں کا مجموعہ بقدر نصاب ہے، یعنی گائے اور بھینس ملا کر تیس یا اس سے زیادہ ہیں تو اس پر زکوٰۃ فرض ہے یا نہیں؟ اگر فرض ہے تو زکوٰۃ میں گائے نکالنا فرض ہے یا بھینس؟ یا کہ اختیار ہے کہ خواہ گائے دیدے یا بھینس دیدے؟ اسی طرح بکری اور بھیڑ کا بھی ایک ہی حکم ہے یا الگ ہے؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

گائے اور بھینس زکوٰۃ اور اضحیہ کے احکام میں ایک ہی جنس ہے، لہٰذا دونوں کا مجموعہ تیس ہو جائے تو زکوٰۃ فرض ہے، دونوں میں سے جس کا عدد زیادہ ہو زکوٰۃ میں وہی دی جائے اور اگر عدد دونوں برابر ہوں تو دونوں میں سے اعلیٰ قسم سے ادنیٰ قیمت کا جانور یا ادنیٰ قسم سے اعلیٰ قیمت کا جانور دیا جائے، بکری اور بھیڑ کا بھی یہی حکم ہے، قال فی التنویر نصاب البقر والجاموس ثلاثون ہ قال ابن عابدین رحمہ اللہ تعالیٰ (قولہ والجاموس) ھو نوع من البقر کما فی المغرب فہو مثل البقر فی الزکوٰۃ والاضحیۃ والربا ویکمل بہ نصاب البقر وتوخذ الزکوٰۃ من اغلبہا وعند الاستواء یوخذ اعلی الادنی وادنی الاعلی نہر وعلی ھذا الحکم البخت والعراب والضأن والمعز ابن ملک (رد المحتار ص ۱۹ ج ۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۱۴ ذی الحجہ سنہ ۱۴۰۳ھ

جو مواشی جنگل اور گھر دونوں جگہ کھائیں ان کی زکوٰۃ کا حکم:

سوال: گائیں جنگل میں بھی چرتی ہیں اور گھر میں بھی چارہ دیا جاتا ہے، تو ان پر زکوٰۃ فرض ہے یا نہیں، جبکہ نصاب کامل ہے؟

بینوا توجروا

الجواب باسم ملهم الصواب

غالب خوراک کا اعتبار ہے، اگر جنگل میں چرنے کی خوراک غالب ہو تو زکوٰۃ فرض ہے اور اگر گھر کا چارہ غالب ہے یا دونوں برابر ہیں تو زکوٰۃ فرض نہیں، البتہ تجارت کے لئے ہوں تو مال تجارت کی زکوٰۃ فرض ہوگی، قال فی التنویر ہی المکتفیۃ بالرعی المباح فی اکثر العام لقصد الدر والنسل والزیادۃ والسمن فلو علفها نصفه لا تکون سائمة، وفی الشرح فلا زکوٰۃ فیها للشک فی الموجب، وفی الحاشیة بکسر الجیم وهو کونها سائمة فانه شرط لکونها سببا للوجوب قال فی فتح القدیر لان العلف الیسیر لا یزول به اسم السوم المستلزم للحکم واذا کان مقابله کثیرا بالنسبة کان هو الیسیر والنصف لیس بالنسبة الی النصف کثیرا ولانه یقع الشک فی ثبوت سبب الایجاب فافهم (رد المحتار ص ۱۱ ج ۲) وقال ابن عابدین رحمه الله تعالی فلو علوفة فلا زکوٰۃ فیها الا اذا کانت للتجارۃ فلا یعتبر فیها العدد بل القیمة (رد المحتار ص ۲۲ ج ۲) فقط والله تعالی اعلم

۱۳ ذی الحجہ سنہ ۸۲ھ

گھر میں چارہ کھانے والے مواشی پر زکوٰۃ نہیں:

سوال: میرے پاس چالیس گائیں ہیں جن کو گھر میں ہی چارہ دیا جاتا ہے، البتہ کبھی کبھار جنگل میں بھی چرنے جاتی ہیں، ان پر کتنی زکوٰۃ فرض ہے؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملهم الصواب

جو مواشی کا غالب چارہ گھر میں ہو یا باہر چرنا کم ہو ان پر زکوٰۃ نہیں، البتہ تجارت کی نیت سے خریدے ہوں تو ان کی قیمت پر زکوٰۃ فرض ہے۔ قال فی التنویر ہی المکتفیۃ بالرعی المباح فی اکثر العام (رد المحتار ص ۱۹ ج ۲) وفی باب زکوٰۃ البقر منه نصاب البقر والجاموس ثلاثون سائمة، وقال ابن عابدین رحمه الله تعالی فلو علوفة فلا زکوٰۃ فیها الا اذا کانت للتجارۃ فلا یعتبر فیه العدد بل القیمة (رد المحتار ص ۲۲ ج ۲) فقط والله تعالی اعلم

۱۳ ذی الحجہ سنہ ۸۲ھ

تجارتی مواشی کی زکوٰۃ:

سوال: ہم بکریوں کی تجارت کرتے ہیں، چالیس پچاس بکریاں موجود رہتی ہیں، مگر خرید و فروخت کی وجہ سے بدلتی رہتی ہیں، کوئی بکری پورا سال نہیں رہتی، یہ بکریاں جنگل میں چرتی ہیں،

ان پر زکوٰۃ ہے یا نہیں؟ اگر زکوٰۃ ہے تو کتنی بکریاں واجب ہیں؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

ان بکریوں پر زکوٰۃ میں بکری واجب نہیں، بلکہ دوسرے اموالِ تجارت کی طرح ان بکریوں کی قیمت لگا کر اس کا چالیسواں حصہ زکوٰۃ میں دیا جائے، قال فی التنویر فی باب السائمۃ ھی الراعیۃ المکتفیۃ بالرعی المباح فی اکثر العام بقصد الدر والنسل والزیادۃ والسمن۔ وفی الشرح عن البدائع لو اسامہا للحم فلا زکوٰۃ فیہا کما لو اسامہا للحمل والرکوب ولو للتجارۃ ففیہا زکوٰۃ التجارۃ (رد المحتار ص ۲۱ ج ۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۱۵ ذی الحجہ ۸۷ھ

دودھ بیچنے کی نیت سے پالی ہوئی بھینسوں پر زکوٰۃ نہیں:

سوال: زید نے دودھ فروخت کرنے کی نیت سے بھینسیں پال رکھی ہیں، ان کی تعداد مختلف اوقات میں بڑھتی رہتی ہے، لیکن کبھی بھی چالیس یا پچاس سے کم نہیں ہوتی، زید ان کا دو وقت کا کھانا پینا خود کرتا ہے، تمام خرچ خود اٹھاتا ہے، انہیں مفت کے جنگل میں چرنے نہیں بھیجتا، اس کے لئے زکوٰۃ ادا کرنے کا طریقہ کیا ہے؟ بھینس والے عموماً پڑھے لکھے نہیں ہوتے، ان کو عربی سمجھانا آسان نہیں ہے، آسان زبان میں جواب دیجئے گا، تاکہ ہم انہیں سمجھا سکیں، ہر سال بھینسوں میں ایک مخصوص قسم کی بیماری پھیلتی ہے، اور پورے علاقہ میں تباہی آتی ہے، ہزاروں بھینسیں مرجاتی ہیں، ان کا کوئی علاج کامیاب نہیں ہوتا، ایسا تو نہیں ہے کہ یہ وبا زکوٰۃ ادا نہ کرنے کی وجہ سے پھیلتی ہو؟ یہ طریقہ کار ان کا ایسا ہے کہ پیسہ دودھ بیچ کر ان کے پاس جمع نہیں ہوتا، جو پیسہ ملتا ہے اس کی اور بھینسیں خرید لاتے ہیں، ایک ایک بھینس والا کروڑوں کا مالک ہے، مگر اپنے آپ پر زکوٰۃ فرض نہیں سمجھتا۔ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

یہ بھینسیں جنگل میں نہیں چرتیں، بلکہ ان کو گھر میں خود کھلایا جاتا ہے، اس لئے ان پر زکوٰۃ فرض نہیں، البتہ اگر بھینسوں کی تجارت بھی مقصود ہو، یعنی بھینس خریدتے وقت اس کا دودھ بیچنے کے ساتھ خود بھینس بیچنے کی بھی نیت ہو تو ایسی بھینسوں کی قیمت پر زکوٰۃ فرض ہوگی۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۱۲ ربیع الآخر ۹۹ھ

بکریوں کی زکوٰۃ سے متعلق چند سوالات :

سوال : بکریوں کی زکوٰۃ کے بارے میں چند سوالات ارسال خدمت ہیں، مفصل جواب عنایت فرمائیں :

(۱) یہاں ایک آدمی کی میراث میں تقریباً اسی بکریاں تھیں، اور ان بکریوں کو بھی تمام ترکہ جمع کرکے اور تمام جائداد کی قیمت مع بکریوں کے لگا کر اس قیمت کو سات ورثہ پر تقسیم کیا، اب ان بکریوں میں زکوٰۃ ہوگی یا نہیں؟ جبکہ ان کی قیمت سات افراد ورثہ پر تقسیم کی گئی ہے، اور یہ بکریاں ایک کے حصہ میں شمار کی جائیں گی یا تمام ورثہ کے حصہ میں شمار کی جائیں گی؟

(۲) اور اگر زکوٰۃ ہے تو اس سال تو نہیں ہوگی؟ اس لئے کہ ابھی تو حولان حول نہیں ہوا ہے، اگرچہ میت کی ملک کے وقت سے ایک سال گزر گیا تھا۔

(۳) اگر یہ بکریاں تقسیم نہ کرتے بلکہ تمام ورثہ آپس میں مشترک ہی چھوڑ دیتے تو ان پر زکوٰۃ فرض ہوتی یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

(۱) جس نے بکریاں خریدی ہیں اس پر ان کی زکوٰۃ واجب ہوگی۔

(۲) وقت خرید سے حولان حول کے بعد زکوٰۃ ہوگی، البتہ اگر خریدار کے پاس پہلے سے بکریوں کا نصاب موجود ہے تو ان بکریوں کو سابق نصاب کے ساتھ شمار کرکے اس کے ساتھ ہی ان کی زکوٰۃ بھی واجب ہوگی۔

(۳) اس صورت میں ہر وارث کا حصہ نصاب سے کم رہتا اس لئے کسی پر بھی زکوٰۃ فرض نہ ہوتی، بکریوں کا نصاب چالیس ہے، قال ابن عابدین رحمہ اللہ تعالیٰ عن البحر تحت (قولہ وما بینہما عفو) ولو کان بین رجلین اربعون شاۃ لا تجب علی واحد منہما الزکوٰۃ ولیس للساعی ان یجمعہا ویجعلہا نصابا ویاخذ الزکوٰۃ منہا لان ملک کل واحد منہما قاصر عن النصاب اھ (رد المحتار ص ۲۲ ج ۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۱۳ رجب سنہ ۹۹ھ

سید اور ہاشمی کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں :

سوال : سید یا ہاشمی اگر انتہائی غربت کے عالم میں ہو تو اس کو زکوٰۃ دینے سے ہوجاتی ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

سید اور ہاشمی کو زکوٰۃ دینے سے زکوٰۃ ادا نہ ہوگی، کیا اہل محلہ میں اتنی مروت بھی نہیں کہ غیر زکوٰۃ سے ان کی حاجت پوری کردیں، اگر کسی کا والد انتہائی غربت کے عالم میں ہو تو کیا اس کو بھی غیر زکوٰۃ نہ دے گا؟ قال فی شرح التنویر (ولا الی بنی هاشم) الا من ابطل النص قرابته وهم بنو لهب فتحل لمن اسلم منهم كما تحل لبنی المطلب ثم ظاهر المذهب اطلاق المنع وقول العینی والهاشمی یجوز له دفع زکوته لمثله صوابه لا یجوز نهر الخ (رد المحتار ص ۶۷ ج ۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲۳ صفر سنہ ۹۱ھ

جس کی صرف ماں سیدہ ہو اس کو زکوٰۃ دینا جائز ہے:

سوال: اگر کسی شخص کی صرف ماں سیدہ ہو باپ سید نہ ہو تو اس کو زکوٰۃ دینا جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

جائز ہے، اس لئے کہ نسب والد کی طرف سے ہوتا ہے، جس کا والد سید نہ ہو وہ صرف والدہ کی وجہ سے سید نہیں ہوسکتا، قال ابن عابدین رحمہ اللہ تعالیٰ ان من كانت امها علویة مثلا وابوها عجمی یکون العجمی كفؤا لها وان كان لها شرف ما لان النسب للآباء ولهذا جاز دفع الزكوة الیها فلا یعتبر التفاوت بینهما من جهة شرف الام (رد المحتار باب الكفاءة ص ۳۲۶ ج ۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۲۳ صفر سنہ ۹۱ھ

جو ہاشمی شجرہ نہ رکھتا ہو اس کو بھی زکوٰۃ حرام ہے:

سوال: زید اپنے آباء واجداد سے یہی سنتا آیا ہے کہ ہمارا سلسلہ حضرت عباس بن عبد المطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملتا ہے، لیکن زید کے پاس کوئی شجرہ نسب نہیں ہے جس سے صحیح طور پر معلوم ہوسکے کہ ہم واقعی قریشی عباسی ہیں، تو اس صورت میں زید کو مال زکوٰۃ لینا جبکہ زید کے پاس کوئی مال زکوٰۃ کی چیز نہیں ہے درست ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

شہرت نسب کے لئے عام شہرت کافی ہے، شجرہ ہونا ضروری نہیں، لہٰذا زید کے لئے زکوٰۃ لینا حرام ہے، فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۱۵ ذی الحجہ سنہ ۹۰ھ

کسی کو زکوٰۃ دینے کے بعد معلوم ہوا کہ وہ مصرف نہ تھا:

سوال: زید ہاشمی ہے، اس کو کسی نے زکوٰۃ دیدی، تو اب زید کے لئے کیا حکم ہے؟ جس نے دی ہے اُسے واپس کرے یا ادا ہوگئی؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

اگر دینے والے نے غور و فکر کے بعد مصرف سمجھ کر زکوٰۃ دی تھی تو اس کی زکوٰۃ ادا ہوگئی، مگر زید کو اس چیز کے زکوٰۃ ہونے کا علم ہوگیا تو اس پر لازم ہے کہ اصل کو واپس کرے، قال فی شرح التنویر دفع بتحر لمن یظنہ مصرفا فبان انہ عبدہ او مکاتبہ او حربی ولو مستأمنا اعادھا لما مر وان بان غناہ او کونہ ذمیا او انہ ابوہ او ابنہ او امرأتہ او ھاشمی لا یعید لانہ اتی بما فی وسعہ حتی لو دفع بلا تحر لم یجز ان اخطأ، وقال ابن عابدین رحمہ اللہ تعالیٰ (قولہ لمن یظنہ مصرفا) اما لو تحری فدفع لمن ظنہ غیر مصرف او شک ولم یتحر لم یجز حتی یظھر انہ مصرف فیجزیہ فی الصحیح خلافا لمن ظن عدمہ وتمامہ فی النھر (قولہ ولو دفع بلا تحر) ای ولا شک کما فی الفتح وفی القھستانی بان لم یخطر ببالہ انہ مصرف او لا (قولہ لم یجز ان اخطأ) ای تبین لہ انہ غیر مصرف فلو لم یظھر لہ شیٔ فھو علی الجواز وقدمنا لو شک فلم یتحر او تحری وغلب علی ظنہ انہ غیر مصرف۔

(تنبیہ) فی القھستانی عن الزاھدی ولا یسترد منہ لو ظھر انہ عبد او حربی وفی الھاشمی روایتان ولا یسترد فی الولد والغنی وھل یطیب لہ فیہ خلاف واذا لم یطب قیل یتصدق وقیل یرد علی المعطی (رد المحتار ص۹۲ ج۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۱۵ ذی الحجہ ۹۰ھ

شیعہ اور قادیانی کو زکوٰۃ دینے سے ادا نہ ہوگی:

سوال: شیعہ یا قادیانی کو زکوٰۃ دینا جائز ہے یا نہیں؟ اور زکوٰۃ ادا ہو جائے گی یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

شیعہ اور قادیانی کافر ہیں، بلکہ دوسرے کفار سے بھی بدتر ہیں، اور کافر کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں، اور قادیانی کو زکوٰۃ دینا بہت سخت گناہ ہے، اور زکوٰۃ ادا نہ ہوگی، بلکہ اُن کو کسی قسم کی

صرف دینا جائز نہیں، قال فی شرح التنویر ولا تدفع الی ذمی لحدیث معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ وجاز دفع غیرها وغیر العشر والخراج الیہ ای الذمی ولو واجبا کنذر وکفارۃ وفطرۃ خلافا للثانی وبقولہ یفتی حاوی القدسی واما الحربی ولو مستأمنا فجمیع الصدقات لا تجوز لہ اتفاقا بحر عن الغایۃ وغیرها (رد المحتار ص ۶۳ ج ۲) وقال ابن عابدین رحمہ اللہ تعالیٰ فی کفارۃ الظہار تحت (قولہ ومصرفها) قال الرملی وفی الحاوی ولو اطعم فقراء اھل الذمۃ جاز، وقال ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ لا یجوز وبہ ناخذ اھ قلت بل صرح فی کافی الحاکم بانہ لا یجوز ولم یحک فیہ خلافا فاولی بہ علمت انہ ظاهر الروایۃ عن الکل، (رد المحتار ص ۶۳۳ ج ۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۲۳ رمضان سنہ [illegible]

مدِ زکوٰۃ سے خیراتی دواخانہ کھولنے کا حکم:

سوال: ہم لوگ اپنے محلہ خیر شاہ میں ایک دواخانہ کھولنا چاہتے ہیں جس کا خرچ زکوٰۃ اور چرم قربانی کے پیسوں سے چلائیں گے، اور اس سے ہر شخص فائدہ اٹھا سکے گا، اس میں مریضوں سے کچھ پیسے بھی وصول کئے جائیں گے، اور یہ پیسے بھی اسی دواخانہ میں خرچ کریں گے، گزارش یہ ہے کہ شریعت محمدی کی رو سے ہر شخص اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے یا نہیں؟ آپ اپنی پہلی فرصت میں شریعت محمدی کی رو سے جواب دیں، عین نوازش ہوگی، بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

دواخانہ میں زکوٰۃ اور چرم قربانی کا مصرف صرف یہ ہے کہ اس رقم سے دوائیں خرید کر مساکین کو مفت دی جائیں، اس رقم سے دواخانہ کے ڈاکٹروں اور دوسرے کارکنوں کی تنخواہ، مکان کا کرایہ، تعمیر اور فرنیچر وغیرہ مصارف پر خرچ کرنا جائز نہیں، اس سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی، مساکین سے دوا کے پیسے لینا اور غیر مسکین کو دوا دینا جائز نہیں، بعض دواخانوں میں مدِ زکوٰۃ سے مریضوں کو خوراک کھلایا جاتا ہے اس سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی، فی اول زکوٰۃ التنویر ھی تملیک جزء مال عینہ الشارع من مسلم فقیر (رد المحتار ص ۲ ج ۲) وفی باب المصرف ھو فقیر وھو من لہ ادنی شیء ومسکین من لا شیء لہ (الی قولہ) یصرف المزکی الکل او بعضھم تملیکا لا اباحۃ کما مر (رد المحتار ص ۶۸ ج ۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۵ جمادی الآخرہ سنہ [illegible]

مالِ زکوٰۃ مسجد پر لگانا جائز نہیں :

سوال : زکوٰۃ اور چرمِ قربانی کی رقم مسجد کی تعمیر اور مصارف میں لگانا جائز ہے یا نہیں؟ اس سے امام اور مؤذن کی تنخواہ دی جا سکتی ہے؟ اور مسجد کے لئے چٹائیاں خریدنا جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

سوال میں مذکورہ مصارف میں زکوٰۃ اور چرمِ قربانی کی رقم لگانا جائز نہیں، منتظمین مسجد سخت گنہگار ہوں گے، زکوٰۃ دینے والوں کی زکوٰۃ ادا نہ ہوگی، اور اس کا دنیوی وبال واخروی عذاب منتظمین مسجد پر ہوگا، قال فی التنویر وشرحہ ویشترط ان یکون تملیکا جزء مال عینہ الشارع من مسلم فقیر، وقال ایضا وفی الشرح لا یصرف الی بناء نحو مسجد ، وفی الشامیۃ کبناء القناطر والسقایات واصلاح الطرقات وکری الانہار والحج والجہاد وکل ما لا تملیک فیہ زیلعی (ردالمحتار ص ۳۴ ج ۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۵ جمادی الآخرہ ۸۸ھ

مدِ زکوٰۃ سے دینی کتابیں طبع کرنا :

سوال : شریعت مطہرہ کا حکم اس میں کیا ہے کہ ایک دینی کتاب مدِ زکوٰۃ سے طبع کی گئی، اور تاجرانہ نرخ پر قیمت لگا کر مستحقین زکوٰۃ کو دی گئی، بقدر رقمِ زکوٰۃ سے زائد نسخے اہلِ علم حضرات (جو مستحقین زکوٰۃ نہیں) کو بطور ہدیہ دیئے گئے، تو کیا اس صورت میں قربۃً اداءِ زکوٰۃ میں کوئی قباحت تو نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

صورتِ مسئولہ میں بلاشبہ بدوں کسی قباحت کے زکوٰۃ ادا ہو گئی، بلکہ یہ کتب دینیہ کی اشاعت کا بہترین ذریعہ ہے، فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۱۷ رجب ۹۲ھ

نصاب پر سال پورا ہونے سے قبل ملنے والی رقم پر بھی اسی سال زکوٰۃ فرض ہے :

سوال : ایک آدمی ہر سال ماہِ رجب میں حساب کر کے اپنے مال کی زکوٰۃ ادا کرنا شروع کرتا ہے، دوران سال میں اس کو دوسری نقدی بھی مل جاتی ہے، آیا یہ نقدی سالِ رواں کے حساب میں ضم کر کے زکوٰۃ ادا کرے گا یا پھر آئندہ ماہِ رجب میں موجود مال اور نقدی پر زکوٰۃ ادا کرے گا؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

دوران سال میں موصول ہونے والی رقم بھی سابق نصاب کے ساتھ شمار کی جائے گی اور اس کی زکوٰۃ بھی اسی سال رجب میں ہوگی، اگرچہ مستفاد پر ابھی تک سال نہیں گزرا، قال العلائی رحمہ اللہ تعالیٰ والمستفاد ولو بھبۃ او ارث وسط الحول یضم الی نصاب من جنسہ فیزکیہ بحول الاصل (رد المحتار ص ۲۶ ج ۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۱۹ر شعبان ۱۳۹۸ھ

مال حرام پر زکوٰۃ واجب نہیں:

سوال: جس نے کسی پاکستانی یا غیر ملکی دفتر، بینک، کارخانہ یا دکان میں ملازمت کرکے یا ملاوٹ کا سامان فروخت کرکے یا بلیک مارکیٹنگ کرکے بقدر نصاب رقم پس انداز کرلی ہے، یا اتنی ملکیت کا مالک ہو، ایسے مال کے بارے میں مندرجہ ذیل سوالات ہیں:

(۱) کیا اس پر زکوٰۃ فرض ہے؟

(۲) اگر حرام یا مخلوط مال پر زکوٰۃ ادا کی جائے یا اس سے دوسرے صدقات واجبہ یا نافلہ ادا کئے جائیں تو کیا مسکین کو اس کا استعمال جائز ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

(۱) اگر جمع شدہ مال خالص حرام ہے، تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں، اس مال کا اگر مالک معلوم ہے تو مالک پر واجب الرد ہے، اگر مالک معلوم نہیں تو یہ مال مساکین پر واجب التصدق ہے، اور اگر حلال و حرام مخلوط ہے تو حرام مال کی مقدار اس سے نکال کر باقی اگر بقدر نصاب بچتا ہو تو زکوٰۃ واجب ہے ورنہ نہیں، قال فی العلائیۃ ولو خلط السلطان المال المغصوب بمالہ ملکہ فتجب الزکوٰۃ فیہ ویورث عنہ لان الخلط استھلاک اذا لم یمکن تمییزہ عند ابی حنیفۃ رحمہ اللہ تعالیٰ وقولہ ارفق اذ قلما یخلو مال عن غصب وھذا اذا کان لہ مال غیر ما استھلکہ بالخلط منفصل عنہ یوفی بہ دینہ والا فلا زکوٰۃ کما لو کان الکل خبیثا کما فی النھر عن الحواشی السعدیۃ، وفی الشامیۃ (قولہ کما فی النھر) ای اول کتاب الزکوٰۃ عند قول الکنز وملک نصاب حولی ومثلہ فی الشرنبلالیۃ وذکرہ فی شرح الوھبانیۃ بحثا وفی الفصل العاشر من التاتارخانیۃ عن فتاوی الحجۃ من ملک اموالا غیر طیبۃ او غصب اموالا وخلطھا ملکھا

بالخلط ويصير ضامنا وإن لم يكن له سواها نصاب فلا زكاة عليه فيها وإن بلغت نصابا لأنه مديون ومال المديون لا ينعقد سببا لوجوب الزكاة عندنا اهـ فأفاد بقوله وإن لم يكن له سواها نصاب أن وجوب الزكاة مقيد بما إذا كان له نصاب سواها وبه يندفع ما استشكله في البحر من أنه وإن ملكه بالخلط فهو مشغول بالدين فينبغي لا تجب الزكاة لكن لا يخفى أن الزكاة حينئذ إنما تجب فيما زاد عليها (رد المحتار ص ۳۸ ج ۲)

(۲) جائز ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم ۲۴ شعبان سنہ ۸۱ھ

زکوٰۃ میں حرام مال دینے کا حکم:

سوال: بیع باطل اور بیع فاسد کا ثمن، بائع کے حق میں کیسا ہے؟ یعنی ثمن بائع کے پاس امانت ہی یا کوئی اور چیز ہے؟ اور اگر کسی نے بیع باطل کی، مثلاً باغ کا پھل ظاہر ہونے سے پہلے فروخت کیا اور مشتری نے کچھ ثمن بھی دیا، پھر بائع نے اس ثمن سے دوسرے حلال مال کی کچھ زکوٰۃ ادا کی، تو کیا اس ثمن سے زکوٰۃ ادا ہو سکتی ہے یا نہیں؟ جبکہ ابھی تک بائع نے اپنے مال کے ساتھ خلط نہیں کیا تھا، اور اگر ثمن مذکور کو اپنے مال کے ساتھ خلط کر کے پھر زکوٰۃ ادا کی ہو تو کیا حکم ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

بیع باطل میں ثمن بائع کی ملک میں داخل نہیں ہوتا، لہٰذا اس سے زکوٰۃ ادا نہ ہوگی، البتہ خلط کے بعد بسبب استہلاک یہ ثمن اس کی ملک ہو گیا، مگر ملک خبیث ہے، اور بیع فاسد کا ثمن بلا خلط بھی ملک میں داخل ہو جاتا ہے اور ملک خبیث ہے، ملک خبیث سے صحت زکوٰۃ میں اختلاف ہے، قائلین صحت بھی اس عمل کو حرام اور بہت سخت گناہ قرار دیتے ہیں۔ قال ابن عابدین رحمہ اللہ تعالیٰ تحت قولہ: وفي شرح الوهبانية الخ أي لو أخرج زكاة المال الحلال من مال حرام ذكر في الوهبانية أنه يجزي عند البعض ونقل القولين في القنية وقال في البزازية ولو نوى في المال الخبيث الذي وجبت صدقته أن يقع عن الزكاة وقع عنها اهـ أي نوى في الذي وجب التصدق به لجهل أربابه اهـ

(رد المحتار ص ۲۲ ج ۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم ۳ جمادی الآخرہ سنہ ۹۴ھ

عامل کو نصف مقبوض سے زائد دینا جائز نہیں:

سوال: اس زمانہ میں عاملین زکوٰۃ کو مدِ زکوٰۃ سے معاوضہ دینا جائز ہے یا نہیں؟

اور کوئی مقدار شرعاً متعین ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملهم الصواب

عاملین زکوٰۃ سے مراد حاکم مسلم کی طرف سے متعین کردہ عاملین ہیں، اس زمانہ میں بھی حاکم مسلم کی طرف سے کوئی عامل متعین ہو تو اس کو مدِ زکوٰۃ سے بقدرِ کفایت دینا جائز ہے، عاملین کی اجرت کوئی خاص متعین نہیں، ان کے اہل و عیال کے نفقہ کے مطابق دیا جاتا ہے، مگر اس کی حاصل کردہ رقم کے نصف سے زائد دینا جائز نہیں، قال فی التنویر وعامل فیعطی بقدر عمله، وفی الشرح ما یکفیه واعوانه بالوسط ولکن لا یزاد علی نصف ما یقبضه (رد المحتار ص ۶۳ ج ۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۱۷ جمادی الآخرہ سنہ ۹۱ھ

اسلامی مشاورتی کونسل حکومت پاکستان کی طرف سے زکوٰۃ سے متعلق سوالات:

(۱) کیا حکومت کی ذمہ داری ہے کہ زکوٰۃ وصول کرے؟

(۲) کیا حکومت زکوٰۃ کی ادائیگی پر جبر کر سکتی ہے؟ اور اس کے لئے کوئی قانون نافذ کر سکتی ہے؟

(۳) کس قسم کے مال پر زکوٰۃ واجب ہوگی؟ حسب ذیل اشیاء پر زکوٰۃ کی شرح کی تفصیل بیان کریں:۔

(۱) کارخانہ دار کے مجموعی اثاثہ پر؟

(۲) مال تجارت پر؟

(۳) کرایہ پر دیئے ہوئے مکانوں، دکانوں و دیگر جائدادہائے منقولہ و غیر منقولہ مثلاً ٹیکسی، رکشہ وغیرہ پر؟

(۴) کارخانوں، تجارتی اداروں اور دوسری قسم کی تنظیمات کے حصص پر؟

(۵) بینک فکسڈ ڈپازٹ، سیونگ سرٹیفکیٹ، پرائز بونڈ، انشورنس؟

(۶) زیورات، نقدی وغیرہ از قسم اموال باطنہ پر؟

(۴) کیا کمپنیاں اور حصہ دار علیحدہ علیحدہ زکوٰۃ دیں؟

(۵) جو کمپنیاں اور ادارے کلیۃً یا جزءً سرکاری ہیں ان پر زکوٰۃ کی کیا صورت ہوگی؟

(۶) کانوں اور معادن پر زکوٰۃ واجب ہے؟

(۷) زکوٰۃ دینے کی صورت میں مندرجہ ذیل ٹیکسوں میں شرعی نقطۂ نظر سے ترمیم کی ضرورت ہے یا نہیں؟ انکم ٹیکس، دولت ٹیکس، گفٹ ٹیکس، پراپرٹی ٹیکس، سیلز ٹیکس لیند ریونیو

ذریعہ ٹریونی یا رایڈ شفنڈ (دالی نیزادادی)

(۸) زکوٰۃ کے لئے نصاب کی تعیین کس طرح کی جائے گی؟

(۹) مصارفِ زکوٰۃ جو قرآن مجید میں ارشاد ہوئے ہیں، آجکل ان میں کون کون داخل ہیں اور کون کون خارج ہیں؟ کیا فوج کے مصارف فی سبیل اللہ میں داخل ہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

(۱) زکوٰۃ وصول کرنا شرعاً حکومت کے ذمہ ضروری نہیں، قال فی الخازن فی هذه الآیة الحکم الاول قولہ سبحانہ وتعالیٰ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً (الیٰ ان قال) فیجوز للامام او نائبہ ان یأخذ الزکوٰۃ من الاغنیاء ویدفعہا الی الفقراء (خازن ص ۲۰۰ ج ۲)

اس عبارت سے ثابت ہوا کہ زکوٰۃ وصول کرنا حکومت کا حق ہے، مگر اس کے ذمہ لازم نہیں، نیز حسب تصریح فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ حکومت کو صرف اموالِ ظاہرہ کی زکوٰۃ لینے کا حق بعوض حمایت ہے اور یہ امر بھی بالکل مسلّم ہے کہ صاحبِ حق پر اپنا حق وصول کرنا شرعاً فرض نہیں ہوتا بلکہ اسے ترکِ حق کا بھی اختیار ہوتا ہے، عُشر بھی بحکم زکوٰۃ ہے، اور کتبِ فقہ میں اس کی تصریح ہے کہ حکومت عشر و خراج معاف کر سکتی ہے، پھر اگر صاحبِ ارض فقیر ہے تو اس کے لئے حلال ہے ورنہ وہ خود صدقہ کر دے، نیز حکومت اگر لوگوں سے زکوٰۃ وصول کر کے فقراء پر صرف کرنے کی بجائے انہیں براہِ راست فقراء پر صرف کرنے کی اجازت دیدے تو اس فعل میں یہ لوگ حکومت کے وکیل ہوں گے، لہٰذا ان کا فعل حکومت ہی کا فعل متصور ہوگا۔

(۲) اگر حکومت شرائطِ ذیل کی پابندی کرنے کا یقین دلائے اور اس کا اعلان کرے اور یہ مرافقہ طبقہ اپنے نجی اور اجتماعی امور میں اتباعِ شریعت کا عملی ثبوت پیش کرے تو حکومت اموالِ ظاہرہ کی زکوٰۃ جبراً وصول کر سکتی ہے، شرائط یہ ہیں:

(۱) مدّ زکوٰۃ کو اس کے صحیح مصرف پر خرچ کیا جائے۔

(۲) اموالِ ظاہرہ اور صحیح مصارف کی تعیین ایسے مستند علماء سے کرائی جائے جن کی دیانت اور تقویٰ پر عوام کو اعتماد ہو۔

(۳) زکوٰۃ وصول کرنے اور صحیح مصارف پر خرچ کرنے کے لئے دیانتدار عملہ متعین کیا جائے۔

(۴) اموالِ زکوٰۃ یہ ہیں: مواشی (بشرائطہا المعہودۃ) اموالِ تجارت، سونا، چاندی، نقد

روپیہ، قال فی التنویر وشرطہ حولان الحول وثمنیۃ المال کالدراہم والدنانیر او السوم او نیۃ التجارۃ (رد المحتار ص ۱۲ ج ۲)

(۱) کارخانہ کی مشین اور مکان وغیرہ پر زکوٰۃ نہیں، لانہ لا یوجد فیہ الشرط المذکور ولذا قال شارح التنویر وکذلک آلات المحترفین الا ما یبقی اثر عینہ کالعصفر (رد المحتار ص ۹ ج ۲)

(۲) مال تجارت پر زکوٰۃ فرض ہے، لما مر من التنویر۔

(۳) کرایہ پر دیئے ہوئے مکانوں، دکانوں اور ٹیکسی رکشہ وغیرہ پر زکوٰۃ نہیں، لفقدان الشرط المذکور، قال فی العلائیۃ ولا فی ثیاب البدن واثاث البیت ودور السکنی ونحوہا، قال الطحطاوی رحمہ اللہ تعالیٰ کحوانیت و خانات یستغلہا (طحطاوی علی الدر ص ۳۹۲ ج ۱)

(۴) حصص اگر بنیت تجارت خریدے ہوں یعنی خود حصص کی خرید و فروخت مقصود ہو تو حصص کی کل قیمت پر زکوٰۃ واجب ہے، ورنہ حصص کی صرف اس مقدار پر زکوٰۃ ہوگی جو تجارت میں لگی ہوئی ہے، کارخانہ کی مشینری اور مکان پر صرف شدہ مقدار پر زکوٰۃ نہیں، لما مر من التفصیل۔

(۵) بینک فکسڈ ڈپوزٹ، سیونگ سرٹیفکیٹ، پرائز بونڈ اور انشورنس یہ سب شرعاً سودی قرض ہیں، انعامی بونڈ میں سود کے علاوہ قمار بھی ہے، اس لئے اصل رقم پر زکوٰۃ فرض ہے، اور کل منافع حرام ہونے کی وجہ سے واجب التصدق ہیں۔

(۶) زیور اور نقدی پر زکوٰۃ فرض ہے، لما مر من التنویر۔

یہ حکم فی نفسہ وجوب زکوٰۃ کا ہے، حکومت کے لئے حق وصول کے لحاظ سے اموال زکوٰۃ کی دو قسمیں ہیں، ایک اموال ظاہرہ یعنی مواشی، ان کی زکوٰۃ حکومت جبراً وصول کرے گی۔ دوسری قسم اموال باطنہ ہیں، سونا، چاندی، نقد روپیہ، یہ سب چیزیں جب تک اپنے اصل مقام پر رہیں اموال باطنہ ہیں، حکومت کو ان کی زکوٰۃ وصول کرنے کا اختیار نہیں، البتہ ایک شہر سے دوسرے شہر کی طرف منتقل کرنے کی صورت میں حکومت کا کارندہ (عاشر) ان کی زکوٰۃ وصول کرے گا، قال ابن عابدین رحمہ اللہ تعالیٰ تحت قول الشارح (الظاہرۃ والباطنۃ) فان مال الزکوٰۃ نوعان الظاہر وہو المواشی وما یمر بہ

الذی مرعلی العاشر وباطن وھوالذھب والفضۃ واموال التجارۃ فی مواضعھا (رد المحتار ص ۲۲ ج ۲) والاموال الباطنۃ بعد اخراجھا من البلد لانھا بالاخراج التحقت بالاموال الظاھرۃ فکان الاخذ فیھا للامام (رد المحتار ص ۲۳ ج ۲)

وقال العلامۃ الکاسانی رحمہ اللہ تعالیٰ وکذا الجواب فیمن مرعلی العاشر بالسوائم او بالدراھم او بالدنانیر او باموال التجارۃ فی جمیع ما وصفنا الا فی قولہ ادیت زکوتھا بنفسی الی الفقراء (الی قولہ) فیما سوی السوائم انہ یقبل قولہ ولا یؤخذ ثانیا لان اداء زکوۃ الاموال الباطنۃ مفوض الی اربابھا اذا کانوا یتجرون بھا فی المصر فلم یتضمن الدفع بنفسہ ابطال حق احد (بدائع ص ۳۶ ج ۲)

④ کمپنیوں کی زکوٰۃ میں اختیار ہے، اجتماعاً وانفراداً دونوں صورتیں جائز ہیں۔

⑤ جو کمپنیاں اور ادارے کلاً سرکاری ہیں ان کے کسی حصہ پر بھی زکوٰۃ نہیں، اور جو جزءً سرکاری ہیں ان کے سرکاری حصہ پر زکوٰۃ نہیں، صرف غیر سرکاری حصص پر زکوٰۃ ہے، سرکاری اموال پر اس لئے زکوٰۃ نہیں کہ یہ شخصی ملکیت نہیں، کالاموال الموقوفۃ وغلۃ الوقف والاراضی السلطانیۃ۔

⑥ کان اور معدن مائع جیسے پٹرول اور غیر منطبع جیسے جواہر میں خمس نہیں، اور منطبع غیر مائع پر خمس واجب ہے، البتہ زیبق کے معدن پر مائع ہونے کے باوجود خمس ہے، اس لئے کہ وہ دوسری اشیاء کے ساتھ مل کر انطباع کی صلاحیت رکھتا ہے، صاحبین رحمہما اللہ تعالیٰ کے ہاں ایسا معدن خواہ ارض مباح میں پایا جائے یا ارض مملوکہ میں یا کسی کے دار یا حانوت میں بہر حال اس پر خمس ہے، امام رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں کسی دار یا حانوت میں پائے جانے والے معدن پر خمس نہیں، ارض مملوکہ سے متعلق امام رحمہ اللہ تعالیٰ سے دو روایتیں ہیں، ترجیح روایت وجوب کو دی گئی ہے۔

معدن ارض مباح میں پایا گیا تو واجد کی ملک ہے، اور ارض مملوکہ میں ہو تو مالک ارض کی ملک ہے، ھذا خلاصۃ ما ھو مشروح فی الکتب المشہورۃ۔

⑦ یہ سب ٹیکس بہر حال ناجائز ہیں، البتہ بوقت ضرورت شدیدہ بشرائط ذیل عارضی طور پر ٹیکس وصول کرنے کی گنجائش ہے۔

(۱) حکومت کے مصارف کو تبذیر و اسراف سے پاک کرنے کے بعد فیصلہ کیا جائے کہ ٹیکس وصول کرنے کی ضرورت ہے یا نہیں؟

(۳) ہر شخص کی آمدنی اور اس کے جائز وضروری مصارف کا موازنہ کرنے کے بعد اس پر ٹیکس تجویز کیا جائے۔

(۴) بذریعہ ٹیکس وصول شدہ رقوم کو صحیح مصارف پر لگایا جائے۔

⑧ ۳۵ء۶۱۲ گرام چاندی کی قیمت کو معیار بنایا جائے یہ عام مشہور وزن ہے، بندہ کی تحقیق کے مطابق چاندی کا نصاب ۴۰۰ء۶۱۸ گرام ہے، اس کی تفصیل میرے رسالہ "بسط الباع لتحقیق الصاع" میں ہے، قول اول مشہور ہونے کے علاوہ باب زکوٰۃ میں احوط بھی ہے، اس لئے اسی کو معیار بنانا چاہیے، البتہ مقدار صدقۃ الفطر میں بندہ کی تحقیق احوط ہے۔

⑨ درحقیقت قرآن کریم میں صرف تین مصارف کا بیان ہے (۱) فقراء (۲) عاملین، (۳) مؤلفۃ القلوب، مؤلفۃ القلوب کا حکم منسوخ ہونے پر حضرات صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا اجماع ہے، (مدارک التنزیل، الدر المنثور، فتح القدیر) باقی صرف فقراء اور عاملین رہ گئے، ان کے سوا جو اقسام قرآن کریم میں مذکور ہیں وہ سب فقراء ہی کی مختلف انواع ہیں۔

فقیر فوجی کو بصورت تملیک بطریق امداد زکوٰۃ دی جا سکتی ہے، غنی فوجی کو دینا یا بمنزلہ تنخواہ فقیر کو دینا اور تملیک کے سوا فوج کے دوسرے مصارف پر لگانا جائز نہیں۔

صحت زکوٰۃ کے لئے تملیک فقیر کی شرط پر اجماع ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۱۴ ربیع الآخر ۹۵ھ

وکیل کے پاس زکوٰۃ کی رقم ضائع ہو گئی تو زکوٰۃ ادا نہیں ہوئی:

سوال: زید نے خالد کو زکوٰۃ کی رقم کسی مسکین کو ادا کرنے کے لئے دی جو خالد کے پاس سے ضائع ہو گئی، ایسی صورت میں زید کے ذمہ جو زکوٰۃ واجب الاداء تھی وہ ادا ہو گئی یا نہیں؟ اگر ادا نہیں ہوئی تو کیا خالد کے ذمہ اس رقم کا زید کو واپس کرنا واجب ہے؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

زید کی زکوٰۃ ادا نہیں ہوئی، اگر خالد نے حفاظت میں غفلت نہیں برتی تو خالد اس رقم کا ضامن نہ ہوگا۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۱۴ محرم ۹۶ھ

وکیل کا رقم زکوٰۃ میں رد وبدل کرنا:

سوال: ایک شخص نے کسی دوسرے شخص کو زکوٰۃ یا دوسرے صدقات واجبہ کی صورت

کوئی رقم مساکین کو دینے کے لئے دی، اس وکیل نے وہ رقم بدل دی مثلاً اس میں سے دس دس روپے کے دس نوٹ لے لئے اور سو روپیہ کا ایک نوٹ اس میں رکھ دیا کیا ایسا کرنا جائز ہے؟ یا بعینہٖ وہی رقم مساکین کو دینا ضروری ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

زکوٰۃ بہرحال ادا ہو جائے گی، البتہ تبدیل کا جواز اس پر موقوف ہے کہ موکل کی طرف سے تبدیل کا اذن صراحۃً یا دلالۃً موجود ہو، موجودہ دور میں اس کی اجازت ہے، اس لئے صراحۃً اذن کی ضرورت نہیں، مع ہذا احتیاطاً اجازت لے لینا بہتر ہے، فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۷ر شعبان ۹۶ھ

وکیل کا مدِ زکوٰۃ سے کوئی چیز خرید کر دینا:

سوال: کیا وکیل زکوٰۃ کی رقم سے کوئی چیز مثلاً کپڑا، جوتا، غلہ اور کمبل وغیرہ خرید کر دے سکتا ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

یہ بھی موکل کے اذن پر موقوف ہے، اگر اس کی طرف سے صراحۃً یا دلالۃً اس کا اذن موجود ہو تو جائز ہے ورنہ نہیں، فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔ ۷ر شعبان ۹۶ھ

مسکین کو مدِ زکوٰۃ سے مکان بنوا کر دینا:

سوال: ایک شخص غریب ہے، اس کو زید زکوٰۃ کی رقم سے ایک مکان بنوا کر دینا چاہتا ہے، آیا اس طرح زکوٰۃ کی رقم سے مکان بنوا کر دینا جائز ہے؟ جبکہ فقہاء یہ بھی فرماتے ہیں کہ ایک ہی شخص کو زکوٰۃ دے کر فوراً صاحب نصاب بنا دینا مکروہ ہے، بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

اگر رقم مسکین کو نہیں دی بلکہ اس رقم سے مکان خود بنوا کر دیا، تو اس میں کراہت نہیں، اس لئے کہ اس سے مسکین صاحب نصاب نہیں ہوا، دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ تعمیر مکان کے تخمینہ کی کل رقم مسکین کو یکمشت نہ دے بلکہ کچھ حصہ دیدے، جب وہ تعمیر پر خرچ ہو جائے تو مزید کچھ حصہ دیدے، اس طرح تعمیر کی تکمیل کرا دے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲۹ر ربیع الاول ۹۰ھ

حوائج اصلیہ کے لئے رکھی ہوئی نقدی پر زکوٰۃ فرض ہے:

سوال: ایک شخص کے پاس کئی ہزار روپیہ جمع ہے، اس پر سال بھی گذر چکا ہے مگر اس کے پاس نہ مکان ہے اور نہ ہی گھر کا سامان، ابھی شادی بھی نہیں کی، انہی ضروریات کے لئے روپیہ جمع کر رہا ہے، اس پر زکوٰۃ فرض ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

اس پر زکوٰۃ فرض ہے، البتہ اگر سال پورا ہونے سے قبل تعمیر مکان کا سامان یا گھر یلو استعمال کی اشیاء وغیرہ خرید لے تو زکوٰۃ فرض نہ ہوگی، قال ابن عابدین رحمہ اللہ تعالیٰ تحت (قولہ وفسرہ ابن ملک) فاذا کان معہ دراہم امسکہا بنیۃ صرفہا الی حاجتہ الاصلیۃ لا تجب الزکوٰۃ فیہا اذا حال الحول وہی عندہ لکن اعترضہ فی البحر بقولہ ویخالفہ ما فی المعراج فی فصل زکوٰۃ العروض ان الزکوٰۃ تجب فی النقد کیفما امسکہ للنماء او للنفقۃ وکذا فی البدائع فی بحث النماء التقدیری اھ قلت واقرہ فی النہر والشرنبلالیۃ وشرح المقدسی وسیصرح بہ الشارح ایضا ونحوہ قولہ فی السراج سواء امسکہ للتجارۃ او غیرہا وکذا قولہ فی التاتارخانیۃ نوی التجارۃ او لا (الی قولہ) ولکن ما سیأتی فی الحج من انہ لو کان لہ مال ویخاف العزوبۃ یلزمہ الحج بہ اذا خرج اہل بلدہ قبل ان یتزوج وکذا لو کان یحتاج [illegible] فلیتأمل واللہ اعلم (رد المحتار ج ۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۱۲ ذی الحجہ [illegible]

زکوٰۃ میں نقدی کی بجائے دوسری چیز دینا جائز ہے:

سوال: جدہ کے ایک اہل خیر نے میری کمزوری اور مالی حالت کے پیش نظر مجھے لکھا کہ اگر زکوٰۃ کی مد سے کچھ خدمت ہو سکتی ہے تو ضرور لکھیں، میں نے اس کے جواب میں جدہ لکھا کہ میرے پاس نقد روپیہ تو ہے نہیں، البتہ مالی یعنی دینی کتب تیس چالیس ہزار کی مالیت کی موجود ہیں، اگر آپ مناسب سمجھیں تو جس قدر بھی رقم زیادہ سے زیادہ آپ بھیج سکتے ہوں وہ رقم مجھے بھیج دیں، میں اس تمام رقم کی یہ کتابیں آپ کی طرف سے زکوٰۃ کے نام سے مستحقین زکوٰۃ کو مدارس عربیہ کے طلباء کو مدرسہ کی معرفت تقسیم کرا دوں گا، اس کے جواب میں جو جدہ سے جواب آیا ہے وہ یہ ہے: "زکوٰۃ کے لئے جو طریقہ کتابیں تقسیم کرنے کا لکھا ہے وہ مجھے میری سمجھ

میں نہیں آیا، اس سے کیا زکوٰۃ ادا ہو جائے گی؟ کیونکہ زکوٰۃ تو فقط مستحق کو دینا ہے، کتابوں سے شاید ادا نہ ہو، اگر آپ اس کے لئے کسی معتبر عالم کا فتویٰ ارسال کریں تو شرح صدر ہو جائے۔ نواب وصل یہ ہے کہ اوپر جو میں نے لکھا کہ رقم مجھے بھیج دیں میں اس تمام رقم کی دینی کتابیں بذریعہ مدرسہ کے ذریعہ عربی پڑھنے والوں کو تقسیم کرادوں گا تو کیا اس طرح کرنے سے بعدہ والوں کی زکوٰۃ ادا ہو جائے گی؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

مد زکوٰۃ میں ہر چیز رائج قیمت لگا کر دی جا سکتی ہے، بشرطیکہ بصورت تملیک دی جائے یعنی فقیر کو اس کا مالک بنا دیا جائے، پس کتابیں اگر مستحقین کی ملک میں دیدی جائیں تو زکوٰۃ ادا ہو جائے گی، ہاں اگر مدرسہ میں وقف کیں یا طلبہ کو عاریۃً مطالعہ کے لئے دیں تو زکوٰۃ ادا نہ ہوگی، غالباً سائل کو اسی سے اشتباہ ہوا ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲۵ صفر ۹۰ھ

طلبہ کا کھانا پکانے کی اجرت مد زکوٰۃ سے دینا جائز ہے:

سوال: مد زکوٰۃ میں سے باورچی کی تنخواہ مقرر کرنا اسی طرح مد عشر سے جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

جو باورچی صرف طلبہ کے لئے کھانا تیار کرتا ہو اس کی تنخواہ مد زکوٰۃ و عشر سے دی جا سکتی ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲۵ ربیع الاول ۹۰ھ

رشتہ دار مسکین کو زکوٰۃ دینا زیادہ ثواب ہے:

سوال: میرا ایک بھائی بہت نادار و مفلس ہے وہ ٹی بی کے مرض میں مبتلا ہے، اس کا خرچ اور آمدنی کچھ بھی نہیں، میں پوری زکوٰۃ اس کو دے کر سبکدوش ہو سکتا ہوں یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

اس کو دینا زیادہ ثواب ہے، مگر یکمشت اتنی رقم نہ دیں کہ وہ فقیر صاحب نصاب ہو جائے کچھ رقم دیں جب وہ خرچ ہو جائے تو مزید دیں، البتہ اگر وہ عیال دار بھی ہے تو یکبارگی وقت اتنی رقم دے سکتے ہیں کہ اگر افراد پر تقسیم کی جائے تو کسی کے پاس بھی نصاب پورا نہ ہو، قال فی التنویر وکرہ اعطاء فقیر نصابا الا اذا کان مدیونا او صاحب عیال لو

فرقه علیهم لایخص کلا نصاب وقلیلا الا الی قرابة، وقال العلائی رحمه الله تعالی بل فی الظهیریة لاتقبل صدقة الرجل وقرابته محاویج حتی یبدأ بهم فیسد حاجتهم (رد المحتار ص ۷۳ ج ۲) فقط والله تعالی اعلم،

۲۹ جمادی الاولیٰ ۱۳۹۰ھ

مد زکوٰۃ سے میت کی تجہیز و تکفین جائز نہیں:

سوال: کسی غریب نادار کے گھر میں اس کے کسی رشتہ دار اولاد یا بیوی کی میت ہو جائے تو اس کی تجہیز و تکفین میں بابت کفن دفن کسی ادارہ کے پاس زکوٰۃ کی رقم ہے تو اس رقم سے مندرجہ بالا رقم خرچ کر سکتے ہیں یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

مد زکوٰۃ سے تجہیز و تکفین جائز نہیں، بوقت ضرورت یہ صورت ہو سکتی ہے کہ میت کا ولی مستحق زکوٰۃ ہو تو اس کو بہ نیت زکوٰۃ رقم دے دی جائے، وہ اس سے تجہیز و تکفین وغیرہ کرے، قال فی التنویر ولا الی بناء مسجد وکفن میت وقضاء دینه (رد المحتار ص ۸۵ ج ۲) فقط والله تعالی اعلم

۲ جمادی الآخرہ ۱۳۹۰ھ

کسی کو اتنی زکوٰۃ دینا مکروہ ہے کہ صاحب نصاب ہو جائے:

سوال: کسی فقیر کو زکوٰۃ سے اتنی رقم دینا کہ وہ فقیر صاحب نصاب ہو جائے مکروہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس نصاب سے کیا مراد ہے؟ کیا موجب زکوٰۃ نصاب مراد ہے یا وہ نصاب جو زکوٰۃ لینے سے مانع ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

زکوٰۃ لینے سے مانع نصاب مراد ہے، یہ کراہت جب ہے کہ فقیر عیال دار نہ ہو، اگر عیال دار ہے تو اس کو یکمشت اتنی رقم مد زکوٰۃ سے دی جا سکتی ہے کہ اس کے عیال پر تقسیم کریں تو ان میں سے کوئی بھی صاحب نصاب نہ بنے، قال فی التنویر وکرہ اعطاء فقیر نصابا الا اذا کان مدیونا او صاحب عیال لو فرقه علیهم لایخص کلا نصاب، وفی الشامیة ان دفع مایکمل النصاب کدفع النصاب قال فی النهر والظاهر انه لافرق بین کون النصاب نامیا او لاحتی لو اعطاه عروضا تبلغ نصابا فکذلک ولابین کونه من النقود او من الحیوانات حتی لو اعطاه خمسا من الابل لم تبلغ قیمتها نصابا کره لما مر، وفی بعض النسخ

تبلغ بدونہ قیمۃ النصاب الاول (رد المحتار ص ۷۸ ج ۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲۵ ذی الحجہ سنہ ۱۴۰۲ھ

مسکین کو اتنی زکوٰۃ دینا کہ اس پر حج فرض ہو جائے مکروہ ہے:

سوال: کیا اگر عالم کو اتنی زکوٰۃ دی کہ جس سے عالم پر حج فرض ہو جائے تو کیا عالم کے لئے یہ بہتر ہوگا کہ اتنی زکوٰۃ نہ لے جس سے حج فرض ہو جاتا ہو یا یہ بہتر ہوگا کہ زکوٰۃ لے لے اور حج ادا کرے؟ مندرجہ ذیل عبارت سے جواز معلوم ہوتا ہے، البتہ افضلیت کو آپ لازم تحریر فرمائیں، فی شرح التنویر وفی سبیل اللہ وھو منقطع الغزاۃ وقیل الحاج وفی الشامیۃ (قولہ وقیل الحاج) ای منقطع الحاج الخ (شامیہ ص ۳۴۳ ج ۲) بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

اتنی رقم مد زکوٰۃ میں دینا مکروہ ہے کہ جس سے فقیر صاحب نصاب ہو جائے، ہمارے دیار میں وجوب حج سے قبل ہی صاحب نصاب ہونا ظاہر ہے، لہٰذا اتنی رقم دینا کہ حج فرض ہو جائے بطریق اولیٰ مکروہ ہے، منقطع الحاج سے وہ شخص مراد ہے جو حج کے لئے نکلا مگر سفر میں اس کا مال جاتا رہا، اس کو زکوٰۃ دینا بلا کراہت جائز ہے، عالم بلکہ عامی کو بھی اتنی زکوٰۃ نہیں لینا چاہئے۔ نقل ابن عابدین رحمہ اللہ تعالیٰ عن الظھیریۃ وغیرھا عن ھشام قال سألت ابا یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ عن رجل لہ مائۃ وتسعۃ وتسعون درھما فتصدق علیہ بدرھمین قال یأخذ واحدا ویرد واحدا اھ (رد المحتار ص ۷۳ ج ۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲۶ جمادی الآخرہ سنہ ۹۹ھ

سیلاب زدگان کو زکوٰۃ دینا:

سوال: سیلاب زدگان کو زکوٰۃ کی رقم سے کھانا پکا کر بھیجنا، لحاف دری یا اور کچھ سامان بھیجنا جائز ہے یا نہیں؟ اور زکوٰۃ ادا ہوگی یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

اگر ظن غالب ہو کہ یہ لوگ مستحق زکوٰۃ ہیں یعنی ان کے پاس بقدر مانع زکوٰۃ نصاب نہیں تو ان کو زکوٰۃ دینا جائز ہے، بشرطیکہ ان اشیاء یا رقم کا ان کو مالک بنا دیا جائے، اگر ان کی ملک میں نہیں دیا بلکہ ویسے ان پر خرچ کیا گیا تو زکوٰۃ ادا نہ ہوگی، اسی طرح کھانا بٹھا کر کھلا دیا گیا تو زکوٰۃ ادا نہیں ہوئی، مسکین کی ملکیت میں دینا ضروری ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۹ رمضان مبارک سنہ ۹۹ھ

تجارتی پلاٹ پر زکوٰۃ فرض ہے:

سوال: ما قولکم رحمکم اللہ اندریں مسئلہ کہ کراچی میں ایک شخص یہ معاملہ کرتا ہے کہ پلاٹ خرید لیتا ہے بنیت تجارت کچھ مدت اپنے قبضہ میں رکھ کر گراں دام ملنے پر بیچ دیتا ہے اب سوال یہ ہے کہ اگر پلاٹ تجارت کی نیت سے خرید کیا کرے اور بیچا کرے اور نفع حاصل کیا کرے، تو کیا اگر کسی شخص کے قبضہ میں کئی پلاٹ ہوں جن کی قیمت مقدار نصاب کو پہنچ جاتی ہو تو پلاٹ کی قیمت پر زکوٰۃ واجب ہے کہ نہیں؟ چونکہ اس نے تجارت کی نیت سے خریدا ہے اس لئے عروض تجارت پر قیاس کیا جائے، اور اگر عروض تجارت پر محمول و مقیس نہ ہو تو بالفرق کیا ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

یہ مال تجارت ہے، لہٰذا اس پر زکوٰۃ فرض ہے، جو چیز بھی بیچنے کی نیت سے خریدی جائے وہ مال تجارت میں داخل ہے، فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۲۲ شوال سنہ ۹۱ھ

مہر میں سامان بنیت تجارت لیا تو اس پر زکوٰۃ فرض نہیں:

سوال: عورت کا مہر مثلاً دس من گندم تھا، اس نے وصول کرتے وقت اس میں نیت تجارت کی کہ اس میں تجارت کروں گی، اور کھاؤں گی نہیں، تو کیا یہ مال تجارت سمجھا جائے گا؟ اور اس میں زکوٰۃ ہوگی؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

صرف نیت تجارت سے زکوٰۃ واجب نہ ہوگی جب تک عمل تجارت نہ کرے، قال فی التنویر: وما ملکہ بصنعہ کہبۃ او وصیۃ او نکاح او خلع او صلح عن قود ونواہ لہا کان لہ عند الثانی والاصح لا۔ (رد المحتار ص [illegible]) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۲۰ شعبان سنہ ۹۹ھ

بعوض مہر بنیت تجارت سامان لیا تو اس پر زکوٰۃ فرض ہے:

سوال: ایک زمین جو میں نے تجارت کی نیت سے لی تھی رہا اس کا ایک حصہ میں اپنی اہلیہ کو اس کے مہر کی رقم کے بدلے میں دینا چاہتا ہوں، کیا میری اہلیہ کو اس زمین کے حصہ پر زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی؟ اگر وہ اس کو گھر بنانے کی نیت سے رکھنا چاہے یا اور کسی نیت سے؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

آپ کی اپنی اس زمین کی زکوٰۃ فرض نہیں خواہ اس میں تجارت کی نیت کرے، تعمیر کی البتہ جس رقم کے عوض میں آپ سے خریدتے وقت اگر اس کی تجارت کی نیت ہو تو زکوٰۃ فرض ہوگی، فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۵ صفر سنہ ۱۳ھ

حیلۂ تملیک:

سوال: ایک نو تعمیر شدہ مسجد میں پنکھے کی ضرورت تھی، متولی مسجد خود مصرف زکوٰۃ تھا، میں نے زکوٰۃ کی نیت سے پنکھا متولی کو دیدیا اور اس نے وہ پنکھا اپنی طرف سے مسجد میں لگادیا، کیا میری طرف سے زکوٰۃ کی ادائیگی صحیح ہوگئی؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

اگر آپ نے متولی کو مالک بنادیا جو خود مسجد میں دینے کی شرط سے یا بدون شرط اس نے آپ کی مروت میں بلا طیب خاطر مسجد کو دیدیا بہرحال زکوٰۃ ادا ہوگئی، مگر شرط لگانے یا بلا شرط مروۃً مسجد کو دینے کا آپ کو گناہ ہوگا اور پنکھا مسجد میں لگانا جائز نہ ہوگا، بطیب خاطر ہو تو جائز ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲۵ رمضان سنہ ۹۵ھ

غیر آباد زمین کے مانع زکوٰۃ ہونے کی تفصیل:

سوال: ایک عیالدار عالم دین جو دینی تعلیم کا کام لوجہ اللہ کرتا ہے اس کی زمین تو ہے لیکن قابل کاشت جو حصہ ہے وہ نفقۂ عیال کے لئے کافی نہیں، ہاں غیر مزروعہ زمین یعنی قابل کاشت وغیر قابل کاشت کی قیمت پندرہ بیس ہزار روپے ہو جاتی ہے، آیا ایسے عالم دین کو زکوٰۃ لینا جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

اگر غیر آباد زمین آباد ہونے کے بعد صرف بقدر کفایت ہی رہے گی تو زکوٰۃ لے سکتے ہیں، اور اگر قدر کفایت سے زائد ہوگی اور زائد حصہ کی قیمت بقدر نصاب ہو تو یہ مانع اخذ زکوٰۃ ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۵ شوال سنہ ۹۹ھ

مدِ زکوٰۃ سے قیدیوں کو کھانا دینا:

سوال: زکوٰۃ، نفل صدقات کی رقم سے کھانا پکوا کر جیل میں قیدیوں کو بھیجنا جائز

ہے یا نہیں؟ کیونکہ قیدیوں میں قیدی ہر چیز کے محتاج ہیں اور پیٹ بھر کھانا جیل میں نہیں ملتا لیکن جیل میں قاتل، چور بھی ہیں اور بے قصور پھنسے ہوئے بھی ہیں، فرمائیے کیا حکم ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

نفلی صدقات سے قیدیوں کو کھلانا جائز ہے، زکوٰۃ میں یہ تفصیل ہے کہ اگر قیدی صاحب نصاب نہ ہوں اور ان کو کھانے کا مالک بنادیا تو زکوٰۃ ادا ہوجائے گی، اور اگر اباحۃً کھلایا، مالک نہیں بنایا تو زکوٰۃ نہیں ہوئی، اس لئے کہ زکوٰۃ میں تملیک فقیر شرط ہے، فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۲ ذیقعدہ ۹۹ھ

وکیل زکوٰۃ اپنے نفس پر خرچ نہیں کرسکتا:

سوال: زید ایک معزز علمی گھرانے سے تعلق رکھتا ہے، یتیم ہوجانے کی بناء پر مالی حالات ناگفتہ بہ تھے اور ہیں، معہذا زید نے دینی تعلیم مکمل حاصل کرکے ایک دینی ادارہ سے وابستگی اختیار کی، اور ایک مسجد میں امامت کے فرائض انجام دینے لگا، والدہ، ہمشیر اور بھائی کا کفیل ہونے کی بناء پر کچھ مقروض بھی ہے، زید کو کبھی کبھار لوگ صدقات واجبہ یا نافلہ دیتے ہیں جو یہ کہہ دیں کہ مدرسہ کو دیدینا، زید مدرسہ میں دیدیتا ہے، جو یہ کہیں کہ کسی طالب علم کو دیدینا، وہ اپنی صوابدید پر کسی طالب علم کو دیدیتا ہے، کبھی کوئی یوں کہہ دیتا ہے کہ جیسے آپ مناسب سمجھیں دیدیں یا جو آپ کے نزدیک مستحق ہو اسے دیدیں، کسی سے بے تکلفی کی بناء پر زید یوں بھی تصریح کرالیتا ہے کہ جو مستحق ہو اسے دیدوں؟ طالب علم ہو یا غیر طالب علم، وہ یہ کہہ دیتا ہے جی ہاں جسے چاہیں دیدیں، ایک آدمی سے خود زید کہتا ہے کہ آپ مجھے پیسے دیدیں میں ان شاء اللہ صحیح مصرف میں صرف کردوں گا وہ دیدیتا ہے، مذکورہ رقوم سے زید کچھ تو مصارف میں صرف کردیتا ہے، کچھ اپنی ناداری اور افلاس اور مدیون ہونے کی بناء پر خود استعمال کرلیتا ہے، زید نے یہ مسئلہ سنا ہوا تھا کہ اگر معطی کہہ دے جسے چاہو دیدو، تو مستحق ہونے کی بناء پر وکیل خود بھی رکھ سکتا ہے، اب زید کو احساس ہوا کہ شامی کے جزئیہ مذکورہ حیث شئت کا یہ مفہوم نہیں، زید متفکر و مغموم ہے کہ یہ میں نے کیا کیا، نہ تو حساب یاد ہے کہ کس کے کتنے پیسے خود صرف کئے، اور کتنے پیسے دیئے، غلبۂ ظن سے تخمینہ بھی لگایا جائے تو پیسے کہاں؟ اور نہ ہی معطین کو آگاہ کیا جاسکتا ہے، یہ تو موت سے بھی زیادہ مشکل ہے، زید کی ظاہری سلامت روی اور نیک چلنی کی بناء پر لوگ اسے اچھا تصور کرتے ہیں ؎

یظن الناس بی خیراً وانی ÷ لشر الناس ان لم یعف عنی

بعد از تفصیل مذکور سوالات یہ ہیں:

(۱) اگر معطین کی زکوٰۃ ادا نہیں ہوئی تو اب کیا کیا جائے؟

(۲) ضماحیث شکست کا مفہوم ادا کرنے کے لئے اردو میں کونسا لفظ بولا جائے گا؟

(۳) خصوصیت سائل کی بنا پر گزشتہ معافی کی صورت نکل آئے اگر گزشتہ اصلاحات آئندہ "احتیاط" پر عمل کیا جائے، نہ ہو تو تلافی کیسے کی جائے، سائل انتہائی غریب ہے، اگر گزشتہ کے لئے کسی قول پر توسع ہو سکتا ہو تو دریغ نہ فرمائیں اعطاک اللہ اجرین مرتین۔

نوٹ:- جسے چاہے دیدو کہتے وقت معطی کے ذہن میں ہوتا ہے کہ آگے دے گا، آخذ کے ذہن میں ہوتا ہے کہ اس سے میرے لئے بھی گنجائش نکل آئی، یہ تضاد اگر اثر انداز ہو تو اسے بھی ذہن میں رکھیں، بہشتی زیور اختری ص ۱۲ ج ۳ میں ہے "البتہ اگر تم نے یہ کہہ دیا ہو کہ جو چاہو کرو اور جسے چاہے دیدو تو آپ بھی لے لینا درست ہے" اور "جسے چاہے دیدو" اگر علت تفسیری ہو تو ظاہر ہے، بصورت دیگر یہ کس کا ترجمہ ہے، جبکہ شامیہ میں جزئیہ مذکور ہو۔ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

اس صورت میں زکوٰۃ نہیں ہوئی، ضماحیث شکست کا ترجمہ ہے "جہاں چاہو خرچ کرو" یہ جملہ تملیک ہے اور "جسے چاہو دیدو" توکیل ہے، عرف عام میں بہشتی زیور کے دوسرے جملہ کو جملہ اولیٰ پر تفریع قرار دیا جاتا ہے، یعنی بعد تملیک چاہو اپنے مصرف میں لاؤ یا دوسرے کو دیدو، گزشتہ کی تلافی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی، یہ صرف تدبیر ہو سکتی ہے کہ مزکی سے کہے کہ "نا علمی کی وجہ سے رقم غیر مصرف میں لگ گئی ہے جس کا ضمان مجھ پر واجب ہے، اور میرے اندر اتنی استطاعت نہیں کہ آپ کا یہ قرض ادا کر سکوں، اس لئے آپ مجھے اتنی رقم بمد زکوٰۃ دے کر بمد قرض مجھ سے واپس لے لیں" فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۸ ذیقعدہ سنہ ۹۱ھ

وکیل زکوٰۃ اپنے ذی رحم کو دے سکتا ہے:

سوال: اگر کسی کو زکوٰۃ دینے کے لئے وکیل بنایا گیا، یہ وکیل اپنے ذی رحم کو دے سکتا ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

دے سکتا ہے، قال فی الدر وللوکیل ان یدفع لولدہ الفقیر وزوجته

لا لنفسه الا اذا انالہ دبھا فیصرفھا حیث شئت، وفی الشامیۃ قولہ لولدہ الفقیر واذا کان ولدہ صغیرا فلابد من کونہ ھو فقیرا ایضا لان الصغیر یعد غنیا بغنی ابیہ افادہ ط عن ابی السعود، (رد المحتار ص ۱۳ ج ۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۱۴ محرم سنہ ۱۴۰۰ھ

زکوٰۃ میں مال تجارت کی قیمت فروخت لگائی جائے گی:

سوال: تجارت کا سامان کپڑا وغیرہ کا حساب لگاتے وقت خریدے ہوئے حساب سے یا کہ جس نرخ پر بیچے اس حساب سے زکوٰۃ ادا کرے گا؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

قیمت فروخت لگائی جائے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۹ شعبان سنہ ۱۴۰۰ھ

برائے فروخت تعمیر کردہ مکانوں پر زکوٰۃ ہے:

سوال: جو زمین یا مکانات تجارت کے لئے خریدے گئے ہوں یا برائے فروخت تعمیر کئے ہوں، ان کے اصل سرمایہ پر زکوٰۃ ہوگی یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

تجارت کی نیت سے خرید کردہ زمین اور مکان اور برائے فروخت تعمیر کردہ مکانات کی موجودہ قیمت پر زکوٰۃ فرض ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۹ شعبان سنہ ۱۴۰۰ھ

چندہ کی رقم پر زکوٰۃ:

سوال: کسی قوم کے فنڈ یا چندہ سے بیس ہزار ۲۰۰۰۰ روپے جمع ہیں، اس لئے جمع کیا ہے کہ کسی تعمیر یا دوسرے خرچ کی جائے، اس پر زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟ یہ رقم کسی ایک فرد کی نہیں بلکہ برادری کا چندہ ہے، بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

اگر یہ رقم مد زکوٰۃ سے جمع کی گئی ہے تو اس پر زکوٰۃ فرض نہیں، اور مد عطیہ سے ہے تو اس پر زکوٰۃ فرض ہے، البتہ مسجد یا مدرسہ وغیرہ کی مد عطیہ پر زکوٰۃ نہیں، اس کی تفصیل میرے رسالہ "الکلام البدیع فی احکام التوزیع" مندرجہ احسن الفتاوی جلد اول

یہ ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۷ رمضان سنہ ۱۴۰۰ھ

کسی کی طرف سے بلا اجازت زکوٰۃ دی تو ادا نہیں ہوئی:

سوال: اگر کسی نے کسی سے کچھ نہیں کہا، اس نے بلا اجازت کے اس کی زکوٰۃ ادا کر دی تو زکوٰۃ ادا ہوگئی یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

زکوٰۃ نہیں ہوئی، اگر وہ بعد میں اجازت بھی دیدے تب بھی درست نہیں، اور جتنی رقم اس کی طرف سے دی ہے اس کو اس سے وصول کرنے کا بھی حق نہیں، لقول ابن عابدین رحمہ اللہ تعالیٰ عن البحر لو ادی زکوٰۃ غیرہ بغیر امرہ فبلغہ فاجاز لم یجز لانہا وجدت نفاذا علی المتصدق لانہا ملکہ ولم یصر نائبا عن غیرہ فنفذت علیہ (رد المحتار ص ۱۲ ج ۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲۸ رجب سنہ ۱۴۰۱ھ

مرغی خانہ اور مچھلی کے تالاب پر زکوٰۃ:

سوال: مرغی خانہ اور مچھلی کا تالاب تجارت کی غرض سے ہو تو اس پر زکوٰۃ ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

مرغی خانہ اور مچھلی کے تالاب کی زمین، مکان اور متعلقہ سامان پر زکوٰۃ نہیں، مرغیاں اور چوزے خریدتے وقت اگر خود انہی کو بیچنے کی نیت ہو تو ان کی مالیت پر زکوٰۃ فرض ہے، اور اگر ان کی بجائے ان کے انڈے اور بچے بیچنے کی نیت ہے تو زکوٰۃ نہیں۔

تالاب میں مچھلیاں یا اُن کے بچے خرید کر ڈالے ہوں تو اُن کی مالیت پر زکوٰۃ فرض ہے، ورنہ نہیں، مرغی خانہ اور تالاب کی آمدنی پر بہرصورت زکوٰۃ ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲۵ ذی الحجہ سنہ ۱۴۰۲ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب

بینک اکاؤنٹس

سے

حکومت کا زکوٰۃ وصول کرنا

از

مجلس تحقیق مسائل حاضرہ کراچی

بینک اکاؤنٹس سے حکومت کا زکوٰۃ وصول کرنا

از مجلس تحقیق مسائل حاضرہ کراچی

تحریر مولانا محمد تقی عثمانی

زکوٰۃ وعشر آرڈیننس عوام کے لئے ایک بالکل نئی بات تھی، عرصۂ دراز تک غیر مسلم حکومت کے تسلط کی وجہ سے مسلمانوں کے ذہن میں یہ بات راسخ ہو چکی تھی کہ نماز روزہ اور زکوٰۃ وعشر جیسی عبادات میں حکومت کا ان سے کوئی تعلق نہیں، علاوہ ازیں حکومت کے کارندوں کی نااہلیت، بے دینی اور بددیانتی کے پیش نظر زکوٰۃ وعشر کی رقوم صحیح شرعی مصارف پر صرف ہونے سے متعلق بجا طور پر شکوک وشبہات ابھرے، ملک بھر کے معروف ومستند دار الافتاؤں کے پاس اس بارہ میں سوالات کا تانتا بندھ گیا، مجلس تحقیق مسائل حاضرہ کراچی نے مسئلہ کی اہمیت اور عوام کے انتشار کے پیش نظر فوری اجتماعی غور کا اقدام کیا، جس کی تفصیل آپ کے سامنے ہے۔ (مرتب)

الحمد للہ وکفی وسلام علی عبادہ الذین اصطفی، اما بعد، مجلس تحقیق مسائل حاضرہ نے اپنے ۱۷ شعبان ۱۴۰۰ھ کے اجلاس میں زکوٰۃ وعشر آرڈیننس پر تبصرہ کرتے ہوئے جو تحریر مرتب کی تھی اسے اظہار رائے کے لئے ملک بھر کے معروف اہل فتویٰ علماء کی خدمت میں بھیج دیا گیا تھا، الحمد للہ! ان میں سے بیشتر حضرات نے اس تحریر پر اصل مسئلے میں کسی ترمیم کے بغیر مجلس کی آراء سے اتفاق کرتے ہوئے تصدیقی دستخط ثبت فرما دیئے، اور چار حضرات نے بعض نکات سے اختلاف فرمایا یا اپنے تردد کا اظہار کیا ہے، اس سلسلہ میں ان حضرات کے دلائل یا شبہات پر مجلس نے دوبارہ غور کیا، لیکن غور وتحقیق کے بعد اس مسئلہ میں مجلس کی رائے تبدیل نہیں ہوئی، لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلہ پر قدرے تفصیل کے ساتھ گفتگو کی جائے۔

بینک اکاؤنٹس اور دیگر مالیاتی اداروں سے زکوٰۃ وصول کرنے پر جن شبہات کا اظہار کیا گیا ہے بنیادی طور پر وہ تین شبہات ہیں:

① حکومت کو صرف اموال ظاہرہ سے زکوٰۃ وصول کرنے کا حق ہے، اموال باطنہ سے زکوٰۃ وصول کرنے کا حق حکومت کو نہیں ہے، بلکہ مالکان پر ان کی زکوٰۃ کی ادائیگی اپنے طور پر فرض ہے، اور نقود چونکہ اموال باطنہ میں سے ہیں اس لئے بینک اکاؤنٹس بھی اموال باطنہ میں سے

ہونے، اُن سے حکومت کو زکوٰۃ وصول کرنے کا حق نہیں ہے،

② بینک اکاؤنٹس درحقیقت بینک کے ذمہ اکاؤنٹ ہولڈروں کا قرض ہے، جب یہ رقم مالک نے بینک کو دیدی تو وہ اس کی ملکیت سے نکل گئی اور بینک کی ملکیت میں داخل ہوگئی، اب اصل مالک پر زکوٰۃ اُس وقت واجب ہوگی جب وہ بینک سے اس کو واپس وصول کریگا، اس سے پہلے جو زکوٰۃ بینک اکاؤنٹس سے وضع کی جارہی ہے، وہ وجوب ادا سے پہلے ایک ایسے مال سے وصول کی جارہی ہے، جس پر زکوٰۃ واجب الادا نہیں اور جو اکاؤنٹ ہولڈر کی ملکیت نہیں ہے، لہٰذا اس کا کوئی جواز نہیں ہے،

③ زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے ادا کنندہ کا نیت کرنا ضروری ہے، اور بینک اکاؤنٹس میں زکوٰۃ وضع کرتے وقت مالک کی نیت بسا اوقات نہیں ہوتی،

ان تینوں مسائل پر قدرے تفصیل کے ساتھ ذیل میں بحث کی جاتی ہے، واللہ سبحانہ الموفق،

اموالِ ظاہرہ اور اموالِ باطنہ:

جیسا کہ مجلس کی سابق تحریر میں امام ابوبکر جصاص رحمہ اللہ علیہ اور دوسرے فقہاء کرام کی تصریحات کے حوالے سے عرض کیا گیا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے عہدِ مبارک میں اموالِ ظاہرہ اور اموالِ باطنہ کی کوئی تفریق نہیں تھی بلکہ ہر قسم کے قابلِ زکوٰۃ اموال سے زکوٰۃ سرکاری سطح پر وصول کی جاتی تھی، لیکن حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں جب اموال اور آبادی کی کثرت ہوگئی، اور اندیشہ ہوا کہ لوگوں کے نجی مکانات وغیرہ میں زکوٰۃ کے کارندوں کی مداخلت سے لوگوں کو تکلیف ہوگی، اور اس سے فتنے پیدا ہوں گے، تو آپ نے صرف اموالِ ظاہرہ کی زکوٰۃ کی تحصیل سرکاری سطح پر باقی رکھی، اور اموالِ باطنہ کی زکوٰۃ کی ادائیگی میں مالکان کو حکومت کا نائب بنادیا،

حضراتِ فقہاء کرام کی تصریحات کی روشنی میں یہ عرض کیا گیا تھا کہ کسی مال کے اموالِ ظاہرہ میں سے ہونے کے لئے دو امور ضروری ہیں، ایک یہ کہ اُن اموال کی زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے مالکان کے نجی مقامات کی تفتیش کرنی نہ پڑے، دوسرے یہ کہ وہ اموال حکومت کے زیرِ حمایت ہوں، پھر عرض کیا گیا تھا کہ بینکوں اور دوسرے مالیاتی اداروں میں رکھوائی ہوئی رقموں میں یہ دونوں امور موجود ہیں، لہٰذا اُن کو اموالِ ظاہرہ کے حکم میں شمار کیا جاسکتا ہے،

بینک اکاؤنٹس ——— – – ۳

اس پر بعض حضرات نے یہ اعتراض کیا ہے کہ کسی مال کے ظاہر ہونے کی اصل علت "خروج عن المصر" ہے چونکہ اس دور میں شہر کے ناکوں پر حکومت کی طرف سے عاشر اسی لئے بٹھائے جاتے تھے کہ وہ گزرنے والوں کی جان و مال کی حفاظت کریں، اس لئے شہر سے نکل کر تمام اموال حکومت کے زیر حمایت آجاتے تھے، اور اس بنا پر حکومت اُن کی زکوٰۃ وصول کرتی تھی، نجی مقامات کی تلاشی اور تفتیش کی ضرورت نہ ہونا اس حکم کی حکمت ہے، علت نہیں، لہٰذا حکم کا مدار "خروج عن المصر" پر ہوگا، اور چونکہ یہ علت بینکوں اور مالیاتی اداروں میں نہیں پائی جاتی، اس لئے اُن کو اموالِ ظاہرہ میں داخل کرکے ان سے سرکاری سطح پر زکوٰۃ وصول کرنا درست نہیں۔

مجلس نے اس نقطۂ نظر پر مکرر غور کیا، اور اس مسئلہ میں فقہ اور حدیث کے متعلقہ مواد کو سامنے رکھا، لیکن غور اور تحقیق کے بعد یہ نتیجہ سامنے آیا کہ سرکاری سطح پر زکوٰۃ کی وصولی کے لئے "خروج عن المصر" کو علت قرار دینا اور اس پر حکم کا مدار رکھنا درست نہیں، بلکہ اصل علت وہی ہے کہ وہ اموال ایسے ہوں جن سے زکوٰۃ کی وصولی کے لئے نجی مقامات کی تفتیش کی ضرورت نہ ہو، اس کے دلائل مندرجہ ذیل ہیں:۔

حدیث اور فقہ کی کتابوں سے یہ بات ثابت ہے کہ حضرات خلفاء راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور بعد کے خلفاء و اُمراء سالانہ تنخواہوں اور وظائف کی تقسیم کے وقت انہی تنخواہوں اور وظائف سے زکوٰۃ کاٹ لیا کرتے تھے اور اس پر صحابہ و تابعین اور دوسرے فقہاء نے نہ صرف یہ کہ کوئی نکیر نہیں فرمائی بلکہ اس طریقہ کی تصدیق و تائید فرمائی ہے، چنانچہ موطا امام مالک میں یہ روایت ہے:

قال القاسم بن محمد وکان ابوبکر الصدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اذا اعطی الناس اعطیاتهم سأل الرجل هل عندک من مال وجبت علیک فیه الزکوٰة فان قال نعم اخذ من عطائه زکوٰة ذلک المال وان قال لا، سلم الیه عطاءه ولم یأخذ منه شیئا (موطا امام مالک ص ۱۰۲ و ۱۰۳، الزکوٰة فی العین من الذهب والورق ومصنف ابن ابی شیبة ص ۱۸۴ ج ۳، ما قالوا فی العطاء اذا اخذ، ومصنف عبد الرزاق ص ۷۶ ج ۴ وکتاب الاموال لابی عبید ۴۱۱)۔

اور امام ابو عبید رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس روایت کے یہ الفاظ نقل فرمائے ہیں: فاِن اخبرہ ان

عندہ مالا قد حلت فیہ الزکوٰۃ فاقتصہ مما یرید ان یعطیہ وان اخبرہ ان لیس عندہ مال قد حلت فیہ الزکوٰۃ سلم الیہ عطاءہ (کتاب الاموال لابی عبید ص ۴۱۲ فقرہ ۱۲۴۵، باب فروض زکوٰۃ الذہب والورق)

نیز امام ابن ابی شیبہ نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ قول نقل فرمایا ہے: عن عبد الرحمٰن ابن عبد القاری وکان علی بیت المال فی زمن عمر مع عبد اللہ بن الارقم: فاذا خرج العطاء جمع عمر اموال التجارۃ فحسب عاجلھا وآجلھا ثم یأخذ الزکوٰۃ من الشاھد والغائب (مصنف ابن ابی شیبہ ص ۱۸۳ ج ۳)

اور امام ابو عبید نے یہ روایت ان الفاظ کے ساتھ نقل فرمائی ہے: فکان اذا خرج العطاء جمع اموال التجار ثم حسبھا شاھدھا وغائبھا ثم اخذ الزکوٰۃ من شاھد المال علی الشاھد والغائب (کتاب الاموال ص ۵۲۹ فقرہ ۱۱۸۰، باب الصدقۃ فی التجارات والدیون)

حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کے راویوں کی تحقیق کے بعد لکھا ہے کہ "وسندہ حسن" (اعلاء السنن ص ۳۰ ج ۱۲، کتاب السیر، باب العطاء یورث صاحبہ بعد ما یستوجبہ)

پھر حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے بارے میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اُن کے دور میں اموال ظاہرہ اور اموال باطنہ کی کوئی تفریق نہ تھی، اس لئے وہ ہر قسم کے اموال سے زکوٰۃ وصول فرماتے تھے، لیکن روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ جنھوں نے یہ تفریق قائم فرمائی تھی، اُن کے دور میں بھی تنخواہوں سے زکوٰۃ وضع کرنے کا یہ سلسلہ جاری رہا، چنانچہ موطا امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ میں مروی ہے: عن عائشۃ بنت قدامۃ عن ابیھا انہ قال کنت اذا جئت عثمان بن عفان اقبض عطائی سألنی ھل عندک من مال وجبت فیہا الزکوٰۃ؟ قال فان قلت نعم اخذ من عطائی زکوٰۃ ذلک المال وان قلت لا دفع الی عطائی (موطا امام مالک ص ۲۳۰، ومصنف عبد الرزاق ص ۷۰ ج ۴ حدیث نمبر ۷۰۲۹، وکتاب الام للشافعی ص ۱۴ ج ۲ طبع بولاق، وکتاب الاموال لابی عبید ص ۴۱۳ فقرہ ۱۲۴۶)۔

نیز بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں بھی تنخواہ سے زکوٰۃ وضع کرنے کا یہ سلسلہ جاری رہا، البتہ اُن کے بارے میں یہ صراحت ملتی ہے کہ وہ

صرف اُن لوگوں کے اموالِ باطنہ کی زکوٰۃ وصول کرتے تھے جن کی تنخواہیں یا وظائف بیت المال سے جاری ہوں، دوسرے لوگوں کی نہیں، (مصنف ابن ابی شیبہ ص ۱۸۳ ج ۳) حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بھی یہی عمل تھا، (موطا امام مالک ص ۲۷۳) ابن عباس رضی اللہ عنہما بھی اسی کے قائل تھے (حاشیہ موطا امام مالک ص ۲۷۳)

نیز حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ وہ تنخواہیں تقسیم کرتے وقت خود تنخواہ کی زکوٰۃ بھی اُسی تنخواہ میں سے وصول فرما لیتے تھے چنانچہ مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے: عن هبيرة قال كان ابن مسعود يزكي عطيا تهم من كل الف خمسة وعشرين (مصنف ابن ابی شیبہ ص ۱۸۴ ج ۳)

حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کے راویوں کی تحقیق فرمانے کے بعد فرمایا ہے کہ: "والاسناد حسن" (اعلاء السنن ص ۲۲۹ و ۲۳۰ ج ۱۲)

البتہ چونکہ یہاں زکوٰۃ خود تنخواہوں کی وصول کی جاتی تھی جو صاحبِ تنخواہ کی ملکیت میں قبضہ کرنے کے بعد آتی ہے، اس لئے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا طریقہ کار یہ تھا کہ وہ پہلے تنخواہ دیدیتے، پھر اس سے زکوٰۃ وصول فرماتے تھے، چنانچہ مصنف عبدالرزاق میں ہے: عن هبيرة بن يريم عن عبد الله بن مسعود قال كان يعطي ثم يأخذ زكوته (مصنف عبدالرزاق ص ۷۸ ج ۴ حدیث نمبر ۷۰۳۲، باب لا صدقة في مال حتى يحول عليه الحول) اور معجم طبرانی میں اس روایت کے الفاظ یہ ہیں: كان يعطي العطاء ثم يأخذ زكوته، اور علامہ نور الدین ہیثمی نے مجمع الزوائد میں اس روایت کو نقل کرکے لکھا ہے: رجاله رجال الصحيح خلا هبيرة وهو ثقة،

نیز امام ابو عبید رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کو زیادہ تفصیل اور وضاحت سے نقل فرمایا ہے: عن هبيرة بن يريم قال كان عبد الله بن مسعود يعطينا العطاء في زبل صغار ثم يأخذ منه الزكوة (کتاب الاموال ص ۴۳۲ فقرہ ۱۲۸۰ باب فرض زكوة الذهب والورق) تنخواہوں اور وظائف سے زکوٰۃ وصول کرنے کا سلسلہ خلفاء راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے بعد بھی جاری رہا، چنانچہ مصنف ابن ابی شیبہ میں روایت ہے: عن ابن عون عن محمد قال رأيت الامراء اذا اعطوا العطاء زكوه (مصنف ابن ابی شیبہ ص ۱۸۵ ج ۳)

حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ تعالیٰ کے زمانے میں اگرچہ اموال ظاہرہ و باطنہ کی تفریق ختم ہو چکی تھی لیکن آپ کے بارے میں بھی مروی ہے، عن عمر بن عبد العزیز انہ کان یزکی العطاء والجائزۃ (بحوالہ بالا)

اور مصنف عبد الرزاق میں اس روایت کے الفاظ یہ ہیں، عن جعفر بن برقان ان عمر بن عبد العزیز کان اذا اعطی الرجل عطاءہ او عمالتہ اخذ منہا الزکوٰۃ (مصنف عبد الرزاق ص ۸۰ ج ۴ فقرہ ۷۰۰۴)

یہ معاملہ صرف تنخواہوں اور وظائف کی حد تک محدود نہیں تھا بلکہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ بیت المال پر جس کسی مسلمان کا کوئی مالی حق ہوتا تو اس کی ادائیگی کے وقت اس کی زکوٰۃ وصول کرنے کا معمول قرون اولیٰ میں جاری تھا چنانچہ مصنف ابن ابی شیبہ اور سنن بیہقی میں مروی ہے، عن عمرو بن میمون قال اخذ الوالی فی زمن عبد الملک[1] مال رجل من اهل الرقة يقال له ابو عائشة عشرين الفاً فادخلت في بيت المال، فلما ولي عمر بن عبد العزيز اتاه ولده، فرفعوا مظلمتهم اليه فكتب الى ميمون ادفعوا اليهم اموالهم وخذوا زكوة عامه هذا، فلولا انه كان مالاً ضماراً اخذنا منه زكوة ما مضى (مصنف ابن ابی شیبہ ص ۲۰۶ ج ۳، ما قالوا فی الرجل یکون له المال السنین واخرجه ایضا البیهقی فی السنن الکبری ص ۱۵۰ ج ۴)

حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کی سند کی تحقیق فرما کر ثابت فرمایا ہے کہ اس کے رجال ثقات ہیں اور سند متصل ہے، (اعلاء السنن ص ۹ ج ۹، باب لا زکوٰۃ فی المال الضمار)۔ نیز یہی واقعہ اجمالی طور پر دوسری سند سے موطا امام مالک میں بھی مروی ہے اور اس میں بھی ایک سال کی زکوٰۃ وصول کرنے کا ذکر موجود ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں، ان عمر بن عبد العزیز کتب فی مال قبضه بعض الولاة ظلماً يأمر برده الى اهله ويؤخذ زكوته لما مضى من السنين ثم عقب بعد ذلك بكتاب ان لا يؤخذ منه الزكوة الا[2] زكوة واحدة فانه كان ضماراً (موطا امام مالک، الزکوٰۃ فی الدین)

---

[1] مصنف ابن ابی شیبہ کے مطبوعہ نسخہ میں عبد الملک لکھا ہے، لیکن دوسرے نسخوں میں اور دوسری کتابوں میں ولید بن عبد الملک کا ذکر ہے، اور وہی صحیح ہے ۱۲

[2] بعض ہندوستانی نسخوں میں لفظ "الا" کاتب کی غلطی سے حذف ہو گیا ہے، صحیح عبارت وہی ہے جو اوپر لکھی گئی (اوجز المسالک ص ۱۲۲ ج ۳)۔

ان تمام واقعات میں نقد روپیہ کی زکوٰۃ سرکاری طور پر وصول کی گئی ہے، اور وہ بھی عاشر پر گذرنے کی صورت میں نہیں، اور نہ مال کے شہر سے باہر ہونے کی حالت میں، بلکہ حضرت ابی بکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا طرز عمل تو یہ تھا کہ وہ تنخواہیں جاری کرتے وقت اُن اموال کی زکوٰۃ اُن تنخواہوں سے وصول فرماتے تھے جو تنخواہ داروں کے گھروں، دُکانوں یا دوسرے مقامات پر اُن کی ملکیت میں ہوتے تھے، یہ حضرات واجب الاداء زکوٰۃ تنخواہ سے کاٹ کر باقی تنخواہ لوگوں کے حوالے کیا کرتے تھے، اور حضرت علی، حضرت عبد اللہ بن مسعود اور حضرت عمر بن عبد العزیز انہی تنخواہوں کی زکوٰۃ وصول فرماتے تھے، کیونکہ اگر مالک پہلے سے صاحب نصاب ہو تو تنخواہ کی اس رقم پر مال مستفاد ہونے کی وجہ سے زکوٰۃ واجب ہوتی تھی، البتہ یہ حضرات تنخواہوں سے زکوٰۃ کاٹنے کی بجائے پہلے تنخواہ حوالے فرما دیتے، پھر مالک سے زکوٰۃ وصول فرماتے تھے، بہرصورت اس نقد رقم سے سرکاری طور پر زکوٰۃ وصول کی جاتی تھی اور یہ سلسلہ اموال ظاہرہ و باطنہ کی تفریق قائم ہونے کے بعد بھی جاری رہا، بلکہ حضرت عمر ابن عبد العزیز نے اُن رقوم سے بھی زکوٰۃ وصول فرمائی جو بیت المال میں غلطاً داخل کر دی گئی تھیں۔

اس طریق کار سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ کسی مال کے اموال ظاہرہ میں شمار ہونے اور اس سے سرکاری سطح پر زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے اس کا شہر سے باہر لے جانا ضروری نہیں بلکہ اصل بات یہ ہے کہ اس سے زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے نجی مقامات کی تلاشی یا تفتیش کی ضرورت پیش نہ آئے، اور وہ کسی طرح حکومت کے زیر حفاظت آ گئے ہوں۔

تنخواہوں وغیرہ سے زکوٰۃ وصول کرنے کا یہ طریقہ اس دور میں بھی بلانکیر جاری رہا ہے اور خود فقہاء حنفیہ نے بھی ان واقعات کو نقل کر کے اس کی تصدیق و تائید فرمائی ہے، چنانچہ حضرت ابو بکر اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا تنخواہوں اور وظائف سے زکوٰۃ وصول کرنا خود امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے بھی نقل فرمایا ہے اور لکھا ہے: قال القاسم وکان ابوبکر اذا اعطی الناس اعطیاتہم یسأل الرجل ہل عندک من مال قد وجبت فیہ الزکوٰۃ، فان قال نعم اخذ من عطائہ زکوٰۃ ذلک المال، وان قال لا سلم الیہ عطاءہ. قال محمد وبہذا ناخذ، وہو قول ابی حنیفۃ رحمہ اللہ تعالیٰ (موطا امام محمد، باب الرجل یکون علیہ الدین ہل علیہ فیہ الزکوٰۃ) اور اس کے بعد حضرت عثمان

———— [illegible]

کے بارے میں جو حضرت قدامہ کی وہ روایت نقل کی ہے جو پیچھے موطا امام مالک وغیرہ کے حوالے سے گزر چکی ہے،

نیز علامہ ابن ہمام اور شمس الائمہ سرخسی رحمہما اللہ نے حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کا وہ مشہور واقعہ جس میں غصب شدہ مال کو واپس کرتے ہوئے اس سے زکوٰۃ وصول کرنے کا ذکر ہے ذکر فرما کر اس سے مال ضمار پر زکوٰۃ واجب نہ ہونے کے مسئلہ میں استدلال فرمایا ہے، (فتح القدیر ص ۴۹۰ ج ۱ اور المبسوط للسرخسی ص ۱۷۱ ج ۲) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مال سے ایک سال کی جو زکوٰۃ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے وصول فرمائی وہ حنفیہ کے نزدیک بھی معمول بہ ہے، ورنہ وہ اس کی تردید یا توجیہ فرماتے،

بلکہ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک عبارت سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اموال باطنہ کی زکوٰۃ کے بارے میں بھی حنفیہ کے نزدیک امام کو مکمل اختیار ہے کہ وہ چاہے تو ان کی زکوٰۃ کی وصول یابی کے لئے مصدق بھیج کر سرکاری سطح پر ان کی زکوٰۃ وصول کرے، اور چاہے تو مالکوں کے حوالے کر دے کہ وہ اپنے طور پر زکوٰۃ ادا کر دیں، چنانچہ انھوں نے شرح معانی الآثار میں ایک مستقل باب قائم فرمایا ہے، "باب الزکوٰۃ هل للامام ان يأخذها ام لا؟" اور اس میں اپنے مسلک پر مسلمانوں نقطہ نظر بیان فرمانے کے بعد آخر میں لکھا ہے: واما وجهه من طريق النظر فانا قد رأيناهم اجمعهم لا يختلفون ان للامام ان يبعث الى ارباب المواشي السائمة حتى يأخذ منهم صدقة مواشيهم اذا وجبت فيها الصدقة وكذلك يفعل في ثمارهم، ثم يضع ذلك في مواضع الزكوات على ما امر به عز وجل، لا يأبى ذلك احد من المسلمين، فالنظر على ذلك ان يكون بقية الاموال من الذهب والفضة واموال التجارات كذلك ...... وهذا كله قول ابي حنيفة وابي يوسف ومحمد رحمهم الله تعالى (شرح معانی الآثار للطحاوی ص ۳۰۲، ۳۰۳ ج ۱) یہاں امام طحاوی نے کسی قید و شرط کے بغیر امام کا یہ حق بیان فرمایا ہے کہ وہ سونا چاندی اور مال تجارت سے زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے مصدق بھیج سکتا ہے، یہاں انھوں نے مصر یا غیر مصر کی بھی کوئی شرط نہیں لگائی، اور نہ عاشر کے پاس گزرنے کا کوئی ذکر فرمایا ہے، امام طحاوی کی عبارت کا یہ اطلاق فقہاء حنفیہ کی دوسری تصریحات سے بظاہر معارض معلوم ہوتا ہے، اور مذکورہ بالا عبارت کے سیاق و سباق میں یہ احتمال بھی موجود ہے کہ ان کی یہ ساری گفتگو "مامر على العاشر"

سے متعلق ہو، لیکن جہاں تک مذکورہ عبارت کا تعلق ہے اس میں کوئی قید یا شرط نہیں ہے، ہو، وجہ النظر بھی اطلاق کو مقتضی ہے، اس سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ امام طحاوی کا مقصد یہ ہے کہ ان اموالِ باطنہ سے بھی زکوٰۃ وصول کرنے کا حق حنفیہ کے نزدیک اصلاً امام کو ہے، البتہ اُس مصلحت کے پیش نظر جو حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پیش نظر تھی، جہاں لوگوں کے مخفی مقامات کی تلاشی یا پڑتال کی ضرورت پڑتی ہو وہاں مالکوں کو خود زکوٰۃ ادا کرنے کی اجازت دیدی گئی ہے، اور جہاں یہ مصلحت داعی نہ ہو وہاں وہ اپنے اصل حق کے مطابق زکوٰۃ وصول کر سکتا ہے، چونکہ عاشر پر گذرنے والے اموال میں اس قسم کا کوئی مفسدہ نہیں ہے، اس لئے وہ اپنے اصل حق کے مطابق اُن سے زکوٰۃ وصول کر سکتا ہے، اور اگر کچھ مزید اموال ایسے ہوں جن سے زکوٰۃ وصول کرنے میں یہ مفسدہ نہ ہو وہاں بھی امام کا اصل حق عود کر آئے گا، اور وہ اُن اموال سے زکوٰۃ وصول کرے گا جس کی نظیریں تنخواہوں، وظائف اور مالِ مغصوب کے سلسلے میں پیچھے گذر چکی ہیں، بلکہ اگر کسی جگہ یہ معلوم ہو کہ لوگ اموالِ باطنہ کی زکوٰۃ نہیں دے رہے ہیں وہاں اس مفسدہ کے باوجود امام اپنے اصل حق کے مطابق اُن اموال کی زکوٰۃ وصول کرے گا، کیونکہ ترکِ زکوٰۃ کا مفسدہ اس مفسدہ سے شدید تر ہے، یہی بات تقریباً تمام فقہاء حنفیہ نے تحریر فرمائی ہے، مثلاً علامہ ابن ہمام تحریر فرماتے ہیں:

"ظاهر قوله تعالى خذ من أموالهم صدقة الآية توجب أخذ الزكاة مطلقا للإمام، وعلى هذا كان رسول الله صلى الله عليه وسلم والخليفتان بعده، فلما ولي عثمان وظهر تغير الناس كره أن يفتش السعاة على الناس مستور أموالهم، ففوض الدفع إلى الملاك نيابة عنه، ولم يختلف الصحابة في ذلك عليه، وهذا لا يسقط طلب الإمام أصلا، ولهذا لو علم أن أهل بلدة لا يؤدون زكاتهم طالبهم بها" (فتح القدير ص ۴۸۷ ج ۱) اس عبارت سے واضح ہے کہ اصلاً تمام اموال کی زکوٰۃ وصول کرنے کا حق امام ہی کو ہے، اور اموالِ باطنہ کے سلسلے میں یہ حق ایک مصلحت سے چھوڑا گیا ہے، اور بالکلیہ بھی ساقط نہیں ہوا، بلکہ اُن اموال کی زکوٰۃ جو مالکان ادا کرتے ہیں وہ بھی امام کے نائب کی حیثیت میں ادا کرتے ہیں، اصلاً اُن کو یہ اختیار بھی نہیں تھا، اور اسی لئے اموالِ باطنہ کی زکوٰۃ کے دین کو فقہاء نے لہ مطالب من جہۃ العباد قرار دیا ہے۔

یہاں بعض حضرات کو یہ شبہ پیش آیا ہے کہ امام ابوبکر جصاص رحمۃ اللہ علیہ نے

حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عمل کا ذکر فرما کر لکھا ہے: "فجعل لهم اداءها الى المساكين وسقط من اجل ذلك حق الامام في اخذها لانه عقد عقده امام من ائمة العدل فهو نافذ على الامة" (احکام القرآن للجصاص ص ۱۹۰ ج ۳) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس فیصلے کے بعد اموالِ باطنہ سے زکوٰۃ وصول کرنے کا حق کسی کو نہیں رہا، لیکن امام جصاص رحمۃ اللہ علیہ کی پوری عبارت بغور پڑھنے سے سمجھ میں آتا ہے کہ حقِ امام سے اُن کی مراد ایسا حق ہے جس کے بعد مالکانِ اموال کو از خود زکوٰۃ ادا کرنے کا اختیار باقی نہ رہے، اور اُن کی ادائیگی کو شرعاً تسلیم نہ کیا جائے، چنانچہ ان کی مذکورہ عبارت سے پہلے ان کے الفاظ یہ ہیں: "وقوله تعالىٰ خذ من اموالهم صدقة يدل على ان اخذ الصدقات الى الامام، وانه متى اداها من وجبت عليه الى المساكين لم يجزه، لان حق الامام قائم في اخذها فلا سبيل له الى اسقاطه" خط کشیدہ جملے سے صاف واضح ہے کہ وہ امام کے ایسے حق کا ذکر فرما رہے ہیں جس کی موجودگی میں مالک کو از خود زکوٰۃ ادا کرنا جائز نہ ہو بلکہ اس سے زکوٰۃ ادا ہی نہ ہو، پھر اسی حق کے بارے میں آگے لکھا ہے کہ چونکہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ ائمہ عدل میں سے تھے، اور انھوں نے اموالِ باطنہ کی حد تک یہ حق ساقط کر دیا، اس لئے یہ حق اب ساقط ہو گیا، جس کا حاصل یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پہلے لوگوں کے لئے اموالِ باطنہ کی زکوٰۃ از خود مساکین کو دینا جائز نہیں تھا، اور اس سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی تھی، حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ اختیار انھیں دے دیا، اب یہ بات طے ہو گئی کہ ایسے اموال کے مالکان اگر از خود زکوٰۃ ادا کر دیں تو زکوٰۃ ادا ہو جائے گی، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ امام کا حقِ اخذ بالکلیہ ساقط ہو گیا، اور اب وہ زکوٰۃ وصول کرنا چاہے تو وصول نہیں کر سکتا، چنانچہ فتح القدیر کی مذکورہ بالا عبارت اس پر صریح ہے کہ وهذا لا يسقط طلب الامام اصلا

امام جصاص رحمۃ اللہ علیہ کی اس پوری بحث اور دوسرے فقہاء رحمہم اللہ کی عبارات اور

ملہ چنانچہ مویشیوں کے بارے میں اب بھی امام کا حق اس نوعیت کا ہے کہ اس کی موجودگی میں مالک کو از خود زکوٰۃ دینا جائز نہیں بلکہ بعض فقہاء کے نزدیک اس طرح زکوٰۃ ادا ہی نہیں ہوتی، مبسوط میں ہے: "فان قال دفعتها الى المساكين لم يصدق في زكوة شيء منه الزكوة عشر ... ولكن هذا مال يستوفيه الامام بولاية شرعية، فلا يصدق من عليه في اسقاطه حقه في الاستيفاء، ولا يجزئه الاداء الى الفقير فيما بينه وبين ربه وهو اختيار بعض مشائخنا (مبسوط ص ۱۶۱ و ۱۶۲ ج ۲)

بقیہ از ص ـــــــــ

روایات کو دیکھنے کے بعد اس سلسلہ میں جو صورت حال سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ:۔

① آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک اور حضرات شیخین رحمہا اللہ تعالیٰ کے زمانوں میں اموال ظاہرہ اور اموال باطنہ دونوں سے زکوٰۃ سرکاری سطح پر وصول کی جاتی تھی، البتہ اتنا فرق ضرور تھا کہ مویشیوں اور زرعی پیداوار کی زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے مصدق بھیجے جاتے تھے، اور نقود اور اموال تجارت کی زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے مصدق بھیجنے کے بجائے مالکوں کو حکم تھا کہ وہ خود زکوٰۃ لے کر آئیں، لیکن دونوں قسم کے اموال میں ادائے زکوٰۃ کا راستہ یہی تھا کہ وہ حکومت کو دی جائے،

② حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے شہر سے باہر جانے والے اموال کے بارے میں یہ تبدیلی فرمائی کہ اس کی وصول یابی کے لئے مصدق مقرر فرمائے، اور باقی اموال باطنہ کی زکوٰۃ حسب سابق مالکان خود لا کر دیتے رہے،

③ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں اموال باطنہ کی کثرت ہو گئی، آبادی پھیل گئی اور انھوں نے محسوس فرمایا کہ اب اموال باطنہ کی زکوٰۃ کی سرکاری طور پر وصول یابی کا یہ سلسلہ کہ اس کے بغیر ادائے زکوٰۃ جائز ہی نہ ہو، اگر باقی رکھا گیا تو اس کے لئے اموال ظاہرہ کی طرح مصدق مقرر کرنے پڑیں گے، نیز لوگوں کے نجی مقامات میں ان کی دخل اندازی سے لوگوں کو تکلیف ہوگی، لہٰذا آپ نے مالکان کو اجازت دیدی کہ وہ ان اموال کی زکوٰۃ خود ادا کر دیا کریں،

④ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس عمل کے بعد لوگوں کو اموال باطنہ کی زکوٰۃ اپنے طور پر ادا کرنے کی اجازت مل گئی، لیکن زکوٰۃ کی وصول یابی کا اصل حق اب بھی امام ہی کو ہے، چنانچہ دو صورتوں میں اب بھی وہ زکوٰۃ کی وصول یابی کا اہتمام کر سکتا ہے، ایک یہ کہ کسی جگہ کے لوگوں کے بارے میں یہ معلوم ہو جائے کہ وہ اپنے طور پر زکوٰۃ ادا نہیں کرتے، اور دوسرے یہ کہ کچھ اموال اس طرح اموال ظاہرہ میں شامل ہو جائیں کہ ان سے زکوٰۃ کی وصول یابی کے لئے نجی مقامات کی تفتیش کی ضرورت نہ پڑے،

⑤ چونکہ قدیم زمانہ میں نجی مقامات کی تفتیش کے بغیر اموال کے ظاہر ہو جانے کی جو صورت کثرت سے پیش آتی تھی وہ یہ تھی کہ اموال کو ایک شہر سے دوسرے شہر لے جاتے وقت وہ عاشر پر گزرتے تھے، اس لئے فقہاء کرام رحمہم اللہ تعالیٰ نے اس صورت کے احکام تفصیل کے ساتھ بیان فرمائے اور اس طرح تعبیر فرمایا کہ "یہ اموال شہر سے باہر نکل کر اموال ظاہرہ میں شامل

ہو گئے ہیں اور جو اموال شہر کے اندر ہیں وہ اموال باطنہ ہیں، اس لئے تو شہر سے باہر نکلنا اصل مدار حکم یا بطور بیان علت نہیں، بلکہ اپنے عہد کے لحاظ سے ایک واقعے کا بیان ہے، ورنہ اصل مدار حکم وہی ہے جس کی بنا پر اموال باطنہ کو زکوٰۃ کی سرکاری وصول یابی سے مستثنیٰ کیا گیا تھا، یعنی تفتیش کے بغیر اُن اموال کا ظاہر ہو جانا، چنانچہ قرونِ اُولیٰ میں اُن اموال سے بھی زکوٰۃ وصول کی گئی جو شہر سے باہر نہیں ہوتے تھے، لیکن تفتیش کے بغیر ظاہر ہوتے تھے، مثلاً تنخواہیں، وظائف، اور حکومت کے اموالِ مغصوبہ، جس کی روایات پیچھے گذر چکی ہیں۔

یہاں بعض حضرات نے یہ شبہ ظاہر فرمایا ہے کہ بعض اموال حکومت پر تفتیش کے بغیر ظاہر ہو جاتے تھے، لیکن اس کے باوجود حکومت اُن سے زکوٰۃ وصول نہ کرتی تھی، مثلاً عاشر پر گذرنے والا اگر اپنے بعض مقامات پر رکھے ہوئے اموال کے بارے میں اقرار کر لیتا تو اُن کی زکوٰۃ وصول نہیں کی جاتی تھی جس کی فقہاء نے تصریح فرمائی ہے،

اس کے جواب میں عرض ہے کہ اقرار کے ذریعہ تو اموالِ باطنہ میں سے ہر مال ظاہر ہو سکتا ہے، لیکن چونکہ جزوی واقعات کو کلی احکام کی بنیاد نہیں بنایا جا سکتا، اور "عاشر" کو یہ اختیار نہیں دیا جا سکتا کہ وہ جس مال کو چاہے ظاہر قرار دے کر اس سے زکوٰۃ وصول کرے، اس لئے اس کو یہ لگا بندھا اصول بتا دیا گیا کہ جو کوئی شخص تمہارے پاس مال لے کر گذرے صرف اُس مال سے زکوٰۃ وصول کر سکتے ہو جو اس وقت تمہارے سامنے آجائے اور لوگوں کے گھروں یا دُکانوں پر جو مال ہے، اس سے تعرض نہ کرو، اس اصول کے تحت "عاشر" کو گھروں میں رکھے ہوئے مال سے تعرض کا اختیار نہیں دیا گیا، اور جب یہ اصول مقرر ہو گیا تو اگر کسی جزوی واقعہ میں اگر کوئی شخص اپنے مالِ باطن کو عاشر پر اقرار کے ذریعہ ظاہر بھی کردے تو یہ ایک استثنائی واقعہ ہوگا جس سے اصول تبدیل نہیں ہو سکتا، اس لئے اس صورت میں بھی بطور اصول اس سے زکوٰۃ وصول نہیں کی جائے گی،

ہاں اگر کچھ ایسے اموال پائے جائیں جن کی نوعیت ہی ایسی ہو کہ وہ سب کے سب بذاتِ خود حکومت پر بغیر تفتیش کے ظاہر ہو جاتے ہوں، اور حکومت اُن اموال کے بارے میں یہ طے کر دے کہ ان تمام اموال سے زکوٰۃ وصول کی جائے گی تو اس میں شرعی ممانعت کی کوئی دلیل نہیں ہے، بلکہ تنخواہوں، وظائف اور اموالِ مغصوبہ سے جو زکوٰۃ وصول کی جاتی تھی وہ اس کی واضح نظیر ہے،
دوسرے الفاظ میں تخریج من الحصر عاشر کے لئے زکوٰۃ وصول کرنے کی اجازت کی توسیع ہے،

لیکن امام کے لئے وصولیٔ زکوٰۃ کے اختیار کی علت نہیں، بلکہ اس کے لئے علت اموال کا تفتیش کے بغیر ظاہر ہو جانا ہے چنانچہ جن اموال کی نوعیت ایسی ہو کہ وہ بغیر تفتیش کے ظاہر ہو جاتے ہوں ان سے "تمامر علی العاشر" کی طرح وہ بھی زکوٰۃ وصول کرنے کا حکم جاری کر سکتا ہے جیسا کہ تنخواہوں وغیرہ کے معاملہ میں کیا گیا یہی وجہ ہے کہ فقہاء کرام رحمہم اللہ تعالیٰ "خروجہ من المصر" کا تذکرہ "باب فیمن یمر علی العاشر" میں تو فرماتے ہیں، جس کا موضوع یہ ہے کہ عاشر کن اموال سے زکوٰۃ وصول کر سکتا ہے، لیکن جس جگہ امام کے وصولیٔ زکوٰۃ کے اختیار کا بیان ہے وہاں عموماً خروجہ من المصر کو بطور علت ذکر نہیں کیا جاتا بلکہ وہاں علت یہی بیان کی جاتی ہے کہ اموال باطنہ سے زکوٰۃ وصول کرنے میں لوگوں کے نجی مقامات میں دخل اندازی اور ان کی تفتیش لازم آتی ہے جس سے عوام کو ضرر پہنچنے کا اندیشہ ہے، جیسا کہ فتح القدیر کی عبارت پیچھے گزر چکی ہے اور امام جصاص کی عبارت مجلس کی سابق تحریر میں نقل کی جا چکی ہے،

بینک اکاؤنٹس کے قرض ہونے کا مسئلہ:

بینک اکاؤنٹس سے زکوٰۃ وصول کرنے پر دوسرا اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ جب کوئی شخص بینک میں رقم رکھواتا ہے تو شرعاً وہ رقم بینک کے ذمہ قرض ہوتی ہے، امانت نہیں، اسی لئے وہ بینک پر مضمون بھی ہوتی ہے، اور اس پر زیادتی وصول کرنا سود ہوتا ہے، اور جب کسی شخص نے کوئی رقم کسی دوسرے فرد یا ادارہ کو بطور قرض دیدی تو وہ اس شخص کی ملکیت سے نکل کر مقروض کی ملکیت میں داخل ہو گئی، اب اس پر زکوٰۃ کی ادائیگی اس وقت واجب ہوگی جب وہ رقم اسے وصول ہو جائے گی اس سے پہلے زکوٰۃ واجب الاداء نہیں، لہٰذا بینک اکاؤنٹس سے زکوٰۃ وضع کرنے پر پہلا اعتراض تو یہ ہے کہ زکوٰۃ واجب الاداء ہونے سے پہلے ہی وضع کر لی گئی ہے، اور دوسرا اعتراض یہ ہے کہ وہ زکوٰۃ دائن سے وصول کرنے کے بجائے مدیون کے مال سے وصول کی گئی ہے حالانکہ اس کی نظیر معہود فی الشرع نہیں ہے کہ ایک شخص کی زکوٰۃ دوسرے کے مال سے وصول کی جائے،

ذیل میں ان دونوں اعتراضات کی تحقیق مقصود ہے:-

ان دونوں مسائل کی تحقیق کے لئے پہلے بینک اکاؤنٹس کی صحیح حیثیت متعین کرنا ضروری ہے،

اس میں شک نہیں کہ فقہی اعتبار سے بینک اکاؤنٹس قرض ہیں[1]، لیکن راقم کے لعمرت کے

---

[1] لہ البتہ جن اکاؤنٹس پر سود کا لین دین طے ہوتا ہے مثلاً سیونگ اکاؤنٹ یا فکسڈ ڈپازٹ، ان میں ایک طور ...

لحاظ سے وہ ایک بالکل نئی قسم کا قرض ہے جو فقہاء کرام رحمہم اللہ کے عہد میں معروف نہیں تھا، اور
جس کی نظیریں بھی اس دور میں کم ملتی ہیں، لہٰذا زکوٰۃ کے حق میں بینک اکاؤنٹس کو بالکلیہ دیگر
دیون اور قرضوں پر قیاس کرنا درست نہیں ہوگا، وجوب زکوٰۃ کے حق میں دیون کے اندر اصل
دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ ان دائن کے لئے کس حد تک رجوع کو وصول ہے! اور دائن کا تصرف
اس پر کس حد تک برقرار ہے! اسی بنا پر فقہاء کرام رحمہم اللہ تعالیٰ نے وجوب زکوٰۃ کے معاملہ
میں دین قوی، دین متوسط اور دین ضعیف کی تقسیم فرمائی ہے، اور اسی بنا پر دین مجحود کو مال
ضمار میں شامل کر کے اسے زکوٰۃ سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے، جب ہم اس نقطۂ نظر سے بینک اکاؤنٹس
کا جائزہ لیتے ہیں تو وہ دین ہونے کے باوجود اس معاملہ میں دوسرے عام دیون سے بالکل ممتاز
نظر آتا ہے جس کی وجوہ درج ذیل ہیں:

① عام قرضوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ مقروض کے قبضے سے نکلنے کے بعد ان پر مقرض کا کوئی تصرف
باقی نہیں رہتا، بلکہ وہ مقروض کے رحم و کرم پر ہوتا ہے کہ جب وہ چاہے اسے ادا کرے، اس کے
برعکس بینک اکاؤنٹس میں مقرض کے طلب کرنے پر فوری ادائیگی نہ ہونے کا کوئی سوال نہیں
ہوتا، اور یہ بینک کی طرف سے صرف زبانی اقرار نہیں ہوتا، بلکہ بینکوں کا مسلسل بلاتخلف

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) احتمال بھی قابل غور ہے، اور وہ یہ کہ وہ شرکت فاسدہ یا مضاربت فاسدہ کا مال ہو، کیونکہ
فقہاء کرام یہ کہتے ہیں کہ اگر کسی شخص سے شرکت یا مضاربت کرتے وقت نفع کے شائع حصہ کے بجائے متعین رقم طے
کر لی جائے تو شرکت اور مضاربت فاسد ہو جاتی ہے، (شامی) اور شرکت فاسدہ اور مضاربت فاسدہ دونوں میں
جب تک شریکین مال واپس نہیں لیں، ان کے درمیان شرکت فی الملک قائم ہو جاتی ہے، اور دونوں اپنے اپنے حصے کے
مالک رہتے ہیں، وہ رقم دین نہیں، بلکہ مال تجارت کے حکم میں رہتی ہے ___ اور غیر سودی اکاؤنٹس میں ایک احتمال یہ
بھی ہے کہ وہ اصلاً ودیعت تھی، لیکن خلط بالاذن کی بنا پر وہ مال شرکت بن گیا، چنانچہ درمختار کتاب الایداع میں
تصریح ہے کہ ودیعت خلط بالاذن سے شرکت ملک بن جاتی ہے، (شامی ص ۴۲۸ ج ۴) اور حضرت تھانوی
قدس سرہ نے سیونگ اکاؤنٹس کو اسی بنا پر شرکت ملک کا مال قرار دیا ہے، (امداد الفتاوی ص ۱۴۹ ج ۲)
اگر ان اکاؤنٹس کی یہ توجیہ درست ہو تو ان اکاؤنٹس کے دین ہونے کا مسئلہ ہی ختم ہو جاتا ہے، لیکن اس توجیہ
میں تأمل یہ ہے کہ اس کے مطابق ان اکاؤنٹس میں رکھی ہوئی رقم مضمون نہ ہوگی، حالانکہ فریقین کی طرف
سے مضمون ہونا شرط ہوتا ہے، فلیتأمل ۱۲

طرز عمل یہی ہے جس کے بغیر بینک چل ہی نہیں سکتے، لہٰذا یہ قرض کی وہ قسم ہے جس میں مقرض اپنی رقم جب چاہے فوراً بلا تکلف واپس لے سکتا ہے، اور عملاً وہ ایسی ہی قابل اعتماد ہے جیسے اپنی تجوری میں رکھی ہوئی رقم، بلکہ اس سے بھی زیادہ، کیونکہ تجوری کی رقم میں ہلاک ہونے کا خطرہ ہے، لیکن بینک اکاؤنٹ میں ایسا خطرہ بھی نہیں ہے،

② بینک اکاؤنٹس میں رکھی ہوئی رقم پر ہر اکاؤنٹ ہولڈر ٹھیک اسی طرح تصرف کرتا ہے جس طرح اپنی الماری میں رکھی ہوئی رقم پر تصرف کرتا ہے، اس وقت تجارت کا سارا کاروبار بینک اکاؤنٹس ہی پر چل رہا ہے، اور بیشتر ادائیگیاں بینک ہی کے ذریعہ ہوتی ہیں،

③ عرف عام میں بھی بینک میں رقم رکھوانے کے بعد کوئی شخص یہ نہیں سمجھتا کہ اس نے یہ رقم کسی کو قرض دے دی ہے، بلکہ وہ اسے اپنی ہی رقم سمجھتا ہے، اور اس کے ساتھ اپنی رقم ہی کا سا معاملہ کرتا ہے، جب کوئی شخص اپنے حاضر و غائب مال کی فہرست بناتا ہے تو بینک اکاؤنٹس کو مال حاضر میں شمار کیا جاتا ہے، مال غائب میں نہیں،

④ عام قرضوں کا حال یہ ہے کہ معاہدۂ قرض کا محرک مستقرض ہوتا ہے، لیکن یہاں محرک مقرض ہوتا ہے، اور اس کا اصل منشأ قرض دینے کے بجائے اپنے مال کی حفاظت ہوتی ہے،

عام قرضوں کے مقابلہ میں بینک اکاؤنٹس کی ان وجوہ فرق کو ذہن میں رکھ کر قرضوں پر زکوٰۃ کے مسئلہ پر غور فرمائیے:

بینک اکاؤنٹس سے زکوٰۃ وصول کرنے پر پہلا اعتراض یہ کیا جا رہا ہے کہ قرض پر اگرچہ زکوٰۃ فرض تو ہوتی ہے لیکن اس کی ادائیگی اس وقت واجب ہوتی ہے جب وہ دائن کے قبضہ میں واپس آجائے، اور زیر بحث صورت میں دائن کے قبضہ میں آنے سے پہلے ہی زکوٰۃ وضع کی جا رہی ہے۔

اس سلسلہ میں گذارش یہ ہے کہ قرضوں پر زکوٰۃ کا نفس وجوب تو متفق علیہ ہے، البتہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے مقرض کو یہ سہولت دی ہے کہ زکوٰۃ کی ادائیگی اس پر واجب اس وقت ہوگی جب قرض کی رقم اسے واپس ملے گی چنانچہ جب بھی چالیس درہم کی مقدار اس کے پاس واپس آئے گی ایک درہم بطور زکوٰۃ ادا کرنا اس پر واجب ہوگا، اس سہولت کا پس منظر اور اس کی اصل وجہ مندرجہ ذیل روایات سے واضح ہوتی ہے،

① امام بیہقی رحمہ اللہ تعالیٰ روایت فرماتے ہیں: عن حسین بن عبد الرحمٰن ابن عبد الرحمٰن ابن عبد القاری، وکان علی بیت مال عمر رضی اللہ عنہ، قال کان الناس یأخذون

من الدین الزکوٰۃ، وذلک ان الناس اذا خرجت الاعطیۃ حبس لهم العرفاء دیونهم وما بقی فی ایدیهم اخرجت زکوتهم قبل ان یقبضوا، ثم دان الناس بعد ذلک دیونا هالکۃ، فلم یکونوا یقبضون من الدین الصدقۃ الا ما نقص منه، ولکنهم کانوا اذا قبضوا الدین اخرجوا منها لما مضی (السنن الکبری للبیهقی ص۱۵۰ ج۴، باب زکوٰۃ الدین اذا کان علی معسر او جاحد) اس روایت سے واضح ہے کہ اصلا دیون کا حکم بھی یہی تھا کہ سال بسال ان کی زکوٰۃ ادا کی جائے خواہ وہ قبضہ میں نہ آئے ہوں، لیکن چونکہ بعض مرتبہ لوگ زکوٰۃ نکال دیتے اور بعد میں دیون وصول نہ ہوتے، اس لئے یہ سہولت دی گئی کہ دیون کی زکوٰۃ وصول ہونے کے بعد ادا کی جائے، لیکن جب وصول ہو جائے تو سابقہ سالہائے گذشتہ کی بھی ادا کی جائے اس کے باوجود صحابہ وتابعین کی ایک بڑی جماعت کا مسلک یہی رہا کہ دیون اگر قابل اعتماد ہوں تو زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے وصولیابی کا انتظار نہ کیا جائے، بلکہ ہر سال کے سال زکوٰۃ ادا کی جاتی رہے، چنانچہ حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت ابن عمر، حضرت جابر بن عبد اللہ، حضرت جابر بن زید، حضرت مجاہد، حضرت ابراہیم نخعی، حضرت میمون بن مہران، حضرت قتادہ اور حضرت سعید ابن المسیب وغیرہ کا مسلک یہی تھا (کتاب الاموال لابی عبید ص۴۳۳ باب الصدقۃ فی التجارات والدین وفقرہ ۱۲۲۱ ومصنف عبد الرزاق ص۱۰۰ ج۴ باب لا زکوٰۃ الا فی الناض) اسی کو امام ابو عبید نے ترجیح دی ہے اور یہی امام شافعی کا مسلک ہے (نهایۃ المحتاج ص۱۳۰ ج۳)

لیکن امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا موقف یہ ہے کہ دین خواہ کتنے قابل اعتماد شخص کے پاس ہو اس میں چونکہ عدم ادائیگی کا احتمال بھی رہتا ہے، لہذا جب تک وہ مالک کے قبضہ اور تصرف میں نہ آجائے اس وقت تک وجوب ادا نہیں ہوگا، اس کے لئے انہوں نے حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ کے اس ارشاد سے استدلال فرمایا ہے جسے امام محمد رحمہ اللہ تعالی نے روایت کیا ہے امام محمد رحمہ اللہ تعالی فرماتے ہیں: عن علی بن ابی طالب قال اذا کان ذلک دین علی الثقۃ فقبضته فزکه لما مضی، قال محمد وبه ناخذ وهو قول ابی حنیفۃ (کتاب الآثار ص۴۹) اس سے معلوم ہوا کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالی نے اس مسئلہ میں اپنے مسلک کی بنیاد حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ کے ارشاد پر رکھی ہے،

اور حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ کا یہ ارشاد امام بیہقی اور امام ابو عبید نے ان الفاظ میں روایت فرمایا ہے: عن علی فی الدین الظنون قال ان کان صادقا فلیزکه اذا قبضه

لا معنیٰ، امام ابو عبید نے "دین ظنون" کی تعریف ان الفاظ میں فرمائی ہے: هو الذی لا يدری صاحبه
أيقضيه الذی عليه الدين أم لا (بیہقی ص ۱۵۰ ج ۴ و کتاب الاموال ص ۴۳۰،
فقرہ ۱۲۲۰ و مصنف ابن ابی شیبہ ص ۱۶۳ ج ۳)

اور اس ارشاد کی تفصیل امام ابن ابی شیبہ نے ان الفاظ میں روایت فرمائی ہے:
عن الحسن قال سئل علی عن الرجل يكون له الدين على الرجل، قال يزكيه صاحب
المال فان توى ما عليه وخشى ان لا يقضى، قال يمهل فاذا خرج ادى زكوٰة ماله
(مصنف ابن ابی شیبہ ص ۱۶۲ ج ۳) اس سے معلوم ہوا کہ اس باب میں حضرت علی
رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا موقف وہی ہے جو حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت عبداللہ بن عمر
وغیرہ کا ہے یعنی: ان عبد الله بن عباس وعبد الله بن عمر قالا من اسلف مالاً
فعليه زكوته فی كل عام اذا كان فی ثقة (السنن الکبریٰ للبیہقی ص ۱۴۹ ج ۴) اور
حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے مکمل الفاظ یہ ہیں: ما كان فی ايديكم وما كان
من دين فی ثقة فهو بمنزلة ما فی ايديكم وما كان من دين ظنون فلا زكوٰة
فيه حتى يقبضه (بیہقی ص ۱۵۰ ج ۴ و مصنف ابن ابی شیبہ ص ۱۶۲ ج ۳) حضرت ابن عمر
رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے اس ارشاد کا ایک حصہ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے بھی نقل فرمایا ہے، اور
اس سے دین کے مسئلہ میں مالکیہ کے خلاف استدلال فرمایا ہے: عن نافع عن ابن عمر
انه قال فی الدين يزكى، قال زكوته كل عام (کتاب الحجة على اهل المدينة ص ۴۴۲ ج ۱)،
اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ فقہاء حنفیہ نے اس باب میں اپنے مسلک کی بنیاد حضرت
علی اور حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے اقوال پر رکھی ہے، اور ان کے نزدیک اگرچہ قبضہ
کے بعد زکوٰۃ کا وجوب صرف اس صورت میں ہے جبکہ دین کی وصولیابی مظنون ہو، جہاں
وصولیابی کا وثوق ہو وہاں اُن کے نزدیک وجوبِ ادا بھی قبضہ سے پہلے ہی ہو جاتا ہے، لیکن
فقہاء حنفیہ نے اس پہلو پر نظر فرمائی کہ معروف دیون میں سے ہر دین میں خواہ وہ کتنے قابل اعتماد
شخص کے پاس ہو، عدم ادائیگی کا کچھ نہ کچھ خطرہ ضرور رہتا ہے، لہٰذا انہوں نے ہر دین قوی کو "دین ظنون"
قرار دے کر یہ عام حکم لگا دیا کہ اس پر نفس وجوب تو ہو جاتا ہے، لیکن وجوبِ ادا قبضہ
کے بعد ہوگا،

اس پس منظر کو ذہن میں رکھ کر جب ہم بینک اکاؤنٹس کا جائزہ لیتے ہیں، اور عام طور پر

کے مقابلہ میں اُن کی موجودہ تشریح شروع میں بیان کی گئیں اُن کو دیکھتے ہیں تو واضح ہو جاتا ہے کہ یہ دیون قویہ کی وہ قسم ہے جو فقہاء کرام رحمہم اللہ تعالیٰ کے عہد میں یا موجود نہیں تھی، یا اس کی نظیریں شاذ و نادر تھیں، اور اس قسم کو "دین ظنون" کسی طرح قرار نہیں دیا جا سکتا، بلکہ یہ مال کے یقینی واپسی کے آزادانہ تصرفات، رو عرف عام کی رو سے بالکل اس طرح واپس کی ملکیت اور تقدیری قبضہ میں رہتا ہے جیسے اپنے گھر میں رکھا ہوا مال، لہٰذا حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے الفاظ میں "بمنزلۃ ما فی یدیک" کا اطلاق اس سے زیادہ کسی دین پر نہیں ہو سکتا،

اس کے علاوہ اگر بینک اکاؤنٹس پر زکوٰۃ کے وجوب ادا کے لئے دوسرے دیون کی طرح ان کے نقد ہونے کی شرط لگائی جائے تو اس سے اتنی عملی پیچیدگیاں پیدا ہوں گی کہ زکوٰۃ کی ٹھیک ٹھیک ادائیگی بہت مشکل ہو جائے گی، امام ابو عبید رحمۃ اللہ علیہ نے تو عام دیون کے بارے میں بھی یہ فرمایا ہے کہ: وانما اختاروا او من اختار منهم، تزكية الدين مع عين المال، لأن من ترك ذلك حتى يصير إلى القبض لم يكن يقف من زكوة دينه على حد، ولم يقم بأدائها، وذلك أن الدين ربما اقتضاه ربه متقطعًا، كالدراهم الخمسة والعشرة، وأكثر من ذلك وأقل، فهو يحتاج في كل درهم يقتضيه فما فوق ذلك إلى معرفة ما غاب عنه من السنين والشهور والأيام، ثم يخرج من زكوته بحساب ما يصيبه، وفي أقل من هذا ما تكون الملالة والتفريط، فلهذا اختاروا له بالاحتياط، فقالوا يزكيه مع جملة ماله في رأس الحول. وهو عندي وجه الأمر (کتاب الأموال ص ۴۳۲، فقرہ ۱۲۲۵) عام دیون کے بارے میں یہ دشواری تو اس لحاظ سے ہو سکتی ہے لیکن بینک اکاؤنٹس کے بارے میں تو اس قسم کا حساب و کتاب عملی اعتبار سے تقریباً ناممکن ہے کیونکہ عام طور پر ان اکاؤنٹس سے بعض اوقات ایک ایک دن میں کئی کئی مرتبہ رقمیں نکالی اور جمع واپس کی جاتی ہیں، اور قبضہ کے بعد زکوٰۃ کی ادائیگی کی صورت صرف یہی ہو سکتی ہے کہ ہر اکاؤنٹ ہولڈر اپنے اکاؤنٹ کے ہر ہر روپے کے بارے میں یہ ریکارڈ پوری طرح محفوظ رکھے کہ وہ کتنے عرصہ بینک میں رہا ہے، تاکہ اس پر واجب ہونے والی گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ ادا کر سکے، اور جب کوئی رقم بینک سے نکالے تو پہلے یہ حساب کرے کہ یہ رقم کتنے سال بینک میں رہی ہے، لہٰذا اس پر کتنی زکوٰۃ واجب ہوئی ہے، پھر زکوٰۃ ادا کرے، اور اس میں جو عملی تعذر ہے وہ مخفی نہیں اور خود فقہاء حنفیہ نے مال مستفاد کا الگ سال شمار کرنے پر ایک دلیل یہی عملی تعذر کی پیش کی ہے

چنانچہ امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ نے اول استفادہ پر الگ سال شمار کرنے والوں پر طنز فرماتے ہوئے یہ تک لکھا ہے کہ: ینبغی لصاحب ھذا المال ان یقعد حتی یحسبوا زکوٰۃ مالہ متی تجب! ارأیتم الرجل ان کان یفید الیوم الفا وغدا الفین وبعد غد ثلاثۃ آلاف وبعد ذلک خمسۃ آلاف وبعد ذلک بعشرین یوم عشرۃ آلاف اینبغی لہ ان یزکی کل مال من ھذہ الاموال علی حدۃ؟ وھذا قول ضیق لا یوافق ما علیہ الناس ینبغی لہ ان یجمع مالہ کلہ ثم یزکیہ اذا وجبت الزکوٰۃ علی مالہ الاول (کتاب الحجۃ علی اھل المدینۃ ص ۴۹۱ و ۴۹۲ ج ۱)۔ اور حضرت ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ، جو فقہ حنفی کا بہت بڑا ماخذ ہیں، ان کا ایک ارشاد امام ابن ابی شیبہ نے ان الفاظ میں روایت فرمایا ہے کہ: ومن کان لہ من دین ثقۃ فلیزکہ، وما کان لا یستقر علیہ الیوم ویأخذ الی یومین فلیزکہ۔ (مصنف ابن ابی شیبۃ ص ۶۲ ج ۳) اس کا منشا بھی غالباً یہی ہے کہ دیون کی جو قسمیں آتی جاتی رہتی ہوں ان کا الگ الگ حساب رکھنا چونکہ متعذر ہے اس لئے ان سب کی زکوٰۃ ایک ساتھ ہی نکالنی چاہئے، اور اس قسم کے دیون کی جتنی مکمل مثال بینک اکاؤنٹس ہیں اتنی مکمل مثال شاید کوئی اور ممکن نہ ہو۔

لہٰذا ان تمام دلائل کی روشنی میں بینک اکاؤنٹس سے زکوٰۃ وصول کرنے پر یہ اعتراض درست نہیں رہتا کہ ان کی زکوٰۃ وجوب ادا سے پہلے وصول کرلی گئی ہے بلکہ مذکورہ بالا دلائل کی رُو سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ ان اکاؤنٹس کا وجوب ادا بھی اسی وقت ہوجاتا ہے جب دوسری رقموں کا سال پورا ہوا۔

بینک اکاؤنٹس کے دَین ہونے کی بنیاد پر اُن سے زکوٰۃ وضع کرنے پر دوسرا اعتراض یہ ہے کہ جب ایک شخص نے کوئی رقم بینک کو قرض دیدی تو وہ اس کی ملکیت سے نکل کر بینک کی ملکیت میں آگئی، لہٰذا جس رقم سے حکومت زکوٰۃ وصول کر رہی ہے وہ بینک کی ملکیت ہے اور اس کی کوئی نظیر شریعت میں نہیں ہے کہ ایک شخص کی زکوٰۃ دوسرے کے مال سے وصول کی جائے۔

اس اعتراض کے جواب میں عرض ہے کہ جس دَین کی وصولیابی اتنی متیقن ہو جتنی بینک اکاؤنٹس میں متیقن ہوتی ہے اس سے زکوٰۃ کی وصولیابی کی متعدد نظیریں موجود ہیں کہ اس کو تقدیراً دائن کے قبضہ میں قرار دیکر اس سے زکوٰۃ وصول کی گئی ہے، چند نظائر درج ذیل ہیں:۔

① پیچھے گزر چکا ہے کہ حضرت صدیق اکبر، حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہم زکوٰۃ کی رقم دی جانے والی تنخواہوں سے کاٹ لیتے تھے، امام ابوعبید رحمہ اللہ تعالیٰ کی روایت کے یہ الفاظ پیچھے گزرے ہیں کہ: فان اخبرہ ان عندہ مالا قد حلت فیہ الزکوٰۃ قاصہ مما یرید ان یعطیہ (کتاب الاموال ص ۴۲۱) ظاہر ہے کہ تنخواہ کی وصولیابی سے پہلے وہ بیت المال پر دَین ہی تھا، اور جب تک صاحب تنخواہ کا اس پر قبضہ نہیں ہوا تھا اس لئے ابھی وہ حقیقۃً اس کی ملکیت اور قبضہ میں نہیں آیا تھا، لیکن قبضہ میں آنے سے پہلے ہی اس سے زکوٰۃ وضع کرنا اس لئے تھا کہ وہ دَین متعین ہونے کی بناء پر تقدیراً صاحب تنخواہ کے قبضہ میں آچکا تھا، چنانچہ امام محمد رحمہ اللہ علیہ نے یہ واقعہ موطا میں نقل کرکے اس پر ترجمۃ الباب یہ قائم فرمایا ہے کہ: "باب الرجل یکون لہ الدین ھل علیہ فیہ الزکوٰۃ" اور پھر یہ روایت نقل فرمائی ہے کہ کان ابوبکر اذا اعطی الناس اعطیاتھم[1] یسأل الرجل ھل عندک من مال قد وجبت فیہ الزکوٰۃ، فان قال نعم اخذ من عطائہ زکوٰۃ ذلک المال، وان قال لا اسلم الیہ عطاءہ۔ اور پھر فرمایا ہے: قال محمد وبھذا ناخذ وھو قول ابی حنیفۃ رحمہ اللہ تعالیٰ (موطا امام محمد ص ۱۷۰)

اور حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی رحمہ اللہ علیہ نے حضرت صدیق اکبر اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما وغیرہ کے اس عمل کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ: فیہ دلالۃ علی انہم کانوا یاخذون زکوٰۃ العطاء لکونہ دیناً ثابتاً علی بیت المال، والا لم یکن لاخذ الزکوٰۃ منہ معنی (اعلاء السنن ص ۲۳۰ ج ۱۲ کتاب السیر باب العطاء لو یموت صاحبہ بعد ما یستحقہ)، ان تمام روایات وعبارات میں اس بات کی واضح دلیل موجود ہے کہ دَین قوی کے قبضہ میں آنے سے پہلے ہی اس سے زکوٰۃ وصول کی جاسکتی ہے، کیونکہ وہ متعین ہونے کی بناء پر تقدیراً مالک کے قبضہ میں ہے۔

② حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے بارے میں امام ابوعبید رحمہ اللہ تعالیٰ روایت فرماتے ہیں: عن نافع عن ابن عمر انہ کان یکون عندہ اموال الیتامیٰ فیستسلف اموالھم لیحرزھا من الھلاک، ثم یخرج[2] عنہا من اموالھم وھو دین علیہ (کتاب الاموال ص ۴۷۵، فقرہ ۱۳۰۹، السنن الکبریٰ للبیہقی ص ۱۰۹ ج ۴ ومصنف عبدالرزاق ص ۷۰، ۱۹۱ ج ۴)

---

[1] عطاء کی جمع ہے یعنی تنخواہ۔ [2] کلمہ تنہا کا مرجع قول ان یضمنا ... [illegible]

یہاں یہ مسئلہ زیرِ بحث ہے کہ نابالغ کے مال پر زکوٰۃ واجب ہی نہیں، اور مذکورہ واقعہ میں "یتامیٰ" سے مراد نابالغ یتامیٰ ہیں یا بالغ یتامیٰ؟ لیکن یہاں جو بات قابلِ غور ہے وہ یہ کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما اُن یتامیٰ پر زکوٰۃ فرض سمجھتے تھے، اور اُن کے اموال کو خود قرض لے لیتے تھے، پھر اُن سے قرض ہونے کی حالت ہی میں زکوٰۃ نکالتے تھے، یہ صورت موجودہ بینک اکاؤنٹس کی صورت سے بہت قریب ہے، کہ دونوں جگہ رقم کو ودیعت کے بجائے قرض بنانے کا مقصد ان اموال کو مضمون بنانا ہے، اور باوجودیکہ وہ رقمیں قرض لینے کے بعد حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی ملکیت میں آگئیں، لیکن انھوں نے انہی رقموں سے اصل مالکوں کی زکوٰۃ ادا فرمائی، اس سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ دینِ مستقرض کو تقدیراً دائن کے قبضہ میں قرار دے کر اس سے زکوٰۃ ادا کی جاسکتی ہے۔

زکوٰۃ کی نیت کا مسئلہ:

بینک اکاؤنٹس سے زکوٰۃ کی وصول یابی پر تیسرا شبہ یہ کیا گیا ہے کہ بینکوں سے جبراً زکوٰۃ وصول کرنے کی صورت میں اصحابِ اموال کی طرف سے نیت متحقق نہیں ہوگی، حالانکہ نیت ادائے زکوٰۃ کے لئے شرط ہے۔

اس سلسلہ میں مجلس کی سابق تحریر میں عرض کیا گیا تھا کہ جن اموال کی زکوٰۃ وصول کرنے کا اختیار حکومت کو ہے اُن میں حکومت کا وصول کرلینا بذاتِ خود نیت کے قائم مقام ہوجاتا ہے، اور دلیل میں علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ کی یہ عبارت بھی پیش کی گئی تھی: "فی مختصر الکرخی اذا اخذھا الامام کرھا فوضعھا موضعھا اجزأ لان لہ ولایۃ اخذ الصدقات، فقام اخذہ مقام دفع المالک، وفی القنیۃ وفیہ اشکال لان النیۃ فیہ شرط ولم توجد منہ اھ، قلت قول الکرخی رحمہ اللہ تعالیٰ فقام اخذہ الخ یصلح للجواب تأمل" (شامی ص ۲۳۵ ج ۲)

اس پر بعض حضرات نے یہ شبہ ظاہر فرمایا ہے کہ علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ نے مذکورہ عبارت کے بعد متصل تحریر فرمایا ہے: "ثم قال فی البحر، والمفتی بہ التفصیل ان کان فی الاموال الظاھرۃ یسقط الفرض لان السلطان او نائبہ ولایۃ اخذھا، وان لم یضعھا موضعھا لا یبطل اخذہ، وان کان فی الباطنۃ فلا" جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اموالِ باطنہ کی زکوٰۃ اگر جبراً وصول کرلی جائے تو وہ ادا نہیں ہوگی۔

اس سلسلہ میں عرض یہ ہے کہ مجلس نے اپنی سابق تحریر میں جو الفاظ لکھے تھے کہ "حکومت کو جن اموال کی زکوٰۃ وصول کرنے کا حق ہے ان میں حکومت کا وصول کر لینا بذاتِ خود نیت کے قائم مقام ہو جاتا ہے" وہ اس عبارت کے پیشِ نظر لکھے تھے کیونکہ مذکورہ عبارت میں مدار اس پر ہے کہ سلطان کو ولایتِ اخذ حاصل تھی یا نہیں؟ اور بینک اکاؤنٹس سے وجوبِ اخذ کے دلائل پیچھے تفصیل کے ساتھ بیان کئے جا چکے ہیں، لہٰذا زیرِ بحث مسئلہ میں مذکورہ عبارت سے حکم میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔

اور جن اموال کی زکوٰۃ وصول کرنے کا حق حکومت کو ہے ان میں حکومت کی وصولی کا نیت کے قائم مقام ہونا ائمہ اربعہ کے نزدیک مسلّم ہے، اگرچہ ائمہ ثلاثہ نیت کے معاملہ میں اتنے سخت ہیں کہ بعض صورتوں میں دلالۃً نیت کو بھی معتبر نہیں مانتے، مثلاً اگر کوئی شخص اپنا سارا مال بغیر نیتِ زکوٰۃ کے صدقہ کر دے، تو حنفیہ کے نزدیک اس کی زکوٰۃ ساقط ہو جاتی ہے (عالمگیریہ ص۱۷۱ ج۱) لیکن ائمہ ثلاثہ کے نزدیک نیت کے فقدان کی وجہ سے زکوٰۃ ساقط نہیں ہوتی (المغنی لابن قدامۃ ص۶۴۹ ج۲ و الحطاب ص۳۵۷ ج۲)

لیکن حکومت کی وصول یابی کے سلسلہ میں ائمہ ثلاثہ بھی اس پر متفق ہیں کہ وہ نیت کے قائم مقام ہو جاتی ہے، چنانچہ فقہ مالکی کی معروف کتاب "مواہب الجلیل" میں ہے "اذا اخرج رجل الزکوٰۃ بغیر علم من ہی علیہ وغیر اذنہ فی ذلک، فان کان مخرج الزکوٰۃ الامام فالزکوٰۃ مجزئۃ (مواہب الجلیل للحطاب ص۳۵۶ ج۲)، اور فقہ شافعی کی معروف کتاب "نہایۃ المحتاج" میں ہے "الاصح عند الشافعیۃ ان نیۃ السلطان تکفی اذا اخذ زکوٰۃ الممتنع (نہایۃ المحتاج ص۱۳۸ ج۳) اور علامہ ابن قدامہ لکھتے ہیں "ولا یجوز اخراج الزکوٰۃ الا بنیۃ الا ان یاخذھا الامام منہ قہراً (المغنی لابن قدامۃ ص۶۳۸ ج۲)۔

پھر یہ ساری تفصیل تو زکوٰۃ کی وصول یابی کے وقت زکوٰۃ کی ادائیگی میں ہے، اور اگر کسی کو اس پر شبہہ بھی ہو تو اس کے لئے یہ راستہ موجود ہے کہ وہ زکوٰۃ وضع ہونے کے بعد نیت کرلے کیونکہ اوپر بتایا جا چکا ہے کہ بینک اکاؤنٹس تقریباً بینک ہولڈرز کی ملک ہے، اور اگر کوئی فضولی کسی کے مال سے زکوٰۃ ادا کر دے تو جب تک مال فقیر (یا اس کے وکیل) کے قبضہ میں ہو اس وقت تک اصل مالک زکوٰۃ کی نیت کر کے اس کی اجازت دے سکتا ہے، اس کی تصریح فقہاء حنفیہ کے

کلام میں موجود ہے، چنانچہ فتاویٰ عالمگیری میں ہے: "رجل ادّی زکوٰۃ غیرہ من مال ذلک الغیر فاجاز المالک فان کان المال قائمًا فی ید الفقیر جاز والّا فلا کذا فی السراجیۃ" (عالمگیریۃ ص ۱۷۱ ج ۱)، اور اگر اصل مالک کی ملک تقدیری سے بالکل صرف نظر کر لیا جائے تو بھی جب تک یہ ظن غالب نہ ہو جائے کہ وہ رقم جمع کردہ زکوٰۃ مسکین کے پاس پہونچ چکی ہے اُس وقت تک مالک زکوٰۃ کی نیت کر سکتا ہے، شامیہ میں ہے، قال فی التتارخانیۃ الّا اذا وجد الاذن او اجاز لما فی التتارخانیۃ ... الی الفقیر لماذا فی البحر لو ادّی زکوٰۃ غیرہ بغیر امرہ فبلغہ فاجاز لم یجز لانہا وجدت نفاذًا علی المتصدق لانہا ملک ولم یصر نائبا عن غیرہ فنفذت علیہ اھ (رد المحتار ص ۱۳ ج ۲) فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم بالصواب

ولی حسن
جامعہ اسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی

رشید احمد
غرہ شعبان سنہ ۱۴۰۲ھ

محمد تقی عثمانی عفا اللہ عنہ
دارالعلوم کراچی

محمد رفیع عثمانی عفا اللہ عنہ
دارالعلوم کراچی

نظرِ ثالث

بعض علماء نے تحریر مذکور پر مفصل بحث اور رسالہ تحریر فرمائی اس پر ۲۳ محرم ۱۴۰۳ھ میں مجلس نے غور کر کے پہلے فیصلہ کی پھر توثیق کی، البتہ مجلس نے اپنی تحریر مذکور میں بعض مسامحات کو تسلیم کر لیا اور ان کی اصلاح کا فیصلہ کیا، نتیجہ کے لحاظ سے ان اصلاحات کا مجلس کے سابق فیصلہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

ان اصلاحات کی مفصل تحریر وقت ختم ہو جانے کی وجہ سے اس مجلس میں نہ ہو سکی اس لئے اس کو دوسری مجلس پر چھوڑ دیا گیا۔ واللّٰہ المستعان

اس تحریر کی تکمیل کے بعد اس کو ماہنامہ "البلاغ" اور تتمہ "احسن الفتاویٰ" میں شائع کر دیا جائے گا ان شاء اللہ تعالیٰ

رشید احمد

باب العشر والخراج

عشر بر حصهٔ مزارعان:

سوال: عشر بر قدر حصه بزرگان در شرع شریف واجب است یا نه؟ اگر واجب است پس کدام حصه بر ایشان صاحب شرع مقرر و معین فرموده اند؟ بینوا توجروا

الجواب ومنه الصدق والصواب

در وجوب عشر در حصهٔ مزارعان اختلاف میان امام وصاحبین رحمهم الله تعالی مشهور است و در کتب مبسوطه مسطور اما فتوی بر قول صاحبین است و در نقل مذهب صاحبین هم اختلاف میان کتب فقه واقع شده است بعض تفصیل کرده اند که اگر بذر من جانب مالک باشد عشر بر وی است واگر من جانب مزارع باشد پس عشر بر مالک و مزارع هر دو مطابق حصهٔ ایشان است، واکثر مصنفین تفصیل مذکور ذکر کرده اند، بلکه بهر صورت عشر را مشترک از حصهٔ هر دو می فرمایند یعنی از خارج ارض عشر ادا کرده بعده تقسیم خواهند کرد. علامه شامی رحمه الله تعالی همین را ترجیح داده اند لهذا در رأی این فقیر همین مذهب معمول به است والدلیل علی کل ما ادعینا ما فی شرح التنویر وفی المزارعة ان کان البذر من رب الارض فعلیه ولو من العامل فعلیهما بالحصة وفی الشامیة (قوله فی المزارعة) قال فی النهر ولو دفع الارض العشریة مزارعة ان البذر من قبل العامل فعلی رب الارض فی قیاس قوله لفسادها وقال فی الزرع لصحتها وقد اشتهر ان الفتوی علی الصحة وان من قبل رب الارض کان علیه اجماعا ومثله فی الخانیة والفتح الی ان قال) لکن ما ذکر من التفصیل یخالفه ما فی البحر والمجتبی والمعراج والسراج والحقائق والظهیریة وغیرها من ان العشر علی رب الارض عنده وعلیهما عندهما من غیر ذکر هذا التفصیل وهو الظاهر لما فی البدائع من ان المزارعة جائزة عندهما والعشر یجب فی الخارج والخارج بینهما فیجب العشر علیهما الخ

وقال ابن عابدین رحمه الله تعالی فی آخر هذا البحث فکان

بقول الشامیؒ متابعۃ ما فی اکثر الکتب (رد المحتار ج ۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۳ ذی قعدہ سنہ ھ

کاریز کے پانی میں نصف عشر ہے:

سوال: چہ میفرمایند علماء دین ومفتیان شرع متین کہ در دیار ما یان کاریز دفتہ جاری هستند کہ از عرصہ تا منبع آب شاید دوازدہ ہزار قدم فاصلہ دارد وہر سال کار روز محنت میخواہد کہ اگر کار کردہ نشود آبش خشک میشود وخرچ ومصرف کارش باندازہ ای میباشد کہ نصف یا کہ در حصہ محصول پیداوارش بکار رفتہ آن صرف میشود در این صورت عشر واجب شود یا نصف عشر؟ مسئلہ مذکورہ بالا را با تحقیق وبحوالۂ کتاب در باب تحریر فرمودہ رفع اشتباہ فرمایند واجر دارین حاصل فرمایند۔

الجواب باسم ملہم الصواب

دریں صورت نصف عشر واجب ہے، قیاساً علی الغرب والدالیۃ، قال الشامیۃ تحت (قولہ وقولہ ثالثاً بالی) لان العلۃ فی العدول عن العشر الی نصفہ فی مستقی غرب ودالیۃ ھی زیادۃ الکلفۃ کما علمت وھی موجودۃ فی شراء الماء (رد المحتار ج ۲ ص ۵۵) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۱۲ ربیع الاول سنہ ھ

مد عشر سے مد خراج کے لئے قرض لینا:

سوال: کیا خراج کے بیت المال کے لئے صدقہ کے بیت المال سے قرض لینا جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

صدقہ کے بیت المال سے خراج کے بیت المال کے لئے قرض لینا جائز ہے اگر اہل خراج فقراء ہوں تو مستقرض منہ کو واپس دینا ضروری نہیں، قال شارح التنویر رحمہ اللہ تعالیٰ وعلی الامام ان یجعل لکل نوع بیتا یخصہ، ولہ ان یستقرض من احدھا لیصرفہ للآخر ویعطی بقدر الحاجۃ۔ وقال ابن عابدین رحمہ اللہ تعالیٰ (قولہ لیصرفہ للآخر) ای لاھلہ قال الزیلعی ثم اذا حصل من ذلک النوع شیء ردہ فی المستقرض منہ الا ان یکون المصروف من الصدقات او من خمس الغنیمۃ علی اھل الخراج وھم فقراء فانہ لا یرد فیہ شیئاً لانھم مستحقون الصدقات

بالفقر وكذا في غيره اذا صرفه الى المستحق (رد المحتار ص ۲۹۰ ج ۲)

دینی اداروں کے مہتمم کے لئے ایک مدرسے دوسرے کے لئے قرض لینا جائز نہیں اس لئے کہ اسکو قرض کی واپسی پر قدرت نہیں، ہو سکتا ہے کہ کوئی رقم وصول نہ ہو، اس کی قدرت بقدرتِ غیر ہے جو غیر معتبر ہے، فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲۷ رجمادی الاولیٰ ۹۲ھ

پھل پکنے سے پہلے کافر کو دیدیا:

سوال: اگر کسی نے قبل الادراک باغ یا زرع کی بیع کسی کافر کے ساتھ کی تو ایسی صورت میں عشر کس پر واجب ہوگا؟ جب کہ کافر نے پھل پختہ ہونے کے بعد کاٹ لیا۔

بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

اس کا عشر کسی پر بھی نہیں، اس لئے کہ بائع کی ملک سے قبل تحقق الوجوب خارج ہو گیا ہے اور کافر میں اہلیت نہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲۴ رمضان المبارک ۹۱ھ

اعتبار غلبۂ ماء کا مطلب:

سوال: ایک زمین کو تین مہینے سیلاب کے پانی سے سیراب کیا جاتا ہے اور چھ مہینے مشین کے پانی سے، سیلاب کا پانی اگرچہ وقت اور مہینوں کے اعتبار سے کم ہے مگر مقدار کے اعتبار سے تین گنا مشین کے پانی سے زیادہ ہے اور فصل کو سیلاب کے پانی سے سیراب کرتے وقت پانی کی ضرورت زیادہ ہوتی ہے بنسبت مشین کے پانی سے سیراب کرنے کے وقت کے، اس صورت میں عشر دینا پڑے گا یا نصف عشر؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

عشر واجب ہے، شامیہ میں بحوالہ زیلعی قیاسا علی السائمۃ والعلوفۃ اعتبار غلبۃ الماء بمعنی اکثر السنۃ تحریر ہے مگر یہ قیاس اس صورت میں صحیح ہے جب کہ پورا سال پانی برابر آئے جیسا کہ سائمہ وعلوفہ کی حاجت اکل ہمیشہ یکساں ہے، صورت سوال میں چونکہ سیلاب کا پانی مقدار میں زائد ہے اور فصل کا زیادہ تر اسی پر مدار ہے اس لئے اسکو سائمہ وعلوفہ پر قیاس نہیں کیا جائے گا۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲۳ ذی الحجہ ۱۴۰۰ھ

بیع الثمر قبل الادراک میں عشر مشتری پر ہے:

سوال: یہاں باغ میں ثمر کا ظہور ہو جاتا ہے قبل الادراک فروخت کرتے ہیں، تو عشر بائع پر ہوگا یا مشتری پر؟ امداد الفتاوی ص ۵۰ ج ۲ میں ہے "میرے نزدیک قول ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ اعدل ہے، اس بناء پر تکمیل ثمرہ کے وقت جس کے پاس وہ باغ ہے اس پر عشر واجب ہوگا" اس پر یہ اشکال ہے کہ امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں وقت وجوب عشر عند ظہور الثمرۃ والامن ہے جس کی بناء پر مذکورہ صورت میں عشر بائع پر ہونا چاہئے، اور صاحب بدائع نے دلیل امام رحمہ اللہ تعالیٰ کو مؤخر فرمایا ہے، اس سے اُن کی عادت کے مطابق قول امام رحمہ اللہ تعالیٰ کی ترجیح ثابت ہوئی، محقق جواب تحریر فرمائیں، بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

بیع قبل الادراک کی صورت میں عشر مشتری پر ہے، امداد الفتاوی کا جواب صحیح ہے، مگر وقت وجوب عشر کو اس کی بناء قرار دینے میں تسامح ہوا ہے، اس لئے کہ اس بناء کو صحیح تسلیم کرنے کا مقتضی یہ ہے کہ وقت وجوب میں اختلاف کی وجہ سے مشتری پر وجوب عشر میں بھی اختلاف ہو، حالانکہ اس میں کوئی اختلاف نہیں، بیع قبل الادراک کی صورت میں بالاتفاق عشر مشتری پر ہے، وقت وجوب میں اختلاف کا ثمرہ صرف یہ ہے کہ وقت وجوب سے قبل جس قدر پھل کھالیا اس پر عشر واجب نہیں، یعنی یہ اختلاف ما یجب فیہ العشر کی بناء پر ہے من یجب علیہ العشر کی نہیں، من یجب علیہ العشر کی بناء تمام تمامیت ادراک ہے، جس کے پاس ثمار تام ہوگا اسی پر عشر واجب ہوگا، قال فی العلائیۃ و یؤخذ العشر عند الامام رحمہ اللہ تعالیٰ عند ظہور الثمرۃ وبدو صلاحها برهان وشرط فی النهر امن فسادها وفی الشامیۃ قال فی الجوهرة واختلفوا فی وقت العشر فی الثمار والزرع فقال ابو حنیفۃ وزفر رحمهما اللہ تعالیٰ یجب عند ظهور الثمرة والامن علیها من الفساد وان لم یستحق الحصاد اذا بلغت حدا ینتفع بها وقال ابو یوسف رحمه اللہ تعالیٰ عند استحقاق الحصاد وقال محمد رحمه اللہ تعالیٰ اذا حصدت وصارت فی الجرین وفائدته فیما اذا اکل منه بعد ما صار حبا او اطعم غیره منه بالمعروف فانه یضمن عشر ما اکل واطعم عند ابی حنیفۃ وزفر رحمهما اللہ تعالیٰ

وقال ابو یوسف ومحمد رحمہما اللہ تعالیٰ لا یضمن ویحتسب به فی تکمیل الاوسق ولا یحتسب به فی الوجوب یعنی اذا بلغ الماکول مع الباقی خمسة اوسق وجب العشر فی الباقی لا غیر وان اکل منها بعد ما بلغت الحصاد قبل ان تحصد ضمن عند ابی حنیفة وابی یوسف رحمہما اللہ تعالیٰ ولم یضمن عند محمد رحمه اللہ تعالیٰ وان اکل بعد ما صارت فی الجرین ضمن اجماعا وما تلف بغیر صنعه بعد حصاده لا یسقط وجب العشر فی الباقی لا غیر (رد المحتار ص ۵۸ ج ۲، بدائع ص ۶۳ ج ۲) وفی العلائیة ولو باع الزرع ان قبل ادراکه فالعشر علی المشتری ولو بعده فعلی البائع (رد المحتار ص ۶۰ ج ۲) وقال الامام الکاسانی رحمه اللہ تعالیٰ ولو باع الارض العشریة وفیها زرع قد ادرک مع زرعها او باع الزرع خاصة فعشره علی البائع دون المشتری لانه باعه بعد وجوب العشر وتقرره بالادراک ولو باعها والزرع بقل فان فصله المشتری للحال فعشره علی البائع ایضا لتقرر الوجوب فی البقل بالفصل وان ترکه حتی ادرک فعشره علی المشتری فی قول ابی حنیفة ومحمد رحمہما اللہ تعالیٰ لتحول الوجوب من الساق الی الحب وروی عن ابی یوسف رحمه اللہ تعالیٰ انه قال عشر قدر البقل علی البائع وعشر الزیادة علی المشتری وکذلک حکم الثمار علی هذا التفصیل (بدائع ص ۵۷ ج ۲) دوسری سب کتب میں بھی اسی طرح مذکور ہے، یعنی اختلاف وقت وجوب پر صرف ما یجب فیه العشر کو متفرع فرمایا گیا ہے، من یجب علیه العشر کو نہیں، من یجب علیه العشر کو تمام ثمار وادراک پر مبنی قرار دیا ہے، شامیہ وبدائع کی عبارت اوپر نقل کی جا چکی ہے، دوسری کتب کے صرف حوالہ پر اکتفاء کیا جاتا ہے، فتح القدیر ص ۸ و ۲۴۸ ج ۲، عالمگیریہ ص ۸۹ و ۱۸۶ ج ۱، طحطاوی ص ۳۰۴ ج ۱، مجمع الانہر ص ۲۱۹ ج ۱، تبیین وحاشیۃ للشلبی ص ۲۹۳ ج ۱، ملا مسکین ص ۲۴ ج ۲۔

البتہ مبسوط کی عبارت موجب التباس ہے، ونصه قال واذا باع الارض وفیها زرع قد ادرک فعشر الزرع علی البائع لان حق الفقراء قد ثبت فی الزرع وهو ملک البائع عند ابی حنیفة رحمه اللہ تعالیٰ بنفس الخروج کما قال اللہ تعالیٰ: ومما اخرجنا لکم من الارض وعند ابی یوسف رحمه اللہ تعالیٰ بالادراک قال اللہ تعالیٰ: وآتوا حقه یوم حصاده وعند محمد رحمه اللہ تعالیٰ

بالاستحقاق ولنا ان الحب حصل فی ملک البائع وهو نماء ارضه فوجب علیه عشره
واما المشتری فقد استحقه عوضا عما اعطی من الثمن فلا شیء علیه وان
باعها والزرع بقل فعشره علی المشتری اذا حصده بعد الادراک لان وجوب العشر
فی الحب وانعقاده کان فی ملک المشتری وهو نماء ارضه وعند ابی یوسف
رحمه الله تعالی عشر مقدار البقل علی البائع لان ذلک القدر من النماء
حصل فی ملکه اما عشر الحب فعلی المشتری وکذلک ان باع الزرع وهو قصیل
فان قصله المشتری فی الحال فالعشر علی البائع وان ترکه علی الارض باذن
البائع حتی استحصد فالعشر علی المشتری وکذلک حکم کل شیء من الثمار
وغیره مما فیه العشر الخ (مبسوط ص ۶ ج ۳) اس عبارت میں من یجب علیه
العشر کے فیصلہ کے لئے بار بار ادراک اور استحصاد کے الفاظ لائے ہیں، مگر ساتھ ہی
لان حق الفقراء وقت نبات الحب سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ من یجب علیه العشر کا
فیصلہ وقت وجوب عشر پر مبنی ہے، مگر مبسوط کی پوری عبارت میں غور کرنے سے یہ حقیقت واضح
ہو جاتی ہے کہ ابتداء ثمرہ کی جس مقدار میں عشر واجب ہوتا ہے اسے قرار نہیں بلکہ نماء ثمرہ کے
ساتھ مقدار عشر میں بھی زیادتی ہوتی رہتی ہے، تمام ثمار اور ادراک و استحصاد کے وقت قرار ثمار
کی وجہ سے مقدار عشر کو بھی قرار حاصل ہو جاتا ہے، حضرت امام اعظم رحمہ اللہ تعالی کے ہاں اگرچہ
ادراک سے قبل ہی عشر واجب ہو جاتا ہے مگر اس کو قرار ادراک کے بعد ہوتا ہے، جس کی ملک میں
مقدار ثمرہ و عشر کو قرار حاصل ہوگا اسی پر عشر واجب ہوگا، مبسوط کے علاوہ بدائع کی عبارت
مذکورہ لانه باعه بعد وجوب العشر وتقرره بالادراک اور لتقرر الوجوب فی البقل
بالفصل میں بھی اس کی تصریح ہے، جیسے کہ بقل میں عشر واجب ہوتا ہے مگر انعقاد حب کے
بعد وہ حب کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اس کو قرار نہیں، البتہ بقل کو کاٹ لینے کی صورت
میں اس میں عشر کو قرار حاصل ہو گیا، اس لئے کاٹنے کی صورت میں عشر بائع پر ہے، لثبوت
القرار فی ملکه، ورنہ کاٹنے کی صورت میں مشتری پر ہے، لانتقال العشر الی الحب وقراره
فی ملک المشتری، غرضیکہ من یجب علیه العشر کا فیصلہ وقت وجوب عشر پر مبنی نہیں بلکہ
وقت قرار عشر پر مبنی ہے، وهو الادراک والاستحصاد، قرار عشر کی دو صورتیں ہیں ایک
عدم امکان الزیادة وهو الادراک والاستحصاد، من یجب علیه العشر میں بالاتفا

یہی مدارِ حکم ہے، روایۃً بھی یہ امر منقول ہے کہ جس کی ملک میں نماء ہوگا عشر اسی پر واجب ہوگا لان
سبب فرضیتہ الارض النامیۃ بالخارج حقیقۃ قرار عشر کی دوسری صورت عدم امکان
انتقاص ہے، خروج زرع و ثمر سے بالاتفاق عشر واجب ہوچکا ہے، قال الامام الکاسانی
رحمہ اللہ تعالیٰ واما سبب فرضیتہ فالارض النامیۃ بالخارج حقیقۃ (وبعد
اسطر) وعلی ہذا یخرج تعجیل العشر وانہ علی ثلاثۃ اوجہ فی وجہ یجوز
بالاتفاق وفی وجہ لا یجوز بالاتفاق وفی وجہ فیہ خلاف اما الذی یجوز
بالاتفاق فہو ان یعجل بعد الزراعۃ وبعد النبات لانہ تعجیل بعد وجود سبب
الوجوب وہو الارض النامیۃ بالخارج حقیقۃ الا تری انہ لو قصلہ فکذا یجب
العشر واما الذی لا یجوز بالاتفاق فہو ان یعجل قبل الزراعۃ لانہ عجل قبل
الوجوب وقبل وجود سبب الوجوب لانعدام الارض النامیۃ بالخارج حقیقۃ
لانعدام الخارج حقیقۃ واما الذی فیہ خلاف فہو ان یعجل بعد الزراعۃ
قبل النبات قال ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ یجوز وقال محمد رحمہ اللہ تعالیٰ
لا یجوز (وبعد سطرین) واما تعجیل عشر الثمار فان عجل بعد طلوعہا جاز
بالاجماع (البدائع ص ۵۴ ج ۲)، مگر اس کے وقت قرار یعنی عدم امکان نقص یعنی
حفاظت از ماکول سے سقوط عشر میں اختلاف ہے، عند الامام رحمہ اللہ تعالیٰ آفت سے امن، عند
الثانی رحمہ اللہ تعالیٰ ادراک، عند الثالث رحمہ اللہ تعالیٰ احراز فی الجرین وقت قرار ہے، یہ قرار
حق ساکین یا ما یجب فیہ العشر سے متعلق ہے، من یجب علیہ العشر سے اس کا کوئی
تعلق نہیں، لان مدارہ ہو النماء،

تفصیل مذکور سے ثابت ہوا کہ تعلیل مبسوط میں اصل مقصد قرار العشر بالمعنی الاول
ای الادراک ہے، اور وقت قرار الوجوب میں اختلاف کے بیان سے صرف تائید مقصود ہے،
کہ اس صورت مخصوصہ میں قرار بالمعنی الثانی بھی حاصل ہوچکا ہے، یہ مدارِ حکم نہیں، اس لئے
کہ بیع قبل الادراک بعد الامن میں عند الامام رحمہ اللہ تعالیٰ قرار بالمعنی الثانی
فی ملک البائع حاصل ہوجانے کے باوجود عشر بالاتفاق مشتری پر ہے، مدارِ حکم آگے بیان
فرمایا ہے، لانہ نماء فی ملکہ، یا استشہاد دوسری کتب مذہب سے تطبیق بلکہ خود عبارت مبسوط ہی
کے مختلف اجزاء کے مابین توفیق کے پیش نظر توجیہ مذکور لازم ہے، بدون اس کے ایک محظور

تو یہ لازم آتا ہے کہ عبارت مبسوط میں تعارض ہے، نیز، ادراک اور استحصار جیسے الفاظ سے ثابت ہوتا ہے کہ مدارِ حکم زوالِ عشر ہے اور وقتِ وجوب میں اختلاف کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مدارِ حکم ہے، دوسرا محظور یہ کہ تعلیل پر تفریع احکام میں مندرجہ ذیل اشکالات پیدا ہوں گے۔

(۱) عند الامام رحمہ اللہ تعالیٰ خروج ثمر وقتِ وجوبِ عشر ہے تو بیع بعد الخروج قبل الادراک کی صورت میں عشر بائع پر ہونا چاہئے، مشتری پر کیوں ہے!

(۲) عند الثانی رحمہ اللہ تعالیٰ وقتِ وجوب ادراک الثمر والزرع ہے تو آپ کے ہاں اس تفصیل میں عشر کیوں ہے!

(۳) عند الثالث رحمہ اللہ تعالیٰ بوقت احراز فی الجرین عشر واجب ہوتا ہے تو بیع بعد الادراک میں عشر بائع پر کیوں ہے! مشتری پر ہونا چاہئے،

عبارت مبسوط میں استحکام سے احراز فی الجرین ہی مراد ہے، اس لئے کہ ادراک و استحصار کے بعد احراز فی الجرین کے سوا کوئی حالت نہیں، علاوہ ازیں دوسری تمام کتب کے مطابق بھی یہی مفہوم ہے، وقال الامام الکاسانی رحمہ اللہ تعالیٰ وعند محمد رحمہ اللہ تعالیٰ وقت التنقیۃ والجذاذ فانہ قال اذا کان الثمر قد حصد فی الحظیرۃ و ذری البر (الی قولہ) ھو یقول تلک الحال ھی حال تناھی عظم الحب والثمر واستحکامھا فکانت ھی حال الوجوب (بدائع ص ۶۳ ج ۲)، اس سے ثابت ہوا کہ استحکام سے احراز فی الجرین ہی مراد ہے،

فان قلت ھذا یخالف عبارۃ المبسوط وذلک کلہ حصل فی ملک البائع،

فالجواب انہ محمول علی اعطاء حکم الحصول لقربہ او علی التغلیب لحصول الاکثر والامر المدار ای تمام نضاء الثمرۃ والزرع غلبت آمل، فقط واللہ تعالیٰ اعلم،

۳ ربیع الاول ۸۲ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

كُلُوا مِن ثَمَرِهِ إِذَا أَثْمَرَ وَآتُوا حَقَّهُ يَوْمَ حَصَادِهِ

السراج

لاحکام

العشر والخراج

① عشر و خراج سے متعلق ستائیس سوالات کا جواب

② عفو عشر و خراج از جانب سلطان

③ پاکستان اور ہندوستان کی اراضی عشری ہیں یا خراجی؟

عشر و خراج سے متعلق تشنۂ تحقیق سوالات:

① مزارعت میں خراج کس پر ہے؟
② اجارۂ ارض کی صورت میں عشر و خراج کس کے ذمہ ہے؟
③ سرکاری ٹیکس جو وصول کیا جاتا ہے اس سے عشر ساقط ہو جاتا ہے یا نہیں؟
④ سرکاری ٹیکس سے خراج ادا ہو جاتا ہے یا نہیں؟
⑤ عشر و خراج کے صحیح مصارف کیا ہیں؟
⑥ زمین کی کاشت پر جو خرچ آیا وہ کاٹ کر باقی پر عشر ہے یا کل پیداوار پر؟
⑦ سرکاری ٹیکس کاٹ کر باقی پیداوار سے عشر دیا جائے گا یا کل ابتداءً جتنی پیداوار ہو اس میں سے عشر واجب ہے؟
⑧ مقروض زائد از قرض کا عشر دے گا یا کل پیداوار کا؟
⑨ عشر کے لئے کوئی نصاب متعین ہے یا نہیں؟
⑩ کیا گھاس، فور، سبزی وغیرہ پر بھی عشر ہے یا صرف اناج پر ہے؟
⑪ صغیر و مجنون کی زمین پر عشر واجب ہے یا نہیں؟
⑫ مساجد یا دینی مدارس وغیرہ کے لئے وقف اراضی پر عشر واجب ہے یا نہیں؟
⑬ عشری زمین میں کس حالت میں دسواں حصہ واجب ہوا اور کس میں بیسواں؟
⑭ خراج کی مقدار کیا ہے؟
⑮ اگر زمین میں کچھ بھی کاشت نہ کیا ہو تو بھی خراج واجب ہے؟
⑯ مزارعت میں اگر عشر مشترک پیداوار پر ہے تو کیا زمیندار کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ بٹائی سے قبل عشر نکال دے اگرچہ مزارع اس پر راضی نہ ہو؟
⑰ خراج سال بھر میں صرف ایک بار واجب ہے یا عشر کی طرح ہر فصل پر واجب ہے؟
⑱ اگر کسی آفت سے فصل تباہ ہو جائے یا چوری ہو جائے تو اس پر عشر و خراج ہوگا یا نہیں؟
⑲ اگر رہائشی مکان کے صحن میں باغ لگالیا تو اس پر عشر یا خراج کا کیا حکم ہے؟
⑳ کسی نے غیر کی زمین پر جبراً قبضہ کر لیا تو اس کا عشر و خراج کس کے ذمہ واجب ہوگا؟
㉑ اگر درمیان سال زمین فروخت کر دی تو اس کا عشر و خراج بائع کے ذمہ ہوگا یا کہ مشتری پر ہوگا؟

السراج ——— ۲

(۲۲) عشر ادا کرنے کے بعد پیداوار کی قیمت پر سال گزر جائے تو اس پر زکوٰۃ فرض ہوگی یا نہیں ؟

(۲۳) کئی سالوں کا عشر قبل از وجوب نکال دینا جائز ہے یا نہیں ؟

(۲۴) ایک شخص زرعی زمین کی تجارت کرتا ہے، تو کیا عشر کے علاوہ زمین کی مالیت پر زکوٰۃ بھی فرض ہے ؟

(۲۵) جو سبزی اور پھل وغیرہ مالک خود اپنے ذاتی استعمال میں لاتا ہے کیا اس پر بھی عشر فرض ہے ؟

(۲۶) عشر پیداوار کی جنس سے دینا ضروری ہے یا اس کی قیمت بھی دی جا سکتی ہے ؟

(۲۷) جو شخص خود بھی مسکین ہو اور اس کے لئے زکوٰۃ لینا حلال ہو کیا اس پر بھی زمین کی پیداوار سے عشر نکالنا واجب ہے ؟ جبکہ وہ دوسروں سے زکوٰۃ و عشر لینے کا مستحق ہے، تو کیا وہ اپنی زمین کا عشر خود نہیں رکھ سکتا ؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملهم الصواب

① مزارعت میں عشر و خراج کس پر ہے ؟

خراج موظف ہر حالت میں زمیندار پر ہے، خراج مقاسمہ اور عشر میں آئندہ تفصیل ہے، خراج مقاسمہ مصرف میں تو خراج موظف کی طرح ہے، اور ماخذ میں عشر جیسا ہے، قال فی الشامیۃ تحت (قولہ خراج مقاسمۃ الخ) خراج المقاسمۃ کالموظف مصرفا وکالعشر ماخذا (الی قولہ) وبہ تقرر ان خراج المقاسمۃ کالعشر لتعلقہ بالخارج ولذا یتکرر بتکرر الخارج فی السنۃ وانما یفارقہ فی المصرف فکل شیئ یؤخذ منہ العشر یؤخذ نصفہ منہ خراج المقاسمۃ وتجری الاحکام التی قررت فی العشر ثم قال ردالمحتار ص ۲۵۹ ج ۳)

عشر اور خراج مقاسمہ میں یہ تفصیل ہے کہ مزارعت صحیحہ میں عشر زمیندار اور مزارع دونوں پر بقدر حصص ہے، یعنی عشر یا خراج مقاسمہ مشترک طور پر ادا کرنے کے بعد تقسیم کریں گے، قال فی الشامیۃ ولو دفع الارض العشریۃ مزارعۃ ان البذر من قبل العامل فعلی رب الارض فی قیاس قولہ لفسادھا وقالا فی الزرع لصحتہا وقد اشتھر ان الفتوی علی الصحۃ وان من قبل رب الارض کان علیہ اجماعا ومثلہ فی الخانیۃ والفتح (الی ان قال) لکن ماذکر من التفصیل یخالفہ ما فی البحر والمجتبی والمعراج والسراج

والحقائق والظهيرية ان العشر على رب الارض عنده وعليهما عندهما من غير ذكر هذا التفصيل وهو الظاهر فما فى البحر اى من ان المزارعة جائزة عندهما فالعشر فى الخارج بينهما اى يجب العشر عليهما الخ وقال ابن عابدين رحمه الله فى آخر هذا البحث فكان ينبغى للشارح متابعة ما فى اكثر الكتب ثم اعلم ان هذا كله فى العشر اما الخراج[عه] فعلى رب الارض اجماعا (رد المحتار ج ۲ ص ۶۱)

اور مزارعت فاسدہ میں اگر بیج زمیندار کی طرف سے ہے تو عشر اور خراج مقاسمہ بھی زمیندار پر ہے، اور اگر بیج مزارع کی طرف سے ہے تو اس میں وہ تفصیل ہوگی جو اجارہ سے متعلق آئندہ جواب میں آرہی ہے، کیونکہ یہ صورت بھی اجارہ کے حکم میں ہے، قال فی الشامیۃ عشر جميع الخارج على رب الارض عنده لان المزارعة فاسدة عنده فالخارج له اما حقيقة او تقديرا لان البذر ان كان من قبله فجميع الخارج له وللمزارع اجر مثل عمله وان كان من قبل المزارع فالخارج له ولرب الارض اجر مثل ارضه الذى هو بمنزلة الخارج الا ان عشر حصته فى عين الخارج وعشر حصة المزارع فى ذمة رب الارض وفائدة ذلك السقوط بالهلاك اذا نيط بالعين وعدمه اذا نيط بالذمة (رد المحتار ج ۲ ص ۶۷)

وفى التحرير المختار للرافعى رحمه الله تعالى (قوله العشر عند الامام على رب الارض مطلقا) لانه ان كان البذر لرب الارض فلا شبهة فى وجوب العشر عليه واما اذا كان للآخر فلان رب الارض موجر ومن مذهبه ان العشر على الموجر (التحرير المختار ص ۱۳۹ ج ۲)

مزارعت کی صورتیں:

(۱) ارض و بیج ایک کے ہوں، اور بیل و عمل دوسرے کے،
(۲) ارض ایک کی باقی سب دوسرے کا،
(۳) عمل ایک کا باقی سب دوسرے کا،
(۴) ارض و بیل ایک کے بیج و عمل دوسرے کے،

عه ای الخراج الموظف لما مر من ان خراج المقاسمة كالعشر فافهم ۱۲ منه

(۵) بقر و بذر ایک کے ارض و عمل دوسرے کے۔
(۶) بقر ایک کے باقی سب دوسرے کا۔
(۷) بذر ایک کا باقی سب دوسرے کا۔

ان سات اقسام میں سے پہلی تین قسمیں مزارعۃ صحیحہ کی ہیں اور آخری چار مزارعۃ فاسدہ کی، قال فی شرح التنویر ولکن صحت لو کان الارض والبذر لزید والبقر والعمل للآخر او الارض له والباقی للآخر او العمل له والباقی للآخر فهذه الثلاثة جائزة وبطلت فی اربعة اوجه لو کان الارض والبقر لزید او البقر والبذر له والآخران للآخر او البقر او البذر له والباقی للآخر (رد المحتار ص ۹۵ ج ۵)

④ اجارۃ الارض کی صورت میں عشر وخراج کس پر ہے؟

اجارۂ صحیحہ اور فاسدہ میں خراج موظف بہرکیف زمیندار پر ہے، اور عشر وخراج مقاسمہ میں یہ تفصیل ہے کہ اگر زمیندار اجرت بہت زیادہ لیتا ہے اور مستاجر کے پاس بہت کم بچتا ہے تو عشر اور خراج مقاسمہ زمیندار پر ہے، اور اگر اجرت کم لیتا ہے، مستاجر کو بہت زیادہ بچتا ہے تو عشر اور خراج مقاسمہ مستاجر پر ہے، اس زمانہ میں عموماً اجرت کم لی جاتی ہے، مستاجر کی آمدنی زیادہ ہوتی ہے اس لئے عشر اور خراج مقاسمہ مستاجر پر ہوگا، قال فی شرح التنویر والعشر علی المؤجر کخراج موظف وقالا علی المستاجر کمستعیر مسلم وفی الحاوی وبقولهما نأخذ وفی الشامیة قلت ولکن افتی بقول الامام جماعة من المتأخرین الی ان قال لکن فی زماننا عامة الاوقاف من القری والمزارع لرضا المستاجر بتحمل غرامتها ومؤنها یستأجرها بدون اجر المثل بحیث لا تفی الاجرة ولا اضعافها بالعشر او خراج المقاسمة فلا ینبغی العدول عن الافتاء بقولهما فی ذلك لانهم فی زماننا یقدرون اجرة المثل بناء علی ان الاجرة سالمة لجهة الوقف وان المستاجر لیس علیه سوی الاجرة فان اجرة المثل تزید اضعافا کثیرة کما لا یخفی فان امکن اخذ الاجرة کاملة یفتی بقول الامام والا فبقولهما لما یلزم علیه من الضرر الواضح الذی لا یقول به احد والله تعالیٰ اعلم (رد المحتار ج ۲ ص ۵۵)

③ سرکاری ٹیکس سے عشر ساقط نہیں ہوتا:

سرکاری ٹیکس سے عشر ساقط نہیں ہوتا، کتب فقہ کی عبارت "لا یجتمع العشر مع الخراج" سے بعض کو اشتباہ ہو گیا ہے کہ سرکاری مالگذاری ادا کرنے سے عشر ساقط ہو جائے گا، حالانکہ اس جزئیہ سے مقصد یہ ہے کہ زمین خراجی سے باوجود خراج کے عشر لینا یا زمین عشری سے عشر کے ساتھ خراج بھی وصول کرنا جائز نہیں، یہ مطلب نہیں کہ عشری زمین سے خراج ادا کرنے سے عشر ساقط ہو جائے گا۔ قال فی شرح التنویر ولا یؤخذ العشر من الخارج من ارض الخراج لانهما لا یجتمعان خلافا للشافعی، وفی الشامیة ای لو کان له ارض خراجها موظف لا یؤخذ منها عشر الخارج وکذا لو کان خراجها مقاسمة من النصف ونحوه وکذا لو کانت عشریة لا یؤخذ منها خراج لانهما لا یجتمعان ولذا لم یفعله احد من الخلفاء الراشدین والا لنقل وتمامه فی الفتح (رد المحتار ص ۲۶۰ ج ۲)

غرضیکہ عشر عبادت ہے جس کا ادا کرنا لازم ہے، جس طرح کہ حکومت کی جانب سے انکم ٹیکس وغیرہ وصول کرنے سے زکوٰۃ ساقط نہیں ہوتی اسی طرح زمین کا سرکاری ٹیکس ادا کرنے سے عشر معاف نہیں ہوتا۔

④ سرکاری ٹیکس سے خراج کی ادائیگی کی تفصیل:

حکومت زمین پر جو رقم وصول کرتی ہے اس کی دو قسمیں ہیں، ایک پانی کی قیمت جسے آبیانہ کہتے ہیں، دوسری رقم محصول یا ٹیکس کے نام سے وصول کی جاتی ہے، سو پہلی قسم کی رقم خراج میں شمار نہ ہوگی، البتہ دوسری قسم کو خراج میں محسوب کرنا درست ہے، لہٰذا اگر کسی زمین پر خراج مقاسمہ فرض ہے تو خراج کی کل مقدار سے سرکاری محصول (دوسری قسم) وضع کر کے باقی خراج ادا کیا جائے، یہ حکم پاکستان کی اراضی کا ہے، جہاں حکومت مسلم ہے، ہندوستان یا اور کسی غیر مسلم حکومت میں واقع اراضی کا خرچ ادا کرنے سے فرض ساقط نہ ہوگا کیونکہ نہ تو کافر حکومت کو خراج وصول کرنے کا حق ہے، اور نہ ہی اس کی فوج وغیرہ خراج کا شرعی مصرف ہے، اس لئے وہاں کے مسلمانوں پر فرض ہے کہ اپنے طور پر خراج نکال کر دینی کاموں پر خرچ کریں، قال العلامة عبد الغفور الهمایونی الہندی فی رسالة "سراج الهند فی تحقیق خراج السند" واما آنچہ حکام نصاری می گیرند پس در ادائے خراج محسوب نمی گردد لان الکافرین لیس لهم ولایة اخذ الخراج من المسلمین والمؤمنین والیضا لیسوا

بمصارف الخراج حتى اذا ادى المسلمون اليهم مال ابنية الخراج لا يخرجون عن عهدته لانهم ليسوا بمقاتلين لاهل الحرب ولا دافعين لاعداء الاسلام عنهم وعن دارهم بل هم اهل الحرب واعداء المسلمين والاسلام اماتهم الله تعالى عليهم والمصارف للخراج المقاتلون لاهل الحرب ودافعوا الاعداء عن دار الاسلام اما عدم ولاية الكافرين لاخذ الخراج من المسلمين فلما مر من عبارة جامع الفصولين واما عدم كون الكافرين مصرفا للخراج فلما ذكر في الدر المختار والكنز والهداية في فصل الجزية من مصارف الخراج وسيجيء عباراتهم والكافرون ليسوا منهم اصلا كما ستعرف، پس آنچہ نصاریٰ می گیرند محض بظلم وتعدی می گیرند بحساب آں بر ذمہ [illegible] خواہد شد ومسلمانان را اعادۂ آں بر ذمے سوء خود باید کرد تا از عہدۂ آں عند اللہ تعالیٰ برآیند ولہم قال بعد ذکر مصارف الخراج، وکفار اہل حرب جیسا کہ نصاریٰ وغیرہم داخل ایں مصارف نیستند کہ بایں اوشاں خراج اداشود، وقد صرح بذلک صاحب الدر المختار ایضا حیث قال فی باب المصرف واما العرفی ولو ما اخذنا فجمیع الصدقات لا یجوز له التقاطه اهـ، فان قلت یفهم من عبارة الدر المختار ان اهل الحرب اذا اخذوا الخراج من المسلمين فلا اعادة عليهم وتفصيله ان صاحب الدر المختار قال في باب زكوة الغنم اخذ البغاة والسلاطين الجائرة زكوة الاموال الظاهرة كالسوائم والعشر والخراج لا اعادة على اربابها ان صرف المأخوذ في محله الآتي ذكره والا يصرف فيه فعليهم فيما بينهم وبين الله تعالى اعادة غير الخراج لانهم مصارفه اهـ فقال المحشي تحت هذا القول ويظهر لي ان اهل الحرب لو غلبوا على بلدة من بلادنا كذلك لتعليلهم اصل المسألة بان الامام لم يحمهم والجباية بالحماية فقوله كذلك يدل على ان حكم اهل الحرب مثل اهل البغاة اذا اخذوا الخراج فلا اعادة على المسلمين فكيف تقول ان المسلمين يعيدون اذا اخذ منهم اهل الحرب قلت لفظ كذلك ليس اشارة الى عدم الاعادة بل اشارة الى عدم اخذ الامام. ثانيا بدليل قوله لتعليلهم اصل المسألة بان الامام لم يحمهم والجباية بالحماية فان عدم حمايته انما هو دليل على عدم اخذ الامام ثانيا منهم لا دليل على عدم اعادتهم فيما بينه وبين الله تعالى

والمشار اليه يكون لك اعنى عدم اخذ الامام ثانيا مذكورا فى اول عبارتنا الحاشية
حيث قال وقوله اخذ البغاة لا الاخذ ليس قيدا احترازيا حتى لو لم ياخذوا منه
ذلك سنين وهو عندهم لم يؤخذ منه شئ ايضا كما فى البحر والشرنبلالية عن
الزيلعى والبغاة قوم مسلمون خرجوا عن طاعة الامام الحق بان ظهروا فاخذوا
ذلك نحو يتطرق له ان اهل الحرب لو غلبوا على بلدة من بلادنا كان كذلك لتعليلهم اصل
المسألة بان الامام لم يحمهم والجباية بالحماية اھ فبالجملة ههنا مسألتان
احدهما ان البغاة اذا اخذوا الخراج والصدقة فلا ياخذ الامام مرة اخرى و
ثانيتهما ان اعادة الخراج على المسلمين بوجوههم غير لازم اذا اخذ البغاة سواء
صرفوها فى محله او لم يصرفوه لانهم مصارفه لكونهم مقاتلة لاهل الحرب
لانهم قوم مسلمون خرجوا عن طاعة الامام بخلاف الصدقة فانها ان صرفت
فى محلها المستحق لا يطالبهما وفصل هاتين مسألتين صاحب الهداية والعلامة العينى
فى شرح الكنز وصاحب المستخلص شرح الكنز قال صاحب الهداية واذا اخذ
الخوارج الخراج وصدقة السوائم لا يثنى عليهم لان الامام لم يحمهم والجباية
بالحماية وافتوا بان يعيدوها دون الخراج لانهم مصارف الخراج لانهم مقاتلة
والزكوة مصرفها الفقراء ولا يصرفونها اليهم وقيل اذا نوى بالدفع التصدق
عليهم سقط عنهم وكذا الدفع الى كل جائر لانهم بما عليهم من التبعات فقراء
والاول احوط اھ وقال العينى ولو اخذ الخراج والعشر والزكوة بغاة لم تؤخذ
مرة اخرى لان الامام لم يحمهم والاخذ بالحماية بخلاف ما اذا مر بهم
فعشره حيث يؤخذ منه ثانيا لان التقصير من جهته والذى كلامهم فيه
ثم اذا لم يؤخذ منهم ثانيا يفتون بان يعيدوها فيما بينهم وبين الله تعالى
وقال فى المستخلص لو اخذ الخراج او العشر او الزكوة بغاة لم يؤخذ اخرى اعلم
ان ولاية الاخذ فى الخراج والعشر وزكوة السوائم وزكوة اموال التجارة انما
هى للامام فان اخذت البغاة او سلاطين زماننا الخراج فلا اعادة على الملاك ان
يعطيها ثانيا وليس للامام ان ياخذ ثانيا لانه لم يحمهم ويفتى على ان للارباب
ان يعيدوها بينهم وبين الله تعالى او يصرفوها الى مستحقيها واما الخراج

فلا اعادة علیهم لانهم مصارف الخراج لکونهم مقاتلة والخراج مصرفها
المقاتلة بخلاف الزکوٰة اه فصاحب رد المحتار اشار بلفظ کذلک الی المسألة الاولی
اعنی عدم الاخذ لاتحاد العلة وهو عدم الحمایة من الامام لا الی المسألة الثانیة
اعنی عدم الاعادة علی اربابه لعدم اتحاد العلة لان علة عدم الاعادة اما صرفهم
الی مصارفه او لانهم مصارفه لکونهم مقاتلة والکفار لیسوا بمصارف الزکوٰة
والخراج ولیس لهم الاخذ واداؤهما الی مصارفهما فانهم نعم لو کان من طرفهم
وال مسلم فیجوز له اخذ الخراج کما صرح به الکتب وفی هذه الدیار الولاة
کفار ولیسوا بمسلمین فلم یکن لهم ولایة اخذ الخراج انتهی قول العمادی

فائدہ ۱:- اس مقام پر علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ کی تحریر میں اشکال ہے، کما
قال الرافعی رحمه الله تعالی (قوله الاخذ لیس قید الخ) کون الاخذ لیس
بقید انما یظهر فی عبارة الکنز وهی لو اخذ الخراج والعشر والزکوٰة بغاة
لم یؤخذ اخری لا فی عبارة المصنف وهی قوله لا اعادة الخ فانه اذا لم یأخذوا
منه سنین وهو عندهم یجب علیه الاخراج بنفسه وتکون ذمته مشغولة
فیما بینه وبین الله تعالی وان کان العامل لیس له ولایة الاخذ لان الجبایة
بالحمایة تأمل (التحریر المختار ص ۱۳۲ ج ۱) وقال العمادی رحمه الله تعالی
اذا تأملت حق التأمل فقد زلت اقدام هذا الهمام فی هذا المقام والتبس
علیه مسألة باخری ولم یفرق بینهما تقریره ان صاحب الدر المختار ذکر فی
کتابه مسألة عدم الاعادة ومسألة عدم الاخذ حیث قال لا اعادة علی اربابها
ولم یقل لا یأخذ منهم ثانیا ثم ذکر المحشی تحت هذه المسألة عبارة تدل علی
ان صاحب الدر متعرض لمسألة عدم الاخذ حیث قال (قوله اخذ البغاة الخ) الاخذ
لیس قیدا احترازیا حتی لو لم یأخذوا منه ستین سنة وهو عندهم لم یؤخذ
منه شیء ایضا کما فی البحر والشرنبلالیة عن الزیلعی اه فقوله ایضا یدل
علی ان صاحب الدر المختار متعرض لمسألة عدم الاخذ لان المفهوم من قولهم
انهم اذا لم یأخذوا الخراج منه ستین سنة وهو عندهم فأمن الامر ای رجع
الحکم الذی اثبت صاحب الدر وهو عدم الاخذ للامام ثانیا ایضا (رجوعا)

فلم يكن للاخذ فيه قيد احترازي يحترز به عن عدم اخذ البغاة الخراج بل حكم
اخذهم الخراج وعدم اخذهم اذا كان عشرهم في دار البغي واحد مع ان صاحب
الدر لم يتعرض مسألة عدم الاخذ اصلا فالتبس على المحشي مسألة بمسألة
اخرى فهو ظن بان هذا اصل لعدم اخذ الامام ثانيا مع انها مسألة عدم اعادة
السلاطين فافهم. الآن يقال ان صاحب الدر اورد آخر المسألة وترك اولها اتكالا
على شهرته ولكونه غير مختلف فيه وعدم كونه ذات تفصيل فان مسألة عدم
الاعادة ليست بمسألة مستقلة برأسها بل كالتذييل والتتميم لمسألة عدم
الاخذ ولهذا اتى عبارات الكتب المارة لوردن هذه المسألة بطريق التفريع و
التذييل والتتميم لا بطريق الاستقلال والاصلية كما لا يخفى على المتدرب
في اساليب الكلام فاوردوا المحشي هذه العبارة تنبيها على اول المسألة واشعارا
على اصلها وبين ما عليه قوله لتعليلهم اصل المسألة اي اصل مسألة المتن وهو
مسألة عدم اخذ الامام ثانيا او يقال ان صاحب الدر متعرض لمسألة عدم الاخذ
ايضا لان معنى قوله لا اعادة على اربابها ليس على المالك ان يعطيه ثانيا وليس
للامام ان يأخذها مرة اخرى كما يدل عليه عبارة المستخلص حيث قال فان
اخذت البغاة او سلاطين زماننا الخراج فلا اعادة على المالك يعني ليس على
المالك ان يعطيه ثانيا وليس للامام ان يأخذه ثانيا او فانه فسر عدم الاعادة
عليهما فيكون معنى قول الدر لا اعادة على اربابها لا يعطون بوجوههم مرة اخرى
ولا يأخذ منهم الامام ثانيا ان صرف المأخوذ في محله والا يصرف فيه فعليهم
اعادة غير الخراج لوجوههم خروجا عن العهدة فيما بينهم وبين الله تعالى
ولكن لا يأخذ منهم الامام ثانيا في هذه الصورة ايضا ولهذه النكتة لم يقيد
صاحب الدر الاعادة الاولى بقوله فيما بينهم وبين الله تعالى وقيد الاعادة
الثانية به لان المراد بالاعادة الاولى هو المطلق وبالثانية المقيد. فالحاصل
ان الامام لا يأخذ منهم مرة اخرى مطلقا سواء صرفوه في محله او لم يصرفوه
ولكن بوجوههم يعيدون غير الخراج ان لم يصرف في محله ولم يعيدوا ان صرف
في محله. والله اعلم بالصواب.

السرنج ـــــ ١٠

⑤ عشر و خراج کا مصرف:

عشر کا مصرف وہی ہے جو زکوٰۃ کا ہے، اور خراج مقاصد و وظائف کا مصرف ہے مصالح عامہ جس میں بناء مساجد و مدارس وغیرہ بھی داخل ہے، قال فی شرح التنویر فی فصل الجزیۃ ومصرف الجزیۃ والخراج (الی قولہ) مصالحنا کسد الثغور وبناء قنطرۃ وجسر وکفایۃ العلماء والمتعلمین وبہ یدخل طلبۃ العلم والقضاۃ والعمال ککتبۃ قضاۃ وشہود قسمۃ ورقباء سواحل ورزق المقاتلۃ وذراریہم ای ذراری من ذکر وقال فی الشامیۃ (قولہ ومصرف الجزیۃ والخراج الخ) قید بالخراج لان العشر مصرفہ مصرف الزکوٰۃ کما مر وایضا فیہا تحت (قولہ وبناء قنطرۃ) ومثلہ بناء مسجد وحوض ورباط وکری انہار عظام غیر مملوکۃ کالنیل وجیحون وکذا النفقۃ علی المساجد فیدخل فیہ الصرف علی اقامۃ شعائرہا من وظائف الامامۃ والاذان ونحوہما (قولہ وکفایۃ العلماء) ہم اصحاب التفسیر والحدیث والظاہر ان المراد بہم من یعلم العلوم الشرعیۃ فیشمل الفقہ والنحو ونحوہما وفی التعبیر بالکفایۃ اشعار بانہ لا یزاد علیہا وکذا یشعر باشتراط الفقر الخ (رد المحتار ج ۳ ص ۳۰۴)۔

⑥ عشر کل پیداوار پر بلا وضع مصارف ہے:

بلا وضع مصارف کل پیداوار پر عشر واجب ہے، قال فی شرح التنویر بلا رفع مؤن ای کلف الزرع وبلا اخراج البذر لتصریحہم بالعشر فی کل الخارج (رد المحتار ج ۲)

⑦ بلا وضع سرکاری ٹیکس کل پیداوار پر عشر ہے:

ابتداءً جتنی پیداوار ہو اس کا عشر واجب ہے، ٹیکس وضع کر کے باقی سے نہیں لما مر فی جواب المسألۃ السابقۃ۔

⑧ مقروض بلا وضع قرض کل پیداوار سے عشر دے گا:

قرض وضع نہیں کیا جائے گا، کل پیداوار سے عشر واجب ہے، قال فی شرح التنویر ویجب مع الدین (رد المحتار ج ۲)

⑨ عشر کا کوئی نصاب نہیں:

۲۱ وجوب عشر کے لئے کوئی نصاب شرط نہیں، البتہ ایک صاع (۸۰۰،۵ لیٹر) سے کم پر عشر

نہ ہوگا، قال فی شرح التنویر ویجب العشر فی عسل وان قل (الی ان قال) بلا شرط نصاب وبقاء وحولان حول الخ وفی الشامیۃ (قولہ بلا شرط نصاب وبقاء) فیجب فیما دون النصاب بشرط ان یبلغ صاعا وقیل نصفہ (رد المحتار ج ۲ ص ۴۹) مقدار صاع معلوم کرنے کی آسان صورت یہ ہے کہ ۵۲۸ء۳ کلوگرام جو سے جو برتن بھر جائے وہ صاع ہے، صاع کی پوری تحقیق بندہ کے رسالہ "بسط الباع لتحقیق الصاع" میں ہے۔

(۱) کپاس اور سبزی وغیرہ پر بھی عشر ہے:

کپاس، اناج اور سبزی ترکاری وغیرہ ہر قسم کی پیداوار پر عشر ہے، مگر بھوسہ اور سوکھی چری وغیرہ جس سے اناج حاصل کیا گیا ہو اس میں عشر نہیں، البتہ اگر دانہ پڑنے سے پہلے ہی کاٹ لی ہو تو اس پر بھی عشر ہے، قال فی شرح التنویر ویجب العشر فی عسل وان قل (الی ان قال) الا فیما لا یقصد بہ استغلال الارض نحو حطب وقصب فارسی و حشیش وتبن وسعف وصمغ وقطران وخطمی واشنان وشجر قطن وباذنجان و بذر بطیخ وقثاء وادویۃ کحلبۃ وشونیز حتی لو اشغل ارضہ بھا یجب العشر وفی الشامیۃ تحت (قولہ بلا شرط نصاب وبقاء) وفی الخضروات التی لا تبقی وھذا قول الامام وھو الصحیح کما فی التحفۃ (قولہ الا فیما لا یقصد الخ) اشار الی ان ما اقتصر علیہ المصنف کالکنز وغیرہ لیس المراد بہ ذاتہ بل لکونہ من جنس ما لا یقصد بہ استغلال الارض غالبا وان المدار علی القصد حتی لو قصد بہ ذلک وجب العشر کما صرح بہ بعضھم (قولہ وتبن) غیر انہ لو فصل قبل انعقاد الحب وجب العشر فیہ لانہ صار ھو المقصود وحین محصن فی التبن لو ایبس العشر (قولہ وشجر قطن) اما القطن نفسہ ففیہ العشر کما مر (قولہ وباذنجان) عطف علی قطن فلا یجب فی شجرہ ویجب فی الخارج منہ (قولہ وبذر بطیخ وقثاء) ای کل حب لا یصلح للزراعۃ کبذر البطیخ والقثاء لکونھا غیر مقصودۃ فی نفسھا بحر ای لانہ لا یقصد بزراعۃ الحب نفسہ بل لما یخرج منہ وھو الخضروات وفیھا العشر کما مر (الی ان قال) ویجب فی العصفر والکتان وبذرہ لان کل واحد منھا مقصود فیہ (قولہ حتی لو اشغل ارضہ بھا یجب العشر) فلو استنمی ارضہ بقوائم الخلاف وما اشبھہ او بالقصب او الحشیش وکان یقطع ذلک ویبیعہ

کان فیہ العشر (الی ان قال) ویجب ما یقطعہ لیس بقید ولذا اطلقہ قاضی خان،
(رد المحتار ج ۲ ص ۷۴)

⑪ صغیر کی زمین پر عشر:

صغیر ومجنون کی زمین پر عشر فرض ہے، قال فی شرح التنویر ویجب مع الدین وفی ارض صغیر ومجنون ومکاتب ومأذون وفی الشامیۃ فلا یشترط فی وجوبہ العقل والبلوغ والحریۃ (رد المحتار ص ۵۲ ج ۲)

⑫ وقف زمین پر عشر:

وقف زمین پر بھی عشر واجب ہے، لما فی العلائیۃ ویجب (الی قولہ) ووقف، وفی الشامیۃ افاد ان ملک الارض لیس بشرط لوجوب العشر وانما الشرط ملک الخارج لانہ یجب فی الخارج لا فی الارض فکان ملکہ لہا وعدمہ سواء بدائع (رد المحتار ج ۲)

⑬ عشر کی مقدار:

عشری زمین اگر بارش یا دریا کے سیل یا قدرتی چشمہ کے پانی سے سیراب کی جاتی ہو تو اس کی پیداوار میں عشر (۱/۱۰) واجب ہے، اور اگر پانی محنت یا قیمت سے حاصل ہوتا ہو جیسے کنواں، ٹیوب ویل اور نہری پانی تو اس میں نصف عشر (۱/۲۰) واجب ہے، نہری پانی کا آبیانہ ادا کرکے اسے حکومت سے خریدا جاتا ہے، اور اگر عشر ونصف عشر دونوں قسم کا پانی استعمال ہوتا ہو تو غالب کا اعتبار ہے، عشر والا پانی غالب ہوگا تو ۱/۱۰ اور نصف عشر والا غالب ہوگا تو ۱/۲۰ واجب ہوگا، اور اگر دونوں پانی برابر ہوں تو عشر کا ۳/۴ یعنی کل پیداوار کا ۳/۴۰ واجب ہوگا، فی شرح التنویر یجب فی مسقی سماء وسیح ونصفہ فی مسقی غرب ودالیۃ، وفی الشامی لکثرۃ المؤنۃ وفی کتب الشافعیۃ او سقاہ بماء اشتراہ وقواعدنا لا تأباہ ولو سقی سیحا وبآلۃ اعتبر الغالب، ولو استویا فنصفہ وقیل ثلاثۃ ارباعہ. وفی الحاشیۃ (قولہ وقواعدنا لا تأباہ) کذا نقلہ الباقانی فی شرح الملتقی عن شیخہ البہنسی لان العلۃ فی العدول عن العشر الی نصفہ فی مسقی غرب ودالیۃ ہی زیادۃ الکلفۃ کما علمت وہی موجودۃ فی شراء الماء الخ (قولہ وقیل ثلاثۃ ارباعہ) قال فی الغایۃ قال بہ الائمۃ الثلاثۃ فیؤخذ نصف کل واحد من الوظیفتین ولا نعلم فیہ خلافا اھ ای لان نصفہ مسقی سیح ونصفہ مسقی غرب فیجب نصف العشر ونصف نصفہ

ورجحہ الزیلعی الاول (رد المحتار ص ۲۵۵ ج ۳)

قلت لما اختلف الترجیح فالاحتیاط فی الاخذ بالثانی۔

④ خراج کی مقدار:

فتح عراق کے وقت حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مفتوحہ اراضی پر جریب کے حساب سے خراج موظف متعین فرمایا تھا، اس جریب کا کل رقبہ ۶۰×۶۰ ذراع تھا اور یہاں ذراع شاہ سات قبضہ کا مراد ہے، جبکہ عام ذراع چھ قبضہ کا ہے، ایک قبضہ = چار انگشت، اس حساب سے ذراع مذکور ۱،۷۵ فٹ ہوا۔ ۶۰ ذراع = ۱۰۵ فٹ = ۳۵ گز = ۳۲ میٹر، لہٰذا جریب = ۱۲۲۵ مربع گز = ۱۰۲۴ مربع میٹر۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بشرح ذیل خراج متعین فرمایا:

عام دانہ دار اجناس پر فی جریب ایک درہم (۲،۶۲۵ ماشہ = ۳،۰۶۲ گرام چاندی) اور ایک صاع (۴،۰۰۵ لیٹر) پیدا ہونے والی جنس سے، (اگر کچھ بھی کاشت نہ کیا تو بظاہر امام کو اختیار ہے کہ جس جنس سے چاہے صاع وصول کرے) اور ایسی سبزیوں پر جن کے پودے طویل مدت تک پھل دیتے رہتے ہیں، مثلاً ککڑی، خربوزہ، بینگن وغیرہ فی جریب پانچ درہم اور انگور کے لیے گنجان باغ جس میں زراعت نہ ہوسکے دس درہم فی جریب۔

انگور کے سوا دوسرے پھلوں کے گنجان باغ بھی امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے نزدیک انگور کے باغ ہی کے حکم میں ہیں، اور امام محمد رحمہ اللہ کے نزدیک ان پر خراج موظف نہیں، امام ابو یوسف رحمہ اللہ کا قول ارفق ہونے کے علاوہ روایۃً و درایۃً ارجح بھی معلوم ہوتا ہے، اما درایۃ فوجہہ ظاهر، واما روایۃ فلانہ هو المذکور فی المتون وتقدیم الامام الثانی علی الثالث۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف سے بتفصیل مذکور توظیف کی وجہ یہ ہے کہ دانہ دار اجناس کے لئے ہر موسم میں تخم ریزی کے مصارف اور محنت کے علاوہ فصل کے کاٹنے، گاہنے اور ہوا میں اڑا کر صاف کرنے کی مشقتیں بھی برداشت کرنی پڑتی ہیں، اور منفعت کم ہے، اور سبزیوں میں منفعت زیادہ ہے مشقت کم، کیونکہ ان کی ایک دفعہ کی بوائی مدتوں کام دیتی ہے، اور کٹائی، گہائی، اڑائی کی محنت نہیں، اور باغ کی پیداوار سب سے زیادہ ہے، اور بار بار بوائی وغیرہ کی محنت نہیں۔

مذکورہ اجناس میں توظیف عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر زیادتی جائز نہیں، اس سے کم کردینا جائز ہے، اور جب کل پیداوار خراج عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے دو چند نہ ہو تو نصف پیداوار تک خراج میں کمی کرنا واجب ہے۔

السراج ——— ۴

جن اشیاء کے خراج کی تعیین حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ثابت نہیں، مثلاً ایسے متفرق باغات جن میں کاشت ہو سکتی ہو اور سبزیوں میں سے بیگن، پیاز، گاجر، مولی وغیرہ اور دوسری فصلیں مثلاً زعفران اور کپاس وغیرہ ان میں پیداوار کے تخمینہ کے مطابق خراج متعین کیا جائے، مگر خراج موظف ہو یا مقاسمہ دونوں میں کل پیداوار کے نصف سے زائد خراج مقرر کرنا جائز نہیں، اور خمس سے کم کرنا جائز ہے، مگر بہتر یہ ہے کہ اس سے کم نہ کیا جائے، البتہ کسی زمین میں محنت بہت زیادہ ہو اور پیداوار بہت کم ہو تو خمس سے بھی کم خراج لیا جائے۔

اگر زرعی یا سبزی والی اراضی میں باغ لگایا تو جب تک توظیف عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے درخت پھل دینے لگیں اس وقت اس پر باغ کا خراج لگے گا، اس سے قبل نصف پھل خراج میں لیا جائے گا، بشرطیکہ نصف پھل خراج زرع اور اراضی رطبہ یا خراج رطبہ سے کم نہ ہو ورنہ خراج زرع یا خراج رطبہ لیا جائے گا۔

اگر کسی نے باغ کاٹ کر اس زمین میں زراعت شروع کر دی تو اس سے باغ ہی کا خراج لیا جائے گا، اسی طرح زمین میں سبزیوں کی صلاحیت کے باوجود سبزیوں کی کاشت کی بجائے زراعت کی تو اس پر سبزیوں کا خراج ہوگا۔

خراج موظف کو خراج مقاسمہ سے بدلنا اور اس کا عکس جائز نہیں، البتہ اس کی تعلیل "لان فیہ نقض العہد وھو حرام" سے معلوم ہوتا ہے کہ زمینداروں کی رضا سے تبدیل کرنا جائز ہے، قال فی شرح التنویر (ووضع عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ علی السواد لکل جریب) ھو ستون ذراعا فی ستین بذراع کسری سبع قبضات (صاعا من بر او شعیر ودرھما ولجریب الرطبۃ خمسۃ دراھم ولجریب الکرم او النخل متصلۃ) قید فیھما (ضعفھا ولما سواہ) مما لیس فیہ توظیف عمر کزعفران وبستان) ھو کل ارض یحوطھا حائط وفیھا اشجار متفرقۃ یمکن الزرع تحتھا فلو ملتفۃ ای متصلۃ لا یمکن زراعۃ ارضھا فھو کرم (طاقتہ و) نھایۃ الطاقۃ (نصف الخارج) لان التنصیف عین الانصاف (فلا یزاد علیہ) فی خراج المقاسمۃ (ولا) فی الموظف علی مقدار ما وظفہ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ لان المنع علی الصحیح کافی (وینقص مما وظف) علیھا (ان لم تطق) بان لم یبلغ الخارج ضعف الخراج الموظف فینقص الی نصف الخارج وجوبا وجوازا عند الاطاقۃ وینبغی ان لا یزاد علی النصف ولا ینقص عن

القصص حنادی، وفیه لو غرس بارض الخراج کرما او شجرا فعلیه خراج الارض الی
ان یطعم وکذا لو قلع الکرم وزرع الحب فعلیه خراج الکرم واذا اطعم فعلیه قدر ما
یطیق ولا یزید علی عشرة دراهم ولا ینقص عما کان، وفی الشامیة (قوله من بر او شعیر)
ای هو مخیر فی اعطاء الصاع من الشعیر او البر کما فی النهایة معزیا الی فتاوی قاضی خان
والصحیح انه مما یزرع فی تلک الارض کما فی الکافی شرنبلالیة ومثله فی البحر وفی
ما اذا عطلها والظاهر ان الامام یخیر تأمل (قوله الرطبة) بالفتح والجمع الرطاب
وهی القثاء والخیار والبطیخ والباذنجان وما جری مجراه والبقول غیر الرطاب مثل
الکراث شرنبلالیة (قوله فلو ملتفة الخ) فی المصباح التف النبات بعضه ببعض
اختلط ثم اعلم ان حاصل ما ذکروه من الفرق بین البستان والکرم هو ان ما کان
اشجاره ملتفة فهو کرم وما کانت متفرقة فهو بستان وقد عزاه فی البحر الی الظهیریة
ومثله فی کافی النسفی ومقتضاه ان الکرم لا یختص بشجر العنب مع ان ما فی المتون
من عطف النخل علی الکرم یفید انه غیره وفی الاختیار والجریب الذی فیه اشجار
مثمرة ملتفة لا یمکن زراعتها قال محمد رحمه الله تعالی یوضع علیه بقدر ما
یطیق لانه لم یرو عن عمر رضی الله تعالی عنه فی البستان شیء فکان مفوضا
الی رای الامام وقال ابو یوسف رحمه الله تعالی لا یزاد علی الکرم لان البستان بمعنی
الکرم فالوارد فی الکرم وارد فیه دلالة وان کان فیه اشجار متفرقة فهی تابعة
للارض اھ ومفاده ایضا ان الکرم مختص بالعنب والبستان غیره بقرینة
التعلیل اولا وثانیا وهذا اوفق بما فی کتب اللغة ومفاده ایضا ان الخلاف بین
محمد وابی یوسف رحمهما الله تعالی فی البستان اذا کانت اشجاره ملتفة وان
ان ما فی المتن عــه قول محمد رحمه الله تعالی وعلیه جری فی الملتقی وذکر فی البدائع
مثل ما فی الاختیار حیث قال وفی جریب الکرم عشرة دراهم واما جریب الارض
التی فیها اشجار مثمرة بحیث لا یمکن زراعتها لم یذکر فی ظاهر الروایة وروی عن

عــه فیما عندی یتجه علی هذا ذکر النخل مع الکرم والظاهر ان المراد بذکر النخل التعمیم بجمیع
الاشجار المثمرة والبستان الاشجار المتفرقة فالمذکور فی المتن هو قول ابی یوسف، ۱۲ رشید احمد

السراج ــــــ ۱۲

ابى يوسف رحمه الله تعالى انه قال اذا كان النخل ملتفا جعلت عليه الخراج
بقدر ما يطيق ولا ازيد على جريب الكرم عشرة دراهم (قوله فلا يزاد عليه فى
خراج المقاسمة) نزل ما لم يوظف مع ان الكلام فيه فكان عليه ان يقول
فلا يزاد عليه فيه ولا فى خراج المقاسمة ولا فى الموظف الخ افاده ح قلت وقد
يجاب بان قوله والتنصيف الخ يفيد انه يجوز وضع النصف او الربع او الخمس
فيصير خراج مقاسمة لانه جزء من الخارج وهو غير الموظف فقوله فى خراج
مقاسمة اراد به هذا النوع وقوله ولا فى الموظف الخ اراد به النوع الاول فافهم
(قوله ولا فى الموظف على مقدار ما وظفه عمر) وكذا اذا فتحت بلدة بعد عمر
رضى الله تعالى عنه فاراد الامام ان يضع على ما يزرع حنطة درهمين وقفيزا
فى تنقيه ليس له ذلك عن ابى حنيفة رحمه الله تعالى وهو الصحيح لان
عمر رضى الله تعالى عنه لم يزد لما اخبر بزيادة الطاقة افاده فى البحر عن
الكافى قال ط وهذا نص صريح فى حرمة ما احدثه الظلمة على الاراضى من
الزيادة على الموظف ولو سلم ان الاراضى آلت لبيت المال وصارت مستاجرة
(قوله وان اطاقت) تعميم لقوله ولا يزاد عليه الخ فيشمل ما لم يوظف كما
صرح به فى قوله وغاية الطاقة نصف الخارج ويشمل خراج المقاسمة كما نص
عليه فى النهر وكذا الموظف من عمر رضى الله تعالى عنه كما فى البحر من امام
بعده كما مر فافهم (قوله وينبغى ان لا يزاد على النصف الخ) هذا فى خراج
المقاسمة ولم يقيد به لانفهامه من التعبير بالنصف والخمس فان خراج
الوظيفة ليس فيه جزء معين تامل قال فى النهر وسكت عن خراج المقاسمة
وهو ان يمن الامام باراضيهم ورأى ان يضع عليهم جزءا من الخارج كنصف
او ثلث او ربع فانه يجوز ويكون حكمه حكم العشر ومن حكمه ان لا يزيد على
النصف وينبغى ان لا ينقص عن الخمس قاله الحدادى اهـ وبه علم ان قول
الشارح وينبغى مذكور فى غير محله لان الزيادة على النصف غير جائزة كما مر
التصريح به فى قوله ولا يزاد عليه وكان عدم النقص عن الخمس غير منقول
فذكره الحدادى بحثا لكن قال الخير الرملى يجب ان يحمل على ما اذا كانت

تطيق فلو كانت قليلة الريع كثيرة المؤن ينقص اذ يجب ان يتفاوت الواجب لتفاوت
المؤنة كما في ارض العشر ثم قال وفي الكافي وليس للامام ان يحول الخراج الموظف
الى خراج المقاسمة اقول وكذا العكس فيما يظهر من تعليله لانه قال لان فيه
نقض العهد وهو حرام قلت صرح بالعكس القهستاني (قوله فعليه خراج الارض)
كذا في البحر عن شرح الطحاوي قال ط والاولى خراج الزرع كما نقله الشارح عن
مجمع الفتاوى في باب زكوة الاموال اي فيدفع صاعا ودرهما (قوله فعليه
خراج الكرم) اي دائما لانه صار الى الادنى مع قدرته على الاعلى قال في الفتاوى
الهندية قالوا من انتقل الى اخس الامرين من غير عذر فعليه خراج الاعلى كمن له
ارض الزعفران فتركه وزرع الحبوب فعليه خراج الزعفران وكذا لو كان له كرم
فقطع وزرع الحبوب فعليه خراج الكرم وهذا شيء يعلم ولا يفتى به كي لا يطمع
الظلمة في اموال الناس كذا في الكافي اه وقال في الفتح اذ يجب على كل ظالم ان ارضه
كانت تصلح لزراعة الزعفران ونحوه وعلاجه صعب اه (قوله واذا اطعمت) معطوف
على قوله الى ان يطعم قال في البحر وفي شرح الطحاوي ولو ابتاع ارضه كرما فعليه
خراجها الى ان يطعم فاذا اطعمت فان كانت تضعف وظيفة الكرم ففيه وظيفة الكرم
وان كان اقل فنصفه الى ان ينقص عن قفيز ودرهم فان نقص فعليه قفيز ودرهم
اه والقفيز صاع كما مر وهذا ايماء الى انها كانت للزراعة قبل الرطبة فالظاهر
لزوم خمسة دراهم فلذا قال الشارح ولا ينقص عما كان يأخذ بدء العمارة (رد المحتار [illegible])

وقال الرافعي رحمه الله تعالى (قوله هذا في خراج المقاسمة الخ) الظاهر ان
الحكم كذلك في الخراج الموظف والتعبير بالنصف والخمس لا يدل على انه في
المقاسمة خاصة وذلك انك اذا وجدت الخراج الموظف زائدا على نصف
الخارج نقصته وردته الى النصف ولك تنقيصه الى الخمس (التحرير المختار ص ۱۲۴ ج ۲)
وفي الهندية بعد ذكر الاشياء الثلاثة التي وظف عليها عمر رضي الله تعالى عنه
وما سوى ذلك من الاصناف كالزعفران والقطن والبستان وغيرها يوضع عليها
بحسب الطاقة الخ (عالمگیریہ ص ۲۳۸ ج ۲)

وفي الهداية مع الفتح ولان المؤن متفاوتة فالكرم اخفها مؤنة لانه

السابعة ـــــــ م

یبقی علی الابد بلا مؤنة والکرم اربعا والمزارع اقلها ربعا لان اکثرها مؤنة لاحتیاجها الی الغرس ومؤن الزراعة من الحراثة والحصاد والدیاس والتذریة فی کل عام والرطاب بینهما لانها لاتدوم دوام الکرم ویکلف فی عملها کل عام فوجب تفاوت الواجب بتفاوت المؤنة اصله قوله علیه الصلوٰة والسلام ما سقت السماء ففیه العشر وما سقی بغرب او دالیة ففیه نصف العشر (فتح القدیر ص ۲۶۳ ج ۴) وفی العنایة علی هامش الفتح والرطاب بینهما لانها تبقی اعواما ولاتدوم دوام الکروم فکانت مؤنتها فوق مؤنة الکروم ودون مؤنة المزارع (فتح القدیر ص ۲۶۲ ج ۴)

وفی الفتح (قوله فان لم تطق ما وضع علیها) وفی هذا الاثر بیان الارضین التی وظف علیها عمر رضی الله تعالٰی عنه لم تنقص عن ریعها وضعفت الآن او غیرها او اجمعوا انه لاتجوز الزیادة علی وظیفة عمر رضی الله تعالٰی عنه فی الاراضی التی وظف فیها عمر رضی الله تعالٰی عنه لو امام آخر مثل وظیفة عمر ذکره فی الکافی واما فی بلد لو اراد الامام ان یبتدئ فیها التوظیف فعند ابی حنیفة وابی یوسف رحمهما الله تعالٰی لایزید وقال محمد رحمه الله تعالٰی وهو قول مالک واحمد رحمهما الله تعالٰی ورواية عن ابی یوسف رحمه الله تعالٰی وقول الشافعی رحمه الله تعالٰی له ذلک ومعنی هذا اذا کانت الارض التی وظف بعض الامام عمر رضی الله تعالٰی عنه تزرع الحنطة فاراد ان یضع علیها درهمین وقفیزا من نطیقه لیس له ذلک وعند محمد رحمه الله تعالٰی له ذلک اعتبارا بالنقصان وهذا اوجه ما ذکرته من حمل الارض فی قوله فان لم تطق ما وضع علیها علی ما یحتمل ارض عمر رضی الله تعالٰی عنه وتمنعه ابو یوسف بان عمر رضی الله تعالٰی عنه لم یزد حین ا[illegible] بزیادة طاقة الارض (فتح القدیر ص ۲۶۳ ج ۴)

تفصیل مذکور سے اراضی کی تین اقسام معلوم ہوئیں:

① علاقہ کی وہ اراضی جن پر حضرت عمر رضی اللہ تعالٰی عنہ نے خراج موظف فرمایا تھا یعنی بعینہ اسی قسم کی علاقہ کی زمینیں، ان میں توظیف عمر رضی اللہ [illegible] زیادتی جائز نہیں۔

② جن زمینوں میں توظیف عمر رضی اللہ تعالٰی عنہ کے سوا اور کچھ کاشت ہو، ان پر

حکومت کو اختیار ہے کہ خراج موظف متعین کرے یا خراج مقاسمہ، اسی طرح مقدار خراج کی تعیین میں بھی حکومت مختار ہے، مگر یہ ضروری ہے کہ خراج زمین کی برداشت سے زیادہ نہ ہو نیز برداشت کے اندر ہونے کے باوجود نصف پیداوار سے زیادہ نہ ہو، مزید برین خراج موظف میں یہ شرط بھی ہے کہ توظیف عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے زائد نہ ہو۔

④ بعد کی مفتوحہ اراضی میں سے توظیف عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ والی اجناس، اُن پر خراج موظف لگایا جائے تو شیخین رحمہما اللہ تعالیٰ کے نزدیک توظیف عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر زیادتی جائز نہیں، امام محمد اور ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ تعالیٰ جواز کے قائل ہیں، امام ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ سے بھی ایک روایت جواز کی ہے۔

یہ امر غور طلب ہے کہ عند الشیخین رحمہما اللہ تعالیٰ ایسی اراضی پر خراج مقاسمہ کا جواز ہے یا نہیں؟ اور اگر جائز ہے تو اس میں توظیف عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے تجاوز بھی جائز ہے یا نہیں؟

دلائل ذیل سے ان دونوں امور کا جواز معلوم ہوتا ہے:

① اگر یہ صورت ناجائز ہوتی تو حضرات فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ اس کی تصریح فرماتے والسکوت فی معرض البیان بیان۔

② ما تقدم من الشامیۃ معزیا الی النھر من انہ اذا من الامام باراضیھم ورأی ان یضع علیھم جزءا من الخارج الخ، یہ عبارت ہر قسم کی اراضی کو شامل ہے، وان کانت من جنس ما وظف علیھا سیدنا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ،

اسی طرح اس میں توظیف عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے تجاوز نہ کرنے کی بھی شرط نہیں۔

③ محمد بن قاسم نے ارض سندھ پر خراج مقاسمہ (ربع) متعین فرمایا تھا، اور ظاہر ہے کہ ان اراضی میں توظیف عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جنس کی اراضی بھی تھیں، قال العلامۃ التھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ فی رسالتہ شرائع الھند فی حکم اراضی الھند: ارض السند خراجیۃ و خراجھا الخمس کما حققہ المحققون ثم سرد النقول عن علماء السند۔

⑮ غیر آباد زمین پر خراج:

اگر خراجی زمین زیرِ آب آگئی یا آب رسانی کے ذرائع مسدود ہوگئے یا اور کسی آفت کی وجہ سے قابلِ کاشت نہ رہی، یا کسی نے کاشت نہ کرنے دی یعنی سال بھر میں ایک فصل اٹھانے کا بھی موقع نہ ملا تو خراج معاف ہوجائے گا، البتہ زمین قابلِ کاشت ہونے کے

باوجود محض غفلت سے معطل چھوڑ دی تو صرف خراج مقاسمہ معاف ہوگا، مگر خراج موظف وصول کیا جائے گا، قال فی التنویر ولا خراج ان غلب الماء علی ارضہ او انقطع او اصاب الزرع آفۃ سماویۃ کغرق وحرق وشدۃ برد (الی قولہ) فان عطلہا صاحبہا وکان خراجہا موظفا او اسلم او اشتری مسلم ارض خراج یجب ولو منعہ انسان من الزراعۃ او کان الخراج مقاسمۃ لا۔ (رد المحتار ص ۲۷۱ ج ۳)

⑥ زمیندار مزارع کے حصے سے جبراً عشر نکالے:

چونکہ مزارعین میں دینداری نہیں، اگر ان کا حصہ تقسیم کر کے ان کے حوالہ کر دیا گیا تو ان سے ادائے عشر کی امید نہیں، اس لئے زمیندار پر لازم ہے کہ مشترک پیداوار سے عشر نکالنے کے بعد مزارع کو اس کا حصہ تقسیم کر کے دے، قال العلامۃ الھمایونی رحمہ اللہ تعالیٰ فی رسالتہ سراج الھند والحق الحقیق بالقبول ان ھذا الامر مسلم الی اصحاب الاراضی الذین یقال لھم فی العرف "زمیندار" فعلیھم ان یخرجوا الخمس بنیۃ الخراج اولاً قبل التنصیف من البین ثم ینصفون لاجل حصۃ الارض فیجمعون ما حصل من الخمس فیصرفونہ بالعدل والانصاف فی بعض المصارف الموجودۃ الآن فی ھذہ الدیار ان اقامۃ ھذا الامر من المزارعین محال لان الدیانۃ قد ارتفعت والاسلام قد ضعف حتی ان ظفر المزارعون بحصۃ الارض لم یعطوھا لاصحاب الاراضی اصلاً بل یصرفونھا فی حاجتھم ویبدلونھا فی ادبارھم لکونھم مفلسین جائعین غیر متدینین فاین یتوھم منھم امثال ھذہ الامور الدینیۃ فالواجب علی صاحب الاراضی المتدین ان یخرج حصۃ الخراج اولاً من البین یصرفھا فی بعض مصارفھا لانا جربنا فی ھذا الزمان ان اصحاب الاراضی کالحکام للزارعین حتی انھم لا یخافون من الحکام مثل ما یخافون من اصحاب الاراضی لوصلۃ متاعھم ورزقھم بالزراعات الکائنۃ فی اراضیھم فاصحاب الاراضی حکام والزارعون رعایاھم وکل مسئول یوم القیامۃ عن رعیتہ اخرج البخاری ومسلم فی صحیحیھما عن عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنھما قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الا کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ الحدیث،

السراج ــــــــــ ۲۱

⑭ خراج موظف سال میں صرف ایک بار ہے:

خراج موظف سال میں صرف ایک بار وصول کیا جائے گا، فصلیں خواہ کتنی ہی زیادہ اٹھائی گئی ہوں، البتہ خراج مقاسمہ عشر کی طرح ہر فصل پر واجب ہو، قال فی العلائیۃ ولا یتکرر الخراج بتکرر الخارج فی سنۃ لو موظفا و الا بان کان خراج مقاسمۃ تکرر لتعلقہ بالخارج حقیقۃ کالعشر فانہ یتکرر (رد المحتار ص ۲۶۲ ج ۲)

⑮ فصل تباہ ہو جائے یا چوری ہو جائے تو عشر و خراج ساقط ہونے کی تفصیل:

اگر عشری زمین کی فصل کٹنے سے پہلے یا اس کے بعد ضائع ہو گئی یا چوری ہو گئی تو عشر ساقط ہو جائے گا، اور اگر یہ کاشت مزارعت کے طور پر تھی تو فصل کٹنے سے قبل ضائع ہونے کا تو یہی حکم ہے جو اوپر بیان ہوا البتہ فصل کٹنے کے بعد ضائع ہو تو قاضی خان کی تحقیق کے مطابق زمیندار کے حصہ کا عشر ساقط ہے اور مزارع کے حصہ کا عشر زمیندار پر لازم ہے، خراج مقاسمہ کا بھی یہی حکم ہے، قال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ تعالیٰ تحت (قولہ ویؤخذ العشر) وما تلف بغیر صنعہ بعد حصادہ او سرق وجب العشر فی الباقی (الی قولہ) وقال فی الخانیۃ وفی ارض العشر اذا ھلک الخارج قبل الحصاد یسقط وان ھلک بعد الحصاد فما کان من نصیب رب الارض یسقط وما کان من نصیب الاکار یبقی فی ذمۃ رب الارض لان فی نصیب الاکار الارض بمنزلۃ المستأجر فکان العشر علی صاحب الارض وخراج المقاسمۃ بمنزلۃ العشر لان الواجب فیہ من الخارج وانما یخالف العشر فی المصرف (خانیۃ علی ھامش العالمگیریۃ ص ۲۷۲ ج ۱) وکذا فی العالمگیریۃ عن الخانیۃ، وقال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ تعالیٰ فی منحۃ الخالق بعد نقل قول الخانیۃ المذکور وفی الولوالجیۃ ما یخالفہ وما فی الخانیۃ اقوی مدرکا واوضح وجھا لکن المعول علیہ (البحر الرائق ص ۱۰۹ ج ۲)

مگر تعلیل کون الارض بمنزلۃ المستأجر سے ثابت ہوا کہ خانیہ کا قول اس صورت کے ساتھ مختص ہے کہ بذر مزارع کی طرف سے ہو، نیز اجارۃ الارض میں مطلقاً عشر زمیندار پر نہیں بلکہ اس میں تفصیل ہے کما قدمنا، علاوہ ازیں صورت زیر بحث میں تو زمیندار کو اجرت بھی موصول نہیں ہوئی، اس لئے بندہ کے خیال میں قول ولوالجیہ کے مطابق راجح یہ ہے کہ مزارع کے حصہ کا عشر بھی زمیندار پر واجب نہیں، بلکہ ساقط ہے۔

خراج موظف کا حکم یہ ہے کہ اگر کھڑی فصل کسی ایسی آسمانی آفت سے تباہ ہوگئی جس سے بچنا انسان کی قدرت میں نہیں، جیسے ژالہ باری اور سیلاب وغیرہ اور اسی سال کوئی دوسری فصل بونے کا موقع بھی نہ ہو جس کا اندازہ کم از کم تین ماہ ہے، تو خراج موظف ساقط ہو جائے گا، اگر تباہی سے کچھ پیداوار بچ گئی تو زراعت وغیرہ کے مصارف وضع کرنے کے بعد باقی پیداوار اگر خراج سے دوچند ہو تو پورا خراج لیا جائے گا، ورنہ نصف پیداوار لی جائے گی، اور اگر آفت سے حفاظت ممکن تھی، جیسے چوہا وغیرہ لگ جانا، یا اسی سال میں اتنا وقت باقی ہو کہ اس میں زمین سے کوئی اور فصل اٹھائی جا سکتی ہو یعنی کم از کم تین ماہ باقی ہوں تو خراج موظف معاف نہیں، اور اگر فصل کٹ جانے کے بعد تباہ ہوگئی خواہ آسمانی آفت ہو یا ممکن الاحتراز ہو بہر حال خراج موظف معاف نہیں ہوگا، قال فی شرح التنویر ولا خراج ان غلب الماء علی ارضہ او انقطع الماء او اصاب الزرع آفۃ سماویۃ کغرق وحرق وشدۃ برد الا اذا بقی من السنۃ ما یمکن الزرع فیہ ثانیا اما اذا کانت الآفۃ غیر سماویۃ و یمکن الاحتراز عنہا کاکل قردۃ وسباع ونحوھما کانعام وفارۃ ودودۃ بحر او ھلک الخارج بعد الحصاد لا یسقط وقبلہ یسقط ولو ھلک بعضہ ان فضل عما انفق شئ اخذ منہ بقدر ما بینا مصنف سراج وتمامہ فی الشرنبلالیۃ معزیا للبحر وقال ابن عابدین رحمہ اللہ تعالی (قولہ ولا خراج الخ) ای خراج الوظیفۃ ولکن خراج المقاسمۃ والعشر بالاولی لتعلق الواجب بعین الخارج فیہما مثل الزرع الرطبۃ والکرم ونحوھما خیریۃ (قولہ ما یمکن الزرع فیہ ثانیا) قال فی الکبری والفتوی انہ مقدر بثلاثۃ اشہر نہر (قولہ ویمکن الاحتراز عنہ) خرج ما لا یمکن کالجراد کما فی البزازیۃ (قولہ وفارۃ ودودۃ) عبارۃ البحر ومنہ یعلم ان الدودۃ والفارۃ اذا اکلا الزرع لا یسقط الخراج ام قلت لا شک انہما مثل الجرادۃ فی عدم امکان الدفع وفی النہر لا یخفی التردد فی کون الدودۃ آفۃ سماویۃ وانہ لا یمکن الاحتراز عنہا قال الخیر الرملی واقول ان کان کثیرا غالبا لا یمکن دفعہ بحیلۃ یجب ان یسقط بہ وان امکن دفعہ لا یسقط ھذا ھو المتعین للصواب (قولہ او ھلک الخارج بعد الحصاد) مفہومہ انہ لو ھلک قبلہ یسقط الخراج لکن یخالفہ التفصیل المذکور فیما لو اصاب

الزرع آفة لان الزرع اسم للقائم فی ارضه فحیث وجب الخراج بهلاکه بآفة یمکن الاحتراز عنها علم انه یجب قبل الحصاد الا ان یحمل الهلاک هنا علی ما اذا کان بما لا یمکن الاحتراز عنه فتندفع المخالفة (قوله وقبله یسقط) ای لانه لم یبق من السنة ما یتمکن فیه من الزراعة کما اوضحناه سابقا قال الخیر الرملی ولو هلک الخارج فی خراج المقاسمة قبل الحصاد او بعده فلا شیء علیه لتعلقه بالخارج حقیقة وحکمه حکم الشریک شرکة الملک فلا یضمن الا بالتعدی فاعلم ذلک فانه مهم ویکثر وقوعه فی بلادنا وفی الخیریة ما هو صریح فی سقوطه فی حصة رب الارض بعد الحصاد ووجوبه علیه فی حصة الاکار مع ان رب الارض فی حصته بمنزلة المستأجر اهـ (قوله ان فضل عما انفق) ینبغی ان یلحق بالنفقة علی الزرع ما یأخذه الاعراب وحکام السیاسة ظلما کما یعلم مما قدمناه (قوله اخذ منه مقدار ما بینا) ای ان بقی ضعف الخراج کدرهمین وصاعین یجب الخراج وان بقی اقل من مقدار الخراج یجب نصفه واشار الشارح الی هذا بقوله وتمامه فی الشرنبلالیة فانه مذکور فیها اهـ (قوله مصحف سراج) علی حذف العاطف او علی معنی مصحفا عن السراج (رد المحتار ص ۲۷۰ ج ۳)

⑨ رہائشی مکان کے باغ میں عشر و خراج:

اگر رہائشی پلاٹ کو مستقل باغ سے تبدیل کر دیا تو اس میں عشر یا خراج واجب ہوگا، اگر کوئی عشری زمین اس سے زیادہ قریب ہوگی تو اس پر عشر، اور خراجی زمین زیادہ قریب ہوگی تو اس پر خراج ہوگا، اگر عشری و خراجی دونوں قسم کی اراضی قرب میں برابر ہوں تو اس باغ پر عشر واجب ہوگا، قال العلامة ابن عابدین رحمه الله تعالی تحت (قوله ولکن منهما الخ) ان الماء یعتبر فیما لو احیا مسلم ارضا او جعل داره بستانا بخلاف النصوص علی انه عشری او خراجی وقدمنا عن الدر المنتقی ان المفتی به قول ابی یوسف رحمه الله تعالی انه یعتبر القرب وهو ما مشی علیه المصنف اولا کالکنز وغیره وقدمه فی متن الملتقی فافاد ترجیحه علی قول محمد رحمه الله تعالی وقال ح وهو المناسب لما فی الحموی علی الکنز من ترجیح اعتبار الماء وعلیه الحموی اعتبارا لقول محمد رحمه الله تعالی (رد المحتار ص ۲۶۶ ج ۳)

اور اگر مکان رہائشی ہی ہے مگر اس کے صحن میں باغ لگالیا تو اس پر عشر یا خراج واجب
نہیں، قال فی التنویر واخذ خراج من دار جعلت بستانا الخ، وفی الشامیة قید
بجعلها بستانا لانه لو لم یجعلها بستانا وفیها نخل تغل اکرارا لا شیء فیها بحر
وکذلک شجر بستان الدار لانه تابع لها کما فی قاضیخان قهستانی (رد المحتار ص ۵۰ ج ۲)

⑭ ارض مغصوبہ میں عشر وخراج:

قال فی شرح التنویر والخراج علی الغاصب ان زرعها وکان جاحدا ولا بینة
بها. وقال ابن عابدین رحمه الله تعالیٰ قال فی الخانیة ارض خراجها وظیفة
اغتصبها غاصب جاحد ولا بینة للمالک ان لم یزرعها الغاصب فلا خراج
علی احد وان زرعها الغاصب ولم تنقصها الزراعة فالخراج علی الغاصب
وان کان الغاصب مقرا بالغصب او کان للمالک بینة ولم تنقصها الزراعة
فالخراج علی رب الارض الخ، قلت وفی الذخیرة قال بعض المشایخ علی المالک
وقال بعضهم علی الغاصب علی کل حال الخ ثم قال فی الخانیة وان نقصتها الزراعة
عند ابی حنیفة رحمه الله تعالیٰ علی رب الارض قل النقصان او کثر کأنه
آجرها من الغاصب بضمان النقصان وعن محمد رحمه الله تعالیٰ علی الغاصب
فان زاد النقصان علی الخراج یدفع الفضل الی المالک وان غصب عشریة فزرعها
ان لم تنقص الزراعة فلا عشر علی المالک وان نقصتها فالعشر علی المالک کأنه
آجرها بالنقصان الخ، قال ح وظاهره ان حکم ذات خراج المقاسمة کالعشریة
(رد المحتار ص ۵۱ ج ۲) وقال الرافعی رحمه الله تعالیٰ (قوله فلا عشر علی المالک)
وعلی الغاصب العشر اجماعا (قوله کأنه آجرها بالنقصان) هذا قول الامام و
علی قولهما العشر علی الغاصب مطلقا وهذا اذا کان الغاصب مسلما واذا کان
ذمیا فلا عشر علی احد عنده اما المالک فلعدم حصول النفعة واما الغاصب
فلانه لو وجب علیه لوجب الخراج وهو لا یتبدل وهو امر بالمالک ولا صنع
له فی ذلک ولا یجوز ان یوجب العشر علی الذمی فلم یبق الا السقوط وهذا
اذا لم تنقص الارض اما اذا نقصت فینبغی ان یکون العشر علیه اذا کان
النقصان مثل العشر او اکثر وعلی قول محمد رحمه الله تعالیٰ یجب العشر

علی الغاصب وعلی قول ابی یوسف عشران لانہ لا اعتبار فی ذلک لان العشر یجب
بعین الخارج ولیس لہ اسنادی عن السراج (رد المحتار ص ۱۴۸ ج ۲)

حاصل یہ کہ اگر غاصب منکر ہے اور مالک کے پاس بینہ بھی نہیں، اور اس کو پورے سال میں ایک فصل اٹھانے کا بھی موقع نہ ملا، یعنی سال میں سے کم از کم تین ماہ زمین اس کے قبضہ میں نہیں رہی، تو مالک پر خراج نہیں، پھر غاصب اگر کاشت کرے گا تو اس پر خراج ہوگا ورنہ اس پر بھی نہیں، اور اگر غاصب منکر نہیں، یا مالک کے پاس بینہ ہے تو مالک پر وجوب خراج میں اختلاف ہے، بندہ کے نزدیک صورت تطبیق یہ ہے کہ اگر مالک نے محض غفلت کی وجہ سے زمین واپس لینے کی سعی نہیں کی تو اس پر خراج واجب ہوگا، اور اگر پوری کوشش کے باوجود عدالت کی لاپرواہی کی وجہ سے زمین واپس نہ لے سکا، یعنی سال بھر میں تین ماہ بھی کاشت کے لئے نہ ملے، تو مالک پر خراج نہیں، جب کسی انسان کا کاشت سے روکنا سقوط خراج ہے کما فی منا تو غصب کی وجہ سے کاشت سے عجز بطریق اولیٰ مسقط ہونا چاہئے۔

عشر اور خراج مقاسمہ چونکہ پیداوار پر ہوتا ہے اس لئے زمیندار پر نہیں بلکہ غاصب کاشت کرے گا تو اس پر ہوگا، ذکر کافر نے عشری زمین غصب کرکے کاشت کی تو اس سے عشر ساقط ہے۔

یہ احکام جب ہیں کہ غاصب کی کاشت سے زمین کو کوئی نقصان نہ پہنچا ہو، اگر زمین کو کوئی نقصان پہنچا تو حضرت امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں مالک زمین کا غاصب سے نقصان کا ضمان وصول کرنا بمنزلہ اجارہ ہے، اس لئے عشر و خراج مالک پر ہوگا، مگر صورت اجارہ میں فتویٰ کے لئے جو تفصیل اوپر گذر چکی ہے اس کے پیش نظر غصب میں بہرکیف عشر و خراج غاصب ہی پر ہوگا، اگرچہ مالک نے ضمان نقصان وصول کر لیا ہو۔

⑵ زمین فروخت کی تو عشر و خراج کس پر ہے؟

اگر فارغ زمین ایسے وقت فروخت کی کہ سال ختم ہونے میں تین ماہ یا اس سے زیادہ مدت باقی تھی، اور بائع نے اس سال میں اس زمین سے کوئی فصل نہ اٹھائی تھی تو اس کا خراج مشتری پر ہے، اور اگر بائع نے بھی کوئی فصل اٹھائی ہو تو خراج بائع اور مشتری دونوں پر تقسیم ہوگا، اور اگر سال گزرنے میں تین ماہ سے کم مدت باقی تھی تو پورا خراج

بائع پر ہو، اگر بوقت بیع زمین میں فصل بھی تھی تو فصل تیار ہونے سے قبل بیع ہونے کی صورت میں خراج مشتری پر ہے، بشرطیکہ بائع نے اسی سال میں کوئی فصل نہ اٹھائی ہو، ورنہ خراج دونوں پر ہوگا، اور اگر فصل تیار ہونے کے بعد بیع کی تو اس میں وہی تفصیل ہے جو فارغ زمین کی بیع سے متعلق گذری،

اگر زمین مسلسل بکتی چلی گئی اور کسی مالک کو بھی سال کے اندر زمین اتنی مدت میسر نہیں ہوئی، اور وہ کوئی فصل نہیں اٹھا سکا، تو کسی پر بھی خراج نہیں،

عشر اور خراج مقاسمہ کا تعلق پیداوار سے ہے، اس لئے فصل تیار ہونے سے قبل زمین فروخت کی تو عشر و خراج مقاسمہ مشتری پر ہوگا، اور فصل تیار ہونے کے بعد بیع ہوئی تو بائع پر۔

اگر صرف فصل بغیر زمین کے بیچی، تو اس میں بھی یہی تفصیل ہے، کہ قبل الادراک بیع ہو تو عشر و خراج مقاسمہ مشتری پر ہے، اور بعد الادراک ہو تو بائع پر، اگر قبل الادراک فصل بیچی اور مشتری نے اسی حال میں کاٹ لی تو اس کا عشر بھی بائع پر ہوگا، قال فی شرح التنویر ولو باع الزرع ان قبل ادراکہ فالعشر علی المشتری ولو بعدہ فعلی البائع وفی الشامیۃ ان حکم خراج المقاسمۃ کالعشر کما یعلم مما مر ثم ھذا لو باع الزرع وحدہ وفصل فیما اذا باعہ وترکہ المشتری باذن البائع حتی ادرکہ فعشرہ علی المشتری وعند ابی یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ عشر قیمۃ القصیل علی البائع والباقی علی المشتری کما فی الفتح وفیما لو باع الارض مع الزرع او بدونہ قال فی البزازیۃ باع الارض وسلمہا للمشتری ان بقی مدۃ یتمکن المشتری فیہا من الزراعۃ فالخراج علیہ والا فعلی البائع والفتوی علی تقدیر المدۃ بثلاثۃ اشہر ھذا لو باعہا فارغۃ ولو فیہا زرع لم یبلغ فعلی المشتری بکل حال وقال ابو اللیث ان باعہا بزرع انعقد حبہ وبلغ ولم تبق مدۃ یتمکن المشتری من الزرع فالخراج علی البائع، ولو باع من آخر والمشتری من آخر وآخر حتی مضی وقت التمکن لا یجب الخراج علی احد اصلاً ای بان لم تبق فی ید احد من المشترین مدۃ یتمکن فیہا من الزراعۃ قبل دخول السنۃ الثانیۃ (رد المحتار ص ۲۳ ج ۲) وفی جملۃ التنویر باع ارضاً خراجیۃ ان بقی من السنۃ مقدار ما یتمکن المشتری من الزراعۃ فعلیہ الخراج

۲۴

والاصل للبائع، وقال ابن عابدین رحمه الله تعالیٰ هذا اذا کانت فارغة لکن اختلفوا فی اعتبار ما یتمکن المشتری من زراعته فقیل الحنطة والشعیر وقیل ای زرع کان وفی انه هل یشترط ادراك الریع بکماله اولا وفی واقعات الناطفی ان الفتوی علی تقدیره بثلاثة اشهر وهذا اسهل اعتبار لزرع الدخن وادراك الریع فان ریع الدخن یدرك فی مثل هذه المدة واما اذا کانت الارض مزروعة فباعها مع الزرع فان کان قبل بلوغه فالخراج علی المشتری مطلقا وان بعد بلوغه وانعقاد حبه فهو کما لو باعها فارغة ولو کان لها ریعان خریفی وربیعی وسلم احدهما للبائع والآخر للمشتری فالخراج علیهما ولو تداولتها الایدی ولم تمکث فی ملك احدهم ثلاثة اشهر فلا خراج علی احد اھ من التتارخانیة ملخصا (رد المحتار ص ۲۴۲ ج ۲) وقال العلامة الکاسانی رحمه الله تعالیٰ ولو باع الارض العشریة وفیها زرع قد ادرك مع زرعها او باع الزرع خاصة فعشره علی البائع دون المشتری لانه باعه بعد وجوب العشر وتقرره بالادراك ولو باعها والزرع بقل فان قصله المشتری للحال فعشره علی البائع ایضا لتقرر الوجوب فی البقل بالقصل وان ترکه حتی ادرك فعشره علی المشتری فی قول ابی حنیفة و محمد رحمهما الله تعالیٰ لتحول الوجوب من البقل الی الحب وروی عن ابی یوسف رحمه الله تعالیٰ انه قال عشر قدر البقل علی البائع وعشر الزیادة علی المشتری وکذلك حکم الثمار علی هذا التفصیل (بدائع الصنائع ص ۵۷ ج ۲)

(۲۲) عشر نکالنے کے بعد پیداوار فروخت کی تو رقم پر زکوٰۃ فرض ہے؟

پیداوار کا عشر الگ فرض ہے، اور پیداوار فروخت کی تو اس سے حاصل ہونے والی رقم پر زکوٰۃ الگ فرض ہے، لان الحقین لم یتعلقا بمحل واحد فان العشر حق الارض النامیة بالخارج حقیقة وزکوٰة النقود حق المال النامی تقدیرا بخلاف ما اذا کانت الارض للتجارة فانه لا تجب فیها زکوٰة التجارة لان الحقین یتعلقان بمحل واحد وهی الارض، وقال ابن نجیم رحمه الله تعالیٰ فی زکوٰة مال التجارة اذا دخل من ارضه حنطة تبلغ قیمتها قیمة نصاب ونوی ان یمسکها او یبیعها فامسکها حولا لا تجب فیها الزکوٰة (البحر الرائق ص ۲۰۱ ج ۲) عبارت مذکورہ میں عدم وجوب زکوٰۃ کی علت یہ بیان کی گئی ہے کہ حنطہ مال تجارت نہیں، اس سے ثابت ہوا کہ

بیع حنطہ کی صورت میں نقود پر زکوٰۃ فرض ہوگی، لانہا متعینۃ للتجارۃ خلقۃ،

(۱۶) قبل از وقت عشر و خراج نکالنا:

خراج مطلقاً قبل از وقت ادا کرنا صحیح ہے، اور عشر میں تفصیل ہے:

فصل بونے سے قبل عشر نکالا تو ادا نہیں ہوا، اور اگر فصل اگنے کے بعد نکالا تو بالاتفاق ادا ہو گیا، اور اگر فصل بونے کے بعد اگنے سے قبل نکالا تو امام ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں صحیح ہو گیا، امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ادا نہیں ہوا وھو الارجح والاحوط،

باغ میں پھول آنے کے بعد عشر نکالنا صحیح ہے، اس سے قبل نکالا تو ادا نہ ہوگا۔ قال العلامۃ الکاسانی رحمہ اللہ تعالیٰ: وعلی ھذا یخرج تعجیل العشر انہ علی ثلثۃ اوجہ فی وجہ یجوز بلا خلاف وفی وجہ لا یجوز بلا خلاف وفی وجہ فیہ خلاف، اما الذی یجوز بلا خلاف فھو ان یعجل بعد الزراعۃ وبعد النبات لانہ تعجیل بعد وجود سبب الوجوب وھو الارض النامیۃ بالخارج حقیقۃ الا تری انہ لو فصلہ ھکذا یجب العشر، واما الذی لا یجوز بلا خلاف فھو ان یعجل قبل الزراعۃ لانہ عجل قبل الوجوب وقبل وجود سبب الوجوب لانعدام الارض النامیۃ بالخارج حقیقۃ لانعدام الخارج حقیقۃ، واما الذی فیہ خلاف فھو ان یعجل بعد الزراعۃ قبل النبات قال ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ یجوز وقال محمد رحمہ اللہ تعالیٰ لا یجوز، وجہ قول محمد ان سبب الوجوب لم یوجد لانعدام[1] الارض النامیۃ بالخارج لانعدام الخارج فکان تعجیلا قبل وجود السبب فلم یجز کما لو عجل قبل الزراعۃ، وجہ قول ابی یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ ان سبب الخروج موجود وھو الزراعۃ فکان تعجیلا بعد وجود السبب فیجوز، واما تعجیل عشر الثمار فان عجل بعد طلوعہا جاز بالاجماع وان عجل قبل الطلوع ذکر الکرخی انہ علی الاختلاف الذی ذکرنا فی الزرع وذکر القاضی فی شرحہ مختصر الطحاوی انہ لا یجوز فی ظاہر الروایۃ، وروی عن ابی یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ انہ یجوز جعل الاشجار للثمار بمنزلۃ الساق للحبوب وھناک یجوز التعجیل کذا ھھنا، ووجہ الفرق لابی حنیفۃ ومحمد رحمہما اللہ تعالیٰ

---

[1] ھکذا فی الاصل ولعل الصحیح لانعدام الخارج ۱۲ منہ

فی الشجر لیس بمحل لوجوب العشر لانه حطب الا تری انه لو قطعه لا یجب العشر فلما سار الزرع محل بدلیل انه لو قطع الساق قبل ان ینعقد الحب یجب العشر ویجوز تعجیل الخراج والجزیة لان سبب وجوب الخراج الارض النامیة بالخارج تقدیرا بالتمکن من الزراعة لا تحقیقا وقد وجد التمکن وسبب وجوب الجزیة کونه ذمیا وقد وجد، والله اعلم، (بدائع الصنائع ص ۵۴ ج ۲)

(۲۲) تجارت کی زمین پر زکوٰۃ نہیں:

عشری یا خراجی زمین بغرض تجارت خریدی ہو تو اس کی مالیت پر زکوٰۃ فرض نہیں، قال الامام الکاسانی رحمه الله تعالیٰ قال اصحابنا فیمن اشتری ارض عشر للتجارة او اشتری ارض خراج للتجارة ان فیها العشر او الخراج ولا تجب زکوٰة التجارة مع احدهما هو الروایة المشهورة عنهم وروی عن محمد رحمه الله تعالیٰ انه یجب العشر والزکوٰة او الخراج والزکوٰة وجه هذه الروایة ان زکوٰة التجارة تجب فی الارض والعشر یجب فی الزرع وانهما مالان مختلفان فلم یجتمع الحقان فی مال واحد وجه ظاهر الروایة ان سبب الوجوب فی الکل واحد وهو الارض الا تری انه یضاف الکل الیها یقال عشر الارض وخراج الارض وزکوٰة الارض وکل واحد من ذلک حق لله تعالیٰ وحقوق الله تعالیٰ المتعلقة بالاموال النامیة لا یجب فیها حقان منها بسبب مال واحد کزکوٰة السائمة مع التجارة واذا ثبت انه لا سبیل الی اجتماع العشر والزکوٰة واجتماع الخراج والزکوٰة فایجاب العشر او الخراج اولی لانهما اعم وجوبا الا تری انهما لا یسقطان بعذر الصبا والجنون والزکوٰة تسقط به فکان ایجابهما اولی (بدائع الصنائع ص ۵۷ ج ۲)

بدائع کی عبارت مذکورہ میں "کزکوٰة السائمة مع التجارة" سے بعض اکابر کو یہ مغالطہ لگا ہے کہ تجارتی مواشی میں زکوٰۃ نہیں، حالانکہ یہاں تشبیہ عدم زکوٰۃ میں نہیں، بلکہ عدم اجتماع الحقین میں ہے، تجارتی مواشی میں سائمہ کی زکوٰۃ نہیں، تجارتی مالیت پر زکوٰۃ ہے، چنانچہ خود امام کاسانی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ولو اسیمت للبیع والتجارة ففیها زکوٰة مال التجارة لا زکوٰة السائمة۔

(بدائع الصنائع ص ۳۰ ج ۲)

(۱۲) ذاتی استعمال میں آنے والی سبزی اور پھل پر بھی عشر ہے:

فصل کے پیدا ہونے اور پھل کے ظاہر ہونے کے وقت عشر واجب ہو جاتا ہے، اس لئے اس سے جو کچھ خود کھایا یا کسی کو ہبہ دیا سب پر عشر واجب ہے، خراج موظف کا بھی یہی حکم ہے، قال العلامة ابن نجیم رحمه الله تعالى واما وقته فوقت خروج الزرع وظهور الثمر عند ابی حنیفة رحمه الله تعالى وعند ابی یوسف رحمه الله تعالى وقت الادراك وعند محمد رحمه الله تعالى عند التنقیة والحصاد اھ (البحر الرائق ص ۲۳۴ ج ۲) وفی شرح التنویر ویؤخذ العشر عند الامام عند ظهور الثمرة وبدو صلاحها، برهان، وشرط فی النهر امن فسادها، وفی الشامیة قال فی الجوهرة واختلفوا فی وقت العشر فی الثمار والزرع فقال ابو حنیفة وزفر رحمهما الله تعالى یجب عند ظهور الثمرة والامن علیها من الفساد وان لم یستحق الحصاد اذا بلغت حدا ینتفع بها وقال ابو یوسف رحمه الله تعالى عند استحقاق الحصاد وقال محمد رحمه الله تعالى اذا حصدت وصارت فی الجرین وفائدته فیما اذا اکل منه بعد ما صار حشیشا او اطعم غیره منه بالمعروف فانه یضمن عشر ما اکل او اطعم عند ابی حنیفة وزفر رحمهما الله تعالى وقال ابو یوسف ومحمد رحمهما الله تعالى لا یضمن (الی قوله) وان اکل منها بعد ما بلغت الحصاد قبل ان تحصد ضمن عند ابی حنیفة وابی یوسف رحمهما الله تعالى ولم یضمن عند محمد رحمه الله تعالى وان اکل بعد ما صارت فی الجرین ضمن اجماعا وما تلف بغیر صنعه بعد حصاده او سرق وجب العشر فی الباقی لا غیر اھ والکلام فی العشر ومثله فیما یظهر خراج المقاسمة لانه جزء من الخارج اما خراج الوظیفة ففی الذمة لا فی الخارج فلا یختلف حکمه بالاکل وعدمه تأمل (رد المحتار ج ۲)

(۱۳) عشر میں پیداوار کی بجائے اس کی قیمت دینا جائز ہے:

عشر اور خراج موظف میں مالک کو اختیار ہے کہ پیداوار کی جنس سے ادا کرے یا اس کی قیمت دے، قال ابن عابدین رحمه الله تعالى فی حاشیته علی قول الشارح وللامام جعل الخارج للخراج، قلت وفی البدائع ان الواجب فی الخراج جزء من الخارج لانه عشر الخارج او نصف عشره وذلك جزء الا انه واجب

من حيث انه مال لا من حيث انه جزء عشر نامٍ حتى يجوز اداء قيمته امر والمتبادر منه ان المراد خراج المقاسمة فاذا كان له اداء القيمة لا يكون للامام الاخذ من عين الخارج جبرًا (رد المحتار ص ۵۸ ج ۲)

(۲۹) ارض مسکین پر عشر کی تفصیل:

سلطان نہ ہونے کی صورت میں مسکین عشر خود رکھ سکتا ہے، سلطان ہو تو اس کو اختیار ہے۔ واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

۱۷ شعبان سنہ ۷۲ھ

عفو عشر و خراج از جانب سلطان:

سوال: چه می فرمایند علماء دین دریں مسئله که واقع شده است بین ائمه بلوچستان چرا که بادشاه حکم مقرر نموده که از محصول پیدا شده از صد من یک من دهیم قلیل یا کامل در هنود یا ارتمه مقدار عشر از ذمه زمینداران ساقط خواهد شد یا نه؟ بعضے قائل بجواز اند بدلیل تصرف بادشاه که بخشد یا ترک کند عشر را، آیا این تصرف خلاف آیات و حدیث و اجماع است یا نه؟ بالاکتب، لا یجوز مثل بحر الرائق وغیره و از کتب یجوز کدام ترجیح دارد؟ از یجوز کدام مذهب و از لا یجوز کدام؟ بینوا بیانا شافیا واضحا و توجروا اجرا وافرا۔

الجواب باسم ملهم الصواب

در جواز معاف کردن عشر و خراج اختلاف در ائمه و فقهاء رحمهم الله تعالیٰ مشهور است در کتب متداوله مسطور، و بعد تحقیق قول وفاقی تفصیل ذیل لازم است،

(۱) اگر سلطان بسبب غفلت یا بوجه جهالت از حکم شریعت یا بوجه عدم مبالات بشریعت از جمیع رعیت عشر یا خراج طلب نمی کند پس دریں صورت عشر و خراج ساقط نمی شود بلکه تصدق بدو واجب است، لما فی الهندیة فی الباب السابع من کتاب السیر (السلطان) اذا لم يطلب الخراج ممن عليه كان على صاحب الارض ان يتصدق به وان كان تصدق بعد الطلب لا يخرج عن العهدة كذا فى فتاوى قاضى خان (عالمگیریة ص ۲۴۳ ج ۲) وايضا فيها معزيا الى الذخيرة وذكر شيخ الاسلام ان السلطان اذا ترك العشر على صاحب الارض فهو على وجهين الاول ان يترك اغفالا منه بان نسى ففى هذا الوجه كان على من عليه العشر ان يتصدق بالعشر الى الفقير (عالمگیریة ص ۲۴۳ ج ۱)۔

(۳) اگر برائے غنی معین عشر معاف کرد پس ایں بر غنی مذکور جائزہ سلطانی ست، و بر سلطان لازم است کہ بمقدار ایں جائزہ از بیت المال کہ برائے خراج ست داخل کند در بیت المال کہ برائے صدقات است، بشرطیکہ صاحب ارض مصرف خراج باشد ورنہ سلطان از مال خود برائے بیت المال صدقہ ضامن خواہد شد پس اگر سلطان مقدار مذکور در بیت المال صدقہ داخل نمود از ذمہ صاحب ارض عشر ساقط شد ورنہ تصدق بقدر عشر واجب ست۔ ہمچنیں خراج ارباب غنی اگر سلطان تبرعاً در بیت المال خراج داخل کرد از ذمہ غنی ساقط خواہد شد ورنہ تصدق واجب ست، لما فی الهندیة معزیا للذخیرة ان کان من علیه العشر غنیا کان له ذلک جائزة من السلطان ویضمن السلطان مثل ذلک من مال بیت مال الخراج لبیت مال الصدقة (عالمگیریه ج۲)

وفی الشامیة تحت (قوله معزیا للبزازیة) وان کان غنیا ضمن السلطان العشر للفقراء من بیت مال الخراج لبیت مال الصدقة اھ قلت وینبغی حمله علی ما اذا کان الغنی من مستحق الخراج والا فینبغی ان یضمن السلطان ذلک من ماله تأمل (رد المحتار کتاب الجهاد ج۳)

وقال فی شرح التنویر وترک السلطان او نائبه الخراج لرب الارض او وهبه له ولو بشفاعة جاز عند الثانی وحل له لو مصرفا والا تصدق به وبه یفتی وما فی الحاوی من ترجیح حله لغیر المصرف خلاف المشهور (رد المحتار ج۳)

(۴) معاف کردن سلطان مصرف عشر یا مصرف خراج را جائز است لما فی الهندیة معزیا للذخیرة وان کان من علیه العشر فقیرا محتاجا الی العشر فترک ذلک علیه جاز وکان صدقة علیه فیجوز کما لو اخذ منه ثم صرف الیه (عالمگیریه ج۲)

وفی الشامیة (قوله معزیا للبزازیة) وذلک حیث قال وفی البزازیة السلطان اذا ترک العشر لمن هو علیه جاز غنیا کان او فقیرا لکن ان کان المتروک له فقیرا فلا ضمان علی السلطان (الی قوله) وفی منیة باب العشر عن الذخیرة مثل ما فی البزازیة (رد المحتار ج۳)

وفی التحریر المختار لرد المحتار للرافعی فی مسائل شتی من المجلد الخامس للشامیة (قوله ولو ترک العشر لا یجوز الخ) ای ولو کان رب الارض غنیا او فقیرا

يجوز لما عن المفتاح وعليه لم يكن فرق بين الخراج والعشر فانه يجوز تركه لكل للمصرف لا لغيره (التحرير المختار ج ۲) در نظر این فقیر فرق میان عشر وخراج این است که ترک کردن خراج برائے غنی جائز است یعنی اینکه سلطان ضامن نخواهد شد، مقدار این خراج برائے غنی حلال نیست بلکه واجب التصدق است، وترک کردن عشر از غنی جائز نیست یعنی اینکه سلطان ضامن خواهد شد، غرضیکه درباره حلت وحرمت فرق نیست، ودرباره تضمین سلطان فرق است، واین فرق درمیان وجوه توفیق که مندرج ذیل اند واضح وثابت خواهد شد.

وجوه توفیق

اما توفیق درمیان جزئیه سراج که شارح التنویر آورده است اعنی "ولو ترك العشر لا يجوز اجماعا ويخرجه بنفسه للفقراء سراج" درمیان جزئیه بزازیه "السلطان اذا ترك العشر لمن هو عليه جاز غنيا كان او فقيرا" بر دو وجه ممکن است۔

(۱) جزئیه سراج محمول کرده شود بر شخصے که اصلاً مصرف نباشد، وجزئیه بزازیه ودیگر بر کسے که مصرف عشر یا خراج باشد یعنی جواز عدم وقوع ضمان است بر سلطان از مال خود ومراد از عدم جواز همین است، قال الرافعي في التحرير المختار لرد المحتار في كتاب الجهاد من المجلد الثالث للشامية وقد يقال يحمل ما في السراج على ما اذا لم يكن رب الارض مصرفا اصلا وما في البزازية على ما اذا كان مصرفا ولو للخراج (التحرير المختار ج ۲)

ودلیل بر حمل کردن جزئیه سراج بر شخصیکه اصلاً مصرف نباشد این است که شارح التنویر درباره خراج لفظ "جاز عند الثاني" آورده است واختلاف میان صاحبین رحمهما الله تعالی در معاف کردن خراج از غیر مصرف است، اما از مصرف بالاتفاق جائز است، کما فی الشامية ولم يظهر لي وجه قول محمد رحمه الله تعالى ان كان مراده انه لا يجوز ولو كان مصرفا للخراج (شامية ج ۳) وفي التحرير المختار لرد المحتار في كتاب الجهاد (قوله ولم يظهر لي وجه قول محمد الخ) ما في الحاوي يفيد ان الخلاف في غير المصرف وعبارته على ما في الحموي واذا ترك الامام خراج ارض رجل او كرمه او بستانه ولم يكن اهلا لصرف الخراج اليه عند ابي يوسف رحمه الله تعالى يحل وعليه

الفتوی وعند محمد رحمه الله لایحل الا للفقیر المحتاج ج ۲) پس لفظ "جاز عند الثانی" دلیل بین ست برآنکه در بحث خراج حکم غیر مصرف مذکور ست نه حکم مصرف وبوجه تقابل مستلزم ست مر این را که حکم عشر هم برائے غیر مصرف ست،

واما دلیل برآنکه مراد از جواز عدم وقوع ضمان ست بر سلطان، آنچه علامه ابن عابدین رحمه الله تعالی درباره خراج تحریر فرموده است (قوله وجعل لو مصرفا) اعاده لان قوله جاز ای جاز ما فعله السلطان بمعنی انه لایضمن ولایلزم من ذلک حله لرب الارض (شامیة ج ۳) پس در حکم شرح لفظ "لایجوز" که در مقابل لفظ "جاز" واقع شده برضد آن محمول کرده شود،

الغرض حاصل عبارت سراج این ست که اگر سلطان عشر معاف کرد شخصے را که اصلاً مصرف نیست نه مصرف عشر نه مصرف خراج، پس سلطان از مال خود برائے بیت المال الصدقة ضامن خواهد شد، اگر سلطان ادا کرد پس بر صاحب ارض لازم ست که تصدق بر مساکین کند، وحصول عبارت بزازیه وذخیره این ست که اگر سلطان عشر ساقط کرد واز مصرف خواه مصرف عشر باشد یا مصرف خراج، پس بر او از مال خود ضمان نیست بلکه بصورت مصرف عشر بیچ حکم بر سلطان لازم نخواهد شد وبصورتیکه مصرف عشر نباشد بلکه مصرف خراج باشد بر سلطان لازم ست که بقدر عشر از بیت المال خراج در بیت المال صدقه داخل کند، فلا تنافی بین العبارتین،

(۲) دوم وجه توفیق که در فهم این فقیر می آید این که مراد از لفظ "لایجوز" که در عبارت سراج ست وقوع ضمان ست بر سلطان از مال خود یا از بیت المال خراج، ومقصد مصنف رحمه الله تعالی بیان کردن ست حکم کسے که مصرف عشر نباشد، واثبات این بر دعوی از تامل که در بیان وجه توفیق اول گذشته اند ممکن ست کما لایخفی، ودر بزازیه لفظ "جاز" بمعنی "حل" ست نه بمعنی عدم وقوع ضمان چراکه خود در بزازیه بعد از لفظ "جاز غنیا او فقیرا" مذکور ست که بصورت معاف کردن عشر از غنی سلطان ضامن خواهد شد، پس مراد از عبارت سراج این ست که اگر سلطان کسے را که مصرف عشر نباشد عشر معاف کرد ضامن خواهد شد از بیت المال خراج اگر مصرف خراج ست ورنه از مال خود، پس بعد از ادای سلطان مقدار عشر برائے صاحب ارض حلال خواهد شد، بیچ وجه حرمت نیست، البته

اگر سلطان ادا نہ کرد پس بر صاحب ارض ادا کردن واجب ست، ومقصود از عبارت بزازیہ ہمیں ست کہ مقدار عشر معاف کردن برائے صاحب ارض حلال ست غنی باشد یا فقیر البتہ بصورت غنا بر سلطان ضمان لازم ست، فوضح التوفیق واندفع التعارض، فافہم

ہذا التحریر وتشکر، بعد از تفصیل مذکور بسوئے اصل سوال رجوع می کنیم، در صورت سوال مذکور ست کہ سلطان از جمیع رعیت یک من وتیم از صد من غلہ وصول می کند، وقانون حکومت ہمیں عشر رشدہ است، پس ایں حکم وقانون برائے ہر غنی وفقیر مراخذ مخالف شریعت بیضاء، ودر مقابلہ نصوص قطعیہ است، لہٰذا ایں قانون مردود ست ومتقن او در ضلالت بینہ ومنحرف از شریعت سمحہ حنیفیہ است، پس بسبب ایں قانون عشر ہرگز ساقط نخواہد شد بلکہ مقدار کہ سلطان گیرد از مقدار عشر وضع کردہ باقی را بر مساکین تصدق کردن واجب ست، فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۱۹ ربیع الاول سنہ ۸۳ھ

پاکستان اور ہندوستان کی اراضی عشری ہیں یا خراجی؟

سوال:۔ سندھ وپنجاب کی زمینیں عشری ہیں یا خراجی؟ امداد الفتاوی میں حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو زمینیں اس وقت مسلمانوں کی ملک میں ہیں اور ان کے پاس مسلمانوں ہی سے پہنچی ہیں ارثاً اور شراءً وہلم جرا، وہ زمینیں عشری ہیں، اور جو درمیان میں کوئی کافر مالک ہوگیا تھا وہ عشری نہ رہی، اور جس کا حال کچھ معلوم نہ ہو اور اس وقت مسلمانوں کے پاس ہیں پھر سمجھا جائے گا کہ مسلمانوں ہی سے حاصل ہوئی ہیں، بدلیل الاستصحاب پس وہ بھی عشری ہوں گی۔ (امداد الفتاوی جدید ج ۲ ص ۵۲، بحوالہ تتمہ ثانی ص ۵۰) حالانکہ مولانا عبد الغفور سندھی ہمایونی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسالہ ”سلم الہند فی تحقیق خراج السند“ میں ثابت کیا ہے کہ محمد بن قاسم رحمہ اللہ تعالیٰ نے سندھ کی اراضی پر خراج مقاسمہ (بٹائی) مقرر کیا تھا، ہمایونی کی عبارت پیش خدمت ہے:

”ارض السند خراجیۃ خراج مقاسمۃ وخراجہا الخمس کما حققہ المحققون فقد قال المخدوم عبد الواحد السیوستانی فی البیاض الواحدی ارض السند خراجیۃ او عشریۃ؟ فالظاہر ان ارض السند خراجیۃ لتحقق عنوۃ اما فتح السند بالسیف وعدم کونہ عشریا فذکر فی رفع الغریۃ للشیخ ابی الحسن الدہری قد ثبت فی کتب التاریخ ان فتح السند کان فی سنۃ ثلاث

وتسعین وکان فتوح الامر ہم چنہ استعمروا طوعا علی ما لص جوابہ فی التاریخ اھ
وعبارۃ المعصومیۃ هکذا: امردم چنہ خبر غلبۂ لشکر اسلام شنیدند و فہمیدند با پشیمانی تمام
بخدمت محمد بن قاسم حاضر شدند و بطاعت رسالت گزاری قبول نمودہ مراجعت نمودند از ان سبب
فقہاء اسلام آں روئی آب را کہ در تصرف مردم چنہ بود عشری می گویند اھ فهذا مشعر بان
الارض التی لیست فی تصرف مردم چنہ خراجیة وقد صرح الشیخ ابو الحسن
المذکور ان خراج اهل السند هو الخمس ای ضعف العشر وقال ایضا فی الرسالة
المذکورة وما سمعت من احد وما وجدت فی کتاب ان محمد بن القاسم وضع
العشر علی ارض السند او وضع لکن انتهی ما فی البیاض الواحدی وقال المخدوم
محمد عارف فی بیاضہ: الظاهر ان ارض السند والهند خراجیة وخراجها
الخمس کما حققه الشیخ المحقق الدهری فی رسالته المسماة برفع الفریة
ونقل فیها عن جامع الفتاوی الناصری ان ارضنا عشریة لکن ضعف هذا النقل
اھ وقال العلامة المخدوم محمد هاشم التتوی فی اتحاف الاکابر قال الاثیر
فی الانساب السند بلاد من الهند اھ وفیه ایضا فی فتح البلدان ان بلاد السند
فتحها محمد بن قاسم الثقفی سنة ثلاث وتسعین اھ وذکر الحافظ السیوطی
فی تاریخ الخلفاء ان فی سنة ثلاث وتسعین ایام خلافة الولید بن عبد الملک
فتحت الدیبل ولا شك ان الدیبل هو اکبر قصبات السند ومدار دیارها اھ
ما فی الاتحاف (سراج الهند فی تحقیق خراج السند)

حضرت والا ان عبارات کو ملاحظہ فرما کر اپنی تحقیق تحریر فرما کر ممنون فرمائیں۔ بینوا توجروا

الجواب باسم ملهم الصواب

جس طرح محمد بن قاسم رحمہ اللہ تعالیٰ کا اراضی سندھ پر خراج مقرر کرنا ثابت ہے اسی
طرح یہ امر بھی محقق ہے کہ بعض علاقوں کے لوگ اسلام لے آئے تھے اس لئے ان پر عشر
مقرر کیا گیا تھا چنانچہ مستند کتب تاریخ کے علاوہ خود مولانا ہالائی کے اسی رسالہ میں بھی

عہ وراجعت الفتح فوجدت فیہ واما الهند فافتتحها القاسم بن محمد الثقفی سنة
ثلاث وتسعین (فتح القدیر ص ۲۵۹ ج ۴) ۱۲ رشید احمد

اس کی تصریح موجود ہے، نیز تاریخ سے ثابت ہے کہ بعض مجاہدین کو کچھ جاگیریں بطور ملک دی گئی تھیں (فتوح البلدان للبلاذری ص ۴۲۵) اور ولید بن عبدالملک کے آخری دور میں راجہ داہر کا بیٹا جیسیہ بغاوت کرکے برہمن آباد کا مستقل بادشاہ بن گیا تھا، اسی طرح سندھ کی دوسری بہت سی ریاستوں کے راجہ بھی باغی ہوکر خود مختار بن گئے تھے، حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ تعالیٰ کی خلافت کا زمانہ آیا تو آپ نے ان راجاؤں کو بذریعہ خطوط اولاً اسلام کی پھر اطاعت کی دعوت دی، جس پر یہ مسلمان ہوگئے، حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ تعالیٰ نے انہی راجاؤں کو ان کی ریاست کا حاکم مقرر کردیا، اور ان کی تمام اراضی پر ان کی ملکیت برقرار رکھی (الکامل لابن اثیر ص ۲۲۴ ج ۴) علاوہ ازیں مسلمانوں کے طویل مدت میں یقیناً بہت سی نئی اراضی بھی آباد کی گئیں، مذکورہ بالا اقسام کی سب اراضی عشری ہیں، مزید برآں جن اراضی پر سیدنا محمد بن القاسم رحمہ اللہ تعالیٰ نے خراج رکھا تھا ان میں یہ بھی احتمال ہے کہ بعض اراضی کچھ مدت کے بعد غیر آباد یا لاوارث ہوکر بیت المال کی ملک ہوگئی ہوں، اور بیت المال کی طرف سے کسی مسلمان کو دی گئی ہوں، غرضیکہ تقریباً تیرہ سو سال کے انقلابات کے بعد کسی زمین کی صحیح حقیقت کا حال معلوم کرنا ممکن نہیں، لہٰذا حضرت تھانوی قدس سرہ کی تحقیق ہی حق ہے، مگر یہ حکم ان زمینوں کا ہے جو عرصۂ دراز سے نسلاً بعد نسلٍ مملوکہ چلی آتی ہیں، اس کے علاوہ کچھ اور اقسام کی زمینیں بھی ہیں:۔

(۱) تقسیم ہند سے قبل حکومت برطانیہ کی طرف سے یا تقسیم کے بعد حکومت ہند یا کسی اور کافر حکومت کی طرف سے جو غیر آباد اراضی مسلمانوں کو قیمتاً یا بلاقیمت دی گئیں یہ ملک کافر سے آنے کی وجہ سے خراجی ہیں، ایسی غیر آباد اراضی کو عموماً مباح الاصل یا غیر مملوک کہا جاتا ہے، اس سے یہ مقصد ہے کہ یہ شخصی ملک نہیں، عبارات ذیل سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ اراضی حکومت کی ملک ہیں، قال الامام الطحاوی رحمہ اللہ تعالیٰ مما یفرق بین الارض الموات وبین ماء الانهار والصید انا رأینا الصید وماء الانهار لایجوز للامام تملیک ذلک احدا ولو رأینا لو ملک رجلاً ارضاً میتة ثم ملکها الرجل آخر جاز ذلک ولو احتاج الامام الی بیعها فی نائبة للمسلمین جاز بیعه لها ولا یجوز ذلک فی ماء نهر ولا فی صید بر ولا بحر فلما کان ذلک الی الامام فی الارضین دل ذلک ان حکمها الیه وانها فی یده کسائر الاموال التی فی بیت المال (طحاوی ج ۲)

وقال العلامة الطوری رحمہ اللہ تعالیٰ لان ھذہ الاراضی کانت فی ایدی الکفار فصارت فی ایدی المسلمین فکانت فیئًا (تکملۃ فتح القدیر ص ۲۱۰ ج ۱)

وفی الھدایۃ لانھا کانت فی ایدی الکفرۃ وحوتھا ایدینا غلبۃ فکانت غنیمۃ (ھدایۃ ص ۱۹۹ ج ۱) وفی اعلاء السنن والجواب عنہ انہ قیاس فاسد لان الارض المیتۃ ملک لبیت المال فیحتاج الی اذن الامام بخلاف الطیر وغیرہ فانہ لا ملک فیہ لاحد (اعلاء السنن ص ۲۰۸ ج ۲)

بعض حضرات کو شامیہ باب الرکاز کی عبارت "فان ارضھا ای دار الحرب لیست ارض خراج وعشر" سے مغالطہ لگا ہے کہ یہ دار الحرب میں رہنے والے مسلمانوں کی اراضی کا حکم ہے کہ ان پر نہ عشر ہے نہ خراج حالانکہ مقصد یہ ہے کہ اہل حرب کی اراضی پر عشر یا خراج نہیں کیونکہ وہ احکام شرع کے مکلف نہیں، چنانچہ شمس الائمہ سرخسی کی عبارت اس مراد کی وضاحت کر رہی ہے، ونصہ ان العشر والخراج انما یجب فی اراضی المسلمین وھذہ اراضی اھل الحرب لیست بعشریۃ ولا خراجیۃ (شرح السیر الکبیر ص ۳۰۳ ج ۳)

۲ تقسیم ہند کے بعد حکومت پاکستان سے مسلمانوں نے جو غیر آباد اراضی قیمۃً یا بلا قیمت لے کر آباد کیں، یہ عشری یا خراجی ہونے میں قریب تر اراضی کے تابع ہوں گی، اگر قرب میں دونوں قسم کی اراضی برابر ہوں تو یہ نو آباد اراضی عشری ہوں گی (قال فی التنویر ولو احیاہ مسلم اعتبر قربہ، وفی الشامیۃ ای قرب ما احیاہ ان کان الی ارض الخراج اقرب کانت خراجیۃ وان کان الی العشر اقرب فعشریۃ، نھر، وان کانت بینھما فعشریۃ مراعاۃ لجانب المسلم ط وھذا عند ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ واعتبر محمد رحمہ اللہ تعالیٰ الماء فان احیاھا بماء الخراج فخراجیۃ والا فعشریۃ بحر وبالاول یفتی، در منتقی (رد المحتار ص ۲۶۹ ج ۳)

۳ پاکستان میں غیر مسلموں کی مملوکہ اراضی جو مسلمانوں کو دی گئیں یہ عشری ہیں، تقسیم ہند کے وقت اگرچہ تبادلۂ املاک کا معاہدہ حکومت پاکستان وہندوستان کے مابین ہوا تھا، مگر حکومت ہند نے جلد ہی اس عہد کو توڑ دیا تھا، اس لئے غیر مسلموں کی املاک پر حکومت پاکستان کا قبضہ مستقل نہیں تھا، بلکہ یہ املاک اموال فئی ہیں،

۴ غیر مسلمین کی متروکہ زمین یا غیر آباد اراضی جو حکومت پاکستان نے کسی مسلمان کو

عاریت یا اجارہ یا مزارعت کے طور پر دی ہوں، بطور تملیک نہ دی ہوں یہ غیر عشری یعنی خراجی ہیں کیونکہ یہ اراضی سلطانیہ ہیں، قال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ تعالیٰ فی عنوان (تتمہ) فی التتارخانیۃ السلطان اذا دفع اراضی لا مالک لہا وھی التی تسمی اراضی المملکۃ الی قوم لیعطوا الخراج جاز وطریق الجواز احد شیئین اما اقامتہم مقام الملاک فی الزراعۃ واعطاء الخراج او الاجارۃ بقدر الخراج ویکون المأخوذ منہم خراجا فی حق الامام اجرۃ فی حقہم اھ ومن ھذا القبیل الاراضی المصریۃ والشامیۃ کما قدمناہ ویؤخذ من ھذا انہ لا عشر علی المزارعین فی بلادنا اذا کانت اراضیہم غیر مملوکۃ لہم لان ما یأخذ منہم نائب السلطان وھو المسمی بالزعیم او التیماری ان کان عشرا فلا شیء علیہم غیرہ وان کان خراجا فکذلک لانہ لا یجتمع مع العشر وان کان اجرۃ فکذلک علی قول الامام من انہ لا عشر علی المستأجر واما علی قولہما فالظاہر انہ کذلک لما علمت من ان المأخوذ لیس اجرۃ من کل وجہ لانہ خراج فی حق الامام تأمل (رد المحتار ص ۲۶۱ ج ۳)

⑤ حکومت ہند کی طرف سے مسلمانوں کی متروکہ اراضی جو مسلمانوں کو ملیں یا استیلاء کفار کی وجہ سے خراجی ہیں۔

محمد بن قاسم رحمہ اللہ تعالیٰ نے اراضی سندھ پر اگرچہ خراج مقاسمہ (بٹائی) مقرر کیا تھا مگر زمینداروں کی رضا سے خراج مقاسمہ کو موظف سے تبدیل کرنا جائز ہے، کما یدل علیہ تعلیل حرمۃ التبدیل بان فیہ نقض العہد وھو حرام (رد المحتار ص ۲۶۴ ج ۳) -

آجکل زمین کا لگان پیداوار کے خمس سے بہت کم ہے، جس میں زمینداروں کی رضا متیقن ہے، لہٰذا حکومت پاکستان کا خراج موظف وصول کرنا صحیح ہے، البتہ عشری زمینوں کا لگان حکومت کو ادا کرنے سے عشر ساقط نہ ہوگا، اور ہندوستان کے مسلمانوں پر لازم ہے کہ اراضی خراجی کا خراج بھی اپنے طور پر مصارف خراج پر صرف کریں، حکومت کو محصول (لگان) ادا کرنے سے خراج ادا نہ ہوگا لان الکفرۃ لیس لہم ولایۃ اخذ الخراج من المسلمین وایضا لیسوا بمصارف الخراج کما فی جامع الفصولین (رسالۃ العذق فی تحقیق خراج السند للعلامۃ الہمایونی)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۱۶ شعبان سنہ ۹۲ھ

باب صدقۃ الفطر

کافر، شیعہ، مرزائی کو صدقۃ الفطر دینا جائز نہیں:

سوال: کافر، آغاخانی، شیعہ یا مرزائی کو صدقہ فطر دینا جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

کافر حربی کو صدقہ فطر دینا بالاتفاق ناجائز ہے، ذمی کے بارے میں اختلاف ہے، شامیہ باب المصرف و باب صدقۃ الفطر میں بظاہر جواز کو ترجیح معلوم ہوتی ہے مگر کفارۃ ظہار کے باب میں کافی سے بدون ذکر خلاف عدم جواز نقل کیا ہے جو فیصلہ کے لئے کافی ہے، و نصہ تحت (قولہ ومصرفہا) قال الرملی وفی الحاوی وان اطعم فقراء اھل الذمۃ جاز وقال ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ لا یجوز وبہ ناخذ قلت بل صرح فی الکافی بانہ لا یجوز ولم یذکر فیہ خلافا وبہ علم انہ ظاہر الروایۃ من الکل (رد المحتار ص ۹۳ ج ۲)

آغاخانی، شیعہ اور قادیانی کا کفر اور انکا حکم دوسرے کفار سے زیادہ سخت ہے، یہ زندیق ہیں، ان کو صدقۃ الفطر دینا بالاتفاق جائز نہیں، ان کے ساتھ کسی قسم کا تعامل مثلاً بیع و شراء، اجارہ و استجارہ وغیرہ کوئی معاملہ بھی جائز نہیں۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

ذمی کو صدقۃ الفطر دینا جائز نہیں، تفصیل تتمہ میں ہے۔ ۱۹ محرم ۱۳۸۸ھ

صدقۃ الفطر کا نصاب:

سوال: صدقۃ الفطر کتنی مالیت پر واجب ہے؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

سونا ۸۷٫۴۸۰ گرام یا چاندی ۶۱۲٫۳۵ گرام یا ان دونوں میں سے کسی ایک کی قیمت کے برابر نقدی یا مال تجارت یا گھر میں روزمرہ استعمال کی چیزوں سے زائد سامان یا ان پانچوں یا ان میں سے بعض کا مجموعہ ہو تو صدقۃ الفطر واجب ہے، تین جوڑوں سے زائد لباس اور ریڈیو اور ٹی وی جیسی خرافات انسانی حاجات میں داخل نہیں اس لئے ان کی قیمت بھی حساب میں لگائی جائے گی، فی الھندیۃ الشامیۃ وصاحب الثیاب الاربعۃ لو ساوی الرابع نصابا غنی وثلاثۃ فلا، لان احدھا للبذلۃ والآخر للمھنۃ والثالث للجمع

والاوفق والاعلى (رد المحتار ص ۱۰۴ ج ۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۱۳ رمضان سنہ ۸۶ھ

صدقۃ الفطر میں گیہوں کی قیمت معتبر ہے:

سوال: صدقۂ فطر راشن کے آٹے کے بھاؤ سے ادا کریں یا بازار میں گندم کا نرخ معلوم کر کے ادا کریں، جبکہ راشن کا آٹا کھاتے ہوں، اور جو لوگ بازار سے اچھا آٹا یا عمدہ گندم خرید کر کھاتے ہیں وہ راشن کے حساب سے صدقۂ فطر ادا کریں یا بازار کے بھاؤ سے ادا کریں؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

گیہوں کی قیمت ادا کریں، آٹے کی قیمت گیہوں سے کم ہو تو آٹا یا اس کی قیمت دینے سے صدقۃ الفطر ادا نہ ہوگا، کذا فی الشامیۃ۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۲۵ رمضان سنہ ۹۵ھ

رمضان سے قبل صدقۃ الفطر دینا جائز ہے:

سوال: تعجیل صدقۃ الفطر قبل شہر رمضان جائز ہے یا نہیں؟ بہشتی زیور میں رمضان میں دینا درست قرار دیا ہے لیکن رمضان سے قبل کا ذکر نہیں، وضاحت فرمائیں۔ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

اس میں اختلاف ہے، جواز راجح ہے، قال فی التنویر وصح اداؤها اذا قدمه علی يوم الفطر او اخره بشرط دخول رمضان فی الاول هو الصحيح، وفی العلائية وبه يفتی جوهرة وبحر عن الظهيرية، لكن عامة المتون والشروح علی صحة التقديم مطلقا وصححه غير واحد ورجحه فی النهر ونقل عن الولوالجية انه ظاهر الرواية قلت فكان هو المذهب. (رد المحتار ص ۸۵ ج ۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۱۱ رمضان سنہ ۹۶ھ

سید کو صدقۃ الفطر دینا جائز نہیں:

سوال: سید کو صدقۂ فطر دینا جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

جائز نہیں، [illegible] زکوٰۃ کے سوا تمام صدقات واجبہ مثل نذر، کفارہ وغیرہ بنو ہاشم پر حرام ہیں، کذا فی الشامیۃ۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۱۳ رمضان سنہ ۱۴۰۱ھ

وَاَقِیْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِیْزَانَ ۝

بسط الباع لتحقیق الصاع

درہم، مثقال، صاع وغیرہ اوزانِ شرعیہ کی تنقیح
فقہاء متقدمین کی گرانقدر تحقیقات اور جدید
وزن بردار مشینوں کی تدقیقات کی روشنی میں

وزن صاع کی تحقیق:

سوال: شرعی درہم، مثقال اور صاع کا وزن کیا ہے؟ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب نے رسالہ اوزان شرعیہ میں جو تحقیق فرمائی ہے اس سے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟ نیز مسافت قصر سے متعلق آپ کی تحقیق کیا ہے؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

اتنی بات مسلم ہے کہ درہم ۱۴ قیراط، مثقال ۲۰ قیراط اور صاع ۱۰۴۰ درہم کا ہے، متعدد وجوہ ذیل کی بنا پر ان اوزان کی بالکل صحیح حقیقت تک رسائی بہت مشکل ہے۔

(۱) ان سب اوزان کی بنا قیراط کے وزن کی تعیین پر ہے۔ حضرات فقہاء رحمہم اللہ نے ایک قیراط کا وزن ۵ جو متوسط غیر مقشر تحریر فرمایا ہے، جن کی دونوں جانب سے باریک لمبا حصہ کاٹ دیا گیا ہو۔ پھر جو کا وزن چاول کے دانوں سے اور چاول کا وزن رائی کے دانوں سے کیا ہے، مگر ان اجناس کے دانے آپس میں مختلف ہوتے ہیں، خصوصاً مختلف ممالک اور مختلف زمانوں میں ان کے دانوں میں اور بھی زیادہ اختلاف کا احتمال ہے اسی لئے ان کے وزن میں بھی حسب ذیل اختلاف ہوا

ایک قیراط = ۵ جو ، ۲۰ چاول ، ۱⅞ رتی ، ۲ رتی

ایک جو = ۴ چاول، ۳ چاول ، ۲ رائی

ایک چاول = ۴ رائی ، ۲ تازہ جنگلی رائی ، ۳ رائی

(۲) ابتدائی اوزان میں غیر محسوس فرق ہو سکتا ہے جو بڑے اوزان میں جا کر بہت زیادہ فرق کا باعث بن سکتا ہے۔ مثلاً ۵ جو = ایک قیراط، اور ۲۰ قیراط = ایک مثقال، تو اس سے ایک مثقال = ۲۰ x ۵ = ۱۰۰ جو کے حساب کی صحت متیقن نہیں۔

(۳) بعض مرتبہ چھوٹے اوزان میں معمولی فرق کو عمداً نظر انداز کر دیا جاتا ہے جو بڑے اوزان میں جا کر بڑے فرق کا سبب بن جاتا ہے۔ چنانچہ علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں والاستار بکسر الهمزة بالدراهم ستة ونصف وبالمثاقيل اربعة ونصف كذا في شرح درر البحار

یہاں ۴½ مثقال تقریباً لکھا گیا ہے۔ تحقیقی وزن ۴ ۱۱/۲۰ مثقال ہے اسلئے کہ حسب تصریح فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ درہم کی نسبت مثقال کے ساتھ ۷/۱۰ ہے۔ جملہ کتب میں وزن سبعہ کی تصریح کے علاوہ درہم = ۱۴ قیراط اور مثقال = ۲۰ قیراط کی تصریح بھی ۷/۱۰ کی نسبت سے متبادر ہے باقی رہا یہ احتمال کہ شاید مثقال کی بجائے ۶½ درہم کا وزن تقریباً لیا ہو، سو یہ اسلئے صحیح نہیں کہ

حسب تصریح شامی صاع = ۱۰۴۰ درہم اور ۱۶۰ استار ہے۔ پس استار = ۶ ½ درہم کا حساب ٹھیک اسکے مطابق بیٹھتا ہے۔ علاوہ ازیں رافعی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اسکی تصریح کردی ہے کہ عبارت مذکورہ میں ۴ ½ مثقال تقریباً لکھا گیا ہے ونصہ (قولہ وبالمثاقیل اربعۃ ونصف ای تقریباً وإلا فستۃ دراھم ونصف تبلغ من القراریط واحدا وتسعین قیراطا والاربعۃ ونصف من المثاقیل تبلغ تسعین قیراطا والتحقیق ان یقال وبالمثاقیل اربعۃ ونصف و قیراط تأمل) (التحریر المختار ص۱۳۲ ج۱) اس تحقیق سے ثابت ہوا کہ رسالہ اوزان شرعیہ میں جو وزن صاع بذریعہ مثقال کو وزن صاع بذریعہ درہم سے تین تولہ کم لکھا ہے وہ ۶ ½ درہم = ۴ ½ مثقال تقریباً کو تحقیقاً سمجھنے کے مغالطہ پر مبنی ہے ورنہ تحقیقی حساب کی بناء پر وزن صاع بذریعہ مثقال وزن بذریعہ درہم کے بالکل برابر ہے۔

(۴) وزن صاع کی تعیین میں ایک مزید اشکال یہ ہے کہ اس کے برابر وزن کے گیہوں اگر ایسے برتن میں ڈالے جائیں جو اس سے بھر جائے تو یہ برتن ہر قسم کے گیہوں کے لئے معیار نہیں بن سکتا، ممکن ہے کہ دوسرے گیہوں اس سے ہلکے ہوں اس لئے اس برتن میں بھرے ہوئے گیہوں کا وزن صاع کے متعین وزن سے کم رہے گا۔

خلاصہ یہ کہ ان اوزان سے متعلق کوئی یقینی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا، البتہ ظن غالب سے ترجیح یا عبادات میں احتیاط کا طریق اختیار کیا جا سکتا ہے۔ فتاویٰ حمادیہ میں قیراط = ۴ ۲/۵ رتی تحریر کیا ہے مگر دلائل ذیل سے معلوم ہوتا ہے کہ قیراط ۲ رتی کے برابر یا اس سے بہت تھوڑا سا کم ہے۔ اس لئے درہم تقریباً ۳ ½ ماشہ اور مثقال تقریباً ۵ ماشہ ہے۔

(۱) شامیہ، بحر، شرح وقایہ، مجمع الانہر اور جامع الرموز وغیرہ میں قیراط کا وزن ۵ جو متوسط غیر مقشر کے برابر لکھا ہے جن کی دونوں طرف سے باریک لمبا تنکا کاٹ دیا گیا ہو اور منتخب میں ایک جو = ۳ چاول لکھا ہے۔ پس ۵ جو = ۱۵ چاول = ۱ ۷/۸ رتی ہوئے۔

(۲) ہندی اوزان میں ۲ جو = ایک رتی کا حساب معروف رہا ہے۔ قال اللکھنوی فالدینار عندھم (اھل الحجاز) مائۃ شعیرۃ وعند اھل مصر قبل ستۃ وتسعون شعیرۃ (الی قولہ) والحبۃ شعیرتان والشعیرۃ ستۃ خرادل (فتح القدیر ص۲۲۵ ج۱) وفی الحمادیۃ وکل حبۃ ستۃ عشر شعیرا (حمادیۃ ص۲۲ ج۱)

حکیم محمد شریف خان دہلوی اپنی کتاب علاج الامراض میں تحریر فرماتے ہیں از چہار جو

یک برنج اعتبار کنند واز چہار برنج یک جو واز دو جو یک رتی (اوزان شرعیہ ص۱۱) یہاں ۴ چاول = ایک جو کی وضاحت سے ثابت ہوا کہ انھوں نے متوسط جو کی بجائے بڑے جو لئے ہیں۔ پس بڑے ۲ جو = ایک رتی ہیں تو متوسط ۵ جو = ۲ رتی یا اس سے کچھ ہی کم و بیش ہو سکتے ہیں۔

(۴) حضرت مفتی محمد شفیع صاحب نے رسالہ اوزان شرعیہ میں اس کی تصریح فرمائی ہے کہ انھوں نے حضرات فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ کی وضاحت کے مطابق درہم کے لئے ۷۰ جو معتدل غیر مقشر دم بریدہ اور مثقال کے لئے اسی قسم کے ۱۰۰ جو کا وزن خود بھی چند بار کیا اور متعدد طریقوں سے وزن کرایا، رائج الوقت ماشہ کے ذریعہ اوّل کا وزن ۳ ماشہ ۵ رتی اور دوسرے کا ۵ ماشہ ۲ رتی ہوا۔ اس کے بعد فرماتے ہیں:

"لیکن رائج الوقت ماشہ تولہ، اصل تولہ ماشہ سے کسی قدر کم ہے کیونکہ اس وقت بازار میں سکہ انگریزی ایک روپے کو ایک تولہ قرار دیا گیا ہے جو حقیقۃً ۱۱½ ماشہ کا ہے اور اصل تولہ سے ۴ رتی کم ہے، اسی حساب سے ماشہ ⅓ رتی کم ہوا۔ ۳ ماشہ پر ایک رتی اور ۵ ماشہ پر ۱⅔ رتی کم ہوگئے، تو گویا اس وزن کے حساب سے ستر جو (درہم) ۳ ماشہ ۴ رتی، یعنی کل ۲۸ رتی تقریباً ہوئے اور سو جو (مثقال) تقریباً ۴ رتی یا ۵ ماشہ کے ہوئے۔"

اس وزن میں دو نقص ہیں۔

(۱) ۳ ماشہ ۵ رتی، ۵ ماشہ ۲ رتی کا ⁷⁄₁₀ نہیں، حالانکہ درہم و مثقال میں یہ نسبت ضروری ہے،

(۲) وزن میں ۴ رتی فی تولہ کی کمی کا حساب تقریباً لگایا گیا ہے۔ صحیح حساب یوں ہے۔

مثقال = ۲۰٫۴۰ رتی = ۲۵ ـــ ۳۲×۹۶/۹۶، درہم = ۲۶٫۷۹۱۶ رتی ـــ ۲۵×۹۲/۹۹

دوسرا نقص تو صحیح حساب کے ذریعہ مرتفع ہو گیا مگر پہلے نقص کے ازالہ کی کوئی صورت نہیں اسلئے کہ درہم = ۲۶٫۷۹۱۶ ÷ ۱۴ = ۱٫۹۸۵۱ رتی = قیراط ہوا۔

اور مثقال = (۴۰٫۲۵) ÷ ۲۰ = ۲٫۰۱۲۵ رتی = قیراط ہوا۔ پس قیراط کے دو مختلف وزن نکلے جن میں سے ایک کا غلط ہونا بدیہی ہے۔ چونکہ مثقال اصل ہے نیز اسکا وزن درہم سے زیادہ ہے اور زیادہ وزن میں صحیح حقیقت تک پہنچنا زیادہ آسان ہے اسلئے اسی کے وزن کو ترجیح ہوگی۔ یعنی قیراط = ۲٫۰۱۲۵ رتی۔ اس کے بعد گنگچیوں کے ساتھ وزن کرنے کا ذکر فرمایا ہے۔ گنگچیوں کے اختلاف کی وجہ سے ۷۰ جو

کے مقابل ۲۵ تا ۲۸ اور ۱۰۰ جو کے مقابل ۳۶ تا ۴۱ کنگچیاں آئیں۔ اسکے بعد فرماتے ہیں

"جس طرح جو متوسط لینے تھے اسی طرح کنگچیاں بھی متوسط لینے کی ضرورت تھی (الیٰ قولہ)

۷۰ جو ۲۵ رتی کے برابر اور ۱۰۰ جو ۳۶ رتی کے برابر نکلے"۔

کنگچیوں کے ذریعہ اس وزن میں دو اشکال ہیں:

(۱) خود حضرت مفتی صاحب کی وضاحت کے مطابق یہ کنگچیاں متوسط لینے کی ضرورت تھی۔ جب ۷۰ جو کے مقابل ۲۵ تا ۲۸ اور ۱۰۰ جو کے مقابل ۳۶ تا ۴۱ آئیں، تو اول میں ۲۵ اور دوسرے میں ۳۶ بڑی سے بڑی ہوئیں نہ کہ متوسط۔

(۲) کنگچیوں کا انتخاب خود کرنے کی بجائے اسکا صحیح طریقہ یہ ہے کہ اتنے وہ دانے لئے جائیں جو ٹکسال کے معہود ماشہ کے مقابل آئیں۔ ٹکسالی وزن کی موجودگی میں کنگچیوں سے ماشہ کی تعیین نہیں کی جائے گی بلکہ ٹکسالی ماشہ کے ذریعہ یہ معلوم کیا جائے گا کہ کس قسم کی کنگچیاں وزن میں معتبر ہیں، غرضیکہ صحیح وزن وہی ہے جو حضرت مفتی صاحب نے ماشہ کے ذریعہ کیا ہے یعنی درہم تقریباً ۳ ۱/۴ ماشہ اور مثقال تقریباً ۴ ۱/۲ ماشہ۔

(۳) فتاویٰ حمادیہ ج ۱ ص ۴۳ میں شیخ بہاء الدین ابراہیم بن عبداللہ ملتانی سے نقل کیا ہے کہ وہ ۷۹۳ھ میں مکہ مکرمہ کا درہم، مثقال، مد اور صاع لائے اور ان کا وزن کرکے انھیں دہلی کی ٹکسال میں محفوظ کرادیا۔ درہم = ۳ ماشہ ۱ ۱/۲ رتی اور مثقال = ۴ ماشہ ۶ ۳/۱۰ رتی ہوا۔ حمادیہ میں مذکورہ اوزان میں جو تحریر ہے بندہ نے ۲ جو = ایک رتی کے حساب سے اوپر کا وزن لکھا ہے، ۲ جو = ایک رتی کی تصریح خود حمادیہ ہی سے اوپر گزر چکی ہے۔ مثقال کا یہ وزن ۵ ماشہ سے ۱ ۳/۱۰ رتی کم ہے، البتہ درہم کے وزن میں زیادہ تفاوت ہے۔ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ درہم کی نسبت مثقال کے ساتھ ۷/۱۰ مسلم ہے چونکہ درہم اور مثقال کے مذکورہ وزنوں میں یہ نسبت نہیں اسلئے یہ دونوں وزن یا دونوں میں سے ایک یقیناً غلط ہے۔ عہد صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں مختلف وزن کے دراہم رائج تھے، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جزیہ متعین کرتے وقت وزن سبعہ کا درہم قرار دیا اس سے اور عبارات فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ میں بھی وزن سبعہ کی تعبیر سے ثابت ہوا کہ وزن مثقال اصل ہے اور درہم اس کا ۷/۱۰ ہے۔ مثقال کے وزن مذکور کا ۷/۱۰ یہ ۳ ماشہ ۹، ۳ رتی بنتا ہے جس کا ۳ ۱/۴ ماشہ سے معمولی تفاوت ہے۔ ابراہیم بن عبداللہ نے جس درہم کا وزن کیا یا تو وہ شرعی درہم نہ تھا یا ان سے وزن کرنے میں کوئی غلطی

ہوتی ہے۔

⑤ غیاث اللغات وغیرہ کتب لغت اور کتب طب میں درہم = ۳½ ماشہ تحریر ہے البتہ اطباء کے ہاں مثقال = ۴½ ماشہ ہے جو مثقال شرعی سے کم ہے۔

⑥ ٹیکسٹ بک آف کوانٹی ٹیٹیو ان آرگینک اینالیسس انکلوڈنگ ایلیمنٹری انسٹرومینٹل اینالیسس مصنفہ آرتھر آئی ووگل لندن ۱۹۶۱ء پر قیراط = ۲۰۰ملی گرام = ۰ر۲۵۹۲۰۰ گرام لکھا ہے یعنی ۲ر۱۳۲ رتی۔

⑦ بندہ نے ۱۰۰ جَو متوسط غیر متقشر دونوں جانب سے باریک لمبا تنکا کاٹ کر وزن کی جدید ترین برقی مشینوں کے ذریعہ متعدد بار وزن کرائے۔ کوہ نور بیٹری مینوفیکچر لمیٹڈ میں تین حضرات نے الگ الگ وزن کیا، پاکستان ریفائنری لمیٹڈ میں ایک صاحب نے ایکبار وزن کیا، فیول اینڈ لیدر ریسرچ سینٹر میں ایک صاحب نے تین بار وزن کیا، تینوں برقی مشینوں کا جواب آپس میں بہت معمولی سا متفاوت تھا جس کی وجہ یہ بتائی گئی کہ برقی مشین کی انتہائی باریک کارکردگی میں ہوا کی رطوبت کا معمولی اثر بھی ظاہر ہوتا ہے غرضیکہ اگرچہ ان مختلف مشینوں کے جواب آپس میں کوئی زیادہ مختلف نہ تھے مع ہذا مذکورہ بالا تینوں اداروں میں سے چونکہ فیول اینڈ لیدر ریسرچ سینٹر کا کام زیادہ اہم ہے اسلئے اس کی مشین کے وزن کو ترجیح دی گئی جو حسب ذیل ہے۔

۱۰۰ جَو = ۴ر۷۸۷۴ گرام = ۳۹ر۴۰۲۵ رتی = مثقال

۴ر۷۸۷۴ × ۷/۱۰ = ۳ر۳۵۱۲ گرام = ۲۷ر۵۸۱۷ رتی = درہم

۴ر۷۸۷۴ ÷ ۲۰ = ۰ر۲۳۹۴ گرام = ۱ر۹۷۰۴ رتی = قیراط

اب تک قیراط کے جو اوزان سامنے آئے وہ یہ ہیں:

①	فتاویٰ حمادیہ کی تحقیق کے مطابق	۱ر۸۰۰۰ رتی
②	متانہ کی تحسیدہ کے مطابق	۱ر۸۷۵۰ ”
③	ابراہیم بن عبداللہ حسانی کے مثقال کے مطابق	۱ر۹۲۵۰ ”
④	برقی مشین کے وزن کے مطابق	۱ر۹۷۰۴ ”
⑤	حضرت مفتی محمد شفیع صاحب کے وزن کے مطابق	۲ر۰۱۲۵ ”
⑥	انگریزی کتاب کے مطابق	۲ر۱۳۲۰ ”

بسط الباع ـــــ ۹

یہ اوزان آپس میں کچھ زیادہ متفاوت نہیں بلکہ مختلف زمانوں میں مختلف لوگوں کے وزن کرنے میں اتنا قلیل تفاوت ناگزیر ہے جبکہ اس دور ترقی کی جدید ترین برقی مشینیں چند معین بجو کا وزن بتانے میں آپس میں مختلف ہیں تو مختلف زمانوں میں مختلف قسم کے بجو کا ہاتھ کے ترازو سے وزن کرنے میں اتنا معمولی تفاوت ذرا بھی مستبعد نہیں بلکہ یہ تو حضرات فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ کی محنت، جانفشانی اور حقیقت رسی پر کھلی دلیل ہے۔

اگر مسئلہ صرف قیراط کے وزن کا ہوتا تو اتنا قلیل تفاوت قابل التفات نہ تھا مگر مشکل یہ ہے کہ یہی قلیل تفاوت اوپر کے اوزان درہم، مثقال، صاع اور نصاب زکوٰۃ وغیرہ تک پہنچتے پہنچتے زیادہ فرق کا باعث بن جاتا ہے اسلئے قیراط کے مندرجہ بالا اوزان میں سے بھی کسی ایک کو راجح قرار دینے کی ضرورت ہے۔ وزن سے متعلق اوپر کے چھ نمبروں میں سے پہلے دو نمبروں اور چھٹے نمبر میں قیراط کا وزن رتی سے کیا گیا ہے۔ پھر اس سے مثقال کے وزن کا حساب لگایا گیا ہے۔ اسمیں وہی قباحت ہے کہ قیراط کے وزن میں ادنیٰ سا تفاوت بھی مثقال کے وزن میں زیادہ تفاوت کا سبب بن جاتا ہے اور درمیان کے تین نمبروں میں براہ راست ایک مثقال کو وزن کیا گیا ہے جو اصل مقصود ہے۔ اس طریقہ کا زیادہ بہتر ہونا واضح ہے، اسلئے یہ تین نمبر راجح ٹھہرے۔ پھر انہیں سے نمبر ۳ اور نمبر ۵ میں ہاتھ کی ترازو سے کام لیا گیا ہے جس کا نقص اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ اس طرح وزن کرنے سے قیراط کے دو مختلف وزن نکلتے ہیں۔ اور نمبر ۴ میں ایک بہت اہم ادارے کی جدید ترین برقی مشین سے تین بار وزن کیا گیا ہے اسلئے یہ وزن سب سے زیادہ راجح ہونا چاہیئے۔ یہ امر قابل توجہ ہے کہ مذکورہ بالا سب اوزان میں سے حضرت مفتی محمد شفیع صاحب کا وزن برقی مشین کے وزن سے قریب تر ہے، مذکورہ اوزان میں سے نمبر ۱ اسلئے بھی مرجوح ہے کہ یہ فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ کا تحریر کردہ نہیں اور نہ ہی اسمیں یہ وضاحت ہے کہ یہ قیراط کس علاقہ کا ہے جبکہ مختلف علاقوں میں قیراط کے اوزان مختلف ہیں۔ اس کا حوالہ محض اس امر کی تائید کیلئے دیا گیا ہے کہ قیراط کا وزن تقریباً ۲ رتی ہے۔

وزارت صنعت حکومت پاکستان نے اعشاری اوزان سے متعلق اردو اور انگریزی میں پمفلٹ شائع کئے ہیں جن میں اعشاری قیراط = ۲۰۰ ملی گرام = ۱٫۳۱۷۲ رتی لکھا ہے اس سے کسی کو قیراط کے وزن میں غلط فہمی نہ ہو، اسلئے کہ یہ اعشاری قیراط کا وزن ہے جو اصل قیراط سے چھوٹا ہے۔ معہذا اعشاری قیراط کو ۱٫۳۱۷۲ رتی قرار دینا صحیح نہیں اس لئے کہ

ایک تولہ = ۱۱٫۶۶۴ گرام ہے تو اس حساب سے ۲۰۰ ملی گرام جو اعشاری قیراط کا وزن ہے = ۱٫۰۶۴۴ رتی ہوا۔ میں نے وزارت صنعت کو اس غلطی سے متعلق لکھا تو محکمہ اوزان و پیمائش وزارت صنعت حکومت پاکستان نے خط نمبر آئی این ڈی / ڈبلیو ایم ڈی ۔ ۲(۷) / ۷۳ مؤرخہ ۲۴ نومبر سنہ ۱۹۷۵ء میں بالفاظ ذیل اپنی غلطی کا اعتراف کیا۔

"دستخط کنندہ ذیل کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ آپ کی چٹھی مورخہ ۱۲/۱۰/۷۵ کے جواب میں درج ذیل گزارشات کرے، آپ کی جانب سے نشان شدہ غلطی (قیراط) بالکل ٹھیک ہے۔ ایک قیراط = ۱٫۰۶۴۲ رتی۔ آپ کے تعاون کا از حد شکریہ۔ آپ کا رتی خادم

خیر محمد ڈپٹی کنٹرولر

احتیاط

عبادات میں احتیاط پر عمل واجب ہے قال فی الشامیۃ عن المبسوط السرخسی ان الاخذ بالاحتیاط فی باب العبادات واجب (رد المحتار ص۲۳ ج ۲) لہذا زکوٰۃ صدقۃ الفطر اور قربانی کے نصاب میں کم سے کم وزن کا اعتبار کرنا لازم ہے اور وہ یہ ہے قیراط = ۱/۵ ۱ رتی، درہم = ۳ ماشہ ۱/۵ ۱ رتی، مثقال ۴ ۱/۲ ماشہ۔ اس حساب سے چاندی کا نصاب ۱/۲ ۵۲ تولہ اور سونے کا ۱/۲ ۷ تولہ ہوگا، البتہ صدقۃ الفطر ادا کرنے میں وہی وزن لینا چاہیے جسے اوپر ترجیح دی گئی ہے، اور اس بارے میں احتیاط بھی اسی میں ہے یعنی

آخری فیصلہ رسالہ کے آخر میں بعنوان "شرح صدر" تحریر ہے			
	قیراط	=	۱٫۰۹۷۰۳ رتی
	درہم	=	۲۷٫۵۸۴۷ ″
	مثقال	=	۳۹٫۴۰۲۵ ″

اور صاع = ۱۰۴۰ درہم ہے تو اس حساب سے صاع کا وزن ۳ سیر ۹ ۵۸۰ تولہ اور نصف صاع = ایک سیر ۳۴ ۲۹۰ تولہ اور مثقال کے ذریعہ حساب یوں ہوگا

صاع = ۱۶۰ استار اور استار = ۱/۲ ۴ مثقال، پس صاع = ۷۲۸ مثقال،

۳۹٫۴۰۲۵ رتی × ۷۲۸ = ۳ سیر ۹ ۵۸۰ تولہ

بذریعہ درہم اور بذریعہ مثقال کا ایک ہی جواب آیا۔

علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ درہم یا مثقال کے ذریعہ متعین کردہ وزن کے برابر جو لیے جائیں ان سے جو برتن بھر جائے اسے صاع قرار دیا جائے، مشائخ مکہ مکرمہ کا اسی

مطابق تعامل و فتویٰ نقل کیا ہے۔

حضرت تھانوی قدس سرہٗ نے الطرائف میں ایک مُد کی سند کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچنا اور اسے دو بار گیہوں سے بھر کر وزن کرنا اور اس وزن کا پونے دو سیر ۳ ماشہ ہونا بیان فرمایا ہے۔

اس پر چند اشکال ہیں:

(۱) اس کی سند کے رجال کی تحقیق نہیں، خصوصاً جبکہ معادیہ میں ابراہیم بن عبیداللہ شیر ملتانی کے صاع پر یوں اعتراض کیا ہے وھذا لا یصلح للاعتماد والتعویل علیہ لان احوال بعض علماء عصرنا لا تشبہ صاع عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فی زمن الحجاج وقد قرب ذلک الزمان من عہد النبی صلی اللہ علیہ وسلم فکیف یعتمد علی صاع اتی بہ فی ھذا العصر وقد تطاول الزمان وتغیر کثیر من المکاییل والصیعان (معادیہ ص ۲۳ ج ۱)

(۲) پیمانہ بھرنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ کناروں کے برابر بھرا جائے، اور دوسرا طریقہ جو عام مروج ہے یہ کہ کناروں سے اوپر تک جتنا بھی بھرا جا سکے۔ یہ معلوم نہیں کہ صاع کے بھرنے کا اصل طریقہ کیا تھا اور اس مُد کو کس طرح بھرا گیا۔

(۳) گیہوں مختلف وزن کے ہوتے ہیں، اسلئے ایک قسم کے گیہوں بھر کر وزن کر لینے سے کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا، ممکن ہے کہ دوسرے گیہوں اس سے زیادہ وزنی ہوں، اسکا صحیح طریقہ یہ تھا کہ یہ مُد ماش یا مسور سے پُر کیا جاتا، پھر انھیں وزن کیا جاتا اور اس وزن کے مطابق گیہوں کے وزن کا فیصلہ کیا جاتا کیونکہ گیہوں کی کوئی قسم بھی ماش و مسور سے زیادہ وزنی نہیں ہوتی، چونکہ ماش اور مسور زیادہ وزنی ہیں، گیہوں ان سے ہلکے اور جَو اس سے بھی ہلکے ہیں، اسلئے عبادت میں یہ احتیاط واجب ہے کہ وزن کے ذریعہ کیل متعین کرنا ہو تو جَو استعمال کئے جائیں اور کیل کے ذریعہ وزن متعین کرنا ہو تو ماش یا مسور استعمال کریں۔

قال ابن عابدین رحمہ اللہ تعالیٰ ذکر صدر الشریعۃ فی شرح الوقایۃ ان الاحوط تقدیر الصاع بثمانیۃ ارطال من الحنطۃ الجیدۃ لانہ اذا قدر بما اخف یکون اصغر واذا یسع ثمانیۃ ارطال من الحنطۃ لانہ اثقل منہا وھی اثقل من الشعیر فالکیل الذی یملأ ثمانیۃ ارطال من الماش یملأ باقل من ثمانیۃ من الحنطۃ الجیدۃ المکتنزۃ اھ قلت وھذا یقتضی عکس

المہدی بیقین علی روایۃ تقدیر الصاع بالکیل او الوزن فلذا کان احوط ولکن علی قول الاحوط تقدیرہ بالشعیر ولعل النقل بعض المحشین عن حاشیۃ الزیلعی للسید محمد امین میرغنی ان الذی علیہ مشایخنا بالحرم الشریف المکی ومن قبلہم من مشایخہم وبہ کانوا یفتون تقدیرہ بثمانیۃ ارطال من الشعیر ولعل ذلک لیحتاطوا فی الخروج عن الواجب بیقین لما فی مبسوط السرخسی من ان الاخذ بالاحتیاط فی باب العبادات واجب اھ فاذا قدر بالشعیر ثمانیۃ ارطال من العدس ومن الحنطۃ ویزید علیہا البتۃ بخلاف العکس فلذا کان تقدیر الصاع بالشعیر احوط اھ (رد المحتار ص ۳۳ ج ۲)

مندرجہ بالا قاعدہ کے مطابق بندہ نے نصف صاع کی تعیین کے لئے ایک سیر ۳۵ر ۲۹ تولہ جو وزن کرکے ایک برتن میں بھرے، پھر اس برتن میں گیہوں، ماش اور مسور بھر کر الگ الگ وزن کیا تو بالترتیب یہ اوزان آئے، ۲ سیر ۳۰ تولہ، ۲ سیر ۳۶ تولہ، ۲ سیر ۴۲ تولہ پھر اس برتن کا حجم معلوم کیا تو ۲٫۸۹۷ لٹر ہوا۔

تفصیل بالا سے ثابت ہوا اگر گیہوں کے ذریعہ صدقۃ الفطر ادا کرنا چاہیں تو یقینی طور پر بری الذمہ ہونے کے لئے ماش کے وزن ۲ سیر ۳۶ تولہ = ۲٫۲۸۵۹ کلوگرام کے برابر گیہوں دینا ضروری ہے۔

تفصیل مذکور کا نقشہ

قیراط	= ۰٫۲۳۹۴ گرام	= ۱٫۹۷۰۳ رتی		
درہم	= ۳٫۳۵۱۲ گرام	= ۲۷٫۵۸۱۷ رتی		
مثقال	= ۴٫۷۸۷۴ گرام	= ۳۹٫۳۰۳۵ رتی		
صاع جو	= ۳٫۴۸۵۴ کلوگرام	= ۳٫۷۳۶۱ سیر		
نصف صاع جو	= ۱٫۷۴۲۶ کلوگرام	= ۱٫۸۶۸۱ سیر	= ۲٫۸۹۷ لٹر	
نصف صاع گیہوں	= ۲٫۲۱۵۹ کلوگرام	= ۲٫۳۷۵۰ سیر	= "	"
نصف صاع ماش	= ۲٫۲۸۵۹ کلوگرام	= ۲٫۴۵۰۰ سیر	= "	"
نصف صاع مسور	= ۲٫۳۵۵۹ کلوگرام	= ۲٫۵۲۵۰ سیر	= "	"

آخری فیصلہ رسالہ کے آخر میں بعنوان تشریح صدقہ تحریر ہے

تنبیہ:

اگر آٹے کی قیمت گیہوں سے کم ہو جیسے کہ آجکل راشن کا آٹا تو آٹے کی بجائے وزن مذکور

برابر گیہوں سے صدقۃ الفطر ادا کرنا چاہئے یا اتنا آٹا دیا جائے جس کی قیمت گیہوں سے برابر ہو،

قال ابن عابدین رحمہ اللہ تعالیٰ (قولہ او دقیقہ او سویقہ) الاولیٰ ان یراعی فیہما القدر والقیمۃ احتیاطا وان نص علی الدقیق فی بعض الاخبار هدایۃ لان فی اسنادہ سلیمان بن ارقم وهو متروك الحدیث فوجب الاحتیاط بان یعطی نصف صاع دقیق بر او صاع دقیق شعیر یساویان نصف صاع بر وصاع شعیر لا اقل من نصف صاع یساوی نصف صاع بر او اقل من صاع یساوی صاع شعیر ولا نصف لا یساوی نصف صاع بر او صاع لا یساوی صاع شعیر فتح وقولہ فوجب الاحتیاط مخالف لتعبیر الهدایۃ والکافی بالاولیٰ الا ان یحمل الوجوب علی الاولیٰ تأمل (رد المحتار ص۸۳ ج ۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

رشید احمد

۲۳ ذی قعدہ ۱۳۸۵ھ یوم الجمعہ

تتمہ

تحقیق صاع سے متعلق بعض علماء سے گفتگو کے بعد بعض عبارات پر نظر ثانی کی ضرورت محسوس ہوئی جسکا نتیجہ درج ذیل ہے۔

قال فی شرح التنویر (وهو) ای الصاع المعتبر (ما یسع الفا واربعین درهما من ماش او عدس) انما قدر بهما لتساویهما کیلا ووزنا وقال فی الشامیۃ (قولہ انما قدر بهما) ای قدر الصاع بما یسع الوزن المذکور منهما ای من کل واحد من أی نوع منهما لان کل واحد منهما یتساوی کیلہ ووزنہ اذ لا تختلف افرادہ ثقلا وکبرا فاذا ملأت اناء من ماش وزنہ الف واربعون درهما ثم ملأتہ من ماش آخر یکون وزنہ مثل وزن الاول لعدم التفاوت بین ماش وماش آخر وکذا العدس بخلاف غیرهما کالبر مثلا فان بعض البر یکون اثقل من البعض فیختلف کیلہ ووزنہ فلذا قدر الصاع بالماش او العدس فیکون مکیالا محررا یکال بہ ما یراد اخراجہ من الاشیاء المنصوصۃ بلا اعتبار وزن لانک لو کلت بہ شعیرا مثلا ثم وزنتہ لم یبلغ وزنہ الفا واربعین درهما ولو اعتبر الوزن لکان ما یسع الفا واربعین درهما من الشعیر اکبر من الصاع الذی یسع هذا القدر من الماش او العدس وقد اعتبروا الصاع فیما قدر بہ فعلم انہ لا عبرۃ بالوزن اصلا فی غیرهما ویدل علی ذلك ایضا قول ابی حنیفۃ قال الطحاوی الصاع ثمانیۃ ارطال

بقیہ الباب ـــــ ۱۱

مما يستوي كيله ووزنه ومعناه ان العدس والماش يستوي كيله ووزنه حتى لو وزن من ذلك ثمانية ارطال ووضع في الصاع لا يزيد ولا ينقص وما سوى ذلك تارة يكون الوزن اكثر من الكيل كالشعير وتارة بالعكس كالملح فاذا كان المكيال يسع ثمانية ارطال من العدس والماش فهو الصاع الذي يكال به الشعير والتمر والحنطة اه‍ . وذكر نحوه في الفتح ثم قال وبهذا يرتفع الخلاف في تقدير الصاع كيلا او وزنا ومراده بالخلاف ما ذكره قبله حيث قال يعتبر نصف صاع من بر من حيث الوزن عند ابي حنيفة لانهم لما اختلفوا في ان الصاع ثمانية ارطال او خمسة وثلث كان اجماعا منهم انه يعتبر بالوزن وروى ابن رستم عن محمد انه انما يعتبر بالكيل حتى لو دفع اربعة ارطال لا يجزيه لجواز كون الحنطة ثقيلة لا تبلغ نصف صاع اه‍ وفي ارتفاع الخلاف بما ذكره تأمل فان المتبادر من اعتبار نصف الصاع بالوزن عند ابي حنيفة اعتبار وزن البر ونحوه مما يريد اخراجه لا اعتباره بالماش والعدس والظاهر ان اعتباره بهما مبني على رواية محمد وان الخلاف محقق وعن هذا ذكر صدر الشريعة في شرح الوقاية ان الاحوط ان يقدر الصاع بثمانية ارطال من الحنطة الجيدة الكثيرة اه‍ قلت وبهذا يخرج عن العهدة بيقين على روايتي تقدير الصاع كيلا او وزنا فلذا كان احوط لكن على هذا الاحوط تقديره بالشعير ولهذا نقل بعض المحشين عن حاشية الزيلعي للسيد محمد امين مير غني ان الذي عليه مشايخنا بالحرم الشريف المكي ومن قبلهم من مشايخهم وبه كانوا يفتون تقديره بثمانية ارطال من الشعير ولعل ذلك ليحتاطوا في الخروج عن الواجب بيقين لما في مبسوط السرخسي من ان الاخذ بالاحتياط في باب العبادات واجب اه‍ فاذا قدر بذلك فهو يسع ثمانية ارطال من العدس ومن الحنطة ويزيد عليها البتة بخلاف العكس فلذا كان تقدير الصاع بالشعير احوط اه‍ ولهذا اقول هذا هو الاحوط في زماننا اخرجه ربيع من شامي تام (رد المحتار ص ۸۲ ج ۲)

وقال الرافعي رحمه الله (قوله فان المتبادر الخ) هذا وان كان هو المتبادر الا انا نتركه بصريح عبارة الطحاوي من ان الصاع ثمانية ارطال مما يستوي كيله ووزنه فانه صريح باعتبار وزن ما يستوي كيله ووزنه في تعريف الصاع لا اعتبار وزن المخرج من البر ونحوه وهو الملائم بالمراد من نصوص المذهب وايضا كان صاع النبي صلى الله عليه وسلم

مکیالا معلوما لا زیادۃ ولا نقصان فیہ وامر علیہ السلام بان یخرج للفطرۃ المقادیر المعلومۃ
المقدرۃ بہ مع علمہ باختلاف الاوزان حتی فی کل نوع منہا فہل ادلیل علی ان العبرۃ
للکیل المخصوص بدون اعتبار الوزن وحینئذ یکون عبارۃ بما قلنا الاتفاق وما نقلہ عن
صدر الشریعۃ وحاشیۃ الزیلعی مبنی علی بقاء الخلاف لا علی الاتفاق بما قالہ فی الفتح
(التحریر المختار ص۱۴۳ ج۱)

عبارات مذکورہ بالا میں مندرجہ ذیل امور زیر بحث آئے ہیں۔

① تنویر اور ذخیرہ کی تحریر کے مطابق ماش یا مسور کے آٹھ رطل صاع کے لئے معیار ہیں یعنی آٹھ رطل ماش یا مسور سے جو برتن بھر جائے وہ صاع ہے مگر یہ دعوی وجوہ ذیل سے مخدوش ہے

(۱) صاحب ذخیرہ نے اس دعوی پر قول طحاوی الصاع ثمانیۃ ارطال مما یستوی کیلہ ووزنہ سے استدلال کیا ہے اور تنویر کے قول کی شارح نے یہ علت بیان کی ہے ای لتعادل بھما الکیل والوزن طحاوی اور شارح التنویر کی ان عبارات سے ثابت ہوا کہ ماش یا مسور کا ذکر اس پر مبنی نہیں کہ حضرات فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ نے کسی خاص قابل وثوق صاع کو ماش یا مسور سے بھر کر وزن کیا تو آٹھ رطل ہوا بلکہ مقصد یہ ہے کہ تقدیر صاع کے لئے ایسی اجناس کو استعمال کرنا چاہیئے جن کے افراد متفاوت نہ ہوں جیسے ماش یا مسور، چنانچہ عبارت طحاوی میں ماش اور مسور کے ساتھ زبیب اور حاشیہ پر زیت کا نسخہ بھی تحریر ہے، فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ کی اس مراد پر یہ امر بھی واضح دلیل ہے کہ خود ماش کا وزن بھی مسور کے برابر نہیں بلکہ اس سے کم ہے۔ کما حررناہ فی اصل المسألۃ، اسی طرح زبیب اور زیت کا وزن بھی ماش اور مسور سے متفاوت ہوگا۔

(۲) اگر کسی صاع مخصوص میں ماش یا مسور بھر کر انہیں وزن کیا گیا ہوتا تو اسے سب فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ بلا چون وچرا تسلیم کر لیتے اور اس سے اختلاف کی گنجائش نہ پاتے، صدر الشریعۃ تقدیر بالحنطۃ اور مشائخ حرم تقدیر بالشعیر کا فتوی نہ دیتے اور علامہ شامی رحمہ اللہ اسے اختیار نہ فرماتے۔

(۳) اگر یہ دعوی تسلیم بھی کر لیا جائے کہ کسی مستند صاع میں ماش یا مسور بھر کر وزن کیا گیا تھا تو بھی اسوقت یہ عمل صاع کی تعیین کے لئے کافی نہیں اسلئے کہ ماش اور مسور کی کئی قسمیں مختلف الوزن ہیں، پھر ان میں سے ہر ایک کی مختلف قسمیں ہیں۔ ماش تین قسم کے ہیں۔

سیاہ، سفید اور مونگ، مونگ کو بھی عربی میں ماش کہا جاتا ہے اور مسور کی دو قسمیں ہیں چھوٹے اور بڑے۔ پھر ہر قسم کے افراد آپس میں حجم اور وزن میں مختلف ہیں، من شاء فلیشاھد۔

(۲) قول ہدایۃ ثم یعتبر نصف صاع من بر من حیث الوزن فیما یروی عن ابی حنیفۃ" کا مطلب شامی رحمہ اللہ تعالیٰ یہ بیان فرماتے ہیں کہ گیہوں وزناً چار رطل ادا کر دینا کافی ہے اگرچہ یہ گیہوں کیلاً نصف صاع سے کم ہوں مگر ابن ہمام اور رافعی رحمہما اللہ تعالیٰ قول ہدایہ سے یہ مراد لیتے ہیں کہ اصل صاع کے ذریعہ کیل کی بجائے کیل کا یہ طریقہ بھی معتبر اور صحیح ہے کہ کسی متساوی الوزن والکیل چیز کے چار رطل سے جو برتن بھر جائے وہ گیہوں سے بھر کر دے دیا جائے، حضرت امام رحمہ اللہ تعالیٰ کے قول کی یہی توجیہ صحیح معلوم ہوتی ہے اسلئے کہ صاع کے بارے میں نص صریح کے مقابلہ میں بدون لحاظ کیل صرف وزن کو معتبر قرار دینا بہت بعید ہے۔ علاوہ ازیں ہدایہ میں "فیما یروی" الفاظ تمریض ہیں اور اسکے مقابلہ میں امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول روایۃً قوی ہونے کے علاوہ درایۃً بھی معقول ہے۔

(۳) اب یہ بحث رہ جاتی ہے کہ تقدیر صاع کے لئے آٹھ رطل کس چیز کے لئے جائیں؟ دلائل ذیل سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ وزن شعیر کا ہے۔

(۱) اس زمانے میں جو ہی کی خوراک پر زیادہ مدار تھا اس لئے لین دین بھی اسی کا زیادہ ہوتا ہوگا۔

(۲) نص میں شعیر یا تمر کا صاع وارد ہوا ہے اس سے ظاہر ہے کہ فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ نے انہی سے وزن کا اندازہ مقرر کیا ہوگا، اس تجربے سے بھی اسکی تائید ہوئی کہ بندہ نے ایک سیر ۲۹ تولہ جو کے مطابق نصف صاع کا جو برتن متعین کیا ہے اسے چھوہاروں سے بھر کر وزن کیا تو جو کے وزن سے بالکل برابر آیا۔

(۳) ہر زمانے میں فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ وزن اور مساحت کی ابتداء جو ہی سے کرتے چلے آئے ہیں۔

(۴) یہ طریقہ احوط ہے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

رشید احمد

۲۹ شعبان سنہ ۹۶ ھ لیلۃ الجمعہ

تتمۂ ثانیہ

بندہ کو معلوم ہوا کہ پیر و جیب اللہ شاہ صاحب پیر جھنڈو ضلع حیدرآباد کے پاس ایک مُد ہے جو ان کے دادا مولانا رشد اللہ شاہ صاحب مدینہ طیبہ سے لائے تھے۔ مولانا رشد اللہ شاہ صاحب اچھے عالم تھے وہ اسی مُد سے صدقۃ الفطر ادا کرتے تھے اور اس کے ساتھ کچھ نقد بھی دیتے تھے۔ میں نے یہ مُد منگوا کر دیکھا اس پر یہ عبارت لکھی ہوئی ہے۔

صنع هذا المد الشریف ابراهیم الغزنوی المدنی الحنفی علی مد الشیخ احمد بن الشیخ عبد القادر الطاهر المدنی الشافعی وهو صنعه علی مد مولانا احمد بن مولانا علی الترمذی المالکی وهو صنعه علی مد امیر المؤمنین راجیا به البرکۃ فی بیته والمتابعۃ للنبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کان طعامه به وکان یتوضأ بمقدار مدہ فی بعض ازمانه ونطهر بها ؟ وهو ربع الصاع وبه تخرج صدقۃ الفطر عن کل راس مدان من بر او دقیقه او سویقه او زبیب او اربعۃ امداد من تمر او شعیر وکان ذلک ثلاث عشرۃ وثلاث مائۃ والف۔

میں نے اسے گیہوں، ماش اور مسور سے بھر کر وزن کیا تو حسب ذیل نتائج نکلے۔

	بلا تکویم		بالتکویم
حنطہ	۵۰ تولہ	——	۵۵ تولہ
ماش اسود	۵۲½ ″	——	۵۶½ ″
عدس	۵۳½ ″	——	۵۵½ ″

اس برتن کی تدویر کی بنسبت اس کا عمق کافی زیادہ ہے نیز نیچے سے کشادہ اور اوپر سے تنگ شبیہ بالمخروط۔ اس لئے اس کی تکویم اور غیر تکویم دونوں صورتوں کے وزن میں کوئی خاص فرق نہیں۔ بہرکیف وزن مذکور تمام محققین علماء کے متعین کردہ وزن سے بہت کم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا صاع تو حجاج ہی کے زمانے میں مشتبہ ہو گیا تھا چنانچہ ہم ابراہیم بن عبد اللہ ختلانی کے صاع پر حمادیہ کا یہی اعتراض اوپر نقل کر چکے ہیں۔ اگر صاع عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں اشتباہ واقع نہ ہوتا تو اس کی تعیین میں ائمہ مجتہدین کا اختلاف نہ ہوتا۔ صاع بالاتفاق چار مُد کا ہے مگر مُد کے وزن میں اختلاف ہے۔ امام صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں دو رطل اور دوسرے ائمہ کے نزدیک ۱⅓ رطل ہے۔ مُد مذکور کے صانع اوّل مالکی ہیں اور اس کے بعد شافعی۔ اس سے ظاہر ہے کہ انھوں نے اپنے مذہب کے مطابق ۱⅓ رطل کا مُد بنایا ہوگا۔ مولانا

رشد اللہ شاہ صاحب کا صدقۃ الفطر میں کچھ نقد بھی دینا اسکی دلیل ہے کہ یہ حضرت بھی اس حقیقت سے واقف تھے کہ یہ مُد حنفی نہیں۔ بندہ نے نصف صاع حنفی میں گیہوں کے وزن کی تقدیر دو سیر تین تولہ کی ہے کما مر۔ اس حساب سے مُد شافعی کے گیہوں ۴۲ ۱/۴ تولہ ہونے چاہئیں مگر مُد مذکور کا وزن بالکلوگرام بھی اس سے ۸ ۱/۴ تولہ کم ہے۔ اگرچہ یہ بھی احتمال ہے کہ بندہ نے نصف صاع میں جو گیہوں بھر کر وزن کئے تھے وہ ان گیہوں سے زیادہ وزنی ہوں جو مُد میں بھرے گئے مگر گیہوں کے مختلف اقسام میں اتنا تفاوت بعید معلوم ہوتا ہے۔ پس اس تفاوت کی صحیح وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس مُد کے صانع نے ۱ ۱/۳ رطل وزن جَو کی بجائے گیہوں کا لیا ہے۔ بندہ نے نصف صاع حنفی کے جَو کا وزن ایک سیر ۱۹ ۱/۴ تولہ لکھا ہے اس حساب سے مُد شافعی کے جَو کا وزن ۳۴ ۳/۴ تولہ ہوا، جو مُد مذکور کے وزن حنطہ بالکلوگرام کے برابر ہے لہٰذا اس مُد سے بھی بندہ کے حساب کی تائید ہوتی ہے، یہ عجیب بات ہے کہ انہوں نے شامی رحمہ اللہ کی تحریر کے مطابق یہ وزن جَو کا لینے کی احتیاط نہیں کی۔

بارہویں صدی ہجری کے مشہور فقیہ حضرت مولانا مخدوم محمد ہاشم صاحب ٹھٹھوی رحمہ اللہ تعالیٰ کا فضل و کمال کسی اہل علم سے مخفی نہیں۔ بندہ نے سب سے پہلے مسبوق خلف المسافر سے متعلق موصوف کا فتویٰ دیکھا تو آپ کی قوت استدلال، عمق نظر اور اختصار کے ساتھ فیصلہ کن اور تشفی بخش جواب نے مجھے بہت متاثر کیا، اسکے بعد سے میری ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ ہر الجھے ہوئے مسئلہ میں علامہ موصوف کی تحقیق معلوم کی جائے، چنانچہ مسئلہ زیر بحث میں بھی میں نے اس کی کوشش کی جو بحمد اللہ تعالیٰ بارآور ہوئی، مولوی محمد صدیق صاحب (فقیر منتظار) مہتمم مدرسہ محمدیہ نز ٹنڈو آدم کے ذریعہ سید داراکی اور ڈیرو لعل ضلع حیدر آباد سے بیاض ہاشمی کا قلمی نسخہ حاصل کیا گیا، اس کتاب کے آخر میں یہ عبارت تحریر ہے۔

"این کتاب نوشتہ است حافظ اسحاق پالکنڈی نو"

کتابت کی تاریخ تحریر نہیں۔

اس کتاب میں حضرت مخدوم رحمہ اللہ تعالیٰ کا مسئلہ زیر بحث سے متعلق ایک مستقل رسالہ "نتیجۃ الفکر فی تحقیق صدقۃ الفطر" ہے۔ چونکہ اس رسالہ سے قبل اور بعد کے چند اوراق میں بھی مفید مباحث ہیں اس لئے بیاض ہاشمی کے ۱۲ صفحات کا عکس دیا جاتا ہے اسکے بعد مقصد سے متعلق ان مضامین کا خلاصہ لکھا جائیگا انشاء اللہ تعالیٰ۔

فصل في ذكر الذهب والفضة

یکی درہم شرعی بحساب مولنا عبید اللہ صاحب

مکوک بالنص و نصفه یعنی کان ... دوم از رطل ... ارطال ...
رطل ... ارطال ...
...
چهار هشت جزء درم ...

خلاصہ تحریرات ہاشمیہ مع نتائج

(۱) مدینہ طیبہ میں وہاں کے سو جو متوسط کو وزن کیا تو ۴½ ماشہ ہوا۔ اسی حساب سے نصاب فضہ ۵۶ تولہ اور نصاب ذہب ۸ تولہ ہوا (ص۱)

ٹھٹھہ میں رائج مثقال = ۵ ماشہ سے سو جو کا وزن کیا تو بالکل برابر آیا (ص۶)

نتیجہ

مثقال کے مذکورہ بالا دونوں وزنوں میں سے دوسرا وزن یعنی ۵ ماشہ راجح ہے اس لئے کہ یہ سرکاری مثقال کا وزن ہے۔ سو جو کو خود وزن کرنے میں معمولی کسر کا تفاوت ظاہر نہ ہونے اور جو کے چھوٹے بڑے ہونے کا احتمال ہے، اسی لئے خود حضرت مخدوم رحمہ اللہ تعالیٰ نے بھی اسی پر اعتماد کیا ہے اور اپنی تحریروں میں بار بار اسی کا ذکر کیا ہے اور رسالہ نتیجۃ الفکر میں بھی اسی کو اختیار فرمایا ہے، ملاحظہ ہو ص۱، ص۲، ص۶۔ اسی بنا پر ایک تولہ = ۲⅖ مثقال قرار دیا ہے (ص۸)

(۲) حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں ایک درہم = ۱۴ قیراط بھی رائج تھا (ص۹)

ٹھٹھہ میں جس سکہ درہم پر درہم شرعی لکھا ہوا ہے اور عام لوگ بھی اسے درہم شرعی کہتے ہیں وہ وزن سبعہ کے خلاف ہے اس لئے کہ جب مثقال = ۵ ماشہ ہے تو ضروری ہوا کہ ۳ درہم کا وزن ۱۰ ماشہ ہو، حالانکہ ان دراہم میں سے ۳ کا وزن ۱۲ ماشہ سے بھی کچھ کم ہے (ص۶)

خواجہ بہاؤالدین ملتانی مکہ مکرمہ سے درہم شرعی لائے جس کا وزن ۳ ماشہ ۴ جو تھا (ص۲)

حرمین شریفین میں رائج درہم = ۶۴ جو ہے (ص۱۱)

عہد صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں دراہم مختلف وزن کے تھے، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے وزن سبعہ کا درہم متعین فرمایا (ص۱۲)

نتیجہ

جن حضرات نے درہم کا وزن ۳ ماشہ یا اسکے قریب بتایا ہے انکو امور ذیل سے مغالطہ ہوا

(۱) حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں ایک درہم = ۱۴ قیراط بھی رائج تھا = ۳ ماشہ

(۲) ٹھٹھہ میں رائج درہم پر درہم شرعی لکھا ہوا تھا لوگ بھی اسے درہم شرعی کہتے تھے، اسکا وزن ۳ ماشہ سے کچھ زیادہ تھا۔ شیخ محمد قاسم سندھی نے بھی اپنی کتاب المصباح المنیر میں اسکا ذکر کیا ہے جسے حضرت مفتی محمد شفیع صاحب نے بھی نقل فرمایا ہے۔

(۳) ساتویں صدی ہجری میں خواجہ بہاؤالدین ملتانی مکہ مکرمہ سے جو شرعی درہم لائے

جو = ۳ ماشہ ۲ رتی تھا،

(۴) بارہویں صدی ہجری میں حرمین شریفین میں جو درہم رائج تھا اسکا وزن ۶۴ جو تھا = ۳ ماشہ ۱۲/۲۱ ۱ رتی

اس سے ثابت ہوا کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے ہی سے ایک درہم ایسا بھی چلا آیا ہے جسکا وزن تین ماشہ یا اس سے قدرے زیادہ تھا جو اختلاط و اشتباہ کا باعث بنا۔

حضرت مخدوم رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ درہم اس لئے شرعی درہم نہیں کہ یہ وزن سبعہ کے خلاف ہے، وزن سبعہ کے مسلّم قانون کے مطابق درہم شرعی کا صحیح وزن ۳/۵ ۳ ماشہ ہے جو موصوف نے جا بجا اسکا ذکر فرمایا ہے۔ ملاحظہ ہو ص۲

ص۳ پر بھی ایک تولہ = ۳/۴ ۳ درہم تحریر فرمایا ہے، یعنی ایک درہم = ۱/۵ ۳ ماشہ

(۳) مذکور تحقیق درہم نقرہ سے متعلق ہے، درہم سنگ اس سے مختلف ہے جس کا وزن ۴ ماشہ ہے (ص۵ و ص۸) یہ نکتہ ملحوظ رکھنے سے درہم کی تعریف میں اشتباہ و اختلاط سے حفاظت رہے گی۔

(۴) ص۱ پر مثقال = ۴/۵ ۴ ماشہ کی بنا پر نصاب فضہ ۵۶ تولہ اور نصاب ذہب ۸ تولہ تحریر فرمایا ہے مگر اسکے بعد اسی صفحہ پر اور ص۲ پر بھی مثقال = ۵ ماشہ کی بناء پر نصاب فضہ ۵۸ تولہ اور نصاب ذہب ۱/۲ ۸ تولہ قرار دیا ہے۔

(۵) مثقال = ۵ ماشہ اور درہم = ۱/۲ ۳ ماشہ کی بنا پر نصف صاع = ۳/۴ ۱۰۱ تولہ قرار دیا ہے، ملاحظہ ہو ص۲، ص۸، ص۹، علاوہ ازیں ص۹ پر مدینہ منورہ سے ایک مُد لانے کا ذکر فرمایا ہے اور اسکے ذریعہ نصف صاع کا وزن ۱۰۳ تولہ تحریر فرمایا ہے البتہ ایک دوسرے مُد کا بھی تذکرہ کیا ہے جس کے ذریعہ نصف صاع کا وزن اس سے بھی تقریباً ۱۰ تولہ زیادہ بنتا ہے

غرضیکہ حضرت مخدوم رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں نصف صاع کا کم از کم وزن ۳/۴ ۱۰۱ تولہ ہے۔

(۶) رسالہ نتیجۃ الفکر (ص۷ تا ص۹) میں علماء ہند سے وجہ اختلاف کو بہت تفصیل سے بیان فرما کر آخر میں اُمت پر توسیع کے جذبہ کے تحت فرماتے ہیں۔

"و شک نیست کہ حساب علماء ہند اسہل واوسع است و حساب مخدوم مذکور از علماء سند اوسط و حساب فقیر احوط است حاصل ہر ہر چہ توفیق یابد عمل نماید واللہ تعالیٰ ہو الموفق (ص۹)" رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ، آمین

بجائے حساب تناسب کے کام لیا گیا تو گیہوں ۲ سیر ۸۱۶ر۲۲ر۳ تولہ اور ماش ۲ سیر ۴۰۹ر۳۸ر۳ تولہ ہوئے،

نصف صاع جو = ۸۹۵۸ر۱ سیر = ۷۶۹ر۱ کلوگرام = ۹۴ر۳ لب

" گیہوں = ۴۱۰۲ر۲ سیر = ۴۴۹ر۲ " " "

" ماش = ۴۸۹۳ر۲ سیر = ۳۲۰ر۲ " " "

پس صدقۃ الفطر میں ماش کے وزن ۳۲ر۲ کلوگرام کے برابر گیہوں دینے چاہئیں

بندہ نے حساب مذکور کے مطابق تشلیل کے وزن پر
نصف صاع جو = ۷۶۹ر۱ کلوگرام = ۹۴ر۳ لب کندہ کرا کے
محفوظ رکھنے کی وصیت کردی ہے۔ واللہ الحفیظ،

تنبیہ

① اوپر جو کسور اور اعشاریہ تک کا حساب لگایا اور لکھا گیا ہے اس سے یہ مقصد نہیں کہ عملاً انکی رعایت ایسی لازم ہے کہ اس سے ذرا بھی کمی بیشی کی گنجائش نہیں اور ادائیگی صحیح نہیں بلکہ تصحیح علم و حفظ حسد ود کے پیش نظر کسور و اعشاریہ تک کا حساب لکھا گیا ہے ورنہ حذف کسور کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ چیز کی حقیقت ہی مستور ہو جاتی ہے اور ایسے محذوف الکسور افراد کا مجموعہ حقیقی حاصل جمع سے بہت متفاوت ہو جاتا ہے۔

② اگر صدقۃ الفطر میں گیہوں یا گیہوں کا آٹا دیا جائے تو وزن ماش کے مطابق ۳۲ر۲ کلوگرام دینا لازم ہے، البتہ اگر قیمت دینا چاہے تو ۲۵ر۲ کلوگرام گیہوں کی قیمت دینے کی بھی گنجائش ہے، مگر ۳۲ر۲ کلوگرام کی قیمت ادا کرنا افضل ہے، فقط واللہ تعالیٰ اعلم،

رشید احمد

۱۲ ذی قعدہ سنہ ۹۶ھ یوم الجمعہ

(دوسرے سوال متعلق مسافت سفر کا جواب بنام "القول الاظہر فی تحقیق مسافۃ السفر" باب صلوۃ المسافر میں درج کیا گیا ہے - مرتب)

کتاب الصوم

رؤیت ہلال میں ریڈیو وغیرہ کی خبر کی تحقیق:[۱]

سوال: چہ می فرمایند علماءِ عظام و فقہاءِ کرام دریں صورت کہ ہلال عید الفطر بتاریخ ۲۹ رمضان شریف از باعث ابر و غبار دریں دیار در نظر هیچ بنی بشر نیامد، بعد ازاں در تار برقی از کراچی پشاور وغیرہ جوانب دریافت نمودہ شد، از ایشاں در جواب تار واضح کرد کہ بتاریخ ۲۹ ماہ رمضان ہلال ماہ شوال دیدہ عید می کنیم، چنانچہ در ریڈیو از کراچی وغیرہ اطراف خبرہا آمد کہ ہلال مذکور دیدہ شد، باستماع خبرہائے مندرجہ صدر مولوی صاحب در شہر خود فتوائی عید کردن داد، جمہور مردماں افطار نمودہ عید کردند لیکن مولانا بکر صاحب مذکور اعتراض فرمودہ کہ در شرع محمدی اعتبار و عمل بر تار و ریڈیو اصلاً جائز نیست حتی کہ مولوی محمود مع جماعت بتاریخ ۳۰ روزۂ رمضان شریف بحال داشتہ عید نہ کردہ، لہٰذا عرض براہ مہربانی بدلائل حدیث و فقہ شریف فتویٰ فرمایند کہ آیا فعل زید صحیح ست یا بکر؟ بینوا بالبرهان توجروا عند الرحمٰن۔

الجواب ومنه الصدق والصواب

اولاً معلوم ہونا چاہئے کہ شہادت اور خبر دو جدا امور ہیں، شہادت میں غیر پر الزام اور خبر میں صرف اپنے نفس کے لئے کسی واقعہ کا یقین حاصل ہوتا ہے، شہادت میں شاہد کا قاضی کے پاس مجلس قضاء میں حاضر ہونا اور اشہد کا لفظ کہنا اور عدم عدالت وغیرها من شرائط المبسوطة فی کتب الفقہ ضروری ہیں، قال الزیلعی ولو سمع من وراء الحجاب لا یسعه ان یشهد لاحتمال ان یکون غیره اذا النغمة تشبه النغمة (تبیین ج ۴ ص ۲۱۳) قلت هٰذا وان کان فی تحمل الشهادة ولکن اعتبارها فی اداء الشهادة اظهر واولیٰ، شہادت کی شرائط سے معلوم ہوا کہ ٹیلیگرام، ٹیلیفون، ریڈیو، وائرلیس وغیرہ آلات جدیدہ کے ذریعہ شہادت ادا نہیں ہو سکتی اس لئے کہ شہادت میں روبرو حاکم کے پاس مجلس حکم میں حاضر ہونا ضروری ہے،

[۱] یہ مسئلہ کی اہمیت و عدم ضرورت کے پیش نظر فارسی سے اردو کیا گیا ۔

موجودہ حکومتوں کے قانون میں بھی قبولِ شہادت کے لئے مجلسِ حکم میں حاضر ہو کر روبرو شہادت دینا
ضروری ہے، کوئی کتنی بڑی سے بڑا افسر یا وزیر ہی کیوں نہ ہو اسے بھی شہادت کے لئے ضرور
جج کی عدالت ہی میں جانا پڑے گا، خط یا ٹیلیفون کے ذریعہ شہادت قبول نہیں کی جاتی، قانوناً
عدالت میں حاضری ضروری ہے۔

خبر کی دو قسم ہیں:

(۱) معاملاتِ دنیویہ کی خبر۔

(۲) معاملاتِ دینیہ کی خبر۔

معاملاتِ دنیویہ: مثلاً بیع و شراء، کفالہ، حوالہ، وکالہ وغیرہ میں خبر واحد بھی معتبر ہے،
خواہ مخبر عادل ہو یا فاسق، مسلم ہو یا کافر، بشرطیکہ سامع کو مخبر کے صدق پر اطمینان ہو جائے،
کما فی الفصل الثانی من کتاب الکراھیۃ من الھندیۃ یقبل قول الواحد فی المعاملات
عدلاً کان او فاسقاً حراً کان او عبداً ذکراً کان او انثی مسلماً کان او کافراً دفعاً للحرج و
تفسیرہ: ومن المعاملات الوکالات والمضاربات والرسالات فی الھدایا والاذن
فی التجارات کذا فی الکافی ولو صح قول الواحد فی باب المعاملات عدلاً کان او غیرہ لٰکن
فلابد فی ذلک من تحکیم رأیہ فیہ ان خبرہ صادق فان غلب علی رأیہ فلہ ان یعمل
علیہ والا لا کذا فی السراج الوہاج (عالمگیریۃ ج ۵ ص ۳۴۴)

اس قسم میں چونکہ مدار عدالت اور حضور فی مجلس القضاء ضروری نہیں، لہٰذا خط، ریڈیو،
تار وغیرہ کی خبر کا اعتبار کیا جائے گا، بشرطیکہ اس کے صدق پر قلب مطمئن ہو جائے۔

معاملاتِ دینیہ: مثلاً کپڑے یا پانی کی نجاست و طہارت، یا نکاح و طلاق یا حلت و
حرمت وغیرہ کی خبر میں مسلم اور عادل ہونا شرط ہے، کافر یا فاسق کی خبر پر عمل کرنا جائز نہیں، ایک
مسلم عادل کافی ہے، خواہ مرد ہو یا عورت، مخبر خواہ مجلس میں روبرو ہو یا غائب، مثلاً خط، ٹیلیفون،
ریڈیو وغیرہ میں، مگر غائب ہونے کی حالت میں یہ شرط ہے کہ سامع آواز سے خوب اچھی طرح یقین کرلے
کہ یہ مخبر فلاں شخص ہے اور وہ مسلم عادل ہی ہے اور خط میں شرط ہے کہ طرزِ تحریر سے شناخت ہو جائے
کہ فلاں شخص کا خط ہے، اور خط لکھنے والا مسلم عادل ہو، غرضیکہ اس قسم میں بھی حضور فی المجلس شرط
نہیں، لہٰذا غائب کی خبر خط یا ریڈیو وغیرہ کے ذریعہ مقبول ہے، مگر چونکہ اس میں اسلام اور
عدالت شرط ہے، لہٰذا ضروری ہے کہ خط میں تحریر اور ریڈیو وغیرہ میں آواز کی شناخت ہو تاکہ

مسلم یا غیر مسلم اور عادل یا غیر عادل کا علم ہو سکے، ٹیلیگرام کا اس قسم میں اعتبار نہیں، اس لئے کہ اس میں آواز کا امتیاز نہیں ہوتا، امتیاز تحریر کی صورت میں اعتبار خط کے لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا عمل متواتر حجت کافیہ ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجاز، عراق، روم، شام وغیرہ کے ملوک کی طرف خطوط روانہ فرمائے، اور عمرو ابن حزم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لئے بعض احکام شرعیہ لکھوائے، خلفاء راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے کئی احکام مختلف بلاد کی طرف بذریعہ خط روانہ فرمائے اور وہاں کے حکام اور قضاۃ نے ان مکتوب احکام پر عمل کرنا ضروری سمجھا، مگر یہ سب اس شرط سے تھا کہ مکتوب الیہ کو تحریر سے کاتب کا یقینی علم ہو جائے، خط سے متعلق حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ تعالیٰ تحریر فرماتے ہیں:

قال فی العیون والفتوی علی قولہما اذا تیقن انہ خطہ سواء کان فی القضاء او الروایة او الشہادة علی الصک وان لم یکن الصک فی ید الشاهد لان الغلط نادر واثر التغییر یمکن الاطلاع علیہ وقلما یشتبہ الخط من کل وجہ فاذا تیقن جاز الاعتماد علیہ توسعة علی الناس اھ (حموی زاد المختار ج ۴ ص ۲۹۰)

وتفصیل حکم کتاب القاضی الی القاضی بمالہ وعلیہ مصرح فی العلائیة مع الشامیة ج ۴ ص ۴۸۶)

تفصیل مذکور سے معلوم ہوا کہ خط کی خبر دینی امور میں دو شرطوں سے قبول ہوگی:

① مکتوب الیہ کاتب کے خط کو اچھی طرح پہچانتا ہو۔

② کاتب مسلم اور عادل ہو۔

ریڈیو اور ٹیلیفون کو بھی خط پر قیاس کیا جاتا ہے، جیسے خط میں مخبر غائب ہے، مگر امتیاز تحریر کے واسطے سے ممتاز ہو سکتا ہے، ایسے ہی ریڈیو اور ٹیلیفون میں بھی غائب ہونے کے باوجود آواز سے امتیاز کیا جا سکتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ دینی معاملات میں خط، ریڈیو اور ٹیلیفون کی خبر کا اعتبار اس شرط سے جائز ہے کہ تحریر اور آواز کے امتیاز سے یقین ہو جائے کہ مخبر فلاں شخص ہے، اور یہ مسلم و عادل ہے، اس قسم میں ٹیلیگرام کی خبر عدم امتیاز صوت کی وجہ سے غیر معتبر ہے، کیونکہ عدم امتیاز کی حالت میں مخبر کے اسلام اور عدالت کا علم نہیں ہو سکتا، البتہ اگر خط، ریڈیو، ٹیلیگرام، ٹیلیفون وغیرہ کسی خاص ایسے ضابطہ اور قانون کے تحت ہوں کہ سوائے کسی معتبر اور عادل شخص کی اجازت کے

اُن کے ذریعہ کوئی شخص کوئی خبر دے سکتا ہو تو اس حالت میں خط، ریڈیو اور ٹیلیفون کی خبر بہر کیف مقبول ہو، خواہ تحریر اور آواز کا امتیاز ہو سکے یا نہ ہو سکے، اسی طرح اس حالت میں ٹیلیگرام کی خبر بھی معتبر ہو، ٹیلیگرام دلالت غیر لفظیہ وضعیہ غیر ممیزہ ہونے میں توپ اور طبل سے مشابہت رکھتا ہے، اور طبل و توپ سے متعلق فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ کی تصریح ہے، يستعمر بقول عدل وكذا بضرب الطبول وبعد [illegible] يدل على أن المدفع في زماننا يفيد غلبة الظن وإن كان ضاربه فاسقا لأن العادة أن الموقت يذهب إلى دار الحكم آخر النهار فيعين له وقت ضربه ويعينه أيضا للوزير وغيره وإذا ضرب يكون ذلك بمراقبة الوزير وأعوانه للوقت المعين فيغلب على الظن بهذه القرائن عدم الخطأ وعدم قصد الإفساد (رد المحتار ج ۲ مطلب في جواز الإفطار بالتحري) وأيضا قال في بحث رؤية الهلال: قلت والظاهر أنه يلزم أهل القرى الصوم بسماع المدافع أو رؤية القناديل من المصر لأنه علامة ظاهرة تفيد غلبة الظن وغلبة الظن حجة موجبة للعمل كما صرحوا به الخ (رد المحتار ج ۲)

خلاصۃ الکلام:

① شہادت میں خط، ٹیلیگرام، ٹیلیفون وغیرہ کا قطعاً کوئی اعتبار نہیں۔

② معاملات دنیویہ میں بشرط اطمینان قلب ان کی خبر معتبر ہے۔

③ معاملات دینیہ میں اگر تحریر یا آواز کا امتیاز ہو اور مخبر مسلم ہو تو خط، ریڈیو اور ٹیلیفون کی خبر معتبر ہے، ٹیلیگرام کی خبر معتبر نہیں، اس لئے کہ اس میں امتیاز صورۃً نہیں ہو سکتا۔

④ اگر ریڈیو، ٹیلیگرام، ٹیلیفون وغیرہ خاص معتبر مسلم ادارہ یا شخص کے ضابطے کے تحت ہوں کہ بدون اس کی اجازت کے کوئی بھی خبر نشر نہ ہو سکے تو اس صورت میں ریڈیو، ٹیلیفون وغیرہ کی خبر دینی معاملات میں بہر صورت (آواز ممتاز ہو یا نہ ہو) معتبر ہے، نیز اس صورت میں ٹیلیگرام کی خبر بھی معتبر ہے۔

تمہید مذکور کے بعد یہ معلوم کرنا ہے کہ ثبوت ہلال کس قسم میں داخل ہے، سو واضح ہو کہ بحالت غیم ثبوت ہلال عیدین کے لئے شرعی شہادت (دو معتبر مرد یا ایک مرد دو عورتیں) ضروری ہے، اور ثبوت ہلال رمضان کے لئے شہادت کی ضرورت نہیں، مجرد خبر عادل کافی ہے، قال العلامة ابن عابدين رحمه الله تعالى في رسالته تنبيه الغافل والوسنان على

احکام ہلال رمضان فی مجموعۃ الرسائل ج ۱ ص ۲۲۳ نقل علمائنا الحنفیۃ فی
کتبہم ویثبت رمضان برؤیۃ ہلالہ وباکمال عدۃ شعبان ثم ان کان فی السماء
علۃ من نحو غیم او غبار قبل لہلال رمضان خبر واحد عدل فی ظاہر الروایۃ او مستور
علی قول مصحح لا ظاہر الفسق اتفاقا سواء جاء ذلک المخبر من المصر او من خارجہ
ولو کانت شہادتہ علی شہادۃ مثلہ او کان انثی او محدودا فی القذف تائبا فی
ظاہر الروایۃ لانہ خبر دینی فاشبہ روایۃ الاخبار ولہذا لا یشترط لفظ الشہادۃ
ولا الدعوی ولا الحکم ولا مجلس القضاء وشرط لہلال الفطر مع علۃ فی السماء
شروط الشہادۃ لانہ تعلق بہ نفع العباد وہو الفطر فاشبہ سائر حقوقہم فاشترط
لہ ما اشترط لہا من العدد والعدالۃ والحریۃ وعدم الحد فی القذف وان تاب
ولفظ الشہادۃ والدعوی علی خلاف فیہ الا اذا کانوا فی بلدۃ لا حاکم فیہا فانہم
یصومون فیہ بقول ثقۃ ویفطرون بقول عدلین للضرورۃ وہلال الاضحی وغیرہ
کالفطر۔ سو معلوم ہوا کہ ہلال عیدین کے ثبوت کے لئے ٹیلیگرام، ٹیلیفون اور خط وریڈیو وغیرہ
کی خبر کا اعتبار نہیں، اگر بذریعہ ریڈیو وغیرہ کسی مستند عالم یا مفتی یا شرعاً معتبر ہلال کمیٹی وغیرہ
کی خبر متعلق فیصلہ ثبوت ہلال عیدین بطریق شہادت شرعیہ نشر کی گئی تو یہ خبر فیصلہ کرنے والے
کی حدود ولایت تک معتبر ہے، حدود ولایت سے خارج معتبر نہیں اس لئے کہ ہلال عید کے ثبوت
کے لئے شہادۃ علی الرؤیۃ یا شہادۃ علی الشہادۃ یا شہادۃ علی قضاء الحاکم الشرعی
اور اس کی عدم موجودگی میں کسی مفتی کے فیصلہ پر شہادت ضروری ہے، اور ریڈیو وغیرہ سے کسی قسم
کی شہادت بھی معتبر نہیں، کما مر مفصلا، شہادت کی اقسام ثلاثہ عبارات ذیل سے ثابت ہیں:

قال فی العلائیۃ شہدوا انہ شہد عند قاضی مصر کذا شاہدان برؤیۃ
الہلال فی لیلۃ کذا، وقضی القاضی بہ ووجد استجماع شرائط الدعوی قضی
ای جاز لہذا القاضی ان یحکم بشہادتہما لان قضاء القاضی حجۃ وقد شہدوا
بہ لا لو شہدوا برؤیۃ غیرہم لانہ حکایۃ، وفی الشامیۃ (قولہ ای جاز) اشار
الی ان المراد بالجواز الصحۃ فلا ینافی الوجوب تأمل۔ (قولہ لانہ حکایۃ) فانہم
لم یشہدوا بالرؤیۃ ولا علی شہادۃ غیرہم وانما حکوا رؤیۃ غیرہم کذا فی فتح القدیر
قلت ولکن لو شہدوا برؤیۃ غیرہم وان قاضی تلک المصر امر الناس بصوم رمضان

لانه حکایة لقضاء القاضی ایضا ولیس بحجة بخلاف قضائه ولهذا قید بقوله ووجه استجماع شرائط الدعوی کما قدمناه فتأمل۔ (رد المحتار ج ۲)

اور ہلال رمضان میں خط، ریڈیو، ٹیلیفون کی خبر اس شرط سے قبول ہوگی کہ تحریر یا آواز کا کاتب متمیز ہو سکے، اور مخبر مسلم عادل ہو، نیز یہ بھی ضروری ہے کہ مخبر اپنی رؤیت کی خبر دے، مبہم خبر مثلاً یہ کہ چاند دیکھا گیا ہے یا ہو گیا ہے وغیرہ کا کوئی اعتبار نہیں، اور ٹیلیگرام کی خبر کسی حال میں بھی معتبر نہیں۔ البتہ اگر ٹیلیگرام یا ٹیلیفون اور ریڈیو و خط وغیرہ کسی خاص ضابطہ کے تحت ہوں کہ ان کے ذریعہ کوئی شخص بلا اذن مسلم عادل کے کوئی خبر نہ دے سکتا ہو تو ان کی خبر بلا امتیاز صوت و خط بھی معتبر ہے۔

حضرت حکیم الامت قدس سرہ نے حکومت شرعیہ کے فقدان کے وقت شہادت ہلال عیدین کو بھی ہلال رمضان کا حکم دے کر اس میں چند شرائط سے ریڈیو، ٹیلیفون اور خط وغیرہ کی خبر کو معتبر قرار دیا ہے مگر حکومت شرعیہ نہ ہونے کی حالت میں اگرچہ شہادت کے جمیع شرائط کو پایا جانا ممکن نہیں، تاہم حتی الامکان جتنی شرائط ہو سکیں ان کا وجود ضروری ہے، لہٰذا ایسی شرائط جن کا تعلق قاضی یا مجلس قضاء سے نہیں مثلاً عدد کامل، عدالت، حریت، عدم الحد فی القذف، روبرو حاضر ہونا ساقط نہ ہوں گی، اس پر ایک قرینہ تو شامیہ کی عبارت ہے کہ اگر حاکم شرعی نہ ہونے کی حالت میں بھی ہلال عیدین میں قول عدلین کو ضروری قرار دیا ہے، حالانکہ عدد بھی شرائط شہادت میں سے ہے، اور دوسرا قرینہ یہ ہے فیشترط فیه ما یشترط فی سائر حقوقهم من العدالة والحریة والعدد وعدم الحد فی القذف ولفظ الشهادة والدعوی علی خلاف فیه ان امکن ذلك والا فقد تقدم انهم لو کانوا فی بلدة لا قاضی فیها ولا والی فان الناس یصومون فیها بقول ثقة ویفطرون باخبار العدلین (البحر الرائق) اس عبارت سے معلوم ہوا کہ قاضی شرعی نہ ہونے کی حالت میں صرف وہ شرائط ساقط ہوں گی جن کا تحقق ممکن نہ ہو، روبرو حاضر ہونا وغیرہ من الشرائط الممکنة ساقط نہ ہوں گی، لہٰذا ہلال عیدین میں ریڈیو وغیرہ کی خبر معتبر نہ ہوگی، فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۲۰ ذی قعدہ سنہ [illegible]ھ

ثبوت ہلال شعبان کی تحقیق:

سوال: ہلال شعبان بحالت صحو شہادت عدلین بشرائطہا معتبرہ سے ثابت ہو، اب

بصورت عدم رؤیت ہلال رمضان تکمیل ثلاثین کے بعد صوم واجب ہوگا یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب ومنه الصدق والصواب

شہادت وقضاء صرف ہیں حق العبد ہو یا ایسے حق اللہ جن میں الزام علی الغیر ہو جیسے طلاق بائن، وہ حقوق اللہ جن میں الزام علی الغیر نہیں بلکہ محض دیانات میں سے ہیں ان کی قضاء صحیح نہیں، اور نہ ہی ان پر شہادت شرعیہ ہو سکتی ہے، ہلال عیدین چونکہ حقوق عباد سے ہیں اس لئے ان کا ثبوت اور حکم بالشہادۃ صحیح ہے۔ ہلال رمضان دیانی ہے حقوق العباد سے نہیں اس لئے یہ تحت الحکم داخل نہیں ہو سکتے اور نہ ہی ان پر شہادت صحیح ہوگی، ہلال رمضان چونکہ دیانات میں سے ہے اس لئے اس میں خبر عادل موجب عمل ہو جاتی ہے، قال فی شرح التنویر وطریق اثبات رمضان والعید ان یدعی وکالۃ معلقۃ بدخوله بقبض دین علی الحاضر فیقر بالدین والوکالۃ وینکر الدخول فیشهد الشهود برؤیۃ الهلال فیقضی علیه به ویثبت دخول الشهر ضمنا لعدم دخوله تحت الحکم[عه] وفی الشامیۃ تحت قوله یدعی ای بان یدعی مسلم علی شخص حاضر بان فلانا الغائب له علیك کذا من الدین وقد قال لی اذا دخل رمضان فانت وکیل بقبض هذا الدین ومثل ذلك ما لو ادعی علی آخر بدین له علیه مؤجل الی دخول رمضان فیقر بالدین وینکر الدخول (قوله ویثبت دخول الشهر ضمنا) لانه من ضروریات صحۃ الحکم بقبض الدین فقد ثبت فی اثبات حق العبد لا قصدا ولهذا قال فی البحر عن الخلاصۃ بعد ما ذکره الشارح هذا لان اثبات مجیء رمضان لا یدخل تحت الحکم حتی لو اخبر رجل عدل القاضی بمجیء رمضان یقبل ویأمر الناس بالصوم یعنی فی یوم الغیم ولا یشترط لفظ الشهادۃ وشرائط القضاء واما فی العید فیشترط لفظ الشهادۃ وهو یدخل تحت الحکم لانه من حقوق العباد اهـ قلت والحاصل ان رمضان یجب صومه بلا ثبوت بل بمجرد الاخبار لانه من الدیانات ولا یلزم من وجوب صومه ثبوته کما مر وحینئذ فلا فائدۃ فی اثباته علی الطریق المذکور عدم توقفه علی الجمع العظیم لو کانت السماء

عه قال الرحمتی یفتقر به ذلك مع انه یتعلق به حقه تعالی وتقبل فیه الشهادۃ من غیر تقدم دعوی اهـ (رد المحتار ج ۲ ص ۱۳۶) ۱۲ منه

مصححة لان الشهادة على حلول الوكالة بدخول الشهر لا على رؤية الهلال ولا خفاء ان حلول الوكالة يكتفى فيها بشاهدين لانها مجرد حق عبد ولا تثبت الا بثبوت الدخول واذا ثبت دخوله فصار حيث صومه الخ (رد المحتار ص ۱۳۲ ج ۲) معلوم ہوا کہ ہلال شعبان بھی اگر حق العبد کے ضمن میں ہو تو اس پر شہادت صحیح ہے، اور اس صورت میں بحالت صحو و غیم ہر حال شہادت عدلین کافی ہے، قال فی شرح التنویر وهلال الاضحى وبقية الاشهر التسعة كالفطر على المذهب وفى الشامية قال الخير الرملي الظاهر انه في الاهلة التسعة لا فرق بين الغيم والصحو في قبول الرجلين لفقد العلة الموجبة لاشتراط الجمع الكثير وهي توجه الكل الى طالعين (رد المحتار ج ۲ ص ۱۳۰)

پس اگر ہلال شعبان حق العبد کے ضمن میں بشہادت معتبرہ ثابت ہوا، یا ویسے ہی جم غفیر کی رؤیت سے ثابت ہوا تو ہر دو صورت میں تکمیل ثلاثین کے بعد صوم واجب ہوگا خواہ ابتداء رمضان میں غیم ہو یا نہ ہو، اور اگر ہلال شعبان حق العبد کے ضمن میں نہیں تو اس پر شہادت فضول ہے، اور چونکہ رمضان موقوف ہے ابتداء شعبان پر اس لئے اس کی خبر متعلق بالدیانات ہوگی لہٰذا اس کا ثبوت بعینہ رمضان کی طرح ہوگا یعنی حالت غیم میں خبر واحد عادل اور صحو میں خبر احد آفاقی یا خبر عدلین پر اعتماد کیا جائے گا، اور ابتداء رمضان میں بحالت غیم تکمیل ثلاثین کے بعد صوم واجب ہوگا بحالت صحو نہ ہوگا لظہور الکذب، رمضان کا یہ حکم شامیہ میں مذکور ہے، البتہ شعبان و رمضان میں اتنا فرق رہے گا کہ رمضان میں بحالت صحو ایک عادل دور موضع مرتفع یا خارج بلد سے آیا ہو کی خبر قطعاً معتبر نہیں، اس لئے تکمیل ثلاثین کے بعد نہ بحالت غیم اور نہ بحالت صحو کسی حال میں فطر کی اجازت نہیں، اور اگر ہلال شعبان ایسے ایک شخص نے بحالت صحو دیکھا تو ابتداء رمضان میں بحالت صحو اگرچہ تکمیل ثلاثین پر صوم واجب نہ ہوگا مگر بحالت غیم وجوب صوم ظاہر ہے، وجہ فرق یہ ہے کہ رؤیت ہلال شعبان کی طرف لوگ توجہ نہیں کرتے اور عموماً دیانات میں خبر عدل اس شرط سے موجب عمل ہوتی ہے کہ خلاف ظاہر ہونے کی وجہ سے اس میں کذب کا ظن غالب پیدا نہ ہو،

تو یہ تقریر شامیہ ج ۲ ص ۱۳۰ کے جزئیہ فلو شهدوا فى الصحو بهلال شعبان و ثبت بشرطها الثبوت الشرعى يثبت رمضان بعد ثلاثين يوما من شعبان الخ سے اعتراض نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ اب خود شامیہ کی عبارت سے ثابت کیا جا چکا ہے کہ ہلال شعبان

تحت الحکم داخل نہیں ہو سکتا، لہٰذا اس پر شہادت بیکار ہے، شامیہ کے جزئیہ مذکورہ کی دو تاویلیں ہو سکتی ہیں۔

① یہ شہادت اور ثبوت ہلال حق العبد کے ضمن میں ہو رہا ہے، اور ثبوت بشرط التعدیت الشرعی اس پر دال ہے، علاوہ ازیں از تنبیہ الطلال کی شان بحر و شامیہ میں موجود ہے، چنانچہ شرح التنویر کی عبارت مطلقہ شهدوا انه شهد عند قاضی مصر کذا شاهدان برؤیة الهلال فی لیلة کذا وقضی القاضی به الخ کے تحت فرماتے ہیں: والظاهر ان المراد من القضاء به القضاء ضمنا کما تقدم تقریره والا فقد علمت ان الشهر لا یدخل تحت الحکم (رد المحتار ج۲ ص ۱۲۸)

② مثبت رمضان یعنی شذ نہیں ہوتا کہ مطلب حکم فی ابتداء رمضان کے ساتھ مقید کیا جائے اور اس پر لفظ شہادۃ مجازاً اطلاق کر دیا ہے، جیسا کہ ہلال رمضان میں شہادت رجل یا شہادت رجلین عام فقہاء لکھتے ہیں، حالانکہ اس میں شہادت نہیں، فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۱۱ ذی الحجہ [illegible]

تیس رمضان کو بعد زوال گزشتہ رات میں رویت ہلال پر شہادت ہوئی تو افطار لازم ہے:

سوال: عید الفطر کی شب میں مطلع صاف نہ تھا، دو معتبر آدمیوں نے چاند دیکھنے کی شہادت حاکم کے پاس تیس رمضان کے زوال کے بعد دی، حاکم نے افطار کا اعلان کیا، ایک شخص افطار نہیں کرتا، تو کیا یہ شخص گنہگار ہوگا؟ بینوا توجروا۔

الجواب منه الصدق والصواب

جو شخص حاکم کے فیصلہ شرعی کے بعد بھی افطار نہ کرے گا وہ گنہگار ہوگا، کیونکہ یہ یوم شہادۃ شرعیہ سے یوم عید ثابت ہوا، اور عید کے دن روزہ رکھنا حرام ہے، فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۵ ذی الحجہ [illegible]

جہاں ہمیشہ ابر کی وجہ سے رویت ممکن نہ ہو:

سوال: برطانیہ میں ہر وقت ابر رہنے کی وجہ سے رویت ہلال ممکن نہیں تو رمضان و عیدین کا ثبوت کیسے ہوگا؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملهم الصواب

ہلال رمضان کے لئے کسی ایسے ملک کے ریڈیو پر اعتماد کیا جائے جس کے بارے میں

بہ یقین ہو کہ وہاں ضوابط شرعیہ کے مطابق رؤیت ہلال کا فیصلہ ہوتا ہے خواہ یہ ملک کتنا ہی بعید کیوں نہ ہو، دوسری صورت یہ ہو کہ کسی دوسرے ملک کے کسی معتبر عالم سے بذریعہ ٹیلیفون معلوم کر کے اس کے مطابق عمل کیا جائے، بشرطیکہ آواز کی پہچان یا دوسرے ذرائع سے یہ معلوم ہو جائے کہ ٹیلیفون پر کون بول رہا ہے، بندہ نے مسئلہ اختلاف مطالع پر انفراداً و اجتماعاً بار بار غور کیا ہر مرتبہ یہی نتیجہ نکلا کہ عند الاحناف بلاد بعیدہ میں بھی اختلاف مطالع غیر معتبر ہے اور یہی قول مفتیٰ بہ ہے، ضرورت کے پیش نظر بلاد بعیدہ و قریبہ میں فرق کے قائلین کی بھی وسعت سے کام لینا چاہئے۔

الحاصل عیدین سے متعلق خبر مستفیض موصول ہو تو اس پر عمل کیا جائے ورنہ تکمیل ثلاثین لازم ہے، فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۱۳ ربیع الآخر سنہ ۹۰ھ

سعودیہ میں رؤیت کا اعلان پاکستان کے لئے حجت نہیں:

سوال: سعودی عرب میں عموماً پاکستان سے دو روز قبل چاند کا اعلان ہو جاتا ہے، اور اس کی خبر مستفیض پاکستان میں پہنچتی ہے، تو اس خبر کے مطابق پاکستان میں عمل کیوں نہیں کیا جاتا؟ اختلاف مطالع کا عذر بھی صحیح نہیں، اس لئے کہ حنفیہ کے ہاں اختلاف مطالع غیر معتبر ہے، بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

اولاً: سعودی عرب میں رؤیت ہلال کی خبر کا حد استفاضہ کو پہنچنا محل تامل ہے۔

ثانیاً: حکومت سعودیہ میں رؤیت ہلال کا فیصلہ مسلک حنفیہ کے خلاف ہونے کے علاوہ بداہت کے بھی خلاف ہوتا ہے، اس لئے وہ پاکستان کے لئے حجت نہیں، حنفیہ کے ہاں بحالت صحو جمع عظیم کی رؤیت شرط ہے، مگر حکومت سعودیہ میں ہر کیف رمضان کے لئے خبر واحد اور شوال و ذی الحجہ کے لئے شہادۃ العدلین پر فیصلہ کر دیا جاتا ہے، اس سلسلہ میں ایک استفتاء کا جواب سعودی وزارۃ العدل کی وساطت سے الہیئۃ القضائیۃ العلیا کی طرف سے موصول ہوا ہے، اس کے ضروری اقتباسات ذیل میں دئیے جاتے ہیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

المملکۃ العربیۃ السعودیۃ الرقم – ۱۵۲۹

وزارۃ العدل التاریخ ۹۳/۱۰/۱۲

مکتب الوزیر

السلام عليكم ورحمة الله وبركاته ـــــ فقد كتبنا لكم بأننا أحلنا فضيلتكم الاستفسار إلى الهيئة القضائية العليا برقم ١٨٢ في ٢٩/٣/١٣٩٣هـ وتلقينا إجابتها بخطاب فضيلة رئيسها رقم ١٥٦/٥/ت في ٢١/١/١٣هـ المتضمن أن المعمول به في المملكة العربية السعودية في كيفية أخذ الشهادة لرؤية الهلال بالنسبة للأشهر عمومًا ولرؤية الهلال عند حلول شهر رمضان المبارك وانسلاخه.. ـــ أنه يثبت لديه بشهادة فلان وفلان وهما عدلان ثقتان بأنهما رأيا هلال شهر شعبان .. ـــــ فيكون تحري رؤية هلال شهر رمضان ليلة ..... فإن شهد أحد لدى أحد القضاة قام بتدوين نص شهادته ـــــ علمًا بأن شهر رمضان يثبت بشهادة عدل واحد بخلاف سائر الشهور فلا يثبت دخولها إلا بشهادة رجلين عدلين

ـــــ والله يتولى الجميع بتوفيقه وزير العدل

محمد بن علي الحركان

اس کے جواب میں بندہ نے لکھا تھا کہ آپ کے رؤیت ہلال کا فیصلہ خلاف ظاہر ہوتا ہے، اور اس کی وجوہ تحریر کی تھیں، مگر پھر کوئی جواب نہ ملا،

خلاف ظاہر ہونے کی وجوہ:

① بحالت صحو جبکہ رؤیت سے کوئی امر مانع نہیں پوری مملکت میں سے صرف ایک یا دو افراد کا چاند دیکھنا اور ان کے سوا اور کسی کو بھی نظر نہ آنا محال عادی ہے،

② وہاں شہادت سے دوسرے روز بھی رؤیت عام نہیں ہوتی یعنی دوسری رات کا چاند بھی عوام کو دکھائی نہیں دیتا،

③ چودھویں یا پندرھویں شب کو بدر کامل ہونا لازم ہے، مگر شہادت کے لحاظ سے سولھویں یا سترھویں کو بدر کامل ہوتا ہے،

④ جس روز مشرق کی طرف بوقت صبح چاند نظر آئے اس روز بلکہ اس سے ایک روز بعد بھی رؤیت ہلال محال ہے، کیونکہ ان ایام میں غروب شمس سے قبل ہی قمر غروب ہو جاتا ہے، اور حکومت سعودیہ میں بسا اوقات خود اسی روز میں رؤیت کا اعلان ہو جاتا ہے جس روز بوقت صبح مشرق میں چاند دیکھا گیا،

⑤ حجۃ الوداع کا یوم جمعہ ہونا تواتر سے ثابت ہے، اور قمر کا دور صغیر و کبیر بھی مشاہد و مسلّم

ہو، لہٰذا کسی ایسے دن کو غرۂ اشہر قرار دینا باطل ہے جس کے حساب سے حجۃ الوداع یوم جمعہ سے قبل ثابت ہوتا ہو۔

(۹) جہاں رؤیت پر شہادت ہوئی اس کے سوا دنیا میں کہیں بھی حتیٰ کہ مغرب بعید میں بھی اس روز کہیں رؤیت نہیں ہوئی۔

(۱۰) شہادت کی رو سے چاند کی عمر کو پہلا دن پہلی تاریخ قرار دیا گیا، یہ بدیہی البطلان ہے اس لئے کہ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ہلال پیدائش سے بھی قبل نظر آسکتا ہے۔

شاید ظاہر حدیث کی بنا پر ان کے مذہب میں بہرحال خبر رؤیت ہلال ہی پر مدار ہے اس لئے وہ امور مذکورہ کی طرف التفات نہیں کرتے۔

تنبیہ:

سعودیہ میں غیر ملکی مقیم حضرات اور حجاج کے لئے رمضان و عیدین اور حج دستر ہلال کی صحت میں شبہہ کی ہرگز گنجائش نہیں، اس لئے کہ بحالت صحو شہادت مدعین کی صحت مختلف فیہا ہے، لہٰذا اس کے مطابق قضاء کی صورت میں یہ فیصلہ سعودیہ کی حدود کے اندر واجب العمل ہے، فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

[illegible] جمادی الاولیٰ سنہ [illegible]

ہلال پر کسی کی شہادت قبول نہ ہوئی تو اس پر روزہ واجب ہے:

سوال: اگر کسی شخص نے عید کا چاند دیکھا اور قاضی کے پاس جا کر اس کی گواہی دی لیکن قاضی نے اس کی گواہی رد کر دی، کیا یہ شخص روزہ رکھے گا یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

اگر اس کی گواہی کو قاضی نے کسی دلیل شرعی کی وجہ سے رد کر دیا ہو تو اس پر روزہ واجب ہے، البتہ روزہ رکھ کر توڑ دیا تو کفارہ نہیں، قال فی التنویر: رأی مکلف ہلال رمضان او الفطر ورد قوله بدلیل شرعی صام مطلقا وجوبا وقیل ندبا فان افطر قضی فقط فیهما لشبهة الرد (رد المحتار ص ۹۰ ج ۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

[illegible] جمادی الآخرہ سنہ [illegible]

جس کی ہلال رمضان پر شہادت قبول نہ ہوئی وہ اکتیسواں روزہ بھی رکھے:

سوال: اگر کسی نے رمضان کا چاند دیکھ کر قاضی کے ہاں شہادت دی مگر قاضی نے اس کی شہادت قبول نہ کی، اور اس نے اپنی رؤیت کی بنا پر روزہ رکھ لیا اور پھر تیس روزے

روزے پورے ہونے پر بھی رؤیت نہ ہوئی تو یہ شخص اکتیسواں روزہ بھی رکھے گا یا صرف تیس روزے رکھ کر چھوڑ دے گا؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

یہ شخص اکتیسواں روزہ بھی رکھے گا، اور دوسروں کے ساتھ عید کرے گا، قال فی الشرح (تنبیہ) لو صام رائی ھلال رمضان واکمل العدۃ لم یفطر الا مع الامام لقولہ علیہ الصلوۃ والسلام صومکم یوم تصومون وفطرکم یوم تفطرون رواہ الترمذی وغیرہ والناس لم یفطروا فی مثل ھذا الیوم فوجب ان لا یفطر نھر (رد المحتار ص ۹۹ ج ۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲ جمادی الآخرہ سنہ ۹۱ھ

برائے تسحیر الصلوۃ والسلام علیک یا رسول اللہ پکارنا:

سوال: یہاں رواج ہے کہ رمضان المبارک میں لوگوں کو رات کے وقت بیدار کرنے کے لئے "الصلوۃ والسلام علیک یا رسول اللہ" کا اعلان کرتے ہیں، اس کے متعلق یہاں کے علماء میں اختلاف ہوگیا ہے، بعض کہتے ہیں جائز ہے، اور حدیث بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے استدلال کرتے ہیں کہ وقت سحر اعلان کیا کرتے تھے، اور بعض کہتے ہیں کہ بدعت ہے، کیونکہ زمانۂ رسالت اور دور صحابہ میں یہ دستور نہ تھا، حدیث کا جواب ان کے پاس نہیں ہے، پس آپ سے امید ہے کہ بطلب محکمہ تحقیق فرما کر اختلاف رفع فرمائیں گے۔ بینوا توجروا۔

الجواب ومنہ الصدق والصواب

بعض حنفیہ نے اذان بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں اذان لغوی یعنی اعلان کی تاویل کی ہے، مگر الفاظ حدیث لا یمنعن احدکم اذان بلال من سحورہ سے اس کی تردید ہوتی ہے، کیونکہ اذان شرعی نہ تھی تو اس سے منع سحور کا کیا خطرہ تھا؟ اذان شرعی مراد لینے پر یہ اشکال وارد کیا جاتا ہے کہ اس صورت میں اذان بلال اور اذان ابن ام مکتوم رضی اللہ تعالیٰ عنہما میں امتیاز کیسے ہوتا ہوگا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ان دونوں حضرات کی آواز کا فرق امتیاز کے لئے کافی تھا، غرضیکہ اذان بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی اذان شرعی ہی تھی جو صبح صادق سے کچھ قبل [illegible] دی جاتی تھی، پھر یہ منسوخ ہوگئی، قال ابن نجیم رحمہ اللہ تعالیٰ وعند ابی حنیفۃ ومحمد رحمہما اللہ تعالیٰ لا یؤذن فی الفجر قبلہ لما رواہ البیہقی انہ علیہ الصلوۃ والسلام قال یا بلال لا تؤذن حتی یطلع الفجر قال فی الامام رجال اسنادہ ثقات ولروایۃ

مسلم کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یصلی رکعتی الفجر اذا سمع الاذان ویخففہما (البحر الرائق ص ۲۶۳ ج ۱) واخرج الامام الطحاوی رحمہ اللہ تعالیٰ عن ابراہیم قال خرجت مع علقمۃ الی مکۃ فخرجنا بلیل فسمع مؤذنا یؤذن بلیل فقال اما ہذا فقد خالف سنۃ اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لو کان نائما کان خیرا لہ فاذا طلع الفجر اذن، قال الطحاوی رحمہ اللہ تعالیٰ فاخبر علقمۃ ان الاذان قبل طلوع الفجر خلاف لسنۃ اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (شرح معانی الآثار ص ۹۶ ج ۱)

بالفرض اذان بلالی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اعلان ہی مراد ہو تو اعلان کے الفاظ کی کہیں تصریح نہیں، اور قاعدہ ہے کہ ذکر اللہ کو بدون الثبوت من الشرع کسی دوسرے مقصد کے لئے وسیلہ بنانا خواہ وہ مقصود دینی ہو، تب بھی جائز نہیں، اگر اس اعلان میں الفاظ ذکر بھی تسلیم کر لئے جائیں تو بھی جملہ مذکورہ فی السوال چونکہ قطعاً بدعت ہے اور عقیدہ حاضر و ناظر رکھنے والوں کا شعار ہے اس لئے جائز نہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

ذی الحجہ سنہ ھ

دائم المرض شیخ فانی کے حکم میں ہے:

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس بارہ میں کہ ایک شخص دائم المرض ہے صحت کی کوئی امید نہیں، تو یہ شخص فدیہ صوم میں شیخ فانی کے حکم میں ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب ومنہ الصدق والصواب

یہ شخص شیخ فانی کی طرح فدیہ دے گا، لما فی الشامیۃ (قولہ وللشیخ الفانی) ای الذی فنیت قوتہ او اشرف علی الفناء ولذا عرفوہ بانہ الذی کل یوم فی نقص الی ان یموت نہر ومثلہ ما فی القہستانی عن الکرمانی المریض اذا تحقق الیأس من الصحۃ فعلیہ الفدیۃ لکل یوم من المرض اھ وکذا ما فی البحر لو نذر صوم الابد فضعف عن الصوم لاشتغالہ بالمعیشۃ لہ ان یفدی ویفطر لانہ استیقن انہ لا یقدر علی القضاء (رد المحتار ج ۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۱۴ رجب سنہ ۸۴ھ

کان میں پانی جانا مفسد نہیں:

سوال:

کان میں پانی پڑ جانے کی وجہ سے روزہ فاسد ہوتا ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب ومنہ الصدق والصواب

کان میں پانی جانے سے روزہ نہیں جاتا، عمداً ڈالنے کے مفسد ہونے میں اختلاف ہے، عدم افساد راجح اور افساد احوط ہے، تیل یا دوا ڈالنا بالاتفاق مفسد ہے، لما فی العلائیۃ او دخل الماء فی اذنہ وان کان بفعلہ علی المختار (الیٰ قولہ) لم یفطر وفی الشامیۃ (قولہ وان کان بفعلہ) اختارہ فی الہدایۃ والتبیین وصححہ فی المحیط وفی الولوالجیۃ انہ المختار وفصل فی الخانیۃ بان دخل لا یفسد وان ادخلہ یفسد فی الصحیح لانہ وصل الی الجوف بفعلہ فلا یعتبر صلاح البدن ومثلہ فی البزازیۃ واستظہرہ فی الفتح والبرہان شرنبلالیۃ ملخصاً والحاصل الاتفاق علی الفطر بصب الدہن وعلی عدمہ بدخول الماء واختلاف التصحیح فی ادخالہ (رد المحتار ص ۱۰۶ ج ۲) وفی الہندیۃ ولو اقطر فی اذنہ الماء لا یفسد صومہ کذا فی الہدایۃ وہو الصحیح ہکذا فی محیط السرخسی (عالمگیریۃ ص ۲۰۴ ج ۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔ ۹ رمضان المبارک ۸۲ھ

متعدد روزوں کا فدیہ ایک مسکین کو دینا جائز ہے:

سوال: پانچ چھ روزوں کا فدیہ ایک مسکین کو دینا جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب ومنہ الصدق والصواب

اس میں اختلاف ہے، درمختار میں جائز لکھا ہے، اور شامیہ میں بحر سے نقل کیا ہے کہ عند الامام رحمہ اللہ تعالیٰ جائز نہیں، امام ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ سے جواز کی روایت ہے، شامیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک فدیہ متعدد اشخاص پر تقسیم کرنے کے بارے میں امام ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول جواز ماخوذ ہے، اس سے ثابت ہوا کہ حکم فدیہ مثل کفارہ نہیں، بلکہ مثل صدقۃ الفطر ہے، لہٰذا متعدد روزوں کا فدیہ ایک مسکین کو دینے میں بھی امام ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول ہی راجح ہوگا، قال فی شرح التنویر وللشیخ الفانی العاجز عن الصوم الفطر ویفدی وجوباً ولو فی اول الشہر وبلا تعدد فقیر کالفطرۃ الخ، وفی الشامیۃ (قولہ وبلا تعدد فقیر) ای بخلاف نحو کفارۃ الیمین للنص فیہا علی التعدد فلو اعطی ہنا مسکیناً صاعاً عن یومین جاز لکن فی البحر عن القنیۃ ان عن ابی یوسف فیہ روایتین وعند ابی حنیفۃ رحمہ اللہ تعالیٰ لا یجزیہ کما فی کفارۃ الیمین وعن ابی یوسف لو اعطی نصف صاع من بر عن یوم واحد لمساکین یجوز قال الحسن وبہ ناخذ اھ ومثلہ فی القہستانی (رد المحتار ص ۱۲۰ ج ۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔ ۲۰ شوال ۸۳ھ

انجکشن سے روزہ نہیں ٹوٹتا:

سوال: انجکشن سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے یا نہیں؟ اگر ٹوٹ جاتا ہے تو کفارہ لازم ہوگا یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب ومنه الصدق والصواب

روزہ اس چیز سے فاسد ہوتا ہے جو کسی منفذ کے ذریعہ معدہ یا دماغ میں پہنچ جائے، انجکشن سے دوا بذریعہ منفذ نہیں جاتی بلکہ عروق اور مسامات کے ذریعہ معدہ میں پہنچتی ہے، لہٰذا روزہ نہیں ٹوٹتا، قال فی شرح التنویر او اکتحل او ادهن او احتجم وان وجد طعمه فی حلقه، وفی الشامیة لانه اثر داخل من المسام الذی هو خلل البدن والمفطر انما هو الداخل من المنافذ للاتفاق علی ان من اغتسل فی ماء فوجد برده فی باطنه انه لا یفطر وانما کره الامام رحمه الله تعالیٰ الدخول فی الماء والتلفف بالثوب المبلول لما فیه من اظهار الضجر فی اقامة العبادة لا لانه مفطر (رد المحتار) فقط والله تعالیٰ اعلم

۱۴ ذیقعدہ سنہ ۹۲ھ

روزہ رکھنے کے بعد بیمار ہوگیا:

سوال: ایک شخص روزہ رکھنے کے بعد بیمار ہوگیا اور حالت نازک ہوگئی اگرچہ موت کا خوف نہ تھا، اس حالت میں ڈاکٹر نے دوا پلادی، تو کیا یہ شخص گنہگار تو نہ ہوگا؟ اور محض قضاء لازم ہے یا کفارہ بھی؟ بینوا توجروا۔

الجواب ومنه الصدق والصواب

اگر روزہ نہ چھوڑنے کی صورت میں مرض کی شدت یا مدت میں اضافہ کا ظن غالب ہو تو افطار جائز ہے، صرف قضاء واجب ہے کفارہ نہیں، اگر انجکشن سے علاج ہو سکے تو روزہ توڑنا جائز نہیں، قال فی الهندیة المریض اذا خاف علی نفسه التلف او ذهاب عضو یفطر بالاجماع وان خاف زیادة العلة وامتدادها فکذلک عندنا وعلیه القضاء اذا افطر (عالمگیریة ص ۲۰۷ ج ۱) فقط والله تعالیٰ اعلم

۱۵ ذیقعدہ سنہ ۹۲ھ

انزال بالقبلہ سے قضاء ہے کفارہ نہیں:

سوال: رمضان میں عورت کو بوسہ دیا اور انزال ہوگیا، تو قضاء اور کفارہ ہے

یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب منہ الصدق والصواب

اس صورت میں فقط قضاء ہے کفارہ نہیں، قال فی التنویر وطی امرأۃ میتۃ او بھیمۃ او فخذا او بطنا او قبل او لمس فانزل او افسد غیر صوم رمضان اداء او داوی آن قال) قضی فقط (رد المحتار ج۲ ص۱۴۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم،

۱۹ رجمادی الآخرہ ۹۳ھ

سفر کی وجہ سے رمضان اکتیس یا اٹھائیس دن کا ہوگیا؟

سوال: مکہ مکرمہ میں پاکستان سے ایک یا دو روز قبل چاند دکھائی دیتا ہے، پس اگر کوئی شخص رمضان میں مکہ مکرمہ سے پاکستان آیا اور پاکستان میں انتیس کی شام کو چاند نظر نہ آیا تو یہ شخص کیا کرے؟ اگر روزہ رکھتا ہے تو اس کے اکتیس روزے ہو جائیں گے، اسی طرح اگر کوئی پاکستان سے مکہ مکرمہ جائے تو اس کے اٹھائیس ہی روزے ہوتے ہیں، اس کا کیا حکم ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

اگر اہل پاکستان نے اس شخص کی خبر متعلق رؤیت ہلال شرائط معتبرہ کے مطابق قبول کر لی تو اہل پاکستان ایک روزہ قضاء رکھیں گے، اور اس آنے والے کے روزے پورے ہو جائیں گے، اگر اس کی خبر قبول نہ کی گئی تو یہ اکتیسواں روزہ بھی رکھے گا، اور دوسرے لوگوں کے ساتھ عید کرے گا، قال فی الشامیۃ تنبیہ: لو صام رائی ھلال رمضان واکمل العدۃ لم یفطر الا مع الامام لقولہ علیہ السلام صومکم یوم تصومون وفطرکم یوم تفطرون رواہ الترمذی (رد المحتار ج۲ ص۹۸)

دوسری صورت میں اہل مکہ کے ساتھ عید کرے اور ایک روزہ قضاء رکھے، فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۹ ربیع الاول ۹۸ھ

ہوائی سفر میں دن بہت بڑا یا بہت چھوٹا ہو جائے تو روزے کا حکم:

یہ مسئلہ باب صلوٰۃ المسافر میں گزر چکا ہے،

طویل النہار مقامات میں روزے کا حکم:

یہ مسئلہ بھی باب صلوٰۃ المسافر میں گزر چکا ہے،

۲۸

شمالی ملکوں میں اوقات سحر و افطار :

یہ مسئلہ کتاب الصلوٰۃ کی ابتداء میں گزر چکا ہے۔

کفارۂ صوم میں تداخل کی تفصیل :

سوال : متعدد روزوں کے کفاروں میں تداخل ہوگا یا نہیں ؟ راجح کیا ہے ؟ تفصیل سے تحریر فرمائیں ؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

اس میں تین قول ہیں :

(۱) مطلقاً تداخل ہے، خواہ ایک رمضان کے روزے ہوں یا مختلف رمضانوں کے، خواہ جماع سے فاسد کئے ہوں یا غیر جماع سے۔

(۲) دو رمضان کے کفاروں میں تداخل نہیں، خواہ جماع سے ہوں یا غیر جماع سے۔

(۳) دو رمضان کے کفارے بسبب جماع ہوں تو تداخل نہیں، بقیہ سب صورتوں میں تداخل ہے۔

تیسرا قول راجح ہے، قال فی شرح التنویر ولو تکرر فطرہ ولم یکفر للاول یکفیہ واحدۃ ولو فی رمضانین عند محمد رحمہ اللہ تعالیٰ وعلیہ الاعتماد بزازیۃ ومجتبی وغیرھما، واختار بعضھم للفتوی ان الفطر بغیر الجماع تداخل والا لا۔ وفی الشامیۃ (قولہ وعلیہ الاعتماد) نقلہ فی البحر عن الاسرار ونقل قبلہ عن الجوھرۃ لو جامع فی رمضانین فعلیہ کفارتان وان لم یکفر للاولی فی ظاھر الروایۃ وھو الصحیح اھ قلت فحیث اختلف الترجیح کما تری یحتمل الثانی بانہ ظاھر الروایۃ (رد المحتار ص ۱۱۲ ج ۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲۲ شوال سنہ ۸۵ھ

روزہ میں عورت کو لبوں پر سرخی لگانا :

سوال : عورت کو روزہ کی حالت میں لبوں پر سرخی لگانا جائز ہے یا نہیں ؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

جائز ہے، البتہ منہ کے اندر جانے کا احتمال ہو تو مکروہ ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۱۲ رمضان المبارک سنہ ۸۸ھ

روزہ میں خون نکلوانا مفسد نہیں:

سوال: روزہ کی حالت میں بذریعہ انجکشن خون نکلوانا مفسد صوم یا مکروہ تو نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

مفسد نہیں، البتہ اگر ایسے ضعف کا خطرہ ہو کہ روزہ کی طاقت نہ رہے گی تو مکروہ ہے، فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲۶ رشوال [illegible]

قبل الغروب چاند دیکھکر افطار کرلیا تو کفارہ لازم ہے:

سوال: ایک مولوی صاحب نے رمضان المبارک کی ۳۰ تاریخ کو قبل الغروب چاند نظر آنے کی وجہ سے لوگوں کو افطار کا حکم دیدیا اور خود بھی افطار کرلیا، ان مولوی صاحب پر شریعت نے کیا حکم دیا، اور جن لوگوں نے مولوی صاحب کے کہنے پر افطار کرلیا ان کا کیا حکم ہے؟ آیا قضاء وکفارہ سب پر لازم ہے یا صرف قضاء یا روزہ کا افطار ہی صحیح ہوگیا؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

یہ جاہل باتفاق ائمہ ثلاثہ اس کو دیکھکر روزہ افطار کرنا اور افطار کا حکم دینا ناجائز اور حرام ہے، حکومت پر لازم ہے کہ ایسے مولوی کو شدت جرم کے مطابق شدید تعزیر لگائے، مولوی صاحب پر توبہ اور قضاء وکفارہ دونوں لازم ہیں، اور عوام جو مسائل سے ناآشنا ہیں اور انھوں نے مولوی صاحب کے مسئلہ بتلانے پر روزہ افطار کیا ہے ان پر صرف قضاء لازم ہے کفارہ نہیں، یہ حکم زوال کے بعد چاند دیکھنے کا ہے، قبل الزوال دیکھا تو بھی روزہ توڑنا جائز نہیں، روزہ توڑدیا تو توبہ اور قضاء فرض ہے، مگر کفارہ نہیں، اس لئے کہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں یہ چاند گزشتہ رات کا ہے، لہٰذا شبہہ اختلاف کی وجہ سے کفارہ ساقط ہے، قال فی العلائیۃ ورؤیتہ بالنہار للیلۃ الآتیۃ مطلقا علی المذہب ذکرہ الحدادی، وفی الشامیۃ (قولہ ورؤیتہ بالنہار للیلۃ الآتیۃ مطلقا) ای سواء رؤی قبل الزوال او بعدہ (قولہ علی المذہب) ای الذی ہو قول ابی حنیفۃ ومحمد رحمہما اللہ تعالیٰ قال فی البحر فلا یکون ذلک الیوم من رمضان عندہما وقال ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ ان کان بعد الزوال فکذلک وان کان قبلہ فہو للیلۃ الماضیۃ ویکون الیوم من رمضان الخ (رد المحتار ص ۱۲۰ ج ۲) وفی التنویر او احتجم فظن فطرہ

به فأكل عمدا قضى وكفر، وفي الشرح لأنه ظن في غير محله حتى لو أفتاه مفت يعتمد على قوله أو سمع حديثا ولم يعلم تأويله لم يكفر للشبهة وإن أخطأ المفتي، وفي الشامية (قوله أو سمع حديثا) كقوله صلى الله تعالى عليه وسلم أفطر الحاجم والمحجوم، وهذا عند محمد رحمه الله تعالى لأن قول الرسول صلى الله تعالى عليه وسلم أقوى من قول المفتي فأولى أن يورث شبهة وعن أبي يوسف رحمه الله تعالى خلافه لأن على العامي الاقتداء بالفقهاء لعدم الاهتداء في حقه إلى معرفة الأحاديث زيلعي (رد المحتار ص ۱۱۸ ج ۲) فقط والله تعالى أعلم۔

۵ ذی الحجہ سنہ ۸۸ھ

سوال مثل بالا:

سوال: اگر کسی شخص نے قبل الغروب عید کا چاند دیکھ کر روزہ توڑ دیا بایں نیت کہ اب تو رمضان ختم ہو گیا تو کیا ایسے آدمی پر کفارہ ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

کفارہ واجب ہے، قال في البزازية رأى هلال الفطر وقت العصر فظن انقضاء مدته وأفطر قال في المحيط اختلفوا في لزوم الكفارة والأكثر على الوجوب (بزازية على العالمگيرية ص ۱۰۰ ج ۴) فقط والله تعالى أعلم۔

۱۱ صفر سنہ ۹۱ھ

روزہ میں دانت نکلوانا یا اس پر دوا لگانا:

سوال: روزہ میں ڈاکٹر سے ڈاڑھ نکلوانا اور منہ میں دوا لگانا جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

بوقت ضرورت شدیدہ جائز ہے، اور بلا ضرورت مکروہ ہے، اگر دوا یا خون پیٹ کے اندر چلا جائے اور تھوک پر غالب ہو یا اس کے برابر ہو یا اس کا مزہ محسوس ہو تو روزہ ٹوٹ جائے گا، قال في شرح التنوير أو خرج الدم من بين أسنانه ودخل حلقه يعني ولم يصل إلى جوفه أما إذا وصل فإن غلب الدم أو تساويا فسد وإلا لا إلا إذا وجد طعمه بزازية، وفي الشامية ومن هذا يعلم حكم من قلع ضرسه في رمضان ودخل الدم إلى جوفه في النهار ولو نائما فيجب عليه القضاء إلا أن يفرق بعدم إمكان التحرز عنه فيكون كالقيء الذي

عادۃ بنفسہ فلیراجع (رد المحتار ص ۱۰۱ ج ۲) قے اور رینٹ نگلنے میں یہ فرق ہے کہ اول غیر
غیر اختیاری ہے اور ثانی اختیاری نیز یہ نسبۃً قلیل الوجود ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم
۱۴ محرم سنہ ۸۹ھ

روزہ میں استنجاء کا پانی خشک کرنا ضروری نہیں:

سوال: کتاب نور الایضاح کی فصل فی الاستنجاء میں ہے کہ صائم مستنجی بالماء کے بعد قبل
القیام مخرج کو کسی چیز سے اچھی طرح خشک کرے تاکہ پانی اندر کی طرف جذب نہ ہونے پائے
کیا یہ قول مفتی بہ ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

اس کی کوئی ضرورت نہیں، استنجاء سے روزہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا، البتہ اگر پانی موضع
حقنہ تک پہنچ جائے تو روزہ ٹوٹ جائے گا، مگر استنجاء میں ایسا نہیں ہوتا، قال فی العلائیۃ
ولو بالغ فی الاستنجاء حتی بلغ موضع الحقنۃ فسد وھذا قلما یکون
ولو کان فیورث داء عظیما (رد المحتار ص ۱۰۸ ج ۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم
۲۳ ذی قعدہ سنہ ۸۹ھ

رجب کے روزہ کا حکم:

سوال: رجب کی ۲۷ تاریخ کا روزہ رکھنا جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

قال فی الاحیاء فی بیان اللیالی والایام الفاضلۃ ویوم سبعۃ وعشرین من رجب
له شرف عظیم روی ابو ھریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
قال من صام یوم سبع وعشرین من رجب کتب اللہ له صیام ستین شھرا وھو
الیوم الذی اھبط اللہ فیہ جبرائیل علیہ السلام علی محمد صلی اللہ علیہ وسلم
بالرسالۃ، وقال الزین العراقی رحمہ اللہ تعالیٰ فی تخریج اخبار الاحیاء حدیث
ابی ھریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ من صام یوم سبع وعشرین من رجب کتب اللہ
له صیام ستین شھرا وھو الیوم الذی ھبط فیہ جبرئیل علی محمد صلی اللہ علیہ و
سلم رواہ ابو موسی المدینی فی کتاب فضائل اللیالی والایام من روایۃ شھر بن حوشب
عنہ (احیاء العلوم ص ۳۶۱ ج ۱) اس روایت سے استحباب ثابت ہوتا ہے، ہبوط جبرئیل

پہلے اشکال کا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ شاید کوئی خاص قسم کا جہلاء مراد ہو، عوام اس روزہ کی فضیلت معراج کی وجہ سے سمجھتے ہیں حالانکہ اس کا شب معراج ہونا مختلف فیہ ہے، لیلۃ المعراج اور اس کے بعد کے دن میں کوئی عبادت ماثور نہیں، جمعہ کی رات اور دن کی فضیلت مسلم ہونے کے باوجود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے لاتختصوا لیلۃ الجمعۃ بالقیام من بین اللیالی ولا یوم الجمعۃ بالصیام من بین الایام، غرضیکہ ۲۷ رجب کا روزہ فی نفسہ مستحب ہے، مگر عوام کے فساد عقیدہ کی وجہ سے اس سے احتراز کرنا چاہئے، ۲۷ رجب کی شب میں عبادت سے متعلق احیاء العلوم کی روایت کو عراقی نے منکر قرار دیا ہے، لیلۃ المعراج میں اختلاف کی تفصیل احسن الفتاوی کے مسائل شتی میں آئے گی، ان شاء اللہ تعالیٰ، فقط واللہ تعالیٰ اعلم،

(نظر ثانی میں اس روزہ کو بدعت قرار دیا ہے، تفصیل تتمہ میں ہے) ۱۱ رجب سنہ [illegible]

حائضہ کا رمضان میں کھانا پینا:

سوال: اگر رمضان میں عورت ایام کی وجہ سے روزہ نہ رکھے تو اس کو دن میں کھانا پینا درست ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملهم الصواب

اگر حیض کی وجہ سے روزہ نہیں رکھا یا روزہ رکھنے کے بعد حیض آ گیا، تو کھانا پینا جائز ہے لیکن دوسروں کے سامنے نہ کھائے، اور اگر دن کو حیض سے پاک ہوئی تو دن کا باقی حصہ روزہ دار کی طرح رہنا واجب ہے، قال فی التنویر ویمنع صلاۃ وصوما، وفی الشامیۃ عن البحر وهل یکره لها التشبه بالصوم ام لا، مال بعض المحققین الی الاول لان الصوم لها حرام فالتشبه به مثله، واعترض بانه یستحب لها الوضوء والقعود فی مصلاها وهو تشبه بالصلوٰۃ اھ فتامل (رد المحتار ص ۲۶۰ ج ۱)، وقال ابن عابدین رحمه الله تعالیٰ العائض اذا طهرت فی رمضان فانها تمسک تشبها بالصائم لحرمة الشهر ثم تقضی الخ (رد المحتار ص ۲۳۳ ج ۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم،

۲۱ رمضان سنہ [illegible]

نکسیر کا خون اندر جانا مفسد ہے:

سوال: نکسیر کا خون حلق سے پیٹ میں چلا گیا، تو اس سے روزہ ٹوٹ جائے گا یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

اس سے روزہ ٹوٹ گیا، صرف قضاء واجب ہے کفارہ نہیں، فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۱۲ رمضان سنہ ۹۱ھ

آنکھ میں دوا ڈالنے سے روزہ نہیں ٹوٹتا:

سوال: آنکھ میں بہتی ہوئی دوا ڈالنے سے حلق میں دوا کا صاف اثر معلوم ہوا تو اس سے روزہ ٹوٹتا ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا، قال ابن عابدین رحمہ اللہ تعالیٰ (قولہ وان وجد طعمہ فی حلقہ) ای طعم الکحل او الدھن کما فی السراج وکذا لو بزق فوجد لونہ فی الاصح بحر قال فی النہر لان الموجود فی حلقہ اثر داخل من المسام الذی ھو خلل البدن والمفطر انما ھو الداخل من المنافذ (رد المحتار ج ۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۱۲ رمضان سنہ ۹۱ھ

روزہ میں منجن ملنا مکروہ ہے:

سوال: روزہ میں منجن یا ٹوتھ پیسٹ یا عورت کو مسی، دنداسہ لگانا جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

مکروہ ہے، اور اگر کوئی چیز حلق سے نیچے اتر گئی تو روزہ فاسد ہو جائے گا، فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۲ ذیقعدہ سنہ ۹۱ھ

کانچ تر کر کے چڑھانا مفسد ہے:

سوال: اگر کسی کی کانچ نکل آئے، اور اس کو تر کر کے چڑھائے تو روزہ فاسد ہوگا یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

روزہ فاسد ہو جائے گا، فی الشامیۃ من الفتح خرج سرمہ فغسلہ فان قام قبل ان ینشفہ فسد صومہ والا فلا (رد المحتار ص ۱۰۰ ج ۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۲ ذیقعدہ سنہ ۹۱ھ

بواسیری مسّے پر دوا لگانا مفسد نہیں:

سوال: بواسیر کے مسّوں کو پانی سے تر کرکے اوپر چڑھانے اور مسّوں پر دوا لگانے سے روزہ فاسد ہوگا یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

بواسیری مسّے موضع حقنہ سے بہت نیچے ہوتے ہیں، اور بر لو مقعد داخل ہونے والی چیز جب تک موضع حقنہ تک نہ پہنچے مفسد نہیں، لہٰذا مسّوں کو پانی سے تر کرکے چڑھانے سے اور مسّوں پر دوا لگانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا، البتہ کاغذ کو تر کرکے چڑھانے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے، اس لئے کہ یہ موضع حقنہ تک پہنچ جاتی ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۸ رمضان المبارک سنہ ۹۳ھ

نابالغ روزہ توڑدے تو قضا ضروری نہیں:

سوال: نابالغ بچہ روزہ فاسد کردے یا اس کا والد رحم کی وجہ سے روزہ کھلوادے یا فاسد کروادے تو اس پر یا اس کے والد پر قضاء یا کفارہ واجب ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

نابالغ روزہ توڑدے تو اس کی قضاء رکھوانا ضروری نہیں، نماز توڑدے تو دوبارہ پڑھوانا واجب ہے، سات برس کا ہو تو زبانی کہا جائے، اور دس برس کا ہو تو مار کر نماز پڑھائی جائے۔

نقل فی الشامیۃ عن احکام الاستروشنی الصبی اذا افسد صومہ لایقضی لانہ یلحقہ فی ذلک مشقۃ بخلاف الصلوۃ فانہ یؤمر بالاعادۃ لانہ لایلحقہ مشقۃ (رد المحتار ص ۱۱۱ ج ۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۷ شوال سنہ ۹۲ھ

شوال میں قضاء روزے رکھنے سے شش عید کا ثواب نہیں ملتا:

سوال: رمضان کے قضاء روزے شش عید میں رکھے تو ان چھ روزوں کا ثواب بھی اس کو ملا اور قضاء بھی ہوگئے، یہ صحیح ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

حدیث مسلم من صام رمضان ثم اتبعہ ستا من شوال کان کصیام الدھر، سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ چھ روزے غیر رمضان کے مراد ہیں، نیز صیام دہر کے ثواب کی وجہ یہ

بتائی جاتی ہے کہ ہر نیکی کا ثواب کم از کم دس گنا ہے، اس حساب سے رمضان کا مہینہ دس ماہ کے قائم مقام ہوا، پورے سال سے دو ماہ رہ گئے، اس کی تکمیل کے لئے شوال کے چھ روزے ہیں، جو ساٹھ روز (دو ماہ) کے قائم مقام ہیں، اس سے بھی یہی ثابت ہوا کہ نفل روزے مراد ہیں، ان ایام میں قضاء روزوں سے یہ فضیلت حاصل نہ ہوگی۔

صوم عاشوراء کی مشروعیت بطور شکرانہ ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی فضیلت بھی نفل روزہ کے ساتھ مخصوص ہے، اس روز قضاء روزہ رکھنے سے یہ ثواب نہ ملے گا۔

نصف شعبان و یوم عرفہ کے روزہ میں تطوع کی قید کہیں سے ثابت نہیں ہوتی، اگرچہ ایسے فضائل کا ورود بالعموم نوافل ہی کے لئے ہے مگر روایت کے الفاظ مطلق ہیں، ظاہر الفاظ کے پیش نظر ان دو دنوں میں قضاء روزہ رکھنے سے حصول فضیلت بعید نہیں، بالخصوص جبکہ ابن عمر رضی اللہ عنہ سے اس کی تائید بھی ہے۔

بعض علماء نے عدم تنصیف پر یوں استدلال کیا ہے کہ فرض میں نیت نفل صحیح نہیں، یہ استدلال اس لئے تام نہیں کہ یہاں نیت نفل کا مسئلہ نہیں بلکہ بحث یہ ہے کہ فضیلت موعودہ صرف نفل ہی کے لئے ہے یا مطلق صوم کے لئے خواہ نفل ہو یا فرض، ونظیرہ ما حرر ابن عابدین رحمہ اللہ تعالیٰ انہ ینال فضل التہجد بقضاء الفوائت بعد العشاء، فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۲۰ر شوال سنہ ۹۲ھ

گزشتہ سالوں کے فدیہ میں وقت اداء کی قیمت معتبر ہے:

سوال: اگر بعد بلوغ اوائل عمر میں روزے قضاء ہو گئے، اب بوجہ ضعیفی و کمزوری قضاء رکھنے سے معذوری ہے، تو کیا فدیہ میں گندم کی قیمت چالیس سال قبل کی لگائی جائے گی جب روزے قضاء ہوئے تھے، یا موجودہ نرخ لگایا جائے گا، اگر اقساط میں فدیہ ادا کیا جائے تو نیت کے روز جو نرخ ہے وہ محسوب ہوگا، یا بوقت ادا جو نرخ ہوگا وہ واجب الادا ہوگا؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

فدیہ میں اصل واجب خود گیہوں ہے، قیمت اس کے قائم مقام ہے، اس لئے بہر صورت وقت اداء کے نرخ کا اعتبار ہے، فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۲۵ر جمادی الاولی سنہ ۹۳ھ

مشتبہ وقت میں سحری کھانا مکروہ ہے:

سوال: اذان ہوتے ہی سحری چھوڑ دی گئی، لیکن ایک دو لقمہ جو منہ کے اندر تھا وہ

نکل کر پانی پی لیا تو کیا روزہ ہوگیا یا اس کی قضاء لازم ہے؟ بعض لوگوں کو دیکھا گیا کہ سائرن بجا رہا ہے سحری بند ہونے کا اعلان ہو رہا ہے اور اذان شروع ہے، لیکن ہوٹلوں میں چائے پی کر کلی کر لیتے ہیں، شرعاً کیا حکم ہے؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

اگر یہ ظن غالب ہو کہ صبح صادق ہونے کے بعد اذان شروع ہوئی تو روزہ نہ ہوگا اور اگر حالت مشتبہ ہو تو اس وقت کھانا پینا مکروہ ہے مگر روزہ صحیح ہو جائے گا، فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲۵ رمضان ۹۵ھ

فدیہ کی مقدار:

سوال: ایک شخص بیماری کی وجہ سے روزہ نہیں رکھ سکتا، اس کا فدیہ کیا ہے؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

صحت کے بعد روزہ قضاء رکھنا فرض ہے، البتہ اگر صحت کی کوئی امید نہیں رہی اور آخر دم تک روزہ رکھنے کی طاقت لوٹنے سے بالکل مایوسی ہے، چھوٹے اور ٹھنڈے ایام میں بھی روزہ رکھنے کی طاقت نہیں تو ایک روزہ کے عوض ۲،۲۵ کلوگرام گندم یا اس کی قیمت کسی مسکین کو دیدے، وزن کی تحقیق کے لئے میرا رسالہ "بسط الباع لتحقیق الصاع" ملاحظہ ہو، فقط واللہ تعالیٰ اعلم

غرہ ذی القعدہ ۹۵ھ

فدیہ و کفارہ کافر کو دینا جائز نہیں:

سوال: فدیہ اور کفارہ کا طعام کافر کو دینا جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

کافر حربی کو دینا بالاتفاق جائز نہیں، اور ذمی کو دینے میں اختلاف ہے، عدم جواز راجح ہے، قال فی الشامیۃ تحت (قولہ ومصرف ...) قال الرحمتی وفی الحاوی وان اطعم فقراء اهل الذمة جاز وقال ابو یوسف رحمه الله تعالى لا یجوز وبه ناخذ اه قلت بل صرح فی کافی الحاکم بانه لا یجوز دفعه لذمی فیه تقدیره ثم انه ظاهر الروایة عن الکل (رد المحتار ص۱۳۳ ج۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲۸ ذی القعدہ ۹۵ھ

صحت کے بعد غروب تک کھانا پینا جائز ہے:

سوال: بندہ کے روزہ کی حالت میں پیٹ میں شدید درد ہو گیا، دوا استعمال

کی آرام ہوگیا تو غروب تک روزہ داروں کی طرح رہنا واجب ہے یا مستحب؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملهم الصواب

واجب ہے، فی العلائیۃ کما فی اتم وحائض ونفساء طہرتا ومجنون افاق ومریض صح ومفطر ولو مکرها او خطأ وصبی بلغ وکافر اسلم (رد المحتار ص۱۲۰ ج۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۱۶ر شوال سنہ ۹۶ھ

روزہ میں قے کا حکم:

سوال: قے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملهم الصواب

اگر قے منہ بھر آئی اور ایک چنے کی مقدار یا اس سے زائد عمداً واپس لوٹالی تو روزہ ٹوٹ گیا، قضاء فرض ہے، کفارہ نہیں، اور اگر جان بوجھ کر منہ بھر کے قے کی تو اس صورت میں بہر حال روزہ فاسد ہو جائے گا اگرچہ واپس نہ لوٹائے، البتہ منہ بھر کے نہ ہو تو مفسد نہیں، قال فی الشامیۃ (قوله وان ذرعه القیء) والمسألة تتفرع الی اربع وعشرین صورة لانه اما ان یقیء او یستقیء وفی کل اما ان یملأ الفم او دونه وکل من الاربعة اما ان خرج او عاد او اعاده وکل اما ذاکر لصومه او لا ولا فطر فی الکل علی الاصح الا فی الاعادة والاستقاء بشرط الملء مع التذکر شرح الملتقی (رد المحتار ص۱۳۰ ج۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۱۳ر رمضان المبارک سنہ ۹۶ھ

قے کو مفسد سمجھ کر کچھ کھا لیا تو کفارہ نہیں:

سوال: اگر ایک انسان نے غیر مفسد صوم قے کو مفسد سمجھ کر اس کے بعد کچھ کھا لیا تو اس پر کفارہ ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملهم الصواب

کفارہ نہیں، صرف قضاء فرض ہے، قال فی شرح التنویر او ذرعه القیء وظن انه افطر فاکل عمداً للشبهة ولو علم عدم فطره لزمته الکفارة، وقال ابن عابدین رحمه الله تعالیٰ لوجود شبهة الاشتباه بالنظیر فان القیء والاستقاء متشابهان لان مخرجهما من الفم (رد المحتار ص۱۱۹ ج۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۱۳ر رمضان المبارک سنہ ۹۶ھ

کفارہ کی مقدار:

سوال: ایک آدمی پر روزوں کا کفارہ لازم ہے اس کے لئے ایک روزہ کا کفارہ ادا کرنا مشکل ہے، صرف دس بیس روپے وغیرہ ادا کرسکتا ہے، تو یہ بتائیں کہ ایک روزہ کا کفارہ مالی قیمت کے اعتبار سے کیا ہوگا؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

جس میں ساٹھ روزے رکھنے کی قدرت نہیں تو ایک مسکین کو ۲ء۱۲ کلو گیہوں کی قیمت ساٹھ روز تک دیدے یا ساٹھ مسکینوں کو ایک ہی دن میں دیدے، ہر مسکین کو ۲ء۱۲ کلو گیہوں کی قیمت، فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۱۹ جمادی الآخرہ سنہ ۹۸ھ

روزہ کی قضاء میں دن کی تعیین:

سوال: زید کے مرض کی وجہ سے متعدد روزے چھوٹ گئے، اور اب اس کا ادا کرنے کا ارادہ ہے، تو کیا اس میں دن کی تعیین ضروری ہے کہ فلاں دن کا روزہ رکھ رہا ہوں یا مطلق روزہ کی نیت کافی ہے؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

اگر ایک ہی روزہ قضاء ہوا ہو یا ایک رمضان کے متعدد روزے قضاء ہوئے ہوں تو نیت میں دن کی تعیین ضروری نہیں، اور اگر متعدد رمضانوں کے روزے قضاء ہوں تو اشتراط تعیین رمضان میں اختلاف ہے، دونوں قول مصحح ہیں، تعیین احوط ہے، قال العلائی رحمہ اللہ تعالیٰ فی شرح التنویر: ولو نوی قضاء رمضان ولم یعین الیوم صح ولو عن رمضانین کقضاء الصلوۃ صح ایضا وان لم ینو اول صلوۃ علیہ او آخر صلوۃ علیہ کذا فی الکنز وقال المصنف قال الزیلعی والاصح اشتراط التعیین فی الصلوۃ وکذا رمضانین الخ. وقال ابن عابدین رحمہ اللہ تعالیٰ (قولہ صح ایضا) وان خالف ما قدمہ الشارح فی باب شروط الصلوۃ عن القہستانی عن المنیۃ انہ الاصح ونقل تصحیحہ عن الولوالجیۃ ایضا ان التعیین احوط (قولہ والاصح اشتراط التعیین الخ) صححہ ایضا فی متن الملتقی فقد اختلف التصحیح (رد المحتار ص ۸۵ ج ۲)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۷ صفر سنہ ۹۹ھ

مسواک کا ریشہ پیٹ میں جانا مفسد نہیں:

سوال: مسواک کرتے وقت اس کا ریشہ حلق میں چلا گیا اور کوشش کے باوجود باہر نہ نکلا، تو اس سے روزہ تو فاسد نہیں ہوا؟

الجواب باسم ملہم الصواب

دانتوں میں اٹکے ہوئے کھانے کا ذرہ اگرچہ چنے کے دانے سے کم مقدار میں حلق میں چلا جائے تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سے احتراز متعسر ہے، اس سے ثابت ہوا کہ مسواک کے ریشے سے بھی روزہ نہ ٹوٹے گا، لتعذر الاحتراز عنه۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۳ رشوال سنہ ۹۹ھ

ثبوت رمضان کی غلط فہمی سے روزہ رکھ لیا:

سوال: ہمارے قریب ایک گاؤں کے لوگوں کو ریڈیو کی خبروں سے ثبوت رمضان کا دھوکہ ہوا، انہوں نے ریڈیو کی خبر سے یہ سمجھا کہ رمضان کا چاند نظر آنے کا فیصلہ ہو چکا ہے، اس لئے روزہ رکھ لیا، بعد میں ظاہر ہوا کہ چاند کا فیصلہ نہیں ہوا، میں نے ان کو روزہ توڑنے کو کہا، بعض نے توڑ دیا اور بعض نے نہ توڑا، اس کا شرعی حکم کیا ہے؟ میرے خیال میں یہ روزہ حرام ہے، اور اس کا توڑنا واجب ہے، آپ اپنے فیصلے سے آگاہ فرمائیں۔ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

یہ روزہ ابتداءً ثبوت رمضان میں مغالطہ پر مبنی ہونے کی وجہ سے بحکم صوم مظنون ہے، مگر وضوح حقیقت کے بعد بحکم صوم یوم شک ہو گیا، اس لئے کہ مطلع صاف نہ تھا، لہٰذا عدم ثبوت رمضان کے بعد اس روزہ کو بنیت رمضان باقی رکھنا مکروہ تحریمی ہے، اگر یہ نیت کر لی تو اس روزہ کا نقض واجب ہے، اور نفل و رمضان میں متردد نیت سے باقی رکھنا مکروہ تنزیہی ہے، اس کے نقض سے قضاء واجب نہیں، اور خالص نفل کی نیت سے ابقاء جائز ہے، اور اس کا نقض موجب قضاء ہے، مگر عوام کو صوم بنیت نفل سے بھی منع کرنا چاہئے۔ ——— البتہ ابتداءً صوم یوم شک بنیت نفل خاص کے لئے بھی دو صورتوں میں افضل ہے، ایک یہ کہ اس دن میں اس کی روزہ رکھنے کی عادت ہو، اور دوسری یہ کہ رمضان سے قبل دو سے زائد روزے رکھے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۸ رمضان سنہ ۹۲ھ

فدیہ رمضان سے قبل دینا جائز نہیں:

سوال: رمضان کے روزوں کے فدیہ کی رقم اگر رمضان آنے سے پہلے ایڈوانس میں

درے تو صحیح ہے یا نہیں، یعنی ابھی روزے نہیں آئے اور روزوں کا فدیہ پہلے ہی دیدیا۔ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

فدیہ بدل صوم ہے، اور سبب وجوب صوم شہود شہر ہے، لہٰذا رمضان شروع ہونے سے قبل فدیہ دینا قبل وجود السبب ہونے کی وجہ سے درست نہیں، البتہ رمضان شروع ہونے پر آئندہ ایام کا فدیہ بھی دفعۃً دے سکتے ہیں۔

اس کے برخلاف صدقۃ الفطر کا سبب وجوب رأس ہے، جو رمضان سے قبل بھی موجود ہے، اس لئے علی الراجح صدقۃ الفطر رمضان سے قبل دینا صحیح ہے، بلکہ کئی سالوں کا پیشگی بھی دے سکتے ہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۷ رمضان المبارک ۱۳۹۰ھ

کھجور یا پانی سے افطار مستحب ہے:

سوال: کیا پانی یا کھجور سے روزہ افطار کرنا سنت ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

تازہ کھجور سے افطار مستحب ہے، وہ نہ ہو تو خشک کھجور سے، وہ بھی نہ ہو تو پانی سے، عن انس ابن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من وجد تمرا فلیفطر ومن لا فلیفطر علی ماء فان الماء طہور (ترمذی ص ۱۲۲ ج ۱) وعن سلمان بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا کان احدکم صائما فلیفطر علی التمر فان لم یجد التمر فعلی الماء فان الماء طہور (ابوداؤد ص ۳۲۱ ج ۱) وعن انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ یقول کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یفطر علی رطبات قبل ان یصلی فان لم تکن رطبات فعلی تمرات فان لم تکن حسا حسوات من ماء (ابوداؤد ص ۳۲۱ ج ۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۱۴ شوال ۱۳۹۲ھ

روزہ کی نیت کب تک کی جا سکتی ہے؟

سوال: روزہ کی نیت کا وقت نصف النہار شرعی لکھا ہے مگر بعض کتابوں میں دوپہر سے ڈیڑھ گھنٹہ پہلے لکھا ہے، اور بعض میں ایک گھنٹہ پہلے، ان میں کونسی بات صحیح ہے، نصف النہار شرعی کس وقت ہوتا ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

صبح صادق سے غروب آفتاب تک کل وقت کے نصف کو نصف النہار شرعی کہا جاتا ہے

صبح صادق اور طلوعِ آفتاب کے درمیان جتنا وقت ہوتا ہے نصف النہار شرعی و نصف النہار عرفی (وقت زوال) کے درمیان اس کا نصف ہوتا ہے، مثلاً صبح صادق سے طلوعِ آفتاب تک ڈیڑھ گھنٹہ ہو تو نصف النہار عرفی سے پون گھنٹہ پہلے نصف النہار شرعی ہوگا، اس وقت کی مقدار ہر موسم میں اور ہر مقام میں مختلف ہوتی ہے، اس لئے کوئی مقدار گھنٹوں سے متعین نہیں کی جا سکتی، ضابطۂ مذکورہ کے مطابق عمل کیا جائے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۲۳ رمضان المبارک سنہ ۱۴۰۲ھ

صبح صادق کے بعد سفر کا ارادہ ہو تو روزہ چھوڑنا جائز نہیں:

سوال: زید کا دن میں سفر پر جانے کا ارادہ ہے تو اگر وہ سحری کھائے مگر روزہ کی نیت نہ کرے تو جائز ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

جو شخص بوقت صبح صادق سفر میں نہ ہو اس کے لئے روزہ چھوڑنا جائز نہیں اگرچہ دن میں سفر کا پختہ ارادہ ہو۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۲۳ رمضان المبارک سنہ ۱۴۰۲ھ

مسوڑھوں سے خون بلا اختیار پیٹ میں جانے کا حکم:

سوال: میرے مسوڑھوں سے خون نکلتا ہے، آجکل روزانہ دوپہر کے بعد خون بہت جاری رہتا ہے، یہ کیفیت بالخصوص سونے کی حالت میں ہوتی ہے، خون تھوک پر غالب رہتا ہے، جاگنے کی صورت میں تو احتیاط برتتا ہوں، لیکن سونے کی حالت میں غفلت میں تھوک حلق کے نیچے اتر جاتا ہے، اب تک رمضان میں دو مرتبہ ہوا ہے، میرا روزہ ہوا یا قضاء روزہ رکھنا ہوگا، آجکل نیند رات کو نہیں ہوتی، دن کو اگر سووں تو رات کی عبادت میں خلل ہوگا اور نوکری کرنا بھی محال ہوگا، میرے لئے کیا حکم ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

خون اگر صرف حلق میں گیا مگر پیٹ میں نہیں پہنچا تو روزہ نہیں ٹوٹا، اور اگر خون مغلوب ہو یعنی تھوک کا رنگ سرخ کی بجائے زرد ہو تو پیٹ میں جانے سے بھی روزہ نہیں ٹوٹتا، البتہ خون مغلوب ہونے کے باوجود حلق میں اس کا مزہ محسوس ہو تو پیٹ میں جانے سے روزہ ٹوٹ جائے گا، اسی طرح خون غالب ہو یعنی تھوک سرخ ہو تو پیٹ میں جانے سے روزہ جاتا رہے گا اگرچہ مزہ محسوس نہ ہو، جن صورتوں میں روزہ ٹوٹ جاتا ہے ان میں اگر سونے کی حالت میں

اور اگر کسی عذر سے خون بلا اختیار پیٹ میں اتر جائے تو عدم فساد کے قول کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، کذا فی الشامیۃ۔ مگر بہتر یہ ہے کہ اگر مستقبل قریب میں صحت متوقع ہو تو روزہ نہ رکھیں، بعد میں قضاء کریں۔ اور اگر روزہ کی حالت میں غیر اختیاری طور پر خون پیٹ میں چلا گیا تو صحت کے بعد احتیاطاً اس روزہ کی قضاء کریں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۸؍ رمضان المبارک سنہ ۹۲ھ

نفل روزہ میں حیض آگیا تو قضاء واجب ہے:

سوال: ایک عورت نے نفل روزہ رکھا، دن کے کسی حصہ میں حیض آگیا تو کیا پاک ہونے کے بعد یہ روزہ قضاء کرنا ہوگا؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

اس روزہ کی قضاء واجب ہے، قال فی العلائیۃ ولو شرعت تطوعا فیہما فحاضت قضتہما (رد المحتار ص ۱۸ ج ۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۲۹؍ شوال سنہ ۹۲ھ

بحالت روزہ فرج میں دوا لگانا:

سوال: روزہ کی حالت میں دن میں عورت کو اپنی شرمگاہ میں ٹیوب لگانا جائز ہے یا نہیں؟ اور روزہ تو فاسد نہ ہوگا؟ جبکہ شرمگاہ میں زخم ہو تو شرعاً کیا حکم ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا، البتہ فرج داخل میں دوا پہنچنے سے ٹوٹ جائے گا، اوپر کے مستطیل سوراخ کے آخر میں گول سوراخ سے فرج داخل شروع ہوتا ہے، فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۱۸؍ ذیقعدہ سنہ ۹۲ھ

کفارہ کے روزے مسلسل رکھنا ضروری ہے:

سوال: ایک شخص کے اوپر رمضان شریف کا کفارہ تھا، اس نے روزے رکھنے شروع کئے، درمیان میں بیماری کی وجہ سے ایک روزہ چھوٹ گیا، کیا اب اس کی ترتیب ٹوٹ گئی؟ اس روزہ سے آگے روزے رکھتا جائے یا شمار سے پھر روزے رکھنے شروع کرے؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

از سر نو ساٹھ روزے رکھے، قال فی التنویر کفر ککفارۃ المظاہر، وفی الشامیۃ

ای مثلها فی التوقیت فیعتق اولا فان لم یجد صام شهرین متتابعین فان لم یستطع اطعم ستین مسکینا لحدیث الاعرابی المعروف فی الکتب الستة فلو افطر ولو لعذر استأنف الا لعذر الحیض (رد المحتار ص ۱۱۹ ج ۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۱۰ر صفر [illegible]

فدیہ میں ہر چیز دی جا سکتی ہے:

سوال: فدیہ میں غرباء اشخاص کو کپڑے دے سکتے ہیں یا نہیں؟ موجودہ وقت میں ایک نماز یا روزہ کا فدیہ بصورتِ نقد تقریباً ایک روپیہ ہوتا ہے، اگر بیس روپیہ کا کمبل خرید کر ایک شخص کو دیدیا تو ایک روزہ کا فدیہ ادا ہوا یا بیس کا؟ اگر کمبل کی پیمائش اور طول و عرض کو دیکھا جائے تو بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ ایک روزہ کا فدیہ ہوا اور اگر قیمت کو مد نظر رکھا جائے تو بیس روزوں کا ادا ہوا، بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

فدیہ میں گیہوں کی قیمت کے برابر کپڑا وغیرہ دینا بھی جائز ہے، اور متعدد روزوں کے فدیہ کی رقم ایک فقیر کو دینا بھی جائز ہے، اس لئے بیس روپے کا کمبل دینے سے بیس روزوں کا فدیہ ادا ہو گیا، قال فی التنویر وفدی عنہ ولیہ کالفطرۃ وفی الشرح قدرا، وفی الشامیۃ ای التشبیہ بالفطرۃ من حیث القدر اذ لا یشترط التملیک ھنا بل تکفی الاباحۃ بخلاف الفطرۃ وکذا هی مثل الفطرۃ من حیث الجنس وجواز اداء القیمۃ، قال القہستانی واطلاق کلامہ یدل علی انہ لو دفع الی فقیر جملۃ جاز ولم یشترط العدد ولا المقدار لکن لو دفع الیہ اقل من نصف صاع لم یعتد بہ وبہ یفتی اھ ای بخلاف الفطرۃ علی قول کما مر (رد المحتار ص ۱۶۰ ج ۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲۵ر شعبان [illegible]

مسکین کو کفارہ کا طعام کھلانے میں تتابع شرط نہیں:

سوال: کفارۂ یمین یا روزہ کے کفارہ میں اگر ایک مسکین کو کھانا کھلایا تیس دن یا ساٹھ دن تک، یا ایک روپیہ یومیہ نقد دیتا رہا، تو کیا اس میں تتابع شرط ہے؟ جس طرح روزہ میں فَمَنْ لَّمْ یَجِدْ فَصِیَامُ شَہْرَیْنِ مُتَتَابِعَیْنِ کا حکم ہے، بینوا توجروا۔

روزہ نہ توڑا اور مرگیا تو گنہگار ہوگا، اور بحالتِ اکراہ یعنی جب کوئی شخص روزہ توڑنے پر مجبور کرے اور نہ توڑنے کی صورت میں جان سے مار دینے کی دھمکی دے، اس پر روزہ توڑنا واجب نہیں، جائز ہے، اور نہ توڑنا افضل ہے، جان دیدی تو ثواب ہے، البتہ روزہ دار مریض یا مسافر ہو تو اکراہ کی صورت میں بھی روزہ توڑنا واجب ہے۔ قال العلامۃ الکاسانی رحمہ اللہ تعالیٰ والمبیح المطلق بل الموجب هو الذی یخاف منه الهلاک لان فیه القاء النفس الی التهلکة لا لاقامة حق الله تعالیٰ وهو الوجوب والوجوب لا یبقی فی هذه الحالة وانه حرام فکان الافطار مباحا بل واجبا (وبعد ورقة) واما المبیح للفطر من السفر فما فیه خوف الهلاک بسبب الصوم والافطار فی مثله واجب فضلا عن الاباحة لما ذکرنا فی المرض (و) اما الاکراه علی افطار صوم شهر رمضان بالقتل فی حق الصحیح المقیم فرخصة والصوم افضل حتی لو امتنع من الافطار حتی قتل یثاب علیه (الی قوله) واما فی حق المریض والمسافر فالاکراه مبیح مطلق فی حقهما بل موجب والافضل هو الافطار بل یجب علیه ذلک ولا یسعه ان لا یفطر حتی لو امتنع من ذلک فقتل یأثم (ثم قال) و الجوع والعطش الشدید الذی یخاف منه الهلاک فمبیح مطلق بمنزلة المرض الذی یخاف منه الهلاک بسبب الصوم لما ذکرنا (بدائع ص ۹۴ تا ۱۰۱ ج ۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۱۲ ربیع الآخر سنہ ۹۹ھ

مذی نکلنے سے روزہ نہیں ٹوٹتا:

سوال: روزہ میں اپنی بیوی کے ساتھ بوس وکنار کرنے سے جوش کی وجہ سے مذی آجائے تو روزہ فاسد یا مکروہ تو نہ ہوگا؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

بوس وکنار کی وجہ سے جو پانی نکلتا ہے اس کو مذی کہتے ہیں، اس سے روزہ میں کوئی نقصان نہیں آتا، منی نکلنے سے روزہ ٹوٹ جائے گا، اگر روزہ پر خطرہ ہو تو بوس وکنار جائز نہیں، مکروہ تحریمی ہے۔ قال العلائی رحمہ اللہ تعالیٰ وکرہ قبلة ومس ومعانقة ومباشرة فاحشة ان لم یأمن المفسد وان امن لا بأس (رد المحتار [illegible]) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲۷ رمضان سنہ [illegible]

صیامِ کفارہ کے درمیان حیض آگیا:

سوال: اگر کسی عورت نے روزہ رکھ کر توڑ دیا اور اب اسے کفارہ کے روزے رکھنے ہیں،

کفارہ کے روزے رکھنے شروع کئے تو چند روز بعد اس کے ماہواری کے دن آگئے، اب وہ روزے نہیں رکھ سکتی، اور کفارہ کے روزوں میں ناغہ نہیں ہونا، ایسی عورت کے بارے میں کیا حکم ہے؟ آیا وہ ماہواری کے بعد دوبارہ کفارہ شروع کرے؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

ماہواری کی وجہ سے کفارہ کے روزوں میں فصل مضر نہیں، ماہواری ختم ہوتے ہی فوراً روزے شروع کردے، اسی طرح ساٹھ روزے پے در پے پورے کرے، اگر ماہواری ختم ہونے کے بعد ایک دن کا بھی ناغہ کیا تو نئے سرے سے ساٹھ روزے رکھنے پڑیں گے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۵ شوال [illegible]

دردِ زہ سے روزہ توڑنا:

سوال: اگر کسی حاملہ عورت کو حمل کی وجہ سے کافی تکلیف ہے، اور روزہ رکھ کر توڑ دیتی ہے، بعض تکلیف کی وجہ سے اور سورج غروب کے وقت اس کے بچہ پیدا ہوجاتا ہے تو اس عورت کے متعلق کیا حکم ہے؟ کیا اس پر روزہ توڑنے کا کفارہ ادا کرنا واجب ہے؟ یا صرف قضاء؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

اگر روزہ نہ توڑنے سے عورت یا بچہ کو کوئی نقصان پہنچنے کا ظن غالب ہو تو روزہ توڑنا جائز ہے، صرف قضاء واجب ہے، کفارہ نہیں، بدون ایسے خطرہ کے روزہ توڑنا ناجائز ہے، کفارہ واجب ہے، البتہ اگر اسی روز غروبِ آفتاب سے قبل بچہ پیدا ہوگیا تو کفارہ ساقط ہوجائے گا۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۵ شوال [illegible]

بحالتِ روزہ لفافہ کا گوند زبان سے تر کرکے بند کرنا:

سوال: روزہ کی حالت میں زبان سے لفافہ کو گوند لگا کر چسپاں کرنا بلاکراہت درست ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

اگر زبان سے لفافہ کا گوند چاٹ کر تھوک نگل گیا تو روزہ فاسد ہوجائے گا، اور اگر چاٹنے کے بعد تھوک دیا تو اس سے روزہ فاسد نہیں ہوگا، مگر ایسا کرنا مکروہ تنزیہی ہے، قال فی العلائیۃ وکرہ لہ ذوق شیء وکذا مضغہ بلاعذر، قید فیہما قالہ العینی

تكون زوجها او سيدها لسى الخلق فذاقت سرفي الشامية الظاهر ان الكراهة في هذه الاشياء تنزيهية (ردّ المحتار ص ۱۲۲ ج ۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲۶ رشوال ۸۷ھ

سحری کھانے کے بعد کلی کرنا :

سوال : سحری کھا کر اگر کلی نہ کرے اور اسی طرح سو جائے تو روزہ میں کچھ حرج تو نہیں ہے ؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملهم الصواب

اگر دانتوں میں اٹکا ہوا کھانا چنے کی مقدار یا اس سے زیادہ حلق میں اتر گیا تو روزہ ٹوٹ جائے گا، صرف قضاء واجب ہے کفارہ نہیں، اور اگر چنے کی مقدار سے کم ہو تو مفسد نہیں، لہذا افساد صوم کے خطرہ کی وجہ سے کلی کرکے سونا چاہیے، قال في شرح التنوير ولو اكل لحما بين اسنانه ان مثل حمصة فاكثر قضى فقط وفي اقل منها لا يفطر (ردّ المحتار ص ۱۴۲ ج ۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲۱ رشوال ۸۷ھ

۲۵ تاریخ کے بدھ کا روزہ بدعت ہے :

سوال : ہماری طرف یہ رواج ہے کہ چاند کی ۲۵ تاریخ میں بدھ آجائے تو اس دن روزہ رکھتے ہیں، اور اس میں بڑا ثواب جانتے ہیں، کیا یہ روزہ رکھنا شرعاً جائز ہے یا نہیں ؟ اور ایسے روزہ کا ثواب ملے گا یا نہیں ؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملهم الصواب

شریعت میں اس روزہ کا کوئی ثبوت نہیں لہذا یہ بدعت اور گناہ ہے فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲۶ ربیع الآخر ۸۸ھ

حدیث "بوقت اذان ہاتھ میں پیالہ ہو تو پانی پی لے" کا مطلب :

سوال : حدیث "ہاتھ میں پیالہ ہو اور اذان ہو جائے تو پانی پی لے" اس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ صبح صادق کے بعد بھی کھانا پینا جائز ہے، حدیث کا کیا مطلب ہے ؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملهم الصواب

حضرات محدثین رحمہم اللہ تعالیٰ اجمعین نے اس حدیث کی مختلف توجیہیں بیان فرمائی ہیں:

(۱) جب روزہ دار کو ظن غالب ہو کہ اذان قبل از وقت ہوئی ہے،

(۲) حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اذان مراد ہے، جو صبح صادق سے قبل رفع قائم و ایقاظ نائم کے لئے ہوتی تھی،

(۳) یہ افطار سے متعلق ہے، مقصد یہ ہے کہ حالت افطار میں اذان سننے یا اس کا جواب دینے کے لئے افطار میں توقف نہیں کرنا چاہئے،

بندہ کے خیال میں اس کی مندرجہ ذیل توجیہیں بھی ہو سکتی ہیں:۔

(۴) اس کا روزہ سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ مقصد یہ ہے کہ جب پانی پینے کے لئے پیالہ ہاتھ میں لے لیا ہو اور اس حال میں اذان شروع ہو جائے تو پانی پی لے، اذان کے استماع و جواب کے لئے پانی نہ چھوڑے،

بعد میں یہ توجیہ بذل المجہود میں بھی مل گئی، فلله الحمد علی توفیقه لموافقة الاکابر،

(۵) حدیث میں نداء کا لفظ ہے، جس سے اقامت مراد لی جا سکتی ہے، یعنی ایسی حالت میں اقامت شروع ہوئی کہ پیالہ ہاتھ میں ہے تو پانی پی کر اطمینان سے جماعت میں شریک ہو،

(۶) الحاق: یہ حدیث صحیح نہیں (اعلاء الحدیث ص ۱۲۵ ج ۱۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۱۹ رجب سنہ ۹۰ھ

بیوی کے فرج میں انگلی ڈالنے کو مفسد سمجھ کر جماع کر لیا:

سوال: بیوی کی شرمگاہ میں دوا ڈالنے کے لئے اندر انگلی داخل کی اور شہوت غالب آئی تو خیال ہوا کہ روزہ ٹوٹ گیا، اس کے بعد وطی کر لی، اب اس کا کیا حکم ہے؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

روزہ کی قضاء اور کفارہ واجب ہے، قال فی شرح التنویر فعل ما لا یظن الفطر به کفصد وکحل ولمس وجماع بهیمة بلا انزال او ادخال اصبع فی دبر ونحو ذلک فظن فطره به فاکل عمدا قضی فی الصور کلها وکفر لانه ظن فی غیر محله، (رد المحتار ص ۱۱۸ ج ۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۱۹ رمضان سنہ ۹۳ھ

عورت نے فرج میں انگلی ڈالنے کو مفسد سمجھ کر کچھ کھا لیا:

سوال: زید کی بیوی کا روزہ تھا، زید نے اپنی انگلی اس کے فرج میں داخل کی، بیوی

نے سمجھا کہ اس کا روزہ ٹوٹ گیا، اس نے کچھ کھا پی لیا، اس کا کیا حکم ہے؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

فرج میں خشک انگلی داخل کرنے سے روزہ نہیں ٹوٹتا، اس کے بعد کھانے سے روزہ ٹوٹ گیا، قضاء اور کفارہ واجب ہے، البتہ انگلی گیلی ہو، خشک انگلی فرج میں ڈال کر پوری یا کچھ حصہ باہر کھینچ کر پھر اندر کر دی تو اس سے روزہ ٹوٹ گیا، صرف قضاء واجب ہے، کفارہ نہیں، اس کے بعد کھانے پینے سے بھی کفارہ واجب نہ ہوگا، قال فی العلائیۃ فعل ما لا یظن الفطر به کفصد وکحل ولمس وجماع بہیمۃ بلا انزال او ادخال اصبع فی دبر ونحو ذلک فظن انه افطر فاکل عمدا قضی فی الصور کلها وکفر لانه ظن فی غیر محله، وفی الشامیۃ (قوله او ادخال اصبع) ای یابسۃ کما تقدم فلو مبتلۃ فلا کفارۃ لاکله بعد تحقق الافطار بالبلۃ ط (رد المحتار ص ۱۱۲ ج ۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۱ صفر سنہ ۱۴۰۳ھ

ہاتھ سے منی نکالنا مفسد صوم ہے:

سوال: منی ہاتھ سے خارج کرنا کیا زنا کے برابر گناہ ہے؟ کیا روزہ کی حالت میں ہاتھ کے ذریعے سے منی خارج کرنے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے؟ بعض لوگ کہتے ہیں کہ کوئی گناہ نہیں ہے، بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

ہاتھ سے منی خارج کرنا بہت سخت گناہ ہے، حدیث میں اس پر لعنت وارد ہوئی ہے، اس سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے، قضاء واجب ہے کفارہ نہیں، قال فی شرح التنویر وکذا الاستمناء بالکف وان کرہ تحریما لحدیث ناکح الید ملعون، وفی الشامیۃ (قوله وکذا الاستمناء بالکف) ای فی کونه لا یفسد لکن هذا اذا لم ینزل اما اذا انزل فعلیه القضاء کما سیصرح به وهو المختار الخ (رد المحتار ص ۱۰۹ ج ۲) وفی الشرح او استمنی بکفه او بمباشرۃ فاحشۃ ولو بین المرأتین فانزل (الی قوله) قضی فقط (رد المحتار ص ۱۳۰ ج ۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲۰ رمضان المبارک سنہ ۹۶ھ

غروب سے قبل ریڈیو کے اعلان پر افطار کر لیا:

سوال: ۱۳ رمضان المبارک سنہ ۹۶ھ کو ریڈیو پاکستان نے غروب سے چار پانچ منٹ قبل

اذان دینا شروع کی جو ابھی ختم نہ ہونے پائی تھی کہ اس کے بعد صحیح وقت پر اذان نشر کی، لاکھوں افراد نے پہلی اذان پر جو قبل از غروب نشر کی گئی تھی روزہ افطار کیا، آیا ان کا روزہ ہوا یا نہیں؟ اگر نہیں ہوا تو اس کی صرف قضاء ہی کافی ہے یا کفارہ بھی لازم ہوگا؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

اس وقت آفتاب یقیناً موجود تھا، بلکہ دوسرے ایام میں بھی مؤذن بجنے کے وقت میں آفتاب غروب ہونے کا یقین نہیں ہوتا، کئی بار مؤذن کے وقت آفتاب کو آنکھوں سے دیکھا گیا ہے، میں نے اس کی اصلاح کی بارہا کوشش کی مگر سب ناکام، اس روزہ کی قضاء واجب ہے، البتہ افطار کرنے والوں کو چونکہ غروب کا ظن غالب تھا اس لئے کفارہ واجب نہیں، ہاں مطلق شک میں افطار کرنے سے وجوب کفارہ میں دو روایتیں ہیں اور روایت وجوب راجح ہے،

قال فی التنویر او تسحر او افطر یظن الیوم لیلا والفجر طالع والشمس لم تغرب قضی فقط، وقال الشارح رحمہ اللہ تعالیٰ ویکفی الشک فی الاول دون الثانی عملا بالاصل فیہما، وقال ابن عابدین رحمہ اللہ تعالیٰ (قولہ ویکفی) ای لاسقاط الکفارۃ الشک فی الاول ای فی التسحر الخ (ردالمحتار ص ۱۱۲ ج ۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۱۰ شوال ۸۷ھ

غروب سے قبل اذان پر افطار کر لیا:

سوال: مؤذن نے اذان تقریباً سات منٹ پہلے دیدی، اور میں نے اسی اذان پر روزہ کھول ڈالا، کیا میرا روزہ ہو گیا؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

روزہ نہیں ہوا، اگر آپ کو اس اذان کے صحیح وقت پر ہونے کا ظن غالب تھا تو صرف قضاء واجب ہے کفارہ نہیں، اور اگر شبہ تھا تو کفارہ بھی واجب ہے، فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۴ شوال ۹۹ھ

روزہ کی حالت میں فرج میں انگلی داخل کرنا:

سوال: عورت کی شرمگاہ میں اگر مرد اپنی انگلی پھیرے کیا روزہ نہیں ٹوٹتا؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

بیوی کی شرمگاہ میں انگلی داخل کرنے سے مرد کا روزہ نہیں ٹوٹتا، اور عورت کے روزہ میں

یہ تفصیل ہے کہ اگر گیلی انگلی داخل کی یا خشک انگلی داخل کرنے کے بعد پوری یا اس کا کچھ حصہ باہر نکال کر پھر آگے کی تو عورت کا روزہ ٹوٹ گیا، قضاء واجب ہے کفارہ نہیں، قال فی العلائیۃ او ادخل اصبعہ الیابسۃ فیہ ای دبرہ او فرجہا ولو مبتلۃ فسد (رد المحتار ص ۱۰۴ ج ۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲۴ جمادی الاولی سنہ ۱۴۰۲ھ

مرد کی سپاری اندر چلی گئی تو روزہ ٹوٹ گیا:

سوال: مرد اپنا آلہ تناسل عورت کے فرج میں داخل کرے اور پھر باہر نکال کر دیکھے اگر آلہ تناسل خشک ہے تو روزہ نہیں ٹوٹتا، ایک مولوی صاحب نے یہ مسئلہ بیان کیا ہے، کیا یہ صحیح ہے؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

مرد کے عضو کی سپاری عورت کی شرمگاہ میں داخل ہو گئی تو مرد اور عورت دونوں کا روزہ فاسد ہو گیا، دونوں پر قضاء اور کفارہ لازم ہے، خواہ انزال ہو یا نہ ہو، قال فی شرح التنویر او تواری الحشفۃ فی احد السبیلین انزل اولا (الی قولہ) قضی وکفر (رد المحتار ص ۱۰۹ ج ۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲۴ جمادی الاولی سنہ ۱۴۰۲ھ

عورت دن میں پاک ہوئی تو کھانا پینا ناجائز ہے:

سوال: اگر کوئی عورت رمضان میں دن میں حیض یا نفاس سے پاک ہوئی تو وہ دن کے باقی حصہ میں کھاتی پیتی رہے یا روزہ داروں کی طرح رہنا واجب ہے؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

غروب آفتاب تک کھانا پینا جائز نہیں، روزہ داروں کی طرح رہنا واجب ہے، قال فی التنویر والاخیران یمسکان بقیۃ یومہما وجوبا علی الاصح کمسافر اقام وحائض ونفساء طہرتا ومجنون افاق ومریض صح وصبی بلغ وکافر اسلم (رد المحتار ص ۱۴۲ ج ۲)
فقط واللہ تعالیٰ اعلم

یکم صفر سنہ ۱۴۰۳ھ

بوجہ عذر چھوٹے ہوئے روزہ کی قضاء کا موقع نہ ملا تو معاف ہے:

سوال: سفر، مرض یا حیض ونفاس کی وجہ سے روزے چھوٹ گئے، قضاء رکھنے سے قبل ہی انتقال ہو گیا تو کیا گناہ ہوگا؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

اگر قضاء کرنے کا وقت ہی نہیں ملا تو یہ روزے معاف ہیں، اور اگر حالتِ اقامت، صحت اور طہارت میں قضاء رکھنے کا موقع مل گیا ہو تو ترکہ سے فدیہ ادا کرنے کی وصیت کرنا واجب ہے، قال فی العلائیۃ فان ماتوا فیہ ای فی ذلک العذر فلا تجب علیہم الوصیۃ بالفدیۃ لعدم ادراکہم عدۃ من ایام اخر ولو ماتوا بعد زوال العذر وجبت الوصیۃ بقدر ادراکہم عدۃ من ایام اخر (رد المحتار ص ۱۲۶ ج ۲)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۱ر صفر سنہ ۱۴۰۳ھ

مسافر نے روزہ رکھ کر توڑ دیا تو کفارہ نہیں:

سوال: زید نے سفر میں روزہ کی نیت کی مگر بعد میں نیت بدل گئی اور کھالیا تو گناہ ہوگا یا نہیں؟ اس پر کفارہ واجب ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

گناہ ہے، کفارہ نہیں، البتہ روزہ رکھنے کے بعد سفر شروع کیا تو وجوب کفارہ میں اختلاف ہے، راجح یہ ہے کہ اس صورت میں بھی کفارہ واجب نہیں، قال فی التنویر ولو نوی مسافر الفطر فاقام ونوی الصوم فی وقتہا صح ویجب علیہ لو فی رمضان کما یجب علی مقیم اتمام یوم منہ سافر فیہ ولا کفارۃ علیہ لو افطر فیہما وفی الشامیۃ (قولہ کما یجب علی مقیم الخ) لما قدمنا اول الفصل ان السفر لا یبیح الفطر وانما یبیح عدم الشروع فی الصوم فلو سافر بعد الفجر لا یحل الفطر قال فی البحر وکذا لو نوی المسافر الصوم لیلا واصبح من غیر ان ینقض عزیمتہ قبل الفجر ثم اصبح صائما لا یحل فطرہ فی ذلک الیوم ولو افطر لا کفارۃ علیہ اھ قلت وکذا لا کفارۃ علیہ بالاولی لو نوی نہارا فقولہ لیلا غیر قید (قولہ فیہما) ای فی مسألۃ المسافر لو اقام ومسألۃ المقیم اذا سافر کما فی الکافی النسفی وصرح فی الاختیار بلزوم الکفارۃ فی الثانیۃ قال ابن الشلبی فی شرحہ للکنز وینبغی التعویل علی ما فی الکافی ای من عدمہ فیہما قلت بل عزاہ فی الشرنبلالیۃ الی الہدایۃ والعنایۃ یقو النہر الفائق (رد المحتار ص ۱۲۳ ج ۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۱ر صفر سنہ ۱۴۰۳ھ

روزہ توڑنے کے بعد بیمار یا مسافر ہوگیا:

سوال: کسی شخص نے رمضان کا روزہ رکھنے کے بعد توڑ دیا، پھر اسی روز بیمار ہوگیا یا سفر پر چلا گیا تو کفارہ ساقط ہوگا یا نہیں؟ عام کتابوں میں لکھا ہے کہ بیمار ہونے سے کفارہ ساقط ہوجاتا ہے، اور سفر پر جانے سے ساقط نہیں ہوتا، مگر خانیہ میں ہے: والاصل عندنا انه اذا صار فی آخر النہار علی صفة لو کان علیها فی اول النہار یباح له الافطار تسقط عنه الکفارة (خانیة علی هامش الهندیة ص ۲۱۶ ج ۱) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سفر کی صورت میں بھی کفارہ ساقط ہوجائے گا، اس کی وضاحت فرمائیں۔ بینوا توجروا

الجواب باسم ملهم الصواب

سفر سے کفارہ ساقط نہیں ہوتا، خانیہ کے کلیہ میں اباحة الافطار سے افطار بعد الشروع فی الصوم مراد ہے، اور روزہ رکھنے کے بعد سفر شروع کرنے سے اس روز افطار مباح نہیں، اس لئے کفارہ ساقط نہ ہوگا، خود خانیہ میں اصل مذکور سے قبل عدم سقوط کے لئے افطار بعد السفر کی تصریح موجود ہے، ونصه: لو اصبح المقیم صائما ثم سافر فافطر بعد ذلك لا کفارة علیه وکذا المرأة اذا افطرت ثم حاضت والصحیح اذا افطر ثم مرض مرضا لا یستطیع معه الصوم تسقط الکفارة عندنا. علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ شرح التنویر کے قول "وقید بطرؤ مسقط" کی شرح میں رحمتی سے نقل فرماتے ہیں: ای سماوی لا صنع له فیه ولا فی سببه (رد المحتار ص ۱۲۰ ج ۲) اس سے یہ کلیہ معلوم ہوا کہ عذر سماوی مرض، حیض، نفاس وغیرہ مسقط ہے، سفر جیسا امر اختیاری مسقط نہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

یکم صفر سنہ ۱۴۰۳ھ

فدیہ صوم سے عاجز کا حکم:

سوال: اگر کوئی شخص اتنا غریب ہے کہ نماز اور روزہ کے فدیہ کی رقم ادا نہیں کرسکتا تو اسے کیا طریقہ اختیار کرنا چاہئے؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملهم الصواب

یہ نیت رکھے کہ اگر زندگی میں مالی استطاعت ہوگی تو روزہ کا فدیہ ادا کردوں گا، نماز کا فدیہ زندگی میں نہیں دیا جاتا، بلکہ قضاء پڑھنا لازم ہے، قیام پر قدرت نہیں تو بیٹھ کر، اس پر بھی قدرت نہ ہو تو لیٹ کر اشارہ سے

نماز پڑھے، فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۱۲ ربیع الآخر سنہ ۹۹ھ

فدیہ میں نابالغ کو کھلانا کافی نہیں:

سوال: ایک خاتون کا انتقال ہوگیا ہے، اس کے ورثاء اس کی طرف سے قضا شدہ نمازوں اور روزوں کا فدیہ ادا کرنا چاہتے ہیں، کیا وہ مسکین کو صدقۂ فطر کی مقدار میں غلہ دینے یا صبح وشام دونوں وقت پیٹ بھر کر کھانا کھلانے کے بجائے غلہ کی قیمت کے برابر کوئی چیز مثلاً کپڑا، جوتہ وغیرہ خرید کر دے سکتے ہیں؟ کیا فدیہ صوم وصلوٰۃ نابالغ مسکین کو دیا جا سکتا ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

غلہ کی قیمت یا اتنی قیمت کا کوئی سامان دیا جا سکتا ہے، نابالغ کا والد مسکین ہو تو اس کو فدیہ دیا جا سکتا ہے، البتہ نابالغ کو کھانا کھلانا کافی نہیں، قال فی الخانیۃ وان غدی اہم وعشاہم وفیہم صبی فطیم لا یجوز علیہ ان یطعم مسکینا آخر مکانہ (خانیۃ علی ہامش الہندیۃ ص ۲۳۲ ج ۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۲۵ ربیع الاول سنہ ۱۴۰۱ھ

صیام کفارہ دو ماہ ہیں یا ساٹھ دن؟

سوال: کفارہ کے روزے دو ماہ قمری ہیں جو اتفاقاً انسٹھ دن بھی ہو سکتے ہیں تو کیا ساٹھ دن پورے کرنا ضروری ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

اگر قمری مہینہ کی پہلی تاریخ سے روزے شروع کئے تو چاند کے حساب سے دو ماہ پورے کرے دنوں کا اعتبار نہیں، اور اگر پہلی تاریخ سے شروع نہیں کئے تو ساٹھ دن پورے کرے، قال فی العلائیۃ صام شہرین ولو ثمانیۃ وخمسین بالہلال والا فستین یوما، وفی الشامیۃ وحاصلہ انہ اذا ابتدأ الصوم فی اول الشہر کفاہ صوم شہرین تامین او ناقصین او کان احدہما تاما والآخر ناقصا (قولہ والا) ای لیکن صومہ فی اول الشہر برؤیۃ الہلال بان غم او صام فی اثناء شہر فانہ یصوم ستین یوما وذکر فی الحاکم ان صام شہرا بالہلال تسعۃ وعشرین وقد صام قبلہ خمسۃ عشر وبعدہ خمسۃ عشر یوما اجزأہ (رد المحتار ص ۱۳۱ ج ۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۳ صفر سنہ ۱۴۰۳ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صوموا لرؤیتہ وافطروا لرؤیتہ

عیون الرجال لرؤیۃ الہلال

- رؤیت ہلال سے متعلق مفتیان پاکستان کا اجتماعی فیصلہ
- رؤیت ہلال کے مسئلہ میں ملک کو انتشار سے بچانے کی تجویز
- حکومت پاکستان کی طرف سے عبادات کو قمری کیلنڈر سے وابستہ کرنے کی تجویز کا جوا

رؤیتِ ہلال

سے متعلق

مفتیانِ پاکستان کا اجتماعی فیصلہ

مسئلہ رؤیتِ ہلال پر اجتماعی غور کے لئے بتاریخ ۱۰ رمحرم ۱۳۷۳ھ مطابق ۱۹ ستمبر ۱۹۵۳ء مدرسہ قاسم العلوم ملتان میں مفتیانِ پاکستان کا اجتماع طلب کیا گیا، مدعوین حضرات کو اجتماع سے قبل سوالات مرتب کرکے بھیج دیئے گئے تھے تاکہ وہ اجتماع میں شرکت سے قبل اُن پر غور و خوض کرکے ان کے تحریری جوابات اجتماعی غور کرنے کے لئے مجلس میں پیش کریں، بندہ کی طرف سے جو جوابات تحریر کئے گئے بحمد اللہ تعالیٰ اجتماعی فیصلہ ان کے مطابق ہوا، ذیل میں سوالات کے بعد بندہ کے جوابات اور پھر متفقہ فیصلہ درج ہے۔ (رشید احمد)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً و مصلیاً

کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیانِ شرع متین مسائل ذیل میں:۔

① رؤیتِ ہلال فطر میں شہادت شرط ہے یا نہیں؟

② اگر شہادت شرط ہے تو موجودہ وقت میں پاکستان کے حکام قائم مقام قاضی یا والی کے ہوکر شہادۃ بشرائطہا المعتبرۃ لے سکتے ہیں یا نہیں؟

③ اگر ان کو قاضی یا والی کا حکم نہیں دیا جاسکتا تو کل شروطِ شہادت ساقط ہوں گے یا بعض؟

④ ریڈیو، ٹیلیفون، تار برقی، اخبار کے ذریعہ سے خبر کسی درجہ میں معتبر ہے یا بالکل ساقط الاعتبار ہے؟

⑤ عالم ثقہ کو بحالاتِ حاضرہ پاکستان کے شہروں اور دیہات میں شہادت لینے اور اس پر حکم عام کرنے کا اختیار ہے یا نہیں؟ اور اس کا حکم واجب العمل ہے یا نہیں؟

⑥ اگر کہیں رؤیتِ ہلال کے لئے باقاعدہ حکومت کی جانب سے علماء کی مجلس مقرر ہو اگر وہ اپنے شہروں میں باقاعدہ شہادت لے کر فیصلہ دیدیں اور اس فیصلہ کا اعلان ریڈیو اسٹیشن سے نشر کردیں، تو دوسرے شہروں میں یہ تو ظاہر ہے کہ وہ شہادت کی حیثیت نہیں رکھتا لیکن جس طرح

ایک شہر والوں کے مضافات میں ضربِ طبل، صوتِ مدافع، تعلیق القنادیل علی المنائر وغیرہ
دلالۃ علی الشہادۃ ٹھیرا کر شہر اور مضافات والوں کے لئے حجت اور موجبِ عمل بتلایا گیا ہے،
(کما فی منحۃ الخالق علی البحر الرائق للعلامۃ الشامی) تو کیا اس اعلان کو بھی بمنزلہ
علامت علی الشہادۃ قرار دے کر سننے والوں کے لئے حجت ٹھیرایا جا سکتا ہے؟ یا نہیں؟ بصورت
اول کسی خاص حد تک یا مطلقاً؟

(۷) اختلافِ مطالع مطلقاً معتبر ہے یا مطلقاً غیر معتبر؟ یا اس میں کوئی تحدید ہے کہ فلاں
فلاں حد تک معتبر ہے اس سے زائد معتبر نہیں؟

(۸) اگر ایک شخص عادل رؤیتِ ہلالِ رمضان میں یا دو عادل رؤیتِ ہلالِ شوال میں یہاں آکر
کسی دوسرے شہر کی رؤیت کی حکایت کریں، مثلاً کہ وہاں عید ہے، یا فلاں دن روزہ تھا،
ان کی یہ خبر یہاں کے لوگوں کے لئے حجت ہے یا نہیں؟ یا کہ ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ
تحمل شہادت بالطریق المعروف کرکے یہاں شہادت علی الشہادۃ ادا کریں یا وہاں کے حاکم
کے حکم پر شہادت دیں؟ صوم وفطر دونوں کے فرق کو ملحوظ رکھیں۔

(۹) استفاضہ کی صورت میں فقط حکایتِ رؤیتِ بلدۂ اُخریٰ کافی ہے یا وہ بھی حکمِ حاکم
یا شہادتِ شاہد کی نقل سے متحقق ہوتا ہے؟ اور کیا ایک بلدہ سے مختلف خبریں بھی موجبِ
استفاضہ ہیں یا مختلف قطعات وجہات سے مختلف خبریں آنا ضروری ہے؟

(۱۰) اگر ہلالِ رمضان میں خبرِ واحد عدل یا خط وغیرہ پر اعتماد کرتے ہوئے روزہ کا حکم کر دیا گیا
اور تیس روزے پورے ہونے کے بعد اگر رؤیتِ ہلال نہ ہوئی تو عید کرنا جائز ہے یا نہیں؟

(۱۱) اگر فاسق کی خبر کو کوئی حاکم یا عالم ثقہ منظور کر لے اگرچہ منظور نہیں کرنی چاہئے؟ نیز
اگر حاکم یا عالم ثقہ کو بذریعہ خط، ٹیلیفون وغیرہ ایسی خبریں پہنچیں جو اگرچہ ہر ایک فی نفسہ حجت نہ تھی
لیکن ان کے مجموعہ سے اس کا غلبۂ ظن وطمانیت ہو گیا تو کیا وہ عید ورمضان میں حکم عام کر سکتا
ہے یا نہیں؟ اور وہاں کے دوسرے باشندگان کو بالخصوص علماء کو عمل کرنا واجب ہو گا یا کہ
وہ اختلاف کر سکتے ہیں؟ اگرچہ تفریق بین المسلمین پیدا ہونے کا قوی خطرہ بھی ہو؟

(۱۲) خبرِ ہلالِ عید یا حج ورمضان محض دیانات میں سے ہے یا معاملات میں سے؟ یا اس میں کچھ
تفصیل ہے؟

(۱۳) بحالتِ صحو فطر میں دو عادلوں کی شہادت اور رمضان میں ایک عادل کی خبر کا اعتبار کیا

پانچویں: باہر سے آنے والے یا مکان مرتفع سے دیکھنے والے کا کچھ اعتبار ہے یا نہیں؟

الجواب ومنه الصدق والصواب

① ہلال فطر میں شہادت شرط ہے:

ثبوت ہلال فطر میں خبر واحد کافی نہیں، شہادت عدلین ضروری ہے، عن حسین بن الحارث الجدلی جدیلة قیس ان امیر مکة خطب ثم قال عهد الینا رسول الله صلی الله علیه وسلم ان ننسك للرؤیة فان لم نره وشهد شاهدا عدل نسکنا بشهادتهما فسألت الحسین بن الحارث من امیر مکة فقال لا ادری ثم لقینی بعد فقال هو الحارث بن حاطب اخو محمد بن حاطب ثم قال الامیر ان فیکم من هو اعلم بالله ورسوله منی وشهد هذا من رسول الله صلی الله علیه وسلم واومأ بیده الی رجل فقال الحسین فقلت لشیخ الی جنبی من هذا الذی اومأ الیه الامیر قال هذا عبد الله بن عمر وصدق کان اعلم بالله منه فقال بذلك امرنا رسول الله صلی الله علیه وسلم (ابوداود مجتبائی ص ۳۲۲ ج ۱)

عن عبد الرحمن بن زید بن الخطاب انه خطب الناس فی الیوم الذی یشك فیه فقال الا انی جالست اصحاب رسول الله صلی الله علیه وسلم وسألتهم وانهم حدثونی ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال صوموا لرؤیته وافطروا لرؤیته وانسکوا لها فان غم علیکم فاتموا ثلثین وان شهد شاهدان فصوموا وافطروا (نسائی مجتبائی ص ۳۰۰ ج ۱)

شوکانی نے ان دونوں حدیثوں کی تصحیح کی ہے (نیل الاوطار ص ۱۸۷ ج ۴)

عن ابن عمر رضی الله تعالی عنهما قال ترآءی الناس الهلال فاخبرت رسول الله صلی الله علیه وسلم انی رأیته فصام وامر الناس بصیامه (ابوداود مجتبائی ص ۳۲۳ ج ۱ وصححه الشوکانی فی نیل الاوطار ص ۱۸۷ ج ۴)

قال طاؤس شهدت المدینة وبها ابن عمر وابن عباس رضی الله تعالی عنهم فجاء رجل الی والیها وشهد عنده علی رؤیة هلال شهر رمضان فسأل ابن عمر وابن عباس رضی الله عنهم عن شهادته فامراه ان یجیزه وقالا ان رسول الله صلی الله علیه وسلم اجاز شهادة واحد علی رؤیة هلال رمضان وکان لا یجیز

شهادة الافطار الا شهادة رجلين قال الدار قطنی تفرد به حفص بن عمر الايلی وهو ضعيف

(نيل الاوطار ص ۱۸۰ ج ۴)

ان روایات سے معلوم ہوا کہ ہلال فطر میں شہادت عدلین شرط ہے، اگرچہ شوکانی نے ان روایات سے استدلال کی تضعیف کی ہے، مگر جمیع علماء کا مذہب انہی کے مطابق نقل کیا ہے واما فی الفطر فلا یجوز بشهادة عدل واحد علی هلال شوال عند جمیع العلماء الا ابا ثور جوزه بعدل واحد (عمدة القاری ص ۲۹۲ ج ۵، نیل الاوطار ص ۱۸۰ ج ۴) اس کے متعلق فقہی جزئیات نمبر ۱۲ میں آرہی ہیں۔

② حاکم مسلم قاضی کے قائم مقام ہے:

اگر مسلم حکام شرعی قاعدہ کے موافق فیصلہ کریں تو ان کا حکم بھی قضاء قاضی کے قائم مقام ہوگا لما فی امامة الشامية (قوله وتصح سلطنة متغلب) اى من تولى بالقهر والغلبة بلا مبايعة اهل الحل والعقد (رد المحتار ص ۵۱۲ ج ۱) وفی العلائية ويجوز تقلد القضاء من السلطان العادل والجائر ولو كافرا ذكره مسكين وغيره (رد المحتار ص ۳۲۲ ج ۴) وقال العلامة ابن عابدين رحمه الله تعالى اقول لو عبروهنا ای عدم اهلية الفاسق للقضاء لانسد باب القضاء خصوصا فی زماننا فلذا كان ما جرى عليه المصنف هو الاصح كما فی الخلاصة وهو اصح الاقاويل كما فی العمادية نهر وفی الفتح والوجه تنفيذ قضاء كل من ولاه سلطان ذو شوكة وان كان جاهلا فاسقا وهو ظاهر المذهب عندنا وحينئذ فيحكم بفتوى غيره (رد المحتار ص ۳۳۳ ج ۴)

③ مسلم حاکم کی عدم موجودگی میں شہادت کی شرائط ممکنہ کا اعتبار ضروری ہے:

اگر مسلم حاکم موجود نہ ہو تو کل شروط شہادت ساقط نہ ہوں گی، بلکہ شروط ممکنہ کا اعتبار ضروری ہے، چنانچہ جزئیات ذیل میں عدد کا لزوم مصرح ہے، حالانکہ عدد بھی شروط شہادت میں سے ہے، ولو كانوا ببلدة لا حاكم فيها صاموا بقول ثقة وافطروا باخبار عدلين مع العلة للضرورة (الدر المختار مع رد المحتار ص ۱۲۵ ج ۲)

فيشترط فيه ما يشترط فی سائر حقوقهم من العدالة والحرية والعدد وعدم الحد فی القذف ولفظ الشهادة والدعوى على خلاف فيه ان امكن ذلك والا فمن تقدم انهم لو كانوا فی بلدة لا قاضی فيها ولا والی فان الناس يصومون ۳۰

بقول ثقة ويفطرون باخبار عدلين (رد المحتار ص ۳۶۴ ج ۲) اس جزئیہ میں "ان امکن" اس پر دلیل ہے کہ شرعی حاکم کا وجود ضروری ہے۔

④ رؤیت ہلال میں ریڈیو اور تار کی خبر کا حکم:

ریڈیو اور تار برقی وغیرہ اگر کسی خاص ضابطہ کے تحت ہوں کہ بلا اجازت معتبر و عادل مسلم کے ان کے ذریعہ خبر شائع نہ کی جا سکتی ہو تو یہ ضرب طبول کے حکم میں ہو جائیں گے، پس ہلال فطر کے اثبات کے لئے کافی نہیں، البتہ ہلال رمضان کے اثبات اور ہلال فطر کو فیصلہ نشر کرنے کے لئے ریڈیو وغیرہ کی خبر بشرط مذکور معتبر ہوگی، قلت والظاهر انه يلزم اهل القرى الصوم بسماع المدافع او رؤية القناديل من المصر لانه علامة ظاهرة تفيد غلبة الظن وغلبة الظن حجة موجبة للعمل كما صرحوا به الخ (رد المحتار ص ۱۲۵ ج ۲)

ينبغي بقول عدل وكذا بضرب الطبول (بعد اسطر) وقد يقال ان المدفع في زماننا يفيد غلبة الظن وان كان ضاربه فاسقا لان العادة ان الموقت يذهب الى دار الحكم آخر النهار فيعين له وقت ضربه ويعينه ايضا الوزير وغيره واذا ضرب به يكون ذلك بمراقبة الوزير واعوانه للوقت المعين فيغلب على الظن بهذه القرائن عدم الخطأ وعدم قصد الافساد الخ (رد المحتار مطلب في جواز الافطار بالتحري)

⑤ حاکم مسلم کی عدم موجودگی میں عالم کا فیصلہ:

جہاں مسلم حاکم موجود نہ ہو یا وہ فیصلہ شرعی نہ کرتا ہو وہاں اگرچہ جمیع معاملات میں تو عالم ثقہ قاضی کے قائم مقام نہیں ہو سکتا البتہ رؤیت ہلال وغیرہ بعض جزئیات میں اس کا فیصلہ حکم قاضی کے قائم مقام ہو جائے گا، قال العلامة ابن عابدين رحمه الله تعالى وفي الفتح اذا لم يكن سلطان ولا من يجوز التقلد منه كما هو في بعض بلاد المسلمين غلب عليهم الكفار كقرطبة الآن يجب على المسلمين ان يتفقوا على واحد منهم (رد المحتار ص ۲۲۳ ج ۳) وفي عمدة الرعاية على شرح الوقاية والعالم الثقة في بلدة لا حاكم فيها قائم مقامه (ص ۳ ج ۲)

⑥ ہر قاضی کا فیصلہ اس کی حدود ولایت تک محدود ہے:

اولاً دو مقدمے سمجھ لئے جائیں:

(۱) ہر مرد و عورت، عالم و جاہل، شہری و بدوی تک شہادت ہلال بالخصوص پہنچانا نہ ضروری ہے اور نہ ہی یہ ممکن ہے، اس لئے شہادت صرف قاضی کے پاس ہوتی ہے، بعد ثبوت ہلال کا

اعلان بحیرہ اصری یا ضرب طبول وغیرہ کے ذریعہ مصر کے گرد و نواح میں کیا جاتا ہے، یہی چیز عوام و
خواص کے لئے دال علی ثبوت الہلال ہونے کی وجہ سے موجب عمل ہے،

(۲) ایک قاضی کے فیصلہ کی خبر محض (بلا خبر و بلا شہادت علی القضاء) دوسرے قاضی
کے لئے موجب عمل بلکہ مجوز عمل بھی نہیں،

ان دونوں مقدموں سے بطور نتیجہ قارئین کی طرف ذرا واضح یہ حاصل ہوتا ہے کہ ہر قاضی کا
فیصلہ صرف اس کی ولایت تک بذریعہ مدافع، طبول اور ریڈیو وغیرہ (بشرائط مذکورہ) نشر
کیا جا سکتا ہے، اور سامعین کے لئے موجب عمل ہے، حکومت مرکزی پاکستان کی ولایت عامہ
ہے، لہٰذا اگر مرکزی حکومت نے کسی معتبر ہلال کمیٹی کے علماء سے فیصلہ کروا کر نشر کیا تو یہ فیصلہ
سارے پاکستان کے لئے موجب عمل ہوگا، بشرطیکہ ریڈیو خاص ضابطہ کے تحت ہو، وثانیہما
لا یلزم اهل بلد رؤیة غیرهم الا ان یثبت ذلک عند الامام الاعظم فیلزم الناس
کلهم لان البلاد فی حقه کالبلد الواحد او حکمه نافذ فی الجمیع، قاله ابن الماجشون
(نیل الاوطار ص ۱۹۴ ج ۴)

⑤ اختلاف مطالع معتبر نہیں:

اختلاف مطالع کا اعتبار نہیں، بعض حضرات کا خیال ہے کہ ایسے بلاد جیسے میں اختلاف
مطالع معتبر ہونا چاہئے جن کی مسافت میں ایک دن سے زیادہ فرق ہو اس لئے کہ اس صورت میں
مہینے کے ایام انتیس سے کم یا تیس سے زیادہ ہو جائیں گے، اور یہ نصوص صریحہ کے خلاف ہے،
یہ خیال اس لئے صحیح نہیں کہ فنی تحقیق کے مطابق پوری دنیا میں ایک دن سے زیادہ فرق
ہو ہی نہیں سکتا، اگر کہیں ایسا ہوتا ہے تو اس کا سبب اختلاف مطالع نہیں بلکہ یہ عوارض
فضائیہ یا خیالات بشریہ پر مبنی ہے، قال فی التنویر واختلاف المطالع غیر معتبر علی المذهب
وقال فی العلائیة وعلیه اکثر المشایخ وعلیه الفتوی بحر عن الخلاصة وفی الشامیة
وانما الخلاف فی اعتبار اختلاف المطالع بمعنی انه هل یجب علی کل قوم اعتبار
مطلعهم ولا یلزم احد العمل بمطلع غیره ام لا یعتبر اختلافها بل یجب العمل
بالاسبق رؤیة حتی لو رؤی فی المشرق لیلة الجمعة وفی المغرب لیلة السبت
وجب علی اهل المغرب العمل بما رآه اهل المشرق فقیل بالاول واعتمده الزیلعی
وصاحب الفیض وهو الصحیح عند الشافعیة لان کل قوم مخاطبون بما عندهم

كما في اوقات الصلوة وايده في الدر بما مر من عدم وجوب العشاء والوتر على فاقد وقتهما وظاهر الرواية الثاني وهو المعتمد عندنا وعند المالكية والحنابلة لتعلق الخطاب عاما بمطلق الرؤية في حديث صوموا لرؤيته بخلاف اوقات الصلوة (رد المحتار ص[illegible] ج ۲)

وقال في الفتح ولو ثبت في مصر لزم سائر الناس فيلزم اهل المشرق برؤية اهل المغرب وقيل يختلف باختلاف المطالع (الى قوله) والاخذ بظاهر الرواية احوط (فتح القدير ص ۲۴۳ ج ۲)

وقال ابن رشد فاما مالك فان ابن القاسم والمصريين رووا عنه انه اذا ثبت عند اهل بلد ان اهل بلد آخر رأوا الهلال ان عليهم قضاء ذلك اليوم الذي افطروه وصامه غيرهم وبه قال الشافعي واحمد وروى المدنيون عن مالك ان الرؤية لا تلزم بالخبر عند اهل البلد الذي وقعت فيه الرؤية الا ان يكون الامام يحمل الناس على ذلك وبه قال ابن الماجشون والمغيرة من اصحاب مالك واجمعوا انه لا يراعى ذلك في البلدان النائية كالاندلس من الحجاز (بداية المجتهد ص ۲۰۸ ج ۱)

وقال الحافظ العسقلاني رحمه الله تعالى اذا رؤي ببلدة لزم اهل البلاد كلها وهو المشهور عند المالكية لكن حكى ابن عبد البر الاجماع على خلافه وقال اجمعوا على انه لا تراعى الرؤية فيما بعد من البلاد كخراسان والاندلس قال القرطبي قد قال شيوخنا اذا كانت رؤية الهلال ظاهرة قاطعة بموضع ثم نقل الى غيرهم بشهادة اثنين لزمهم الصوم (فتح الباري ص ۱۰۴ ج ۴)

وقال الشوكاني والذي ينبغي اعتماده هو ما ذهب اليه المالكية وجماعة من الزيدية واختاره المهدي منهم وحكاه القرطبي عن شيوخه انه اذا رآه اهل بلد لزم اهل البلاد كلها ولا يلتفت الى ما قاله ابن عبد الله من ان هذا القول خلاف الاجماع قال لانهم قد اجمعوا على انه لا تراعى الرؤية فيما بعد من البلدان كخراسان والاندلس وذلك لان الاجماع لا يتم والمخالف مثل هؤلاء الجماعة (نيل الاوطار ص ۱۹۵ ج ۴)

وقال في فتح الملهم قلت ونقل ابن رشد ايضا الاجماع في بداية المجتهد وهو مقلد لابن عبد البر في نقل المذاهب والذي يظهر عندي من سياق الفتح

ویمکن من سیاق ابن رشد انهما لم یریدا من الاجماع اجماع الائمة بل اتفاق اصحاب مالک رحمه الله تعالیٰ علی اعتبار اختلاف المطالع فی البلاد النائیة والله سبحانه وتعالیٰ اعلم (ورجح اسطر) ثم ینبغی ان یعتبر اختلافها ان لزم منه التفاوت بین البلدین باکثر من یوم واحد لان النصوص مصرحة بکون الشهر تسعة وعشرین او ثلاثین فلا تقبل الشهادة ولا یعمل بها فیما دون اقل العدد ولا فی ازید من اکثره والله سبحانه وتعالیٰ اعلم

(فتح الملهم ج ۳ ص ۱۱۳)

وفی البدائع هذا اذا کانت المسافة بین البلدین قریبة لا تختلف فیها المطالع فاما اذا کانت بعیدة فلا یلزم احد البلدین حکم الآخر لان مطالع البلاد عند المسافة الفاحشة تختلف فیعتبر فی اهل کل بلد مطالع بلدهم دون البلد الآخر وحکی عن ابی عبد الله بن ابی موسی الضریر انه استفتی فی اهل اسکندریة ان الشمس تغرب بها ومن علی منارتها یری الشمس بعد ذلک بزمان کثیر فقال یحل لاهل البلد الفطر ولا یحل لمن علی رأس المنارة اذا کان یری الشمس لان مغرب الشمس یختلف کما یختلف مطلعها فیعتبر فی اهل کل موضع مطلعه (بدائع الصنائع ص ۸۳ ج ۲)

بدائع کی پوری عبارت پر غور کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ یہاں اختلاف مطالع کے اعتبار یا عدم اعتبار کا بیان مقصود نہیں، بلکہ مقصد یہ ہے کہ اگر دو شہر آپس میں اتنے قریب ہوں کہ ان میں اختلاف مطالع کا کوئی امکان نہ ہو تو یہ دونوں ایک ہی شہر کے حکم میں ہوں گے، یعنی ایک شہر میں ثبوت رویت کی خبر دوسرے شہر والوں پر حجت ملزمہ ہوگی، وہاں کسی علیحدہ حجت کی ضرورت نہیں، جب کہ ایک شہر میں ثبوت رویت کی خبر اس کے تمام حصوں پر بلکہ شہر کے مضافات پر بھی حجت ملزمہ ہوتی ہے۔ اس کے برعکس اگر دو شہروں کا مطلع مختلف ہے تو اگرچہ یہ اختلاف مطالع عند الاحناف ظاہر الروایۃ پر معتبر نہیں، مگر ایک شہر میں ثبوت کی خبر دوسرے شہر والوں پر حجت ملزمہ نہ ہوگی، بلکہ ان کے لئے مستقل حجت (شہادۃ علی الشہادۃ یا شہادۃ علی القضاء یا استفاضہ) ضروری ہے، غرضیکہ بدائع کی عبارت سے تو بلفظ ناظرین صرف اختلاف مطالع کا تحقق ثابت ہوتا ہے جو بدیہی اور مشاہد و مسلّم ہے کوئی عاقل بھی اس سے انکار کی جرأت نہیں کر سکتا، کلام تو اس میں ہے کہ یہ اختلاف مطالع جو کہ مشاہد و مسلّم ہے ثبوت رمضان میں شرعاً معتبر بھی ہے یا نہیں؟

بدائع کی عبارت کا یہ مفہوم بالکل واضح ہے، علاوہ ازیں صاحب بدائع کا طرز بیان خود بھی

میں شہادۃ علی الشہادۃ یا شہادۃ علی القضاء یا استفاضہ کی شرط نہ لگانا نیز اعتبار مطالع میں اختلاف مشہور اور ظاہر الروایۃ میں عدم اعتبار مذکور ہونے کے باوجود اس سے مکمل سکوت اختیار کرنا اور محمد بن ابی موسیٰ الضریر کے فتویٰ سے استشہاد بھی دلیل ہے، کہ یہاں ہلال رمضان میں اختلاف مطالع کے اعتبار یا عدم اعتبار کا مسئلہ بیان کرنا مقصود نہیں، واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

⑧ فیصلہ کے نشر میں شہادت ضروری نہیں:

قاضی کا فیصلہ اس کی حدود ولایت میں نشر کرنے کے لئے شہادت کی ضرورت نہیں صرف خبر معتبر کافی ہے، البتہ ایک قاضی کا فیصلہ اس کی حدود ولایت سے خارج دوسرے قاضی کی ولایت میں تب قبول ہوگا کہ شہادۃ علی الشہادۃ یا شہادۃ علی القضاء یا استفاضہ ہو، قال فی العلائیۃ: شهدوا انه شهد عند قاضي مصر كذا شاهدان برؤية الهلال في ليلة كذا وقضى القاضي به ووجد استجماع شرائط الدعوى قضى اي جاز لهذا القاضي ان يحكم بشهادتهما لان قضاء القاضي حجة وقد شهدوا به لا لو شهدوا برؤية غيرهم لانه حكاية نعم لو استفاض الخبر في البلدة الاخرى لزمهم على الصحيح من المذهب، وفي الشامية (قوله اي جاز) الظاهر ان المراد بالجواز الصحة فلا ينافي الوجوب تأمل والصيام تحت (قوله لانه حكاية) وكذا لو شهدوا برؤية غيرهم وان قاضي تلك المصر امر الناس بصوم رمضان لانه حكاية لفعل القاضي ايضا وليس بحجة بخلاف قضائه (رد المحتار ج ۲ ص ۱۳۰) وفي الهندية لو شهد جماعة ان اهل بلد قد رأوا هلال رمضان قبلكم بيوم فصاموا وهذا اليوم ثلاثون بحسابهم ولم ير هؤلاء الهلال لا يباح لهم فطر غد ولا تترك التراويح في هذه الليلة لانهم لم يشهدوا بالرؤية ولا على شهادة غيرهم وانما حكوا رؤية غيرهم ولو شهدوا ان قاضي بلدة كذا شهد عنده اثنان برؤية الهلال في ليلة كذا وقضى بشهادتهما جاز لهذا القاضي ان يحكم بشهادتهما لان قضاء القاضي حجة وقد شهدوا به، (عالمگیریۃ مجیدی ص ۱۸۲ ج ۱، فتح القدیر ص ۲۴۳ ج ۲)

مذکورہ بالا جزئیات سے اور استفاضہ کی تعریف میں کتب کی عبارت سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ ہلال صوم و فطر میں بہرحال کوئی فرق نہیں، مگر غور کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ ثبوت ہلال رمضان میں یہ شرائط نہیں۔

ذکر شہادۃ علی القضاء مع اجتماع شرائط سے معلوم ہوا کہ حالتِ صحو اور غیم میں کوئی فرق نہیں کیونکہ حالتِ غیم میں تو محل عدد میں بھی نہ شہادت ہوتی ہے اور نہ اس پر قضاء مرتب ہوتی ہے اور حالتِ صحو میں قولِ راجح پر شہادۃِ عدلین کافی ہے، کما سیجیٔ، البتہ جزئیات مذکورہ حالتِ غیم کے حکم سے ساکت ہیں، بحالتِ غیم ہلالِ رمضان میں شرائط مذکورہ کی ضرورت خلافِ عقل ہونے کے ساتھ خلافِ نقل بھی ہے، لاطلاق ما قال ابن عابدین رحمہ اللہ تعالیٰ فی تنبیہ الغافل والوسنان وتمامہ قبل لہلال رمضان خبر ولو عبد عدل (الی قولہ) ولو کان شہادتہ علی شہادۃ مثلہ اھ وفی البدائع وتقبل شہادۃ واحد عدل علی شہادۃ واحد عدل فی ہلال رمضان بخلاف الشہادۃ علی الشہادۃ فی سائر الاحکام انہا لا تقبل ما لم یشہد علی شہادۃ رجل واحد رجلان او رجل وامرأتان لما ذکرنا ان ہذا من باب الاخبار لا من باب الشہادۃ ویجوز اخبار رجل عدل عن عدل کما فی روایۃ الاخبار (بدائع الصنائع ص ۸۱ ج ۲)

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

⑨ استفاضہ کی تحقیق:

اصل مقصد یہ ہے کہ ایک شہر کے قاضی کے فیصلہ کا دوسرے شہر والوں کو یقین ہو جائے، اور حصولِ یقین کی تین صورتیں ہیں:

(۱) شہادۃ علی الشہادۃ (۲) شہادۃ علی القضاء (۳) خبرِ مستفیض

اس سے معلوم ہوا کہ استفاضہ میں شہادۃ علی القضاء یا شہادۃ علی الشہادۃ ضروری نہیں اور نہ ہی مختلف شہروں سے خبروں کا آنا شرط ہے، صرف ایک شہر سے ثبوتِ ہلال کی خبرِ مستفیض کافی ہے، قال فی الشامیۃ (قولہ نعم الخ) فی الذخیرۃ قال شمس الائمۃ الحلوانی الصحیح من مذہب اصحابنا ان الخبر اذا استفاض وتحقق فیما بین اہل البلدۃ الاخری یلزمہم حکم ہذہ البلدۃ اھ وقلت ووجہ الاستدراک ان ہذہ الاستفاضۃ لیس فیہا شہادۃ علی قضاء قاض ولا علی شہادۃ لکن لما کانت بمنزلۃ الخبر المتواتر وقد ثبت بہا ان اہل تلک البلدۃ صاموا یوم کذا لزم العمل بہا لان البلدۃ لا تخلو عن حاکم شرعی عادۃ فلابد من ان یکون صومہم مبنیا علی حکم حاکمہم الشرعی فکانت تلک الاستفاضۃ بمعنی نقل الحکم المذکور وہی اقوی من الشہادۃ بان اہل تلک البلدۃ رأوا الہلال وصاموا لانہا لا تفید الیقین فلا ینافی ما قدمناہ اما لو

لی تأمل،

تنبیہ: قال الرحمتی معنی الاستفاضة ان تأتی من تلک البلدة جماعات متعددون کل منهم یخبر عن اهل تلک البلدة انهم صاموا عن رؤیة لا مجرد الشیوع من غیر علم بمن اشاعه (وبعد اسطر) ویشیر الیه قول الذخیرة اذا استفاض وتحقق فان التحقق لا یوجد بمجرد الشیوع (رد المحتار ج ۲ ص ۱۲۹)

استفاضہ اور تواتر میں فرق

علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ کی عبارت مذکورہ اور امام ابن الہمام اور علامہ شامی رحمہما اللہ تعالیٰ کی تحقیق ذیل سے معلوم ہوتا ہے کہ استفاضہ اور تواتر میں کوئی فرق نہیں، جس طرح تواتر میں اتنے افراد کی خبر ضروری ہے کہ صدق کا یقین ہو جائے اسی طرح استفاضہ میں بھی یہی شرط ہے۔

قال العلامة ابن عابدین رحمه الله تعالیٰ فی تنبیه الغافل والوسنان بعد نقل عبارة الفتح التی قدمناها فی الجواب الثامن عن الهندیة، قلت لکن قال فی الذخیرة البرهانیة ما نصه قال شمس الائمة الحلوانی رحمه الله تعالیٰ الصحیح من مذهب اصحابنا ان الخبر اذا استفاض وتحقق فیما بین اهل البلدة الاخری یلزمهم حکم هذه البلدة (اه) ونقل مثله الشیخ حسن الشرنبلالی فی حاشیة الدرر عن المغنی وعزاه فی الدر المختار الی المجتبی وغیره مع ان هذه الاستفاضة لیس فیها حکم ولا شهادة لکن لما کانت الاستفاضة بمنزلة الخبر المتواتر وقد ثبت بها ان اهل تلک البلدة صاموا یوم کذا لزم العمل بها لان المراد بالبلدة فیها حاکم شرعی کما هو العادة فی البلاد الاسلامیة فلا بد ان یکون صومهم مبنیا علی حکم حاکمهم الشرعی فکانت تلک الاستفاضة بمعنی نقل الحکم المذکور وهی اقوی من الشهادة بان اهل تلک البلدة رأوا الهلال یوم کذا وصاموا یوم کذا لانها مجرد شهادة لا تفید الیقین فلذا لم تقبل الا اذا شهدت علی الحکم او علی شهادة غیرهم لتکون شهادة معتبرة شرعا والا فهی مجرد اخبار واما الاستفاضة فانها تفید الیقین کما قلنا ولذا قالوا اذا استفاض وتحقق الخ فلا ینافی ما تقدم عن فتح القدیر ولو سلم وجود المنافاة فالعمل علی ما صرحوا بتصحیحه والامام الحلوانی من اجل

عیون الرجال ــــــــــ ۱۲

مشایخ المذهب وقد صرحوا بانه الصحیح من مذهب اصحابنا وکتبت فیما علقته علی البحر ان المراد بالاستفاضة تواتر الخبر من الواردین من تلک البلدة الاخری لا مجرد الاستفاضة لانها قد تکون مبنیة علی اخبار رجل واحد فیشیع الخبر عنه ولا شک ان هذا لا یکفی بدلیل قولهم اذا استفاض وتحقق الخبر فان التحقق لا یکون الا بما ذکرنا، والله تعالی اعلم. (رسائل ابن عابدین ص ۲۵۲ ج ۱)

مگر تحقیق نظر اور کتب اصول حدیث وفقہ کی طرف مراجعت سے ثابت ہوتا ہے کہ استفاضہ اور تواتر میں فرق ہے، قال الحافظ العسقلانی رحمه الله تعالی والثانی وهو اول اقسام الآحاد ماله طرق محصورة باکثر من اثنین وهو المشهور عند المحدثین سمی بذلک لوضوحه وهو المستفیض علی رأی جماعة من ائمة الفقهاء (شرح نخبة الفکر ص۳)، وقال صدر الشریعة رحمه الله تعالی ای المشهور علم طمانینة وهو علم تطمئن به النفس وتظنه یقینا لکن لو تأمل حق التأمل علم انه لیس بیقین (توضیح) وقال العلامة التفتازانی فی شرح القول المذکور فالطمانینة رجحان جانب الظن بحیث یکاد یدخل فی حد الیقین (تلویح) ان عبارات سے ثابت ہوا کہ خبر مستفیض اخبار آحاد کی قسم ہے جو خبر متواتر کا قسیم ہے، اس میں مخبرین کی اتنی کثرت ضروری نہیں کہ جس سے یقین کامل ہو جائے اور عقلاً احتمالِ خطا باقی نہ رہے، جس سے غلبۂ ظن حاصل ہو جائے۔

اس سے معلوم ہوا کہ علامہ شامی رحمہ اللہ تعالی کے کلام میں یقین سے یقین لغوی یعنی علم قطعی مراد نہیں، بلکہ یقین شرعی یعنی ظن غالب مراد ہے، اور "تواتر الخبر من الواردین" میں تواتر سے اصطلاحی تواتر مراد نہیں، بلکہ کثرۃ الاخبار مراد ہے، اسی لئے علامہ شامی رحمہ اللہ تعالی نے استفاضہ کو "الخبر المتواتر" نہیں فرمایا، بلکہ "بمنزلة الخبر المتواتر" فرمایا ہے۔ شریعت میں سوائے تکفیر کے اور کسی حکم میں بھی علم قطعی کی شرط نہیں لگائی گئی، بلکہ تمام احکام کا مدار غلبۂ ظن ہی پر رکھا گیا ہے، اگرچہ احکام میں اختلاف نوعیت کے لحاظ سے غلبۂ ظن کے درجات بھی متفاوت رکھے گئے ہیں، کہیں محض خبر عدل، کہیں دو عادلوں کی شہادت، کہیں چار کی اور کہیں جم غفیر۔ علامہ شامی رحمہ اللہ تعالی کی عبارت میں "جماعات متعددۃ" بھی تواتر کو مستلزم نہیں، چنانچہ علمائے "جمع عظیم یقع العلم بخبرهم" کی تشریح اس طرح منقول ہے: "العلم الشرعی وهو غلبة الظن"، وقال ابن عابدین رحمه الله تعالی

[illegible] ۔ ——— ۱۲۰

تحت قوله وقبل بلا علة) انه ليس المراد هنا بالجمع العظيم ما يبلغ مبلغ التواتر الموجب للعلم القطعي، (رد المحتار ص ۱۰۰ ج ۲)

یہاں علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اولاً خود تصریح فرمادی ہے کہ جمع عظیم سے خبر متواتر مراد نہیں، پھر ثانیاً وھو مفوض الی رأی الامام کے تحت سراجیہ سے حاکم کی طمانینت قلب نقل کی ہے، پھر ثالثاً بحر اور فتح سے تعبیر بالتواتر نقل کی ہے، اس مجموعہ سے بالکل واضح ہوجاتا ہے کہ یہاں تواتر سے اصطلاحی تواتر مراد نہیں، بلکہ اتنی کثرت مراد ہے جو موجب طمانینت ہو، شامیہ کی یہ پوری عبارت جواب نمبر ۱ کے آخر میں جمع عظیم کی تعریف کے تحت نقل کی گئی ہے، جب اخبار رؤیت میں تواتر شرط نہیں تو استفاضہ میں بطریق اولیٰ تواتر کی شرط نہ ہوگی، کیونکہ اخبار رؤیت میں لزوم کثرت وعدم اکتفاء بشہادۃ العدلین کی بنا یہ ہے کہ پورے شہر میں سے صرف دو تین افراد کے سوا اور کسی کو چاند نظر نہ آنا خلاف ظاہر ہے، مگر استفاضہ میں عدم قبول کی یہ وجہ موجود نہیں، اس لئے کہ یہاں رؤیت کی خبر نہیں، بلکہ دوسرے علاقہ میں حاکم کے فیصلہ کی خبر ہے، اس خبر کا چند افراد میں محدود ہونا خلاف ظاہر نہیں، بالخصوص جبکہ اس خبر کا تعلق بھی دوسرے علاقہ سے ہے، پس مخبر یہ علاقہ کے لوگوں کا چاند نہ دیکھنا اُن کی خبر میں قادح نہیں۔

استفاضہ کے لئے کوئی عدد معین نہیں

شرح تحفۃ الفکر کی گذشتہ عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ تحقیق استفاضہ کے لئے تین افراد کی خبر کافی ہے، اور علامہ شامی رحمہ اللہ کی عبارت "جماعات متعددون" میں اگر دو افراد کو بھی جماعت قرار دیا جائے تو مجموعہ چار ہوئے، اور اگر تین افراد کی تین جماعتیں مراد لی جائیں تو نو افراد ہوئے، مگر حقیقت یہ ہے کہ استفاضہ کے لئے کوئی عدد متعین نہیں، بلکہ جتنی اخبار سے بھی حاکم کو غلبۂ ظن متحقق ہوجائے وہ خبر مستفیض ہے۔

⑩ ہلال رمضان خبر واحد پر مبنی ہو تو تکمیل ثلاثین کے بعد افطار کا حکم:

جزئیات ذیل سے افطار کی تعمیم وعدم افطار کی آخر کو ترجیح معلوم ہوتی ہے، اذا صاموا بشهادة الواحد واكملوا ثلاثين يوما ولم يروا هلال شوال لا يفطرون فيما روى الحسن عن ابى حنيفة رحمهما الله تعالى للاحتياط وعن محمد رحمه الله تعالى انهم يفطرون كذا فى التبيين، وفى غاية البيان قول محمد اصح كذا فى النهر

وقال شمس الائمة هذا الاختلاف فيما اذا لم يروا هلال شوال والسماء مصحية فاما اذا كانت متغيمة فانهم يفطرون بلا خلاف كذا في الذخيرة وهو الاشبه هكذا في التبيين (عالمگيرية مصري ص ۱۸۱ ج ۱)

ومنهم من استحسن ذلك في عدم قبوله في صحو وفي قبوله لغيم اخذا بقول محمد رحمه الله تعالى (رشد الفقير ص ۲۰ ج ۲)

وقال في شرح التنوير ولو صاموا بقول عدل حيث يجوز وغم هلال الفطر لا يحل على المذهب خلافا لمحمد رحمه الله تعالى كذا ذكره المصنف لكن نقل ابن الكمال عن الذخيرة انه ان غم هلال الفطر حل اتفاقا وفي الزيلعي الاشبه ان غم حل والا لا (وفي الشامية) (قوله لكن الخ) استدراك على ما ذكره المصنف من ان خلاف محمد فيما اذا غم هلال الفطر بل المصرح به في الذخيرة وكذا في المعراج عن المجتبى ان حل الفطر هنا محل وفاق وانما الخلاف فيما اذا لم يغم ولم ير الهلال فعندهما لا يحل الفطر وعند محمد يحل كما قال شمس الائمة الحلواني درر الشرنبلالي في الامداد وقال في غاية البيان وجه قول محمد وهو الاصح ان الفطر ما ثبت بقول الواحد ابتداء بل بناء وتبعا فكم من شيء يثبت ضمنا ولا يثبت قصدا وسئل عنه محمد فقال ثبت الفطر بحكم القاضي لا بقول الواحد يعني لما حكم في هلال رمضان بقول الواحد ثبت الفطر بناء على ذلك بعد تمام الثلاثين قال شمس الائمة في شرح الكافي وهو نظير شهادة القابلة على النسب فانها تقبل ثم يفضي ذلك الى استحقاق الميراث والميراث لا يثبت بشهادة القابلة ابتداء (قوله وفي الزيلعي الخ) نقله لبيان فائدة لم تعلم من كلام الذخيرة وهي ترجيح عدم حل الفطر ان لم يغم شوال لتعبيره عنه بالاشبه لان الاشبه من الفاظ الترجيح لكنه مخالف لما علمته من تصحيح غاية البيان لقول محمد رحمه الله تعالى بالحل نعم حمل في الامداد ما في غاية البيان على قول محمد بالحل اذا غم شوال بناء على تحقق الخلاف الذي نقله المصنف وقد علمت عدمه وحينئذ فما في غاية البيان في غير محله لانه ترجيح لما هو متفق عليه تأمل (رد المحتار ص ۱۲۳ ج ۲)

وايضا فيه لو تم عدد رمضان ولم ير هلال الفطر لعلة يحل الفطر وان

ثبت رمضان بشهادة واحد لثبوت الفطر تبعا وان کان لا یثبت قصدا[۱] الا بالعدد والعدالة

ھذا ما ظهر لی رحمه المحتار ص ۳۲۴ ج ۲)

وقال الرافعی (قوله وفی ترجیح عدم حل الفطران لم یغم الخ) وهوان اشعر بالترجیح یشعر بالخلاف فی المسألة مع خلاف عبارة الذخیرة وعبارة جمیع الروایات المنقولة فی السندی لشهدا بالخلاف ایضا حیث قال رقی الامداد عن جمیع الروایات عن الزاهدی لو قبل الامام شهادة واحد واتموا ثلاثین ثم غم علیهم هلال شوال قال الامام والثانی رحمهما الله تعالی یصومون من الغد وقال محمد رحمه الله تعالی یفطرون وقال شمس الائمة الحلوانی الخلاف فیما اذا لم یر هلال شوال والسماء مصحیة فان کانت متغیمة یفطرون بلا خلاف اه والاظهر ان ما نقله عن الزیلعی انما ذکره لبیان ان ما ذکره عن المصنف من تصحیح عدم الحل صحح الزیلعی خلافه وان ما حکاه ابن الکمال من الاتفاق حکی الزیلعی ما یدل علی الخلاف (قوله اذا غم شوال الخ) الاولی ان یقول وهل ما اذا غم شوال الخ وعبارة الامداد او (قوله فی غایة البیان قول محمد هو الاصح یحمل علی ما قاله الکمال اه (قوله وحینئذ فما فی غایة البیان فی غیر محله) لکن علی ما علمت من عبارة الزیلعی وجمیع الروایات تکون عبارة غایة البیان خلافیة علی ما حملها علیه فی الامداد فتأمل (التحریر المختار لرد المحتار ص ۱۴۱ و ۱۴۲ ج ۱)

(۱۱) حکم بشہادۃ فاسق :

فاسق کے صدق کا اگر ظن غالب ہو تو اس کی شہادت قبول کرنا جائز ہے، بلکہ بعض حالات میں ضروری ہے، قال فی العلائیة والعدالة لوجوبه لا لصحته خلافا للشافعی رحمه الله تعالی فلو قضی بشهادة فاسق نفذ واثم فتح الا ان یمنع منهای من القضاء بشهادة الفاسق الامام فلا ینفذ (الی قوله) وما فی القنیة والمجتبی من قبول ذی المروءة الصادق فقول الثانی بحر وضعفه الکمال بانه تعلیل فی مقابلة النص فلا یقبل اقره المصنف،

وفی الشامیة (قوله بشهادة فاسق نفذ) قال فی جامع الفتاوی واما شهادة الفاسق فان تحری القاضی الصدق فی شهادته تقبل والا فلا اه فتال دف

---

[۱] کما سیأتی عن الاستاذ المحترم المفتی محمد شفیع رحمه الله تعالی ۱۲ منه

الفتاوى الخانية يقضى اذا غلب على ظنه صدقه وهو مما يحفظ ومر اول كتاب القضاء وظاهر قوله وهو مما يحفظ اعتماده اهـ (قوله النص) وهو قوله تعالى وأشهدوا ذوى عدل منكم واجماعه اول القضاء (رد المحتار ص ۵۱۶ ج ۴)

کتاب القضاء کی ابتداء میں علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ نے یہی تحقیق لکھی ہے کہ فاسق کے صدق کا ظن غالب ہو تو اس کی شہادت قبول کرنا جائز ہے، قاضی آثم نہ ہوگا۔

(رد المحتار ص ۳۰۵، ۵۱۶ ج ۴)

۱۲ خبر ہلال دیانات سے ہے یا کہ معاملات سے؟

خبر ہلال رمضان دیانات سے ہے اور خبر ہلال عیدین معاملات میں سے، قال العلامة الشامی رحمه الله تعالى في رسالته تنبيه الغافل والوسنان على احكام هلال رمضان قال علمائنا الحنفية رحمهم الله تعالى في كتبهم ويثبت رمضان برؤية هلاله وباكمال عدة شعبان ثم ان كان في السماء علة من نحو غيم او غبار قبل لهلال رمضان خبر واحد عدل في ظاهر الرواية او مستور على قول مصحح لا ظاهر الفسق اتفاقا سواء جاء ذلك المخبر من المصر او من خارجه ولو كانت شهادته على شهادة مثله او كان قنا او انثى او محدودا في القذف تاب في ظاهر الرواية لانه خبر ديني فاشبه رواية الاخبار ولهذا لا يشترط لفظ الشهادة ولا الدعوى ولا الحكم ولا مجلس القضاء وشرط لهلال الفطر مع علة في السماء شرط الشهادة لانه تعلق به نفع العباد وهو الفطر فاشبه حقوقهم فاشترط له ما اشترط لها من العدد والعدالة والحرية وعدم كونه محدودا في القذف وان تاب ولفظ الشهادة والدعوى على خلاف فيه الا اذا كانوا في بلدة لا حاكم فيها فانهم يصومون بقول ثقة ويفطرون بقول عدلين للضرورة وهلال الاضحى وغيره كالفطر (مجموعة رسائل ابن عابدين ص ۲۳۳ ج ۱)

۱۳ بحالت صحو خبر واحد و شہادۃ عدلین کا حکم؟

قال في الشامية ايدي قول الطحاوي بقبول الشهادة في الصحو اذا جاء من المصر او كان على مكان مرتفع في المصر وقد منا ترجيحه وما هنا يرجحه ايضا فقد قال في الفتح في قول الهداية اذا قبل الامام شهادة الواحد وصاموا الخ هكذا الرواية على الاطلاق (رد المحتار ص ۱۳۹ ج ۲)

وحقق العلامة الشامی رحمه الله تعالی قبل العبارة المذکورة بورقة علی صفحة ۱۲۰ و ۱۲۱ ما یفید انه یکتفی بشاهدین مطلقا فی الغیم والصحو لهلالی رمضان وشوال ویکتفی ایضا بواحد فی حالة الصحو ان جاء من خارج البلد او کان علی مکان مرتفع لهلال رمضان خاصة، عبارة الشامیة فی الاکتفاء بشاهدین بالاطلاق انها شاملة لهلال شوال ورمضان ولم یصرح بهلال شوال واما صاحب البحر فانه قد اتی بروایة صریحة فی هلال الفطر، ان عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ ہلال رمضان وشوال دونوں میں بحالت صحو شہادت عدلین کافی ہے اور بحالت صحو خارج بلد یا مکان مرتفع سے آنے والے واحد عادل کی خبر صرف ہلال رمضان میں معتبر ہے، ہلال شوال میں نہیں۔

مگر آجکل عام بے احتیاطی کی وجہ سے بحالت صحو ہلال شوال میں شہادت عدلین پر فیصلہ نہیں کرنا چاہئے، نیز علامہ شامی رحمہ اللہ تعالی نے قبول کی علت تکاسل الناس عن رؤیة الہلال بیان کی ہے، اور آجکل ہلال عید کی رؤیت میں تکاسل نہیں پایا جاتا، لہٰذا اس صورت میں جمع عظیم کی رؤیت ضروری ہے۔

جمع عظیم کی تعریف:

اس کی تعداد میں مختلف اقوال ہیں، مگر صحیح یہ ہے کہ عدد کی تعیین نہیں، بلکہ دیکھنے والوں کی اتنی کثرت مراد ہے جس سے حاکم کو غلبۂ ظن حاصل ہو جائے، تاہم تحصیل غلبۂ ظن میں مزید بصیرت کے لئے عبارات فقہاء رحمہم اللہ تعالی میں مذکور عدد کو بھی ملحوظ رکھنا چاہئے، قال فی العلائیة وهو مفوض الی رأی الامام من غیر تقدیر بعدد علی المذهب وفی الشامیة قال فی السراج لم یقدر لهذا الجمع تقدیر فی ظاهر الروایة وعن ابی یوسف رحمه الله تعالی خمسون رجلا کالقسامة وقیل اکثر اهل المحلة وقیل من کل مسجد واحد او اثنان وقال خلف بن ایوب خمسمائة ببلخ قلیل والصحیح من هذا الاقاویل مفوض الی رأی الامام ان وقع فی قلبه صحة ما شهدوا به وکثرت الشهود امر بالصوم اهـ وکذا صححه فی المواهب وتبعه الشرنبلالی وفی البحر عن الفتح والحق ما روی عن محمد وابی یوسف

مه اب ہمارے زمانہ میں رؤیت ہلال میں تسابق کے شوق کا دور شروع ہو گیا ہے، اس لئے ہلال رمضان میں بھی بحالت صحو جمع عظیم کی شرط لازم ہے۔ (نظر ثانی ۱۴۱۵ھ) ۱۲ منه

جمادی الاولی ـــ ۱۰

ایضاً ان المبرق یعنی الخبر بغیر تواتر من کل جانب، او ولی النظر انه موافق لما صححه فی شرح تامل ورد المحتار ص ۱۰۱ ج ۲۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم وعلمه اتم واحکم۔

رشید احمد

۲۰ محرم سنہ ۸۷ھ

علماء کا متفقہ فیصلہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی خیر خلقه وخاتم انبیائه سیدنا ومولانا محمد وآله واصحابه اجمعین۔

تمہید: سال بسال سے دیکھا جا رہا ہے کہ عید و رمضان میں عام مسلمین میں شدید اختلاف ہوتا ہے ایک ہی شہر میں بعض روزے سے ہوتے ہیں اور بعض عید منا رہے ہیں، بلکہ اسی پر بس نہیں ہوتا بلکہ ہر ایک اپنے مخالف فریق پر طعن وتشنیع کرنے میں پوری ہمت صرف کرتا ہے سب سے زیادہ اختلاف کا موجب ریڈیو پر نشر شدہ خبریں ہوتی ہیں، ریڈیو کے ذریعہ جب کسی شہر میں خبر پہنچتی ہے، تو بعض حضرات بغیر تحقیق کے اس پر عمل کرنے لگتے ہیں، اور بعض اس کی شرعی خامیوں کو دیکھ کر مجتنب رہتے ہیں، اس خرابی اختلاف کے پیش نظر مدرسہ عربیہ قاسم العلوم کچہری روڈ ملتان شہر کے مدیر محترم حضرت مولانا محمد شفیع صاحب نے اس خاص علمی مسئلہ کو حل کرنے کے لئے قدم اٹھایا، اور اطراف پاک وہند میں اس بارہ میں سوالات بھیجے، جوابات آنے پر چونکہ بعض میں اختلاف پایا جاتا تھا اس کو رفع کرنے کے لئے ۱۹، ستمبر سنہ ۵۶ء کو مدرسہ قاسم العلوم ہی میں مفتیان پاکستان کا ایک اجتماع کرایا، اور دو دن مکمل بحث کے بعد جو فیصلہ ہوا اس کو ہندوستان کے مشہور دارالعلوموں نیز پاکستان کے ان علماء کی خدمت میں جو اجتماع میں بوجہ اعذار کے تشریف نہ لا سکے تھے بذریعہ ڈاک روانہ کر دیا، سب کی تصدیقات حاصل کرنے کے بعد اب اس کو مسلمانوں کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

نیز حکومت سے بھی گزارش ہے کہ وہ مستند علماء دین کی جماعت کے فیصلہ کے بعد ہی اس کو نافذ کرنے کے لئے بذریعہ ریڈیو اعلان کرے، اور محکمہ اطلاعات کو پابند کرے کہ وہ رؤیت کے بارے میں بغیر رؤیت ہلال کمیٹی کے فیصلہ کے کوئی خبر نشر نہ کرے، تاکہ عامۃ المسلمین کے فرائض میں کوئی نقصان نہ آئے۔

خلاصۂ از مقتبس

اجتماع علماء منعقدہ ملتان مورخہ ۱۰ ستمبر ۱۹۵۸ء مدرسہ قاسم العلوم ملتان کی دعوت پر مسائل پیش آمدہ رویت ہلال پر غور و خوض اور بحث و تمحیص کے بعد جو متفقہ مسائل طے ہوئے وہ بغیر اعادۂ سوالات کے حسب ذیل ہیں، اس میں اس بات کی پوری کوشش کی گئی ہے کہ متون معروفہ و مشہورہ کی مفتی بہ روایات کے خلاف کوئی بات نہ ہو اور اختلافات و خود رائی کی پوری طرح [illegible] ہوئی ہے اس کا انسداد ہو سکے، ان جوابات اور طے شدہ مسائل کی ایک ایک کاپی اور تمام اطراف و اکناف کے علماء کرام کی خدمت میں پیش کی جائے گی، اور اتفاق و تصدیق کے بعد جو بات حکومت سے متعلق ہے اس کی منظوری کی استدعا حکومت سے کی جائے گی۔ وباللہ التوفیق

(۱) ہلال رمضان بحالت مطلع ابر واحد سے خواہ وہ عادل ہو یا مستور الحال ہو ثابت ہو سکتا ہے، اس میں شہادت شرط نہیں، البتہ ہلال عیدین میں شہادت شرعیہ کا ہونا ضروری ہے یعنی کم از کم دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں ایسی ہوں جو دیندار ہوں، اور اشہد سے حاکم یا جماعت مجاز کے سامنے باقاعدہ شہادت ادا کریں۔ بحالت صحو رویت ہلال میں جم غفیر کے ایسے اخبار جو موجب ظن غالب ہوں ضروری ہوں گے، اور ان کا شمار کیا جائے گا، لیکن اگر ہلال رمضان میں بستی سے باہر آتے ہوئے یا مقام مرتفع سے دیکھنے والے ایک عادل شخص کی یا بستی کے دو عادلوں کی شہادت سے بھی اطمینان حاصل ہو جائے تو اس پر حکم دیا جا سکتا ہے۔

(۲) ریڈیو، ٹیلیفون، تار برقی، خط اور اخبار میں یہ فرق ہے کہ تار برقی اور اخبار سوائے صورت استفاضہ کے ہرگز معتبر نہیں، البتہ خط بشرط معرفۃ الکاتب و عدالتہ اور ریڈیو و ٹیلیفون بشرط معرفۃ صاحب الصوت و عدالتہ درجۂ اخبار میں معتبر ہوں گے، شہادت میں نہیں ہوں گے۔

(۳) مجلس نے یہ بھی طے کیا ہے کہ اگر جماعت علماء مجاز کے سامنے تحت احکام شرعیہ ہلال صوم یا فطر ثابت ہو جائے اور اس کا اعلان ریڈیو میں حاکم مجاز کی طرف سے ہو تو اس کے

عــہ۱ یہ فیصلہ اس بنا پر کیا گیا تھا کہ لوگ چاند دیکھنے میں غفلت کرتے ہیں، مگر اب بھی زمانہ میں مسائل ظاہر الروایۃ کا شوق پیدا ہو رہا ہے اس لئے ہو سکے تو ہلال رمضان میں بھی جم غفیر کی رویت شرط ہو (رفع نزاع محرم ۱۳۸۷ھ) رشید احمد

عــہ۲ ریڈیو میں بشرط اخبار بمذہب کے لئے یہ فیصلہ نشر کرنے کے لئے یہ شرط نہیں، بلکہ اتنا کافی ہے کہ ریڈیو نائب امتناع الظلم کے تحت ہو جیسا کہ آگے آ رہا ہے ۱۲ رشید احمد

حدود ولایت میں سب کو اس پر عمل کرنا لازم ہوگا۔

(۴) ہلالِ صوم یا ہلالِ فطر دونوں میں دیہات و رساتیق کے لوگوں کو جہاں علماء یا قضاۃ نہیں ہیں صرف افواہوں پر اعتماد کرکے روزہ اور عید جائز نہیں، بلکہ اس کے لئے ضروری ہے کہ عادل اور ثقہ ذمہ داری کے ساتھ یہ بیان دے کہ فلاں جگہ میں نے مل کر فیصلہ سنا ہے، یا وہاں متفقہ طور پر عید ہوئی اور میں خود پڑھ کر آیا ہوں، یا میں نے مشاہدہ کیا ہے یا میں نے منادی سنی ہے اور اس کے لئے ایسے بیان پر اہلِ قریہ کو غلبۂ ظن بھی حاصل ہو اس پر عمل کرنا درست ہوگا۔

(۵) رؤیتِ ہلال میں جہاں جہاں استفاضہ کا لفظ آیا ہے اس میں بھی بے سروپا افواہوں یا مبہم اور غیر معروف لوگوں کے خطوط کا اعتبار نہیں، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ حاکم وقت یا اس کے نائب مجاز (یعنی جماعتِ علماء یا عالم ثقہ) کے پاس متعدد خبر دینے والے خبر رؤیتِ ہلال کو بالشرائط المرقومہ فی الجواب السابق بیان کریں، اور اس سے مجیب کو طمانیتِ قلب اور غلبۂ ظن حاصل ہو جائے تو اس صورت میں یہ طریق موجب عمل قرار دیا جائے گا اس کے علاوہ استفاضہ میں یہ صورت بھی داخل ہے کہ حاکم یا نائب یا عالم ثقہ فی العشرۃ کے پاس متعدد خطوط یا ٹیلیفون یا تار توسط یا بغیر توسط کے ایسے اور اتنے آجائیں کہ اس کی طمانیتِ قلب ہو سکے۔

(۶) اگر ہلالِ رمضان میں خبر واحد عادل یا خط وغیرہ پر اعتماد کرتے ہوئے روزہ کا حکم دیا گیا اور تیس روزے پورے ہو جانے کے بعد بھی رؤیتِ ہلال نہ ہوئی تو بحالتِ صحو عید کرنی جائز نہیں، اور بحالتِ علت عید کرنی جائز ہے۔

(۷) اگر کسی جگہ حاکم وقت یا اس کے نائب (جماعتِ علماء یا عالم ثقہ فی القریہ) نے رؤیتِ ہلال کے باب میں فاسق کی شہادت کا غلبۂ ظن کے بعد اعتبار کرتے ہوئے حکم دیدیا تو نتیجۃً وہ سب کے لئے قابلِ تسلیم سمجھا جائے گا، لیکن اس کو ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔

(۸) اختلافِ مطالع صوم و فطر میں بشرطیکہ دوسری جگہ ثبوتِ رؤیت بطریق موجب ہو معتبر نہیں ہوگا۔

(۱) صدر مجلس:
خیر محمد عفا اللہ عنہ، خیر المدارس ملتان

(۲) محررہ:
محمود عفا اللہ عنہ مفتی قاسم العلوم ملتان

ارکانِ مجلس:

(۳) رشید احمد دارالافتاء والارشاد کراچی

(۴) محمد عبد اللہ خادم دارالافتاء خیر المدارس ملتان

(۵) محمد صادق عفا اللہ عنہ ناظم امور مذہبیہ بہاولپور

(۶) محمد ناظم ندوی شیخ الجامعۃ العباسیہ بہاولپور

(۷) محمد الحسن عفی عنہ خطیب جامع مسجد مظفر گڑھ

(۸) عبد الرحمن عفی عنہ مفتی دار الافتاء محکمہ امور مذہبیہ بہاولپور

(۹) محمد چراغ عفی عنہ مدرس عربیہ گوجرانوالہ

(۱۰) محمد شفیع غفرلہ مہتمم مدرسہ قاسم العلوم ملتان

(۱۱) جلال الدین غفرلہ مردانی مدرس خیر المدارس ملتان

(۱۲) محمد برکت کشمیری مدرس خیر المدارس ملتان

(۱۳) جواب ۲ میں مجھے ابھی تک شرح صدر نہیں، تحقیق کروں گا، باقی جزئیات میں متفق ہوں
عطا محمد

(۱۴) بشرح صدر مولانا عطا محمد صاحب کے ۲ میں تامل ہے، باقی سے متفق ہوں۔
فقیر محمد شمس الدین ہزاروی

مصدقین:

(۱۵) ظفر احمد عثمانی تھانوی عفا اللہ عنہ

(۱۶) محمد امیر بقلم خود غفرلہ بجوک وغیرہ

(۱۷) علی محمد عفی عنہ مدرس قاسم العلوم ملتان

(۱۸) احقر الانام احمد علی عفی عنہ لاہور

(۱۹) عبد الحق عفی عنہ شیخ الحدیث مدرسہ حقانیہ اکوڑہ خٹک

(۲۰) محمد یوسف عفی عنہ مفتی مدرسہ حقانیہ اکوڑہ خٹک

(۲۱) محمد اشفاق الرحمن دار العلوم الاسلامیہ ٹنڈو الہ یار سندھ

(۲۲) سعید احمد غفرلہ مفتی مظاہر علوم سہارنپور

(۲۳) مظفر حسین مظاہری معین مفتی مظاہر علوم سہارنپور

(۲۴) محمد عبد اللہ غفرلہ شیخ الحدیث معراج العلوم بنوں

(۲۵) محمد صالح الدین مفتی اشاعۃ العلوم فیصل آباد

(۲۶) سعید احمد مفتی سراج العلوم سرگودھا

(۲۷) صالح محمد مدرس سراج العلوم سرگودھا

(۲۸) محمد عطاء اللہ عفی عنہ انوری مدرس تعلیم الاسلام فیصل آباد

(۲۹) عبد السمیع عفی عنہ مدرس مدرسہ سراج العلوم سرگودھا

(۳۰) مسعود احمد نائب مفتی دار العلوم دیوبند

(۳۱) سعید احمد مسعود دار العلوم دیوبند

(۳۲) عزیز الرحمن بجنوری دار العلوم دیوبند

(۳۳) مسعود علی قادری مفتی انوار العلوم ملتان

(۳۴) احمد یار خان خطیب چوک پاکستان گجرات

(۳۵) ابو الحسنات قادری

(۳۶) خادم حسین صدر مفتی غلامان محمد رنگ لاہور

(۳۷) غلام محمد مہتمم مرکزی جمعیۃ علماء پاکستان لاہور

(۳۸) فقیر عبد القادر غفرلہ خطیب جامع مسجد خانیوال

(۳۹) محمد عبد المصطفیٰ ازہری غفرلہ

(۴۰) نور احمد آزاد خطیب جامع مسجد انوار العلوم ملتان

(۴۱) فقیر محمد قاسم خطیب جامع مسجد بستی ... ضلع مظفر گڑھ

(۴۲) غلام علی خطیب جامع مسجد ... ڈیرہ غازی خان

محترم حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی ثم کراچی نے باقی جوابات سے اتفاق فرمایا ہے صرف اختلاف مطالع کے عدم اعتبار میں خلجان کا اظہار کیا ہے، اس لئے ریڈیو کے اعلان

سے متعلق جواب ۱۲ میں یہ الفاظ تحریر فرمائے ہیں:

"جس علاقہ کے ریڈیو سے وہاں کے علماء کے فیصلے کے مطابق اعلان ہو وہ اسی علاقہ کے حدود میں واجب التعمیل ہوگا، دوسرے علاقوں میں جب تک شرعی ثبوت کے ذریعہ وہاں کے علماء فیصلہ نہ دیں یہ اعلان اثر انداز نہ ہوگا، مثلاً کراچی ریڈیو کا اعلان صرف سندھ و بلوچستان پر، اور لاہور ریڈیو کا اعلان صوبہ پنجاب پر اور راولپنڈی ریڈیو کا اعلان راولپنڈی ڈویژن پر اور آزاد کشمیر ریڈیو کا اعلان صرف آزاد کشمیر پر اور پشاور ریڈیو کا اعلان صوبہ سرحد و آزاد قبائل پر اور ڈھاکہ ریڈیو کا اعلان پورے مشرقی پاکستان پر اثر انداز اور واجب التعمیل ہوگا، ایک علاقہ کا اعلان دوسرے علاقہ کے لئے مؤثر نہ ہوگا"

نیز شہادت فاسق کے بارے میں ذیل کی تحریر ارسال فرمائی جو بلفظہ درج ہے۔

"فیصلہ میں یہ الفاظ کہ ایسی شہادت اب قبول نہیں کرنا چاہئے، محل تامل ہے کیونکہ جب شرعاً غلبۂ ظن کی صورت میں قاضی کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ فاسق کی شہادت قبول کرے، تو پھر یہ کہنا کہ ایسا نہیں کرنا چاہئے فی نفسہ بھی محل نظر ہے، اور موجودہ زمانہ کے اعتبار سے تو یہ حکم شاید ناقابل عمل ہو جائے، کیونکہ اگر فاسق کی شہادت کو مطلقاً رد کرنا قرار دیا جائے تو ساری دنیا کا نظام مختل ہو جائے، کیونکہ معاملات کے لئے قابل قبول شہادت ہزاروں میں ایک بھی میسر آنا مشکل ہو جائے گا۔ ہاں یہ ظاہر ہے کہ قاضی کے لئے غلبۂ ظن بصدق مخبر ضروری ہے جو فاسق اس درجہ میں نہ ہو اس کی شہادت رد کی جائے گی، ورنہ قبول کرنا چاہئے تاکہ حقوق ضائع نہ ہو جائیں، معین الحکام باب الثانی والعشرین میں اس مسئلہ پر مفصل کلام کرکے اس کو ترجیح دی ہے،

مسألة: قال القرافی فی باب السیاسة نص بعض العلماء علی انا اذا لم نجد فی جهة الا غیر العدول اقمنا اصلحهم واقلهم فجوراً للشهادة علیهم ویلزم مثل ذلک فی القضاة وغیرهم لئلا تضیع المصالح قال وما اظن احداً یخالف فی هذا فان التکلیف شرط فی الامکان وهذا کله للضرورة لئلا تهدر الاموال وتضیع الحقوق قال بعضهم واذا کان الناس فساقاً الا القلیل النادر قبلت شهادة بعضهم علی بعض ویحکم بشهادة الامثل فالامثل من الفساق هذا هو الصواب الذی علیه العمل وان انکره کثیر من الفقهاء بالسنتهم وکذلک العمل علی صحة کون الفاسق ولیاً فی النکاح ووصیاً فی المال وهذا یؤید ما نقله القرافی واذا غلب علی الظن صدق الفاسق

معین الحکام ——— ۱۰۳

قبلت شهادته وحكم بها؛ لأن الله تعالى لم يأمر برد خبر الفاسق فلا يجوز رده مطلقاً بل يتثبت فيه حتى يتبين صدقه من كذبه فيعمل على ما تبين وفقه عليه»

محترم حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری نے فقط اختلاف مطالع میں فیصلۂ علماء سے اختلاف فرمایا ہے، آپ کی تحریر بعینہ بلفظہ درج ذیل ہے:

"عکے میں حدودِ ولایت میں عمل کرنے کا کلیہ صحیح نہیں، بعض اوقات بلاد میں بُعد اتنا ہوتا ہے کہ حقیقۃً مطلع مختلف ہوسکتا ہے، جیسے پشاور، ڈھاکہ، اس لئے یہ قید بڑھانا چاہیے "بشرطیکہ دونوں ملکوں میں اتنا فاصلہ نہ ہو جہاں اختلاف مطلع حقیقۃً ہوسکتا ہو"

"بلادِ بعیدہ میں اختلافِ مطالع کا معتبر ہونا مسئلہ اجماعی ہے، کما صرح بہ ابن عبد البر وغیرہ، بدایۃ المجتہد لابن رشد، فتح الباری لابن حجر ملاحظہ ہوں، احنفیہ کے ہاں بھی بلادِ بعیدہ میں معتبر ہونا متعین ہے، رجوع الی البدائع والاختیار شرح المختار وتبیین الحقائق للزیلعی اور جب اجماع ثابت ہوجاتا ہے دوسرا مرجوح قول خود بخود ختم ہوجاتا ہے، ائمہ کا قول لا عبرۃ لاختلاف المطالع مخصوص ان بلاد کے ساتھ ہے جہاں وسط شہر یا آخر شہر تک اتنی مسافت طے نہیں ہوسکتی تھی، متأخرین حنفیہ نے جو توسیع کردی ہے نہ ائمہ کی مراد ہے نہ حقیقۃً صحیح ہے، تفصیل کی اس وقت ہمت نہیں" متفقہ فیصلہ کا مضمون ختم ہوا۔

اختلافِ مطالع سے متعلق مندرجہ بالا دونوں حضرات کی آخری رائے

مندرجہ بالا تحریر کے بعد ۲۰ رشوال ۱۳۸۶ھ میں حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی، حضرت مفتی محمد شفیع صاحب، حضرت مولانا محمد یوسف بنوری اور بندہ کے اتفاقِ رائے سے اختلافِ مطالع کو غیر معتبر قرار دے کر پورے ملک میں تنفیذ حکم کے لئے چند تجاویز حکومت کو بھیجی گئی تھیں جو پہلے ماہنامہ البلاغ میں اور پھر حضرت مفتی محمد شفیع صاحب کی کتاب جواہر الفقہ میں شائع بھی ہوچکی ہیں، ذیل میں یہ تجاویز اور ان سے متعلق پورا مضمون درج کیا جاتا ہے:

رؤیتِ ہلال کے مسئلہ میں ملک کو انتشار سے بچانے کی تجاویز

کئی سال سے عید الفطر کے موقع پر پورے پاکستان میں عجیب طرح کا انتشار وافتراق

جیسا ہے، مرکزی ہلال کمیٹی کے اعلان کا مقصد تو یہ تھا کہ سارے ملک میں ایک دن عید ہو، اور واقع یہ ہونے لگا کہ ہر ہر شہر اور ہر ہر قصبہ میں دو دو عیدیں ہونے لگیں، عین عید کے دن جو اظہار محبت و مسرت کا دن ہے اس میں باہمی اختلاف اور جھگڑوں کے مظاہرے ہونے لگے جس کو کوئی سمجھدار انسان کسی ملک کے لئے پسند نہیں کر سکتا،

اس سے زیادہ مضرت رساں وہ بحثیں ہیں جو عید کے بعد ہفتوں تک اخباروں میں چلتی ہیں، سرکاری حلقوں سے علماء کو مطعون کیا جاتا ہے کہ وہ سیاسی مقاصد کے لئے بالقصد انتشار پھیلاتے ہیں، دوسری طرف سے حکومت پر یہ الزامات لگائے جاتے ہیں کہ حکومت جان بوجھ کر مسلمانوں کی عبادات کو مختل اور دینی معاملات کے ساتھ مذاق کرتی ہے،

لیکن ذرا بھی غور اور انصاف سے کام لیا جائے تو یہ دونوں الزام غلط اور بالکل بے جا ہیں، علماء میں بہت بڑی تعداد ایسے علماء کی ہے جن کا سیاست سے کوئی دور کا بھی علاقہ نہیں، اور نہ اُن کی کسی ذاتی غرض کا کوئی شبہ ہو سکتا ہے، اسی طرح حکومت کے ارکان و افراد میں بہت بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو خود روزے رکھتے ہیں اور دینی اقدار کا احترام کرتے ہیں، اُن پر کیسے یہ بدگمانی کی جا سکتی ہے کہ وہ جان بوجھ کر خلق خدا کے روزوں کا وبال اپنے سر لینے کو تیار ہو جائیں،

حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک دوسرے کے موقف کو سمجھنے میں کچھ غلط فہمیاں ہیں، وجہ شاید یہ ہے کہ سرکاری حلقوں کے حضرات اس کو ایک خالص تہوار اور انتظامی معاملہ سمجھتے ہیں، جس میں علماء کی کوئی مداخلت اُن کو گوارا نہیں، دوسرے یہ کہ وہ اس معاملہ میں صرف خبر صادق جس پر سننے والوں کو یقین ہو جائے، اعلان کے لئے کافی سمجھتے ہیں، اور اس فرق کو نظرانداز کر دیتے ہیں کہ اپنے یقین کو دوسروں پر مسلط کرنے کے لئے صرف خبر صادق کافی نہیں ہوتی، بلکہ شرعی شہادت ضروری ہے، جس کے لئے خاص شرائط اور قواعد ہیں، اور علماء یہ جانتے ہیں کہ ہماری عید عام قوموں کے تہواروں کی طرح ایک تہوار نہیں، بلکہ ایک عبادت کا ختم اور دوسری عبادت کا شروع کرنا ہے، جس میں شریعت کے بتلائے ہوئے اصول سے مختلف کوئی صورت جائز نہیں، اور کوئی خبر کتنی ہی سچی اور قابل اعتماد ہو اور سننے والے کو اس پر پورا یقین ہو، مگر وہ اپنے اس یقین کو پورے ملک پر اس وقت تک مسلط اور لازم نہیں کر سکتا جب تک حجت شرعیہ اور باقاعدہ شہادت نہ ہو، اس لئے ضرورت اس امر کی ہے کہ اس معاملہ پر سنجیدگی سے غور کیا جائے اور شرعی اصول

کے مطابق رؤیت ہلال کے اعلان کے لئے ملک کے ماہرین فقہی علماء کے مشورہ سے ایسا ضابطہ کار بنایا جائے جس پر تمام علماء اور عوام کو اطمینان ہوسکے، اور پھر اسی ضابطہ کا سب کو پابند بنایا جائے اور اسی ضابطہ کے تحت ریڈیو پر اعلان کیا جائے، مجھے پورا یقین ہے کہ اگر ایسا کیا گیا تو ملک کے کسی گوشہ سے سرکاری اعلان کے خلاف کوئی آواز نہ اٹھے گی، ہر طبقہ کے علماء اس کی موافقت کریں گے، اور ملک میں عیش و مسرت اور وحدت و اتفاق کے ساتھ ایک ہی دن عید ہوا کرے گی۔

اگرچہ شرعی حیثیت سے اس کی کوئی اہمیت نہیں کہ پورے ملک میں عید ایک ہی دن ہو، اسلام کے قرون اولیٰ میں اس وقت کے موجودہ ذرائع مواصلات کو بھی اس کام میں استعمال کرنے اور عید ایک ہی دن منانے کا کوئی اہتمام نہیں ہوا، اور ملک کے وسیع و عریض ہونے کی صورت میں شدید اختلاف مطالع کی مشکلات بھی اس میں پیش آسکتی ہیں۔

لیکن پاکستان کے عوام اور حکومت کی اگر یہی خواہش ہو کہ عید پورے پاکستان میں ایک ہی دن ہو تو شرعی اعتبار سے اس کی بھی گنجائش ہے، شرط یہ ہے کہ عید کا اعلان پوری طرح شرعی ضابطۂ شہادت کے تابع ہو۔

رؤیت ہلال کے لئے شرعی ضابطۂ شہادت جس پر تقریباً امت کے چاروں مذہب حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی اور جمہور علماء، سلف و خلف کا اتفاق رہا ہے، ذیل میں لکھا جاتا ہے جس کا مقصد ایک تو یہ ہے کہ انصاف پسند طبقہ یہ محسوس کرے کہ ہلال کمیٹی کے حالیہ اعلان سے علماء کا اختلاف درحقیقت کسی ضد یا سیاسی غرض کے لئے نہیں بلکہ اصول شرعیہ کی مجبوری سے عمل میں آیا، دوسرے یہ کہ حکومت کے ذمہ دار حضرات توجہ فرما کر ملک کے ہر مکتبۂ فکر کے مستند علماء کے مشورہ سے اس ضابطہ کے تحت مرکزی ہلال کمیٹی کا ایسا ضابطہ کار بنا دیں جس پر ملک کے علماء اور عوام مطمئن ہو کر عمل کرسکیں، اس ضابطہ شرعیہ کی تفصیل لکھنے سے پہلے ایک امر کی وضاحت ضروری ہے جو شہادت کی اصل بنیاد ہے۔

خبر صادق اور شہادت میں فرق

کسی معاملہ کے متعلق ایک ثقہ معتبر آدمی زبانی خبر دے یا ٹیلیفون پر بتلائے اور اس کی آواز پہچانی جائے، یا خود ہاتھ سے لکھے اور خط بھیجا جائے تو مخاطب کو اس خبر کے سچے ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہتا، بلکہ خود اس کو یقین کامل ہو جاتا ہے، اور اس کے مقتضیٰ پر عمل کرنا

اپنی حد تک اس کے لئے جائز بھی ہے، اور عام معاملات میں ساری دنیا اس پر عمل بھی کرتی ہے، لیکن اگر وہ اپنے اس یقین کو دوسروں پر لازم اور مسلط کرنا چاہے کہ سب اس کو تسلیم کریں تو شریعت اور موجودہ قانون دونوں میں اس کے لئے ضابطۂ شہادت قائم ہونا ضروری ہے، اس کے بغیر کوئی قاضی یا حاکم اپنے یقین کو دوسروں پر مسلط نہیں کر سکتا،

ایک جج کو ذاتی طور پر کسی مقدمہ کے متعلق ایک امر پر کتنا ہی یقین بلکہ مشاہدہ ہو مگر وہ اپنے یقین کی بنا پر مقدمہ کا فیصلہ نہیں کر سکتا، جب تک باقاعدہ شہادت کی شرائط پوری کر کے اسے ثابت نہ کرے، اور اس شہادت میں کسی عدالت کے نزدیک ٹیلیفون کا بیان کافی نہیں سمجھا جاتا، بلکہ گواہ کا عدالت میں حاضر ہونا شرط ہے، دنیا کی عدالتوں کا موجودہ ضابطۂ شہادت اس معاملہ میں بالکل شرعی اور اسلامی ضابطہ کے مطابق ہے کہ شاہدوں کا قاضی یا حاکم کے سامنے حاضر ہونا ضروری ہے، ٹیلیفون پر کسی خبر کا بیان کرنا کتنا ہی قابل اعتماد ہو شہادت کے لئے کافی نہیں،

حالیہ واقعہ میں مرکزی ہلال کمیٹی کا فیصلہ عوام کے نزدیک اسی لئے نا قابل قبول ٹھہرا کہ ہلال عید کے لئے باتفاق امت شہادت شرط ہے، محض خبر صادق کافی نہیں، اور مرکزی کمیٹی نے صرف ٹیلیفون کی خبر پر اعتماد کر کے اعلان کر دیا، اس کی کوشش نہیں کی کہ گواہ کمیٹی کے سامنے پیش ہو کر گواہی دیتے یا کمیٹی کا کوئی معتمد عالم وہاں جا کر ان سے روبرو گواہی لیتا، اور پھر شہادت کی بنیاد پر فیصلہ کرتا، اگر ایسا کر لیا جاتا تو کسی عالم کو اس سے اختلاف نہ ہوتا،

ضابطۂ شہادت کی یہ باریکیاں موجودہ عدالتیں بھی جانتی ہیں اور مانتی ہیں، مگر عوام کو ان میں فرق محسوس کرنا آسان نہیں، اس لئے طرح طرح کی چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں،

ہلال عید کے متعلق شرعی ضابطۂ شہادت

جب چاند کی رؤیت عامہ نہ ہو سکے صرف دو چار آدمیوں نے دیکھا ہو تو یہ صورت حال اگر ایسی فضاء میں ہو کہ مطلع بالکل صاف ہو چاند دیکھنے سے کوئی بادل یا دھواں، غبار وغیرہ مانع نہ ہو تو ایسی صورت میں صرف دو تین آدمیوں کی رؤیت اور شہادت شرعاً قابل اعتماد نہیں ہوگی جب تک مسلمانوں کی بڑی جماعت اپنے دیکھنے کی شہادت نہ دے چاند کی رؤیت تسلیم کی جائیگی جو دیکھنے کی شہادت دے رہے ہیں اس کو ان کا مغالطہ یا جھوٹ قرار دیا جائے گا،

ہاں اگر مطلع صاف نہیں تھا، غبار، دھواں، بادل وغیرہ افق پر ایسا تھا جو چاند دیکھنے میں مانع ہو سکتا ہے ایسی حالت میں رمضان کے لئے ایک ثقہ کی اور عیدین وغیرہ کے لئے دو ثقہ مسلمانوں کی شہادت کا اعتبار کیا جا سکتا ہے،

مگر حکومت کے لئے ایسی شہادت کا اعتبار کر کے ملک میں اعلان کرنے کے واسطے تین صورتوں میں سے کسی ایک کا ہونا ضروری ہے، اگر ان صورتوں میں سے کوئی بھی نہیں ہے تو ایسی شہادت کی بنیاد پر عید کا اعلان کرنا حکومت کے لئے یا کسی ذمہ دار جماعت کے لئے جائز نہیں،

وہ تین صورتیں اصطلاح شریعت میں یہ ہیں:-

(۱) ـــــ شہادت علی الرؤیۃ

(۲) ـــــ شہادت علی شہادۃ الرؤیۃ

(۳) ـــــ شہادت علی القضاء

شہادت علی الرؤیۃ:

شہادت علی الرؤیۃ یہ ہے کہ ایسے عالم یا جماعت علماء کے سامنے یہ شہادت دینے والے بذات خود پیش ہوں جن کی احکام شرعیہ فقہیہ اور اسلام کے ضابطہ شہادت میں مہارت پر پورے ملک میں اعتماد و یقین کیا جاتا ہو، اور یہ عالم یا علماء متفقہ طور پر اس شہادت کو قبول کرنے کا فیصلہ کرے،

شہادت علی الشہادۃ:

شہادت علی الشہادۃ یہ ہے کہ اگر یہ گواہ خود حاضر[1] نہیں ہو سکتے یا نہیں ہو سکے، تو ہر ایک کی گواہی پر دو گواہ[2] ہوں اور وہ گواہ عالم یا علماء کے سامنے یہ شہادت دیں کہ ہمارے سامنے فلاں شخص نے بیان کیا ہے کہ میں نے فلاں رات میں فلاں جگہ اپنی آنکھوں سے چاند دیکھا ہے[3]،

شہادت علی القضاء:

شہادت علی القضاء یہ ہے کہ جس مقام پر چاند دیکھا گیا ہے اگر وہاں حکومت کی طرف سے

---

[1] یعنی مرض یا سفر کی وجہ سے خود حاضر ہونے پر قادر نہ ہوں۔

[2] یعنی اصل گواہ ان کو اپنی گواہی پر گواہ بنائے ۱۲

[3] اور یہ الفاظ کہیں کہ میں شہادت دیتا ہوں کہ فلاں بن فلاں نے مجھے اپنی شہادت پر شاہد بنایا ہے اس لئے میں اس کی شہادت پر شہادت دیتا ہوں ۱۲ رشید احمد

کوئی ذیلی کمیٹی قائم ہے، اور اس میں کچھ ایسے علماء موجود ہیں جن کے فتویٰ پر علماء اور عوام اعتماد کرتے ہیں، اور چاند دیکھنے والے ان کے پاس پہنچ کر اپنی اپنی شہادت پیش کریں، اور وہ علماء ان کی شہادت قبول کریں، تو ان علماء کا فیصلہ اس حلقہ کے لئے تو کافی ہے جس میں شہادت پیش ہوئی ہو، مگر پورے ملک میں اس کے اعلان کیلئے ضروری ہے کہ حکومت کی نامزد کردہ مرکزی رویت ہلال کمیٹی کے سامنے ان علماء کا فیصلہ بشرائط ذیل پیش ہو:

یہ مستند علماء و ان کا امیر یہ تحریر کریں کہ فلاں وقت ہمارے سامنے دو یا زیادہ شاہدوں نے بچشم خود چاند دیکھنے کی گواہی دی، اور ہمارے نزدیک یہ گواہ ثقہ اور قابل اعتماد ہیں، اس لئے ان کی شہادت پر چاند ہونے کا فیصلہ دے دیا، یہ تحریر دو گواہوں کے سامنے لکھ کر سربمہر کی جائے اور یہ گواہ تحریر لے کر مرکزی کمیٹی کے علماء کے سامنے اپنی اس شہادت کے ساتھ پیش کریں کہ فلاں علماء نے یہ تحریر ہمارے سامنے لکھی ہے۔

مرکزی کمیٹی کے نزدیک اگر ان علماء کا فیصلہ شرعی قواعد کے مطابق ہے تو اب یہ کمیٹی پورے ملک میں مرکزی حکومت کے دیئے ہوئے اختیارات کے تحت اعلان کر سکتی ہے، اور یہ اعلان سب مسلمانوں کے لئے واجب القبول ہوگا، وہ بھی اس شرط[^1] کے ساتھ کہ یہ اعلان عام خبروں کی طرح نہ کیا جائے بلکہ مرکزی ہلال کمیٹی کے سرکردہ کوئی عالم خود ریڈیو پر اس امر کا اعلان کریں کہ ہمارے پاس شہادت علی الرؤیۃ یا شہادت علی شہادۃ الرؤیۃ یا شہادت علی القضاء کی تین صورتوں میں سے فلاں صورت پیش ہوئی ہے، ہم نے تحقیقات ہونے کے بعد اس پر چاند ہونے کا فیصلہ کیا، اور مرکزی حکومت کے دیئے ہوئے اختیارات کی بناء پر ہم یہ اعلان پورے پاکستان کے لئے کر رہے ہیں۔

یہ چند اصولی باتیں ہیں جن کا رویت ہلال اور اس کے معاملہ میں پیش نظر رہنا ضروری ہے۔

اس ضابطہ شہادت میں عمل اور انتظامی طور پر اگر کوئی مشکل پیش آسکتی ہے تو وہ عرصہ

---

[^1]: عــہ یہ صورت درحقیقت کتاب القاضی الی القاضی ہے، چونکہ شہادت علی القضاء کی بنسبت یہ صورت سہل اور زیادہ قابل اعتماد ہے، اس لئے اسے اختیار کیا گیا۔ ۱۲

عــہ یہ شرط ریڈیو پر توثیق اور رسالہ سال سے پیدا شدہ بے اعتمادی کی بنا پر لگائی گئی ہے، ورنہ جب یہ اعتماد ہو اور پورا وثوق و یقین ہو کہ رویت ہلال کا فیصلہ اور اس فیصلہ کا اعلان شرعی ضابطہ کے تحت ہوتا ہے تو اعلان میں تفصیل مذکور کی ضرورت نہیں۔ ۱۲ رشید احمد

آخری صورت یعنی شہادت علی القضاء میں ہے کہ اس میں ایک شہر کی ذیلی کمیٹی کے فیصلہ کو مرکزی کمیٹی تک پہنچانے کے لئے دو گواہوں کا وہاں جانا ضروری ہے، جو اگرچہ ہوائی جہاز کے دور میں کچھ مشکل نہیں تاہم ایک مشقت سے خالی نہیں،

اس دشواری کا حل تلاش کرنے کے لئے مندرجہ ذیل علماء کے اجتماع میں غور کیا گیا کہ یہ شہادت علی القضاء کس حد تک ضروری ہے، اور آیا اس میں کوئی سہولت نکل سکتی ہے یا نہیں؟

مذاہب اربعہ اور جمہور علماء کی کتابوں کا مطالعہ کرنے سے یہ علماء اس نتیجہ پر پہنچے کہ اصولی طور پر تو ذیلی ہلال کمیٹی کا فیصلہ مرکزی ہلال کمیٹی کے لئے اسی وقت قابل تنفیذ ہو سکتا ہے جبکہ وہ فیصلہ دوسرے قاضی کے پاس شرعی شہادت کے ساتھ دو گواہ لے کر پہنچیں، صرف ٹیلیفون وغیرہ پر اس کی خبر دینا کافی نہیں، جمہور فقہاء امت حنفیہ، شافعیہ، مالکیہ، حنبلیہ کا اصل مذہب یہی ہے، ہدایہ، کتاب الام امام شافعی، مغنی ابن قدامہ حنبلی وغیرہ میں اس کی تصریحات درج ہیں، اس لئے بہتر تو یہی ہے کہ حکومت اس اصول کے مطابق کوئی انتظام کرے، لیکن علماء کے اس اجتماع میں اس پر غور کیا گیا کہ اگر حکومت اس میں دشواریاں محسوس کرے تو کوئی دوسری صورت بھی ہو سکتی ہے یا نہیں؟ غور و فکر کے بعد متفقہ طور پر اس کا ایک حل یہ نکالا گیا کہ،

حکومت ہر بڑے شہر میں ذیلی کمیٹیاں قائم کرے، ان میں سے ہر ایک میں کچھ ایسے مستند علماء کو ضرور لیا جائے جو شرعی ضابطۂ شہادت کا تجربہ رکھتے ہیں، اور ہر ذیلی کمیٹی کا کام صرف شہادت مہیا کرنا نہ ہو بلکہ اس کو فیصلہ کرنے کا اختیار دیا جائے، یہ ذیلی کمیٹی اگر باقاعدہ شہادتیں لے کر کوئی فیصلہ کر دیتی ہے تو فیصلہ شہادت کی بنیاد پر ہو چکا، اب صرف اعلان کا کام باقی رہا اس کے لئے شہادت ضروری نہیں، بلکہ ذیلی کمیٹی کا کوئی ذمہ دار آدمی مرکزی کمیٹی کو ٹیلیفون پر محتاط طور پر جس میں کسی مداخلت کا خطرہ نہ ہو ذیلی کمیٹی کے اس فیصلہ کی اطلاع دیدے، اور مرکزی کمیٹی اس صورت میں اس کو اپنا فیصلہ کہہ کر نہیں بلکہ ذیلی کمیٹی کا فیصلہ بتلا کر اس طرح نشر کرے کہ مرکزی کمیٹی کے سامنے اگرچہ کوئی شہادت نہیں آئی بلکہ فلاں ذیلی کمیٹی نے جس میں فلاں فلاں

عہ یعنی اسے پورے ملک کے لئے فیصلہ کرنے کا اختیار دیا جائے ۱۲

عہ اوپر وضاحت کی جا چکی ہے کہ اعلان میں اس تفصیل کی شرط احتیاط کرنے کے لئے ہے، ورنہ بصورت اطمینان اعلان میں یہ تفصیل بتانا ضروری نہیں ۱۲ رشید احمد

علماء شریک ہیں شہادت کی بنیاد پر فیصلہ کیا ہے، ہم اس فیصلہ پر اعتماد کر کے اعلان کر رہے ہیں، اس صورت میں مرکزی کمیٹی کا یہ اعلان ٹیلیفون سے آئی ہوئی اطلاع پر درست ہو سکتا ہے۔

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ
۱۰ر ۹ ۸۶ھ

ظفر احمد عثمانی عفا اللہ عنہ
۱۳ر شوال سنہ ۱۳۸۶ھ

محمد یوسف بنوری عفا اللہ عنہ
۱۳ر شوال سنہ ۱۳۸۶ھ

رشید احمد
۱۳ر شوال سنہ ۱۳۸۶ھ

حکومت پاکستان کی طرف سے عبادات کو قمری کیلنڈر سے وابستہ کرنے کی تجویز کا جواب

سوال:- محترم جناب مفتی صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ، حکومت پاکستان شمسی کیلنڈر کی بجائے قمری کیلنڈر کی ترویج چاہتی ہے، قمری کیلنڈر تیار کرنے کے لئے ایک بورڈ متعین کیا گیا ہے، مجھے بھی اس کا رکن نامزد کیا گیا ہے، اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل سوالات کے بارہ میں آپ کی رہنمائی کی ضرورت ہے:

① اُمّی کے کیا معنی ہیں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہم اُمّی ہیں، زیادہ حساب کتاب نہیں جانتے، مہینہ ۲۹ دن کا ہوتا ہے یا تیس دن کا، اس سے کیا نتیجہ نکلتا ہے کہ اس زمانہ میں صرف عوام الناس کی سہولت کی خاطر چاند کی رؤیت کو اپنایا گیا تھا؟

② بعض علماء خلاء بازوں کے چاند پر پہنچنے کو صحیح نہیں مانتے، آپ کی اس بارہ میں کیا رائے ہے؟

③ تعیین پر نماز کے اوقات کی قرآن مجید یا احادیث نبوی میں وضاحت نہیں اگر یہ اجتہاد جائز ہے تو پھر رؤیت ہلال کے بارے میں اجتہاد کیسا ہے؟

④ پہلے زمانہ میں چاند کے وجود کے بارے میں عوام کو علم نہ تھا اب ریاضی کے ذریعہ مقام قمر معلوم کیا جا سکتا ہے، لہٰذا کیا اب بھی رؤیت کی ضرورت باقی ہے؟

⑤ اوقات نماز کے لئے طلوع وغروب آفتاب کا مشاہدہ ضروری نہیں تو رؤیت ہلال کے بارے میں کیوں؟

⑥ سعودی عرب میں آپ کے علم کے مطابق تاریخ کا تعین کیسے کیا جاتا ہے؟ اخبار ہر کر

وہ حسابی طریقہ سے کیلنڈر تیار کرتے ہیں کیا یہ طریقہ صحیح ہے؟ اگر نہیں تو ہمارا حج صحیح ہوتا ہے کہ نہیں؟ اور اگر صحیح ہو تو پھر پاکستان میں اس کی ترویج کیسی ہے؟

۷ لاؤڈ اسپیکر کا استعمال بعض علماء کے نزدیک کسی زمانہ میں جائز نہ تھا اس کی کیا وجوہ تھیں؟ اب اگر جائز قرار دیا گیا ہے تو کس بنا پر؟ اگر لاؤڈ سپیکر کے بارے میں بدلتے ہوئے زمانہ کے ساتھ تبدیلی رائے ہو سکتی ہے تو رؤیت کے بارے میں کیوں نہیں ہو سکتی ہے؟ یعنی وجود قمر کو بنیاد قرار دیا جائے۔

۸ پاکستان میں شمسی کیلنڈر کے بجائے قمری کیلنڈر کی ترویج کا سوچا جا رہا ہے آپ کے نزدیک ایسا کرنا اسلام کے کس تقاضے کو پورا کرتا ہے؟ اور اس کی افادیت کیا ہو سکتی ہے؟

۹ اسلامی تاریخ کے اہم واقعات مثلاً میلاد النبی، واقعہ معراج، عاشوراء کو مجوزہ قمری کیلنڈر (جو کہ وجود قمر پر نہ کہ ظہور قمر پر مبنی ہو سکتا ہے) کے ساتھ منسلک کرنا خلاف شریعت تو نہ ہوگا؟

۱۰ اگر قمری کیلنڈر بر بنائے وجود قمر اور اسلامی قمری کیلنڈر بر بنائے ظہور قمر الگ الگ بنائے جائیں تو دونوں میں صرف امتیاز کیا ہوگا کہ اول الذکر کی فوقیت باقی رہے اور مؤخر الذکر کی حرمت؟

الجواب باسم ملہم الصواب

۱ امی، ام (ماں) کی طرف منسوب ہے، یعنی ناخواندہ، اس مناسبت سے کہ عورتیں عموماً ناخواندہ ہوتی ہیں، یا یہ مطلب کہ ناخواندہ شخص لکھنے پڑھنے کے اعتبار سے نوزائیدہ کی طرح ہوتا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اگرچہ ناخواندہ عوام کی اکثریت تھی مگر حساب داں بھی موجود تھے، حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قضاء کا واقعہ مشہور ہے، ستر و اشرفی کو جس اسلوب سے تقسیم فرمایا ہے اس سے آجکل کے دور ترقی کے اکثر محاسبین بھی ناواقف ہیں، بہت کم لوگ اس کی حقیقت جانتے ہیں، غرضیکہ وہ زمانہ محاسبین سے بالکل خالی نہ تھا، اس کے باوجود آپ کا ثبوت ہلال میں حساب کو باطل قرار دے کر رؤیت کو شرط قرار دینا اس پر کھلی دلیل ہے کہ شرعاً اثبات ہلال کے لیے حسابی طریقہ استعمال کرنا جائز نہیں، اور اسی پر پوری امت مسلمہ کا اجماع ہے، ملاحظہ ہو صحیح بخاری کی شرح فتح الباری ص ۱۰۹ ج ۴، اور عمدۃ القاری ص ۲۸۰ ج ۱۰۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ صوم و افطار کا مدار یعنی رؤیت پر رکھو: صوموا لرؤیتہ وافطروا لرؤیتہ

اگر حسابی طریق کی گنجائش ہوتی تو رؤیت کے حکم کی بجائے اہل حساب سے دریافت کرنے کا حکم فرماتے، بالخصوص جبکہ حسابی فیصلہ میں کئی سہولتیں بھی ہیں، مثلاً،

(۱) رؤیت کے لئے جد وجہد اور مشقت سے نجات،

(۲) اختلاف وانتشار سے حفاظت،

(۳) آئندہ معاملات کے لئے تعیین تاریخ میں سہولت وغیرہ،

مگر آنحضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے رؤیت ہی کو شرط قرار دیا، اس میں حکمت یہ ہے کہ عامۃ المسلمین کے معاملات اور عبادات کسی ایک یا معدودے چند لوگوں کی رائے اور فیصلہ پر موقوف ہونے کی بجائے عام مسلمانوں کے مشاہدہ سے متعلق رہیں، تاکہ وہ اندھی تقلید کی بجائے علی وجہ البصیرۃ عبادات ادا کریں، اور اپنے معاملات وعبادات کو چند انسانوں کے قبضہ میں اور ان کے رحم وکرم پر موقوف نہ سمجھیں اور اس قسم کے شکوک وشبہات میں گرفتار ہو کر پریشان نہ ہوں کہ شاید چاند کے فیصلہ میں محاسب نے سہواً یا کسی مصلحت سے عمداً غلطی کا ارتکاب کیا ہو، چنانچہ شمسی کیلنڈر کا یہی حال ہے، مہینہ ۲۸ دن کا ہے یا ۲۹ یا ۳۰ یا ۳۱ کا اس بارے میں پوری دنیا چند محاسبین کی کورانہ تقلید کر رہی ہے، بس بے چون وچرا جو کہہ دیا ماننا پڑے گا، چونکہ دراز تک آگسٹس اور جولیس سیزر وغیرہ یکے بعد دیگرے دنیا کے ذہنوں پر مسلط رہے، پھر پوپ گریگوری نے ان کے تسلط پر اپنا قبضہ جما لیا اور ۱۹ اکتوبر کو ۲۹ اکتوبر کر دیا، علاوہ ازیں ہر چہار صدی جو ۴ پر برابر تقسیم نہ ہو اس کے آخری فروری کو ۲۸ دن کا قرار دینے کا حکم دیا، کئی ممالک نے پوپ کی بغاوت کی لیکن بالآخر یہ بھی سب کو اپنی ذہنی غلامی میں مبتلا کرنے میں کامیاب ہو گیا، حتی کہ آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا، شریعت مطہرہ نے ثبوت ہلال کے لئے رؤیت کو شرط قرار دے کر انسان کو کسی دوسرے انسان کی کورانہ تقلید اور ذہنی غلامی اور عبادات کو غیر کے قبضہ میں دینے سے محفوظ فرما دیا ہے، اور رؤیت کی مشقت ومجاہدہ برداشت کر لیں اور اس کی وجہ سے تاریخ میں تھوڑے اختلاف کی زحمت گوارا کر لیں، مگر اپنی عبادات غیر کے قبضہ میں نہ دیں، بلکہ خود علی وجہ البصیرۃ ادا کریں،

(۲) شرعی لحاظ سے اس پر کوئی دلیل اور کسی قسم کا کوئی اشکال نہیں، اس لئے آج تک کسی بھی عالم دین نے اس کو خلاف شرع نہیں بتایا، اگر آپ حضرات کے علم میں کوئی ایسا عالم ہے تو وہ ہرگز ہرگز عالم دین نہیں، آپ کو دھوکہ لگا ہے کہ ایسے جاہل کو عالم سمجھ لیا ہے

نہ ہر کہ چہرہ برافروخت دلبری داند ÷ نہ ہر کہ آئینہ سازد سکندری داند
ہزار نکتہ باریک تر ز مو اینجاست ÷ نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

تکبہ چوں تیغ پولاد ست تیز ÷ چوں نداری سپر واپس گریز
پیش ایں الماس بے اسپر میا ÷ کز بریدن تیغ را نبود حیا

اس سے متعلق اشکال وجواب کے لئے میری کتاب احسن الفتاوی جلد اول ملاحظہ فرمائیں۔

(۳) جواز اجتہاد کے لئے یہ شرط ہے کہ وہ مسئلہ منصوص نہ ہو، شرعی بنا پر ثبوت ہلال کے لئے رؤیت کی شرط نص سے ثابت ہے، اس لئے اس میں اجتہاد کرنا حرام ہے، اور شریعت مطہرہ کا مقابلہ ہے۔

(۴) اس کا جواب نمبرا میں تحریر کیا جا چکا ہے۔

(۵) اوقات نماز اور ثبوت ہلال میں دو وجہ سے فرق ہے، ایک یہ کہ شریعت نے اوقات نماز کا مدار عینی رؤیت پر نہیں رکھا، بلکہ اس میں علم الیقین کو کافی قرار دیا ہے، بخلاف ثبوت ہلال کے کہ اس کے لئے عینی رؤیت کو شرط قرار دیا ہے، دوسرا فرق یہ ہے کہ حسابی طریقہ سے متعین کردہ اوقات نماز کی ہر شخص جب چاہے بذریعہ مشاہدہ تصدیق کر سکتا ہے، مگر وجود ہلال کی تصدیق کے لئے عوام کے پاس سوائے رؤیت پر شہادت کے اور کوئی ذریعہ نہیں، حسابی طریقہ سے مرتبہ اوقات میں طلوع وغروب وغیرہ اوقات عموماً قابل رؤیت ہوتے ہیں، مگر ہلال اصطلاحی پیدائش کے باوجود بالعموم قابل رؤیت نہیں ہوتا، پھر طلوع وغروب وغیرہ کی تصدیق کے لئے چند بار مشاہدہ ہمیشہ کے لئے کافی ہوگا، مگر ہلال میں ایسا نہیں ہو سکتا۔

(۶) سعودی عرب میں ثبوت ہلال کے لئے حسابی طریقہ ہرگز استعمال نہیں ہوتا، وہ اس کو حرام قرار دیتے ہیں، اور عینی رؤیت پر شہادت کی بناء پر فیصلہ کرتے ہیں، اس سے متعلق سابق رئیس الجامعہ شیخ ابن باز اور حکومت سعودیہ کی وزارۃ العدل کی تحریریں میرے پاس موجود ہیں، عند الطلب ان کی فوٹو کاپیاں ارسال کی جا سکتی ہیں، رہا یہ سوال کہ وہاں اتنی جلدی رؤیت کیسے ہو سکتی ہے؟ تو اس کی وجوہ کچھ اور ہیں، اس وقت ان کو تحریر میں لانے کی ضرورت نہیں، چونکہ وہاں روزہ، عید اور حج وغیرہ احکام شرعی قضاء کے تحت ہوتے ہیں، اس لئے ان کی صحت میں کوئی شبہ نہیں، (اس مسئلہ کی تفصیل اسی جلد میں عنوان "سعودیہ میں رؤیت کا اعلان پاکستان کے لئے حجت نہیں" کے تحت ملاحظہ ہو۔ مرتب)

جمعہ ۱ ربیع الثانی ——— ۴۴

⑦ لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ پہنچنے والی آواز کے اتباع سے مقتدی کی نماز صحیح ہوگی یا نہیں؟
اس میں اختلاف کی دو بنیادیں ہیں، ایک یہ کہ لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ خود متکلم کی آواز بلند ہوجاتی ہے، یا متکلم کی آواز بعینہٖ نہیں بلکہ اس کی صدائے بازگشت ہے، دوسری بنیاد یہ ہے کہ صدائے بازگشت کا اتباع نماز میں جائز ہے یا نہیں؟ جوازِ اقتداء کے لئے یہ شرط تو منصوص ہے کہ مقتدی کو انتقالِ امام کا علم ہو، مگر یہ منصوص نہیں کہ مقتدی تک پہنچنے والی آواز بعینہٖ امام کی آواز ہو صدائے بازگشت نہ ہو، اس لئے اس مسئلہ میں اجتہاد کی گنجائش ہے۔ اس کے برعکس ثبوتِ ہلال کے لئے رؤیت کی شرط منصوص ہے، اور نص کے مقابلہ میں اجتہاد حرام ہے۔

⑧ اس کی کوئی افادیت نہیں، بلکہ سخت مضر ہے، جس کی تفصیل اوپر لکھی جا چکی ہے، اگر فی الحال عباداتِ اسلامیہ کو اس کیلنڈر سے وابستہ نہ بھی کیا جائے تو بھی آئندہ چل کر اس کا خطرہ ہے؛ اور جو کام حرام کا ذریعہ و سبب بنے وہ بھی حرام ہوتا ہے، مستقبل میں تاریخوں کے تخمینی اندازہ اور وقت کی تقریبی تعیین کے لئے جو دستور چلا آتا ہے کہ شمسی کیلنڈر کے ساتھ قمری تخمینی تاریخ بھی لکھ دی جاتی ہے وہی کافی ہے۔

⑨ یقیناً خلافِ شریعت اور ناجائز ہے۔

⑩ وجودِ قمر کے کیلنڈر کی صرف یہ افادیت ہو سکتی ہے کہ وجودِ قمر سے قبل رؤیتِ ہلال کی آنے والی شہادت غیر معمولی غور طلب ہوگی، اسی طرح ماہرینِ فن وجودِ قمر کے بعد بھی ہلال کی رؤیت کی صلاحیت نہ ہونے کے کچھ ضوابط متعین کر دیں، مثلاً افق سے ارتفاع اور شمس سے بُعد کے درجات کی تعیین ہو جائے تو رؤیت کی شہادت کا معیار معلوم کرنے کے لئے مفید ہو سکتا ہے، معہٰذا اس کے نفع سے ضرر کا خطرہ زیادہ ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۱۳ ذی قعدہ سنہ [illegible]ھ

سوال متعلق بالا:

محترم جناب مفتی صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ، رؤیتِ ہلال اور حکومت کے مجوزہ قمری کیلنڈر کے بارے میں آپ کی تحریر موصول ہوئی، جو کہ ہماری گزشتہ ہفتہ کی اسلام آباد میں منعقدہ میٹنگ میں ممبران کو پڑھ کر سنائی گئی، اس سے اسلامی کیلنڈر کے لئے رؤیتِ ہلال کی شرعی اہمیت واضح ہوگئی، البتہ مزید چند سوالات ذہنوں میں ابھرے ہیں، مہربانی فرما کر ان کی وضاحت فرمائیں، وہ سوالات یہ ہیں:-

(۱) آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ ثبوتِ ہلال کے لئے رؤیت کی شرط نص سے ثابت ہے، مہربانی فرما کر قرآن کریم کی متعلقہ آیت مع ترجمہ و تشریح سے آگاہ فرمائیں!

(۲) قطبین کے قریب بعض مقامات پر ۲۲ گھنٹے کا دن ہوتا ہے، یعنی بالکل ۲۴ گھنٹے کا بھی نہیں ہوتا اگر اسے عام شرعی قانون سے مستثنیٰ قرار دیا جائے، لیکن اتنے لمبے وقفہ میں روزہ رکھنا یا اجتناب سحری تعیین کرنا مشکل ہے، اس مخصوص موقع پر قرآن کریم سے ہٹ کر اجتہاد کیونکر جائز ہوگا؟

(۳) رؤیت کے کیا معنی ہیں؟ کیا اس کے لئے کمزور نظر کی صورت میں چشمہ لگانا، دوربین کا استعمال، ہوائی جہاز یا راکٹ پر سوار ہو کر چاند کو دیکھنا یا دیگر جدید ذرائع کا استعمال کیسا ہے؟

(۴) انما المؤمنون اخوۃ کے تحت تمام دنیا کے مسلمان ایک خاندان کے افراد یا ایک سوسائٹی کے ممبر ہیں، تمام یا بعض دینی امور میں کم از کم ان کا ایک امیر یا قاضی ہونا کیسا ہے، کہ جس کی اتباع میں دنیا کے کسی بھی مقام پر چاند نظر آنے کی صورت میں ساری اسلامی دنیا میں ایک ہی وقت تاریخ کا آغاز کیا جائے، کوئٹہ میں چاند نظر آنے کی صورت میں اگر لاہور میں عید ہو سکتی ہے، تو مکہ معظمہ میں چاند نظر آنے کی صورت میں انڈونیشیا میں جائز ہوگی کہ نہیں، جبکہ مسلمانوں میں جغرافیائی یا سیاسی حدود اہم نہیں بلکہ جنوبی افریقہ اور انڈونیشیا کے دو مسلمان باہم اپنے آپ کو بہت قریب پاتے ہیں جبکہ ایک ہی شہر کے ایک ہی محلہ کے دو مختلف المذہب افراد کے دل باہم کوسوں دور ہوتے ہیں، ہمارا آئندہ اجلاس یکم فروری کو ہونا قرار پایا ہے، لہٰذا مہربانی فرما کر ان سوالات کا جواب جلد تحریر فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔

الجواب باسم ملہم الصواب

(۱) نص سے حدیث مراد ہے، رؤیت کی شرط کئی احادیث صریحہ صحیحہ سے ثابت ہے، صحیح بخاری میں اس مضمون کی متعدد روایات ہیں، جن میں سے ایک نقل کی جاتی ہے۔ عن عبد اللہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ذکر رمضان فقال لا تصوموا حتی تروا الہلال ولا تفطروا حتی تروہ فان غم علیکم فاقدروا له. قال الحافظ رحمہ اللہ تعالیٰ وذکر البخاری رحمہ اللہ تعالیٰ فی الباب احادیث تدل علی نفی صوم یوم الشک ورتبها ترتیبا حسنا فصدرها بحدیث عمار رضی اللہ تعالیٰ عنه المصرح بعصیان من صامه ثم بحدیث ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنهما من وجهین احدهما بلفظ فان غم علیکم فاقدروا له والآخر بلفظ فاکملوا العدة

ثلاثین وقصد بذلک بیان المراد من قوله فاقدروا له الخ (فتح الباری ج۴ ص)
وقال فی شرح وقوله لا تصوموا حتی تروا الهلال ونقل الوار الجمهور المراد
بقوله فاقدروا له ای انظروا فی اول الشهر واحسبوا تمام الثلاثین ویرجح
هذا التاویل الروایات الاخر المصرحة بالمراد وهی ما تقدم من قوله
فاکملوا العدة ثلاثین ونحوها (فتح الباری ص ۱۰۲ ج ۴)

(۳) طویل النہار مقامات پر روزہ کا حکم خلاف نص اجتہاد سے نہیں ثابت کیا گیا، بلکہ یہ عام قرآنی قانون میں داخل ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ صوم سے عجز کی دو صورتیں ہیں، ایک عارضی اور دوسری وقت موت تک دائمی، ان دونوں صورتوں کا حکم اس آیت کریمہ میں مذکور ہے، فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۚ وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ (البقرة ۲: ۱۸۴) یعنی جو شخص رمضان میں مریض ہو یا شرعی مسافر وہ صحت یا اقامت کے بعد دوسرے ایام میں روزے قضاء کرے (یہ پہلی صورت کا حکم ہوا) "اور جن کو روزہ کا کبھی بھی تحمل نہ ہو وہ فدیہ ادا کریں" (یہ دوسری صورت کا حکم ہے) میں نے "یطیقونہ" کا جو مفہوم بیان کیا ہے حضرات مفسرین رحمہم اللہ تعالیٰ نے اس کی مختلف وجوہ بیان فرمائی ہیں جن کے نقل کرنے کی حاجت نہیں،

مسافر کے لئے عجز حقیقی ضروری نہیں، بلکہ مظنۂ مشقت کی وجہ سے نفس سفر شرعی ہی کو عجز حکمی قرار دیا گیا ہے، مریض اور مسافر کے لئے رخصت کی علت عجز یا دفع ضرر ہے، اس لئے یہ حکم ہر ایسے عارض کو شامل ہے جس میں صوم سے ضرر کا غالب خطرہ ہو، چنانچہ حمل یا دودھ پلانے کی حالت میں روزہ رکھنے سے اگر ماں پر یا بچہ پر ضرر کا خطرہ غالب ہو تو بالاتفاق اس کے لئے روزہ چھوڑنے کی رخصت ہے، حالانکہ یہ عورت نہ مریض ہے، اور نہ مسافر، اس کے لئے رخصت خلاف نص قرآن نہیں، بلکہ نص قرآن ہی سے ہے، اس تفصیل سے ثابت ہوا کہ اسی نص قرآنی کے مطابق طویل النہار مقامات میں روزہ کا حکم یہ ہے کہ جس میں تحمل ہو اس پر فرض ہے، اور جس میں تحمل نہ ہو وہ دوسرے معتدل ایام میں قضاء رکھے،

(۴) رؤیت کے معنی "دیکھنا" اس کے لئے دوربین، ہوائی جہاز اور دوسرے ذرائع کا استعمال جائز ہے، مگر شرعی ضابطۂ ثبوت ہلال کی رعایت فرض ہے، اس کے لئے جو طریق بھی اختیار کیا جائے اس میں متعدد ماہرین فقہ کی شمولیت ضروری ہے، ورنہ کوئی فیصلہ

۳۲

بھی قابلِ قبول نہیں ہوگا۔

(۴) اگر مسلمانوں کی تمام حکومتیں رؤیتِ ہلال کے فیصلہ کے لئے کسی کمیٹی کو اختیار دے دیں تو اس کمیٹی کا فیصلہ ان سب حکومتوں کے لئے واجب العمل ہوگا بشرطیکہ کمیٹی کے ارکان میں ماہرینِ فقہ کی اکثریت ہو اور اُن کی رائے کو قانونی تحفظ حاصل ہو، فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔
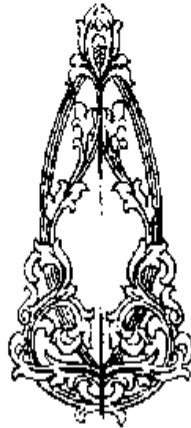
۱۵ صفر سنہ ۹۹ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نحن امۃ امیۃ لانکتب ولا نحسب

الطوالع لتنویر المطالع

اس رسالہ میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ رویت ہلال میں اختلاف مطالع کا اعتبار نا ممکن ہے۔

شرع، عقل اور فلکیات کی روشنی میں منفرد تحقیق

شوافع کے سوا اور کسی مذہب میں بھی اختلافِ مطالع معتبر نہیں

سوال: زید کہتا ہے کہ ایک علاقہ میں رؤیت ہلال کی وجہ سے دوسرے علاقہ میں صوم لازم[عہ] نہیں، کیا زید کا یہ قول صحیح ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب منه الصدق والصواب

زید کا یہ قول صحیح نہیں، صوم میں اختلافِ مطالع صرف شوافع رحمہم اللہ تعالیٰ کے ہاں معتبر ہے، باقی ائمہ کے ہاں معتبر نہیں، حنفیہ، حنابلہ اور مالکیہ کا اتفاق ہے کہ اختلافِ مطالع کا اعتبار نہیں، لہذا اہل مغرب کی رؤیت سے اہل مشرق پر صوم فرض ہو جائے گا، قال فی شرح التنویر: واختلاف المطالع ورؤيته نهارا قبل الزوال وبعده غير معتبر على ظاهر المذهب وعليه اكثر المشايخ وعليه الفتوى بحر عن الخلاصة فيلزم اهل المشرق برؤية اهل المغرب اذا ثبت عندهم رؤية اولئك بطريق موجب كما مر وقال الزيلعي الاشبه انه يعتبر لكن قال الكمال الاخذ بظاهر الرواية احوط، وقال فی الشامية: وانما الخلاف في اعتبار اختلاف المطالع بمعنى انه هل يجب على كل قوم اعتبار مطلعهم ولا يلزم احد العمل بمطلع غيره ام لا يعتبر اختلافها بل يجب العمل بالاسبق رؤية حتى لو رئي في المشرق ليلة الجمعة وفي المغرب ليلة السبت وجب على اهل المغرب العمل بما رآه اهل المشرق فقيل بالاول واعتمده الزيلعي وصاحب الفيض وهو الصحيح عند الشافعية (الى قوله) وظاهر الرواية الثاني وهو المعتمد عندنا وعند المالكية والحنابلة لتعلق الخطاب عاما بمطلق الرؤية في حديث صوموا لرؤيته الخ (رد المحتار ج ۲)

علامہ ابن عابدین رحمہ اللہ تعالیٰ نے عدم اعتبار اختلافِ مطالع کو صرف صوم کے ساتھ مخصوص فرما دیا ہے، حج اور قربانی وغیرہ میں اختلافِ مطالع کو معتبر تسلیم کیا ہے، مگر حکیم الامت قدس اللہ سرہ العزیز نے عدم اعتبار کو جملہ امور کے لئے عام قرار دیا ہے، ذیل میں امداد الفتاوی سے سوال و جواب نقل کیا جاتا ہے۔

عہ موجودہ تحقیق سے یہ حقیقت قطعی طور پر معلوم ہو چکی ہے کہ مغربی ممالک میں مشرق سے پہلے رؤیت کا امکان ہے ۱۲ منه

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ مدرسہ اشرفیہ راندیر کا ایک طالب علم رؤیت ہلال کی گواہی دو روز قبل عید الاضحیٰ کے نامنظور کرتا ہے اور موافق ذہن اپنے کے اس پر دلیل عبارت شامی کی جو کہ ذیل میں لکھی گئی ہے پیش کرتا ہے، تو یہ موافق شرع شریف کے ہے یا نہیں؟

یفهم من کلامهم فی کتاب الحج ان اختلاف المطالع فیه معتبر فلا یلزمهم شیٔ لو ظهر انه رؤی فی بلدة اخری قبلهم بیوم وهل یقال کذلك فی حق الاضحیة لغیر الحجاج لم اره والظاهر نعم. اه مختصراً۔

الجواب: قیاس تو مقتضی ہے اس کو کہ اختلاف مطالع معتبر ہو مگر حنفیہ نے بناء بر قول علیہ السلام لا نکتب ولا نحسب الحدیث اس کا اعتبار نہیں کیا کہ خالی حرج ورعایت قواعد ہیئت سے نہ تھا، یہی مقتضی حدیث مسطور کا ہے کہ اختلاف مطالع مطلقاً معتبر نہ ہو نہ قبل وقوع عبادت نہ بعد وقوع عبادت، بلکہ ہر مقام کی رؤیت ہر مقام کے لئے کافی ہو جائے چنانچہ قبل وقوع تو کہیں بھی اعتبار نہیں کیا گیا، ہاں بعض مواقع میں جیسے بعض بعض صور حج میں اس کا اعتبار کرنا بظاہر مفہوم ہوتا ہے، مگر رائے ناقص میں وہ اعتبار اختلاف مطالع کا نہیں لاطلاق الحدیث بلکہ محل اس حدیث پر ہے الصوم یوم تصومون والفطر یوم تفطرون والاضحیٰ یوم تضحون، الحدیث، او کما قال، چنانچہ صاحب ہدایہ نے مسئلہ حج میں اسی کو دلیل ٹھہرایا حیث قال وفی الامر بالاعادة حرج، اور علامہ شامی رحمہ اللہ نے ہر چند کہ بناء عدم قبول شہادت کی اعتبار اختلاف مطالع پر ٹھہرائی ہے، مگر اس کو کسی سے صراحۃً نقل نہیں فرمایا بلکہ یفهم من کلامهم کہا، جس کے معنی یہ ہیں کہ ان کے کلام سے یہ اعتبار مستخرج ہوتا ہے تو اصل حنفیہ کے نزدیک کل جگہوں میں عدم اعتبار اختلاف مطالع ٹھہرا کما هو ظاهر من الملاقاة اور استنباط علامہ شامی کا مسئلہ اضحیہ میں اسی بنا پر ہے کہ انہوں نے عدم قبول شہادت کو بعض مسائل حج میں مبنی بر اعتبار اختلاف مطالع ٹھہرایا، حالانکہ عند التامل یہ امر غیر صحیح ہے، بلکہ بناء اس عدم قبول کی وہی حرج ہے، پس جب بناء ہی صحیح نہیں تو مبنی کیونکر صحیح ہو سکتا ہے خصوصاً جبکہ کتب مذہب کے خلاف ہو، پس صورت مسئولہ میں رد شہادت صحیح نہیں، واللہ اعلم، ۱ ربیع الثانی بروز پنجشنبہ ۱۳۰۵ھ (امداد الفتاوی مبوب ص ۱۰۸ ج ۲)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲۰ ربیع الآخر ۱۳۹۳ھ

العوالج ــــــــــــ ۲

اختلاف مطالع سے متعلق مولانا لکھنوی کی تحقیق:

سوال: حضرت مولانا عبدالحی صاحب نے مجموعۃ الفتاوی میں رؤیت ہلال کے بارے میں اعتبار اختلاف مطالع کے قول کو ترجیح دی ہے، اور اس کی تحدید مسافۃ شہر سے کی ہے، اس بارے میں آپ کی کیا تحقیق ہے؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملهم الصواب

مجموعۃ الفتاوی میں اختلاف مطالع کا مسئلہ متعدد جگہ آیا ہے، جو مختلف تاریخوں میں لکھا گیا ہے، ج اول ص ۱۱ مؤرخہ ربیع الاول ۱۲۸۶ھ اور صفحہ ۴۸ مؤرخہ شوال ۱۲۹۱ھ جلد دوم ص ۱۱۹ مؤرخہ شوال ۱۲۹۲ھ میں مسیرۃ شہر (تقریباً ۴۸۰ میل) پر اختلاف مطالع کے قول کو ترجیح دی ہے، مگر جلد سوم ص ۸۰ پر جمہور کے قول کے مطابق مطلقاً عدم اعتبار کا فتوی دیا ہے، اس فتوی کی تاریخ تحریر موجود نہیں، مگر وجوہ ذیل کی بناء پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ عدم اعتبار کا فتوی مؤخر ہے:

① اس کا تیسری جلد میں ہونا ہی اس کی تاخیر پر کافی دلیل ہے۔

② جلد دوم میں لکھی ہوئی تاریخیں جلد اول کی تاریخوں سے مؤخر ہیں، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جلد سوم کے فتاوی جلد دوم سے مؤخر ہیں۔

③ پہلی دونوں جلدوں کے فتاوی میں بسط اور تیسری جلد میں اختصار اس کی دلیل ہے کہ پہلی دونوں جلدیں ابتدائی زمانہ کی ہیں، اور تیسری جلد بعد کے فتاوی کی ہے، اس سے ثابت ہوا کہ مولانا نے بھی آخر میں جمہور کے قول کی طرف رجوع فرما لیا تھا۔

پہلے فتاوی میں مولانا نے جن عبارات سے استدلال کیا ہے ان میں طحطاوی علی مراقی الفلاح کی یہ عبارت بھی ہے: وهو الاشبه لان انفصال الهلال عن شعاع الشمس يختلف باختلاف الاقطار كما في دخول الوقت وخروجه وهذا اثبت في علم الافلاك والهيئة واقل ما تختلف مسيرة شهر كما في الجواهر. اس عبارت میں اعتبار اختلاف مطالع کو اشبہ قرار دینے کی جو وجہ بیان کی گئی ہے وہ صحیح نہیں، اس لئے کہ اختلاف مطالع سے کسی کو انکار نہیں، بلکہ اختلاف مطالع کو تسلیم کرنے کے باوجود جمہور اس کو شرعاً غیر معتبر قرار دیتے ہیں۔ عبارت مذکورہ کے علاوہ بھی جو عبارات مجموعۃ الفتاوی میں تحریر ہیں وہ قول جمہور اور ظاہر المذہب کے خلاف ہونے کے علاوہ وجوہ ذیل کی بناء پر بھی ناقابل عمل ہیں:-

① قوله تعالى يَسْـَٔلُونَكَ عَنِ الْأَهِلَّةِ قُلْ هِيَ مَوَاقِيتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ، وقوله تعالى

وَقَدَّرَهُ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ میں واضح ہدایت ہے کہ احکام شرع کا مدار قمری حساب پر ہے شمسی پر نہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ شمسی تاریخوں کو ہر شخص معلوم نہیں کر سکتا بلکہ دنیا کے چند افراد یہ تاریخیں متعین کرتے ہیں، اور باقی ساری دنیا محض اُن کی تقلید کرتی ہے، اس کے برعکس قمر کے مشاہدہ سے ہر ناخواندہ شخص بھی تاریخ معلوم کر سکتا ہے چونکہ احکام شرع ہر شہری و جنگلی اور خواندہ و ناخواندہ کے لئے یکساں ہیں اس لئے اُن کا مدار تیسیر وسہولت اور عام فہم طریقہ پر رکھا گیا ہے، مگر مطالع قمر کے اختلاف کا علم اتنا مشکل اور دقیق پیچیدہ ہے کہ تیز قمر کے موجودہ دور ترقی میں بھی ایسے لوگ بہت ہی کم بلکہ کالعدم ہیں جو اختلاف مطالع کا خط کھینچ کر یہ بتا دیں کہ اس خط سے ایک جانب رؤیت کا امکان ہے اور دوسری جانب نہیں، اختلاف مطالع قمر کے علم کی بنسبت تو شمسی حساب بھی ہزاروں درجہ سہل اور آسان ہے، پس جبکہ شریعت نے شمسی حساب کو عام فہم نہ ہونے کی وجہ سے غیر معتبر قرار دیا ہے تو اختلاف مطالع قمر جیسے پیچیدہ اور مشکل ترین حساب کا مکلف بنانا بطریق اولیٰ مقتضائے شرع کے خلاف ہے

② اگر یہ مسئلہ مقتضائے شرع کے خلاف اختلاف مطالع قمر کے علم میں مہارت رکھنے والے چند افراد کے سپرد کر بھی دیا جائے تو اس میں ایک مزید قباحت یہ لازم آئے گی کہ ایک ہی مملکت کے اندر واقع دو متقارب مقامات کے درمیان خط اختلاف مطالع واقع ہونے کی صورت میں ایک شہر میں مرکزی حکومت رؤیت کی بنا پر عید کا فیصلہ کرے، اور دوسرے ملحق شہر میں اختلاف مطالع کی بنا پر روزہ کا حکم دے، ایسے فیصلہ کی نظیر تاریخ اسلام میں نہیں ملتی،

③ خط اختلاف مطالع کا محل وقوع ہر ماہ مختلف ہوتا ہے، لہٰذا ہر مہینہ میں اس کی تعیین کے لئے ماہرین فن کی ضرورت پڑے گی جو کالعدم ہیں، نیز اس میں ہر ماہ تبدیلی واقع ہونے کی وجہ سے اجراء احکام میں تعسر اور عوام میں انتشار پیدا ہونا لازمی امر ہے،

④ مسیرۃ شہر کو اختلاف مطالع کا مدار قرار دینا صحیح نہیں، علم الافلاک میں اس قول کی صحت کا کوئی امکان نہیں، اور نہ ہی "غدوها شهر ورواحها شهر" سے اس پر استدلال کا کوئی جواز ہے کیونکہ کسی عالم نے کبھی ایک آدھ دفعہ اپنے خیال میں اس قسم کا کوئی مشاہدہ کیا ہو اور علم الافلاک سے ناواقفیت کی وجہ سے اس کی حقیقت نہ سمجھی ہو، پھر اس مشاہدۂ خیالیہ جزئیہ کو قاعدۂ کلیہ قرار دے دیا، جیسا کہ بعض علماء نے محض مشاہدۂ جزئیہ کی بنا پر صبح صادق سے طلوع آفتاب تک کے وقت کی بطور قاعدۂ کلیہ تعیین کر دی ہے، یا رات کے مجموعۂ وقت کے ساتھ اس کی کوئی

خاص نسبت یا وغیرہ متعین کردی، حالانکہ یہ دونوں امر صحیح نہیں کیونکہ اس وقت کی مقدار ہر موسم اور ہر مقام میں مختلف ہوتی ہے،

بعض نے ۲۴ فرسخ سے اختلاف مطالع کی تحدید کی ہے، غالباً انھوں نے ایک درجہ کی مسافت کو ملحوظ رکھا ہے، اور بعض نے مسافت قصر پر مدار رکھا ہے، ان اقوال پر بھی نہ تو کوئی دلیل ہے اور نہ ہی فلکیات کی رو سے ان کی صحت کا کوئی امکان ہے، کما مر من التفصیل،

(۵) اختلاف مطالع پر طول البلد کی طرح عرض البلد بھی مؤثر ہوتا ہے، مگر دونوں کی تاثیر کے اصول بالکل مختلف ہیں، پس اگر مسیرۃ شہر صرف طول البلد کے لحاظ سے لی جائے تو عرض البلد کا ہدر لازم آتا ہے، اور اگر طولاً و عرضاً ہر دو جانب میں مسیرۃ شہر مراد لی جائے تو اس میں دو مختلف اصولوں کو ایک معیار پر ماننا لازم آتا ہے جو باطل ہے،

(۶) اگر مسیرۃ شہر پر مطلع کا اختلاف لازم ہے تو پوری دنیا کی تاریخوں میں تقریباً پونے دو ماہ کا فرق آجائے گا، اور یہ بھی بدیہی البطلان ہے، پوری دنیا میں ایک دن سے زیادہ فرق نہیں ہو سکتا،

اور اگر مسیرۃ شہر پر اختلاف مطلع متیقن نہیں بلکہ اس کا امکان ہے جیسا کہ "ادنیٰ ما اختلف" کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے تو محض امکان پر ثبوت کا حکم لگانا اور اس بنا پر احکام شرعیہ کے نفاذ سے منع کرنا کیسے جائز ہو سکتا ہے، علاوہ ازیں اختلاف مطالع کا امکان تو ہر دو متقارب مقامات کے درمیان بھی موجود ہے،

(۷) کوئی خاص مقام مثلاً صفر طول البلد متعین کر کے اس سے مشرق و مغرب ہر دو جانب میں مسیرۃ شہر پر اختلاف مطلع فرض کیا جائے تو اس مقام کی جانب مخالف یعنی ۱۸۰ طول البلد سے متصل اس کی مشرق اور مغرب میں واقع دو متقارب بلکہ آپس میں متصل مقامات کی تاریخوں میں تقریباً پونے دو ماہ کا فرق آجائے گا، ۱۸۰ طول البلد کی ایک جانب یکم محرم واقع ہونے کی صورت میں اس سے متصل دوسری جانب میں تقریباً ۲۰ صفر ہوگی جس کا بطلان ظاہر ہے،

(۸) مسیرۃ شہر پر اختلاف مطالع فرض کر لیا جائے تو تقریباً ہر ۴۸۰ میل کے علاقہ کی تاریخ دوسرے علاقہ سے مختلف ہوگی، اس طرح دنیا بھر میں ہر چھوٹے سے خطہ کی تاریخ کا دوسرے خطہ سے اختلاف "مواقیت للناس" اور "لتعلموا عدد السنین والحساب" کی حکمت کے سراسر خلاف ہوگا،

الطوالع ــــــــــــــــ

⑨ مسیرۂ شہر اگر معروف راستوں پر لی جائے تو راستوں کے پیچ و خم کی وجہ سے ہو سکتا ہے کہ مقام اقرب مسیرۂ شہر ہو جائے اور مقام ابعد مسیرۂ شہر نہ ہو اور اگر بذریعہ خط مستقیم مسیرۂ شہر لی جائے تو اس کا معلوم کرنا ہر شہر کے طول البلد و عرض البلد اور علم المثلث الکروی پر موقوف ہے جس کے جاننے والے بہت کم ہیں، حالانکہ احکام شرعیہ کی بنیاد تیسیر و سہولت پر ہے، اور وہ شہروں، دیہاتوں، جنگلوں، پہاڑوں اور جزیروں میں بسنے والوں اور سمندروں سے گذرنے والوں خواندہ اور ناخواندہ سب افراد کے لئے یکساں ہیں،

غالباً انہی وجوہ کی بناء پر مولانا عبد الحی صاحب نے آخر میں اختلاف مطالع کے عدم اعتبار کا فتویٰ دیا ہے، اور یہی ظاہر المذہب اور قول جمہور حنفیہ، مالکیہ وحنابلہ ہے، اس کے خلاف اعتبار اختلاف مطالع بصیغۂ تمریض منقول ہے اور مقتضائے شرع کے خلاف ہونے کے علاوہ ناقابل عمل بھی ہے، فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۲۸ رمضان المبارک [illegible]

اختلاف مطالع کے بارے میں بدائع کی عبارت:

سوال: قال فی البدائع هذا اذا كانت المسافة بين البلدين قريبة لا تختلف فيه المطالع فاما اذا كانت بعيدة فلا يلزم احد البلدين حكم الآخر لان مطالع البلاد عند المسافة الفاحشة تختلف فيعتبر فی اهل كل بلد مطالع بلدهم دون البلد الآخر وحكى عن ابى عبد الله بن ابى موسى الضرير انه استفتى فی اهل اسكندرية ان الشمس تغرب بها ومن على منارتها يرى الشمس بعد ذلك بزمان كثير فقال يحل لاهل البلد الفطر ولا يحل لمن على رأس المنارة اذا كان يرى الشمس لان مغرب الشمس تختلف كما يختلف مطلعها فيعتبر فی اهل كل موضع مطلعه (بدائع الصنائع ج ۲ ص ۸۳)

عبارت بالا سے ثابت ہوتا ہے کہ بلاد بعیدہ میں اختلاف مطالع معتبر ہے اس کا کیا جواب ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملهم الصواب

بدائع کی پوری عبارت پر غور کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ یہاں اختلاف مطالع کے اعتبار یا عدم اعتبار کا بیان مقصود نہیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ اگر دو شہر آپس میں اتنے قریب

ہوں کہ ان میں اختلافِ مطالع کا کوئی امکان نہ ہو تو یہ دونوں ایک ہی شہر کے حکم میں ہوں گے یعنی ایک شہر میں ثبوتِ رؤیت کی خبر دوسرے شہر والوں پر حجت ملزمہ ہوگی، وہاں کسی علیحدہ حجت کی ضرورت نہیں، جیسا کہ ایک شہر میں ثبوتِ رؤیت کی خبر اس کے تمام حصوں پر بلکہ شہر کے مضافات پر بھی حجت ملزمہ ہوتی ہے، اس کے برعکس اگر دو شہروں کا مطلع مختلف ہے تو اگرچہ یہ اختلاف مطالع عند الاحناف ظاہر الروایۃ پر معتبر نہیں، مگر ایک شہر میں ثبوت کی خبر دوسرے شہر والوں پر حجت ملزمہ نہ ہوگی بلکہ ان کے لئے مستقل حجت (شہادۃ علی الشہادۃ یا شہادۃ علی القضاء یا استفاضہ) ضروری ہے، غرضیکہ بدائع کی عبارت سے تو بلادِ نائیہ میں صرف اختلافِ مطالع کا تحقق ثابت ہوا جو بدیہی اور مشاہد ومسلّم ہے کوئی عامی بھی اس سے انکار کی جرأت نہیں کر سکتا، کلام تو اس میں ہے کہ یہ اختلافِ مطالع جو کہ مشاہد ومسلّم ہے ثبوتِ رمضان میں شرعاً معتبر بھی ہے یا نہیں؟ بدائع کی عبارت کا یہ مفہوم بالکل واضح ہے، علاوہ ازیں صاحبِ بدائع کا بلادِ قریبہ میں شہادۃ علی الشہادۃ یا شہادۃ علی القضاء یا استفاضہ کی شرط لگانا نیز اعتبارِ مطالع میں اختلافِ مشہور اور ظاہر الروایۃ میں عدمِ اعتبار مذکور ہونے کے باوجود اس سے مکمل سکوت اختیار کرنا اور ابی عبداللہ بن ابی موسیٰ الضریر کے فتویٰ سے استشہاد بھی دلیل ہے کہ یہاں ہلالِ رمضان میں اختلافِ مطالع کے اعتبار یا عدمِ اعتبار کا مسئلہ بیان کرنا مقصود نہیں، مسئلہ اختلافِ مطالع کی مزید بحث اور اس سے متعلق مفتیانِ پاکستان کا متفقہ فیصلہ بندہ کے رسالہ "تحقیق الرجال لرؤیۃ الہلال" میں ہے، فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۲۴ شوال سنہ ۹۴ھ

باب الاعتکاف

مسجد سے نسیانا نکلنا مفسد اعتکاف ہے:

سوال: اگر نسیانا مسجد سے نکل گیا تو اعتکاف فاسد ہوگا یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب ومنہ الصدق والصواب

نسیانا نکلنے سے بھی اعتکاف فاسد ہوجائے گا، قال فی شرح التنویر فلو خرج ولو ناسیا ساعة زمانیة لا رملیة کما مر بلا عذر فسد فیقضیه (رد المحتار ص ۱۳۲ ج ۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲۳ ذیقعدہ سنہ ۷۲ھ

غسل تبرید کے لئے نکلنا جائز نہیں:

سوال: تبرید کے لئے مسجد سے باہر نکل کر معتکف کو غسل کرنا جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب ومنہ الصدق والصواب

جائز نہیں، اگر ضرورت زیادہ ہو تو مسجد میں کوئی بڑا برتن رکھ کر اس میں بیٹھ کر نہائے اس طور پر کہ مسجد میں مستعمل پانی نہ گرنے پائے، یا تولیہ بھگو کر نچوڑ کر بدن پر ملے، متعدد بار ایسا کرنے سے بدن صاف ہوجائے گا، قال فی شرح التنویر وحرم علیه الخروج الا لحاجة الانسان طبیعیة کبول وغائط وغسل لو احتلم ولا یمکنه الاغتسال فی المسجد

وفی الشامیة فلو امکنه من غیر ان یتلوث المسجد فلا بأس به بدائع ای بان کان فیه برکة ماء او موضع معد للطهارة او اغتسل فی اناء بحیث لا یصیب المسجد الماء المستعمل قال فی البدائع فان کان بحیث یتلوث بالماء المستعمل یمنع منه لان تنظیف المسجد واجب اهـ والتقیید بعدم الامکان یفید انه لو امکن کما قلنا فخرج انه یفسد (الی قوله) لکن قول البدائع لا بأس به ربما یفید الجواز فتأمل (رد المحتار ص ۱۳۳ ج ۲)

احتلام کی قید سے معلوم ہوا کہ تبرید کے لئے خروج جائز نہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲۳ ذیقعدہ سنہ ۷۲ھ

معتکف اذان کے لئے نکل سکتا ہے:

سوال: معتکف اذان دینے کے لئے ماذنہ پر جا سکتا ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب ومنہ الصدق والصواب

اگر ماذنہ کا دروازہ مسجد میں داخل ہے تو وہاں معتکف بہرحال ہر وقت جا سکتا ہے، اور اگر دروازہ مسجد سے خارج ہے تو صرف اذان دینے کی غرض سے جا سکتا ہے۔ قال فی شرح التنویر (او شرعیۃ) ای خروج لحاجۃ شرعیۃ کعید واذان لو مؤذنا وباب المنارۃ خارج المسجد، وفی الشامیۃ اما اذا کان داخلہ فکذلک بالاولیٰ قال فی البحر وصعود المأذنۃ ان کان بابہا فی المسجد لا یفسد والا فکذلک فی ظاہر الروایۃ اھ ولو قال الشارح واذان ولو غیر مؤذن وباب المنارۃ خارج المسجد لکان اولیٰ ح قلت بل ظاہر البدائع ان الاذان ایضا غیر شرط فانہ قال ولو صعد المنارۃ لم یفسد بلا خلاف وان کان بابہا خارج المسجد لانہا منہ لانہ یمنع فیہا من کل ما یمنع فیہ من البول ونحوہ فاشبہ زاویۃ من زوایا المسجد اھ لکن ینبغی فیما اذا کان بابہا خارج المسجد ان یقید بما اذا خرج للاذان لان المنارۃ وان کانت من المسجد لکن خروجہ الیٰ بابہا لا للاذان خروج منہ بلا عذر وبہذا لا یکون کلام الشارح مفرعا علی الضعیف ویکون قولہ وباب المنارۃ الخ جملۃ حالیۃ معتبرۃ المفہوم فافہم (رد المحتار ص۱۳۱ ج۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۳ ذی قعدہ سنہ ۸۳ھ

اعتکاف ہر محلہ میں سنت علی الکفایہ ہے:

سوال: عشرۂ اخیرۂ رمضان المبارک کا اعتکاف سنت مؤکدہ علی الکفایہ ہے، علی الکفایۃ کا کیا مطلب ہے؟ صرف ایک مسجد میں اعتکاف کرنے سے پورے شہر والوں کی طرف سے سنت ادا ہو جائے گی یا ایک محلہ والوں کی طرف سے ادا ہوگی؟ یا یہ کہ محلہ کی ہر ہر مسجد میں اعتکاف ضروری ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

اس سے متعلق کوئی صریح جزئیہ نہیں ملا البتہ شامیہ میں اعتکاف کی سنیت کو نظیر اقامت تراویح کہا ہے، اور تراویح کے باب میں تین قول نقل فرما کر اس کو ترجیح دی ہے کہ ہر محلہ کی ایک مسجد میں اقامت تراویح سے سنت کفایہ ادا ہو جائے گی، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ

اعتکاف کا بھی یہی حکم ہے، قال فی الشامیۃ (قولہ ای سنۃ علی کفایۃ) نظیرہا اقامۃ التراویح بالجماعۃ فلو اقام بہا البعض سقط الطلب عن الباقین فلم یأثموا بالمواظبۃ علی الترک بلا عذر ولو کان سنۃ عین لأثموا بترک السنۃ المؤکدۃ اثماً دون اثم ترک الواجب (رد المحتار ص ۱۲۹ ج ۲) وقال فی فصل التراویح (قولہ والجماعۃ فیہا سنۃ علی الکفایۃ الخ) افاد ان اصل التراویح سنۃ عین (الی ان قال) وھل المراد انہا سنۃ کفایۃ لاھل کل مسجد من البلدۃ او مسجد واحد منہا او من المحلۃ ظاہر کلام الشارح الاول واستظہر ط الثانی ویظہر لی الثالث لقول المنیۃ حتی لو ترک اھل محلۃ کلہم الجماعۃ فقد ترکوا السنۃ واساؤا اھ (رد المحتار ص ۶۶۰ ج ۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

(مزید تحقیق تتمہ میں ہے) ۱۹ رجب سنہ ھ

معتکف کا نماز جنازہ یا عیادت کے لئے نکلنا:

سوال: معتکف نماز جنازہ یا عیادت مریض کے لئے مسجد سے نکل سکتا ہے یا نہیں؟ اگر شروع ہی سے نماز جنازہ اور عیادت کے لئے نکلنے کی نیت کرلے تو جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

اعتکاف کی نذر میں نماز جنازہ، عیادت مریض اور مجلس علم میں حاضری کے لئے خروج کا استثناء صحیح ہے، اور نکلنا جائز ہے، بشرطیکہ نذر کی طرح استثناء بھی زبان سے کیا ہو، صرف دل کی نیت کافی نہیں، مگر مسنون اعتکاف میں یہ نیت کی تو وہ نفل ہوجائے گا سنت ادا نہ ہوگی، مسنون اعتکاف صرف وہی ہے جس میں کوئی استثناء نہ کیا ہو، اس میں نکلنا مفسد ہے، البتہ قضاء حاجت جیسی ضرورت کے لئے نکلے پھر دیکھا کہ راستہ ہی میں نماز جنازہ شروع ہورہی ہے تو اس میں شریک ہوسکتا ہے، نماز سے قبل انتظار اور نماز کے بعد وہاں ٹھیرنا جائز نہیں، اسی طرح قضاء حاجت کے لئے اپنے راستہ پر چلتے چلتے عیادت کرسکتا ہے، عیادت اور نماز جنازہ کے لئے راستہ سے کسی جانب مڑنا یا ٹھیرنا جائز نہیں، شامیہ میں بحر عن البدائع سے نقل ہے: لو خرج لحاجۃ الانسان ثم ذھب لعیادۃ مریض او لصلاۃ جنازۃ فانہ جائز، مگر بدائع میں ثم ذھب الخ کی بجائے ثم عاد مریضا او صلی علی جنازۃ ہے، اس سے راستہ سے انحراف و مکث کا جواز ثابت نہیں ہوتا۔

عن عائشۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہا قالت کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یعود المریض وھو معتکف فیمر کما ھو فلا یعرج یسأل عنہ رواہ ابوداؤد وابن ماجۃ، قال علی القاری

رحمه الله تعالى قال الحسن والنخعي يجوز للمعتكف الخروج لصلوة الجمعة وعيادة المريض وصلوة الجنازة وعند الائمة الاربعة اذا خرج لقضاء الحاجة واتفق له عيادة المريض والصلوة على ميت فلم ينحرف عن الطريق ولم يقف اكثر من قدر الصلوة لم يبطل الاعتكاف وان ابطل ذكره الحلبي ولا دلالة في الحديث على صلوة الجنازة فكانهم قاسوها على العيادة بجامع انهما فرضا كفاية ولكن بينهما فرق فان العيادة يمكن ان تكون بلا وقوف بخلاف الصلوة ولذا ايضا نسب الى ابي حنيفة رحمه الله تعالى بالصلوة خلافا لصاحبيه، قال ميرك وفي سنده ليث بن ابي سليم (زق) قوله، ويتقوى بما هو منجبر بما في مسلم عن عائشة رضي الله تعالى عنها ان كنت لادخل البيت للحاجة والمريض فيه فما اسال عنه الا وانا مارة (مرقاة ص ٣٢٣ ج ٢) فقط والله تعالى اعلم

۲۳ رمضان المبارک [illegible]

معتکف کا نفل وضو کے لئے نکلنا جائز ہے:

سوال: کیا معتکف بحالت اعتکاف مسجد سے باہر جا کر فرض اور نفل نمازوں اور تلاوت کلام پاک کے لئے وضو کر سکتا ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

اگر مسجد کے اندر بیٹھ کر وضو کرنے کی ایسی جگہ ہو کہ پانی مسجد سے باہر گرے تو مسجد سے باہر جانا جائز نہیں ورنہ جائز ہے، وضو خواہ فرض نماز کے لئے ہو یا نفل، تلاوت یا ذکر کے لئے سب کا یہی حکم ہے لاطلاق الطهور في عباراتهم على انه صرح بجواز الخروج لوضوء النفل في شرعة المعارف من شرح الاصل اه وفي البياض الهاشمي وحياة الصائمين للمحدث التهانوي رحمه الله تعالى عن التاتارخانية والحجة والشامية والنهر وكنز العباد. فقط والله تعالى اعلم

۵ شوال

کھانے کے بعد ہاتھ دھونے کے لئے نکلنا:

سوال: کیا معتکف مسجد سے باہر جا کر کھانا کھانے سے قبل اور بعد میں ہاتھ دھو سکتا ہے خواہ صابن کے ساتھ یا بغیر صابن کے، اور منجن، پیسٹ یا مسواک سے دانت صاف کر سکتا ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

ہاتھ دھونے کے لئے نکلنا جائز نہیں، مسجد ہی میں کسی برتن میں دھوئے، منجن یا مسواک

وغیرہ وضو کے ساتھ کر سکتا ہو صرف تجدید وضو کے لیے مسجد سے نکلنا جائز نہیں، فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۵ شوال سنہ ۸۸ھ

بیت الخلاء خالی ہونے کا انتظار کرنا:

سوال: اگر معتکف رفع حاجت کے لئے جائے اور بیت الخلاء خالی نہ ہو تو کیا بیت الخلاء کے باہر انتظار کرے، یا فوراً اپنی جگہ پر مسجد میں واپس چلا جائے اور پھر کچھ دیر کے بعد واپس آجائے؟ بعض اوقات ایسی صورت میں کئی کئی مرتبہ جانا اور لوٹنا پڑتا ہے۔ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

ایسی ضرورت کے وقت وہیں باہر انتظار کرنا جائز ہے، فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۵ شوال سنہ ۸۸ھ

معتکف کا مسجد میں ٹہلنا:

سوال: کیا معتکف مسجد میں ٹہل سکتا ہے؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

بضرورت جائز ہے، فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۵ شوال سنہ ۸۸ھ

اعتکاف ٹوٹنے پر حکم قضاء:

سوال: اگر کسی وجہ سے اعتکاف ٹوٹ گیا تو اس کی قضاء واجب ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

نفل اعتکاف کی قضاء واجب نہیں، اس لئے کہ وہ مسجد سے نکلنے سے ٹوٹتا نہیں بلکہ ختم ہو جاتا ہے، اعتکاف منذور معیّن یا غیر معیّن ٹوٹ جائے تو سب ایام کی قضاء واجب ہے، نئے سرے سے اتنے دن پورے کرے کیونکہ ان میں تتابع لازم ہے، اور عشرہ اخیرہ رمضان کے مسنون اعتکاف میں صرف اس دن کی قضاء واجب ہے جس میں اعتکاف ٹوٹا، فساد کے بعد یہ اعتکاف نفل ہو گیا، ایک دن کی قضاء چاہے رمضان ہی میں کرلے یا رمضان کے بعد نفل روزہ کے ساتھ کرے، ایک دن کی قضاء میں رات دن دونوں کی قضاء واجب ہے یا صرف دن کی؟ اس سے متعلق کوئی صریح جزئیہ نظر سے نہیں گزرا، قواعد سے یوں مفہوم ہوتا ہے کہ اعتکاف دن میں فاسد ہوا تو صرف دن کی قضاء واجب ہوگی، صبح صادق سے قبل شروع کرکے غروب آفتاب تک اعتکاف

کرے، اور اگر رات میں اعتکاف نہ ہو سکا تو رات دن دونوں کی قضاء واجب ہے، غروب آفتاب سے قبل شروع کرکے دوسرے روز غروب کے بعد ختم کرے، اگر ایک دن کے اعتکاف کی نذر کی تو صرف دن کا اعتکاف واجب ہے، اور رات دن دونوں کی نذر میں چوبیس گھنٹے کا اعتکاف واجب ہے اور قضاء اعتکاف بھی وجوب میں نذر کی طرح ہے، اس لئے اس کا بھی وہی حکم ہوگا وھو المراد من مفہوم الشامی، فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۲ ذی الحجہ ـــــھ

عورت کو اعتکاف میں حیض آگیا:

سوال: اگر عورت کو اعتکاف کی حالت میں حیض آجائے تو وہ اتنے دنوں کے اعتکاف کی قضاء کرے گی یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

جس روز حیض شروع ہوا صرف اسی ایک دن کی قضاء واجب ہے، فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۲۸ رمضان ـــــھ

معتکف غسل جمعہ کے لئے نکل سکتا ہے:

سوال: معتکف جمعہ کے دن غسل کرنے کے لئے مسجد سے باہر جا سکتا ہے یا نہیں؟ یہاں بعض علماء اس کو ناجائز بتا رہے ہیں، اس لئے مفصل تحریر فرمائیں۔ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

جائز ہے، جمعہ کے روز غسل مستحب ہے، اور وضوء وغسل خواہ فرض ہو یا نفل اس کے لئے مسجد سے نکلنے کا جواز دلائل ذیل سے ثابت ہے:

① نقل فی الشامیة عن فتاوی الحجة ویجوز للمعتکف ان یخرج من المسجد فی سبعة اشیاء البول والغائط والوضوء والاغتسال فرضا کان او نفلا والجمعة ویخرج ایضا لحاجة السلطان ویخرج ایضا للامر لا بد منه ثم یرجع بعد ما فرغ من ذلک الامر سریعا (الشامیة فی حرمة الخزانة ص ۳۲۸)

② نقل الروایة المذکورة عن فتاوی الحجة الشیخ محمد ھاشم التتوی رحمه الله تعالی فی بیاضه المعروف بالبیاض الهاشمی،

③ ونقلها العلامة الشامی رحمه الله تعالی عن الاکلیل عن الخزانة

عن فتاوی الحجة (احکام القرآن ص ۱۹۰ ج ۱)

④ قال المخدوم التتوی رحمه الله تعالیٰ فی حیاة الصائمین دوم از حاجت شرعیه وضو واغتسال است پس جائز ست معتکف را خروج از مسجد برائے آں اگرچه فرض باشد یا نفل کذا فی المضمرات والفتاوی الحجة والتتارخانیة وکنز العباد وخزانة الروایات والفتاوی المحمدیة (ص ۰۰ ج ۲ الفصل الحادی الاثنی المستدی)

⑤ وفی مظهر الانوار یجوز للمعتکف الخروج للبول والغائط والوضوء والاغتسال فرضا کان او نفلا (حواله بالا)

⑥ قال الشیخ الدهلوی رحمه الله تعالیٰ اما غسل جمعه ودیگر سنن پس صریح دراں از اصول نمی یابم جز اینکه در شرح امداد گفته است که بیروں می آید برائے غسل فرض باشد یا نفل۔

(اشعة اللمعات ص ۱۲ ج ۲)

فتاوی الحجة، خزانة الروایات، بیاض ہاشمی، الاکلیل، احکام القرآن، حیاة الصائمین، مضمرات، تتارخانیہ، کنز العباد، فتاوی محمدیہ، مظہر الانوار، اشعة اللمعات، مجموعہ تیرہ کتابوں میں یہ مسئلہ بلا تردد منقول ہے، اگرچہ ان میں سے بعض کتابیں غیر معروف ہیں، اور خزانة الروایات وکنز العباد کی مولانا عبد الحی صاحب لکھنوی قدس سرہ نے النافع الکبیر میں تضعیف فرمائی ہے مگر دوسری کتب معروف ومعتبر ہیں، بالخصوص علماء واہل فتویٰ جن میں علامہ مخدوم ٹھٹھوی رحمہ اللہ تعالیٰ جیسے جلیل القدر فقیہ بھی ہیں ان سب کا بلا انکار وبلا ذکر اختلاف نقل کرنا مستقل دلیل ہے، علاوہ ازیں قول علائیہ رحمہ اللہ تعالیٰ وحرم علیه الخروج الا لحاجة الانسان کے تحت علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ولا یمکث بعد فراغه من الطهور، یہاں طہور سے نفل وضو متبادر ہے اور نفل وضو کے لئے جواز خروج سے مخالف کو بھی انکار نہیں، بعض نے وضو للصلوة النافلة اور غسل نفل میں فرق کیا ہے، اول کے لئے جواز خروج اور ثانی کے لئے عدم جواز اختیار کیا ہے، یہ فرق غیر معقول ہونے کے علاوہ شامیہ کے جزئیہ مذکورہ کے بھی خلاف ہے، پس نفل وضو کے حوائج شرعیہ میں داخل اور نفل غسل کے اخراج کی کوئی وجہ نہیں، نیز غیر مؤذن کو بھی اذان کے لئے خروج کی اجازت ہے، اور اس کا عموم حالت حضور مؤذن کو بھی شامل ہے، اس سے ثابت ہوا کہ ہر وہ عبادت جس کا تعلق مسجد سے ہو وہ حوائج شرعیہ میں داخل ہے اگرچہ نفل ہو، بخلاف صلوة الجنازة ونحوها۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۲۳ ذی قعدہ سنہ ۹۱ھ

اعتکاف منذور کی مختلف صورتیں:

سوال: کیا مندرجہ ذیل صورتوں میں دن رات دونوں کا اعتکاف کرنا ہوگا یا صرف دن کا یا صرف رات کا؟

(۱) اگر ایک دن کے اعتکاف کی نذر کی؟
(۲) اگر ایک رات کے اعتکاف کی نذر کی؟
(۳) اگر یہ نذر کی کہ صرف دن کا اعتکاف کروں گا رات کا نہیں کروں گا؟
(۴) اگر یہ نذر کی کہ صرف رات کا اعتکاف کروں گا دن کا اعتکاف نہیں کروں گا؟
(۵) اگر یہ نذر کی کہ دو یا تین یا اس سے زیادہ دنوں کا اعتکاف کروں گا؟
(۶) اگر یہ نذر کی کہ دو یا تین یا اس سے زیادہ راتوں کا اعتکاف کروں گا؟
(۷) اگر یہ نذر کی کہ دو یا تین یا اس سے زیادہ دنوں کا اعتکاف کروں گا اور نیت صرف دنوں کی تھی؟
(۸) اگر یہ نذر کی کہ دو یا تین یا اس سے زیادہ راتوں کا اعتکاف کروں گا اور نیت صرف راتوں کی تھی؟
(۹) اگر دو یا تین یا زیادہ دنوں کی نذر کی اور نیت صرف رات کی تھی؟
(۱۰) اگر دو یا تین یا اس سے زیادہ راتوں کی نذر کی اور نیت صرف دنوں کی تھی؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملهم الصواب

(۱) اگر ایک دن کے اعتکاف کی نذر کی تو صرف ایک دن کا اعتکاف واجب ہوگا، صبح صادق سے قبل شروع کرکے غروب آفتاب تک۔
(۲) اگر ایک دن کے اعتکاف کی نذر کی اور دن رات دونوں کی نیت کی تو دونوں کا واجب ہوگا۔
(۳) اگر ایک رات کے اعتکاف کی نذر کی تو صحیح نہیں، کچھ واجب نہ ہوگا۔
(۴) اگر ایک رات کے اعتکاف کی نذر کی مگر رات بول کر دن مراد لیا تو ایک دن کا اعتکاف واجب ہوگا۔
(۵) دنوں اور راتوں دونوں کا اعتکاف کرنا ہوگا۔
(۶) دنوں اور راتوں دونوں کا اعتکاف کرنا ہوگا۔
(۷) صرف دنوں کا اعتکاف واجب ہوگا۔
(۸) کچھ واجب نہ ہوگا۔
(۹) دن اور رات دونوں کا اعتکاف کرنا ہوگا۔
(۱۰) صرف دنوں کا اعتکاف ضروری ہوگا۔

قال في شرح التنوير ولزمه الليالي بنذره بلسانه اعتكاف ايام ولاء اي متتابعة وان لم يشترط التتابع وكعكسه لان ذكر احد العددين بلفظ الجمع وكذا التثنية يتناول الآخر فلو نوى في نذر الايام النهار خاصة صحت نيته لنية الحقيقة وان نوى بها اي بالايام الليالي لا بل لزمه كلاهما، وفي الشامية تحت قوله لا والحاصل انه اما ان يأتي بلفظ المفرد او المثنى او المجموع وكل من الثلاثة اما ان يكون اليوم او الليل وكل من الستة اما ان ينوي الحقيقة او المجاز او ينويهما او لم تكن له نية فهي اربعة وعشرون وعلمت حكم المثنى والمجموع بأقسامهما بقي المفرد فلو نذر اعتكاف يوم لزمه فقط نواه او لم ينو وان نوى الليلة معه لزماه ولو نذر اعتكاف ليلة لم يصح ما لم ينو بها اليوم كما مر وتمامه في البحر (رد المحتار ص ۱۴۸ ج ۲) فقط والله تعالى اعلم

۶ ذیقعدہ سنہ ۹۱ھ

قضاء حاجت کے لئے نکلا تو غسل نہیں کر سکتا:

سوال: اگر معتکف کسی شرعی یا طبعی ضرورت سے باہر نکلے مثلاً قضاء حاجت کے لئے تو بعض تبرید کے لئے یا میل دور کرنے کے لئے استنجاء کرنے کے بعد یا اس سے پہلے غسل کر سکتا ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

جائز نہیں، اعتکاف فاسد ہو جائے گا، البتہ اگر غسلخانہ بیت الخلاء کے ساتھ ہی ہو اور نہانے میں وضوء سے زیادہ دیر نہ لگے تو قضاء حاجت کے بعد غسل کی اجازت ہے، اس کی صورت یہ ہو سکتی ہے کہ مسجد ہی میں کپڑے اتار کر صرف لنگی میں چلا جائے اور نل کھول کر بدن پر پانی بہا کر نکل آئے، نہ صابون لگائے اور نہ زیادہ ملے، اس طرح تنظیف تو نہیں ہوگی تبرید البتہ ہو جائے گی، اور اگر مسجد کی طرف چلتے چلتے تولیہ سے بدن رگڑ لے تو کوئی حد تک تنظیف بھی ہو سکتی ہے، فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۶ ذیقعدہ سنہ ۹۱ھ

معتکف کا اخراج ریح کے لئے خروج جائز نہیں:

سوال: معتکف ریح خارج کرنے کے لئے مسجد سے باہر جا سکتا ہے یا نہیں؟ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب "آداب المساجد" میں بحوالہ عالمگیریہ لکھتے ہیں کہ اخراج ریح کے لئے

معتکف کو مسجد سے باہر جانے کی اجازت ہے، اس بارے میں آپ کی تحقیق کیا ہے؟ بینوا توجروا،

الجواب باسم ملہم الصواب

عالمگیریہ میں حتی المقدور تلاش کے بعد جو عبارت ملی اس میں معتکف کی تصریح نہیں، عام عبارات سے ثابت ہوتا ہے کہ اس صورت میں معتکف کے لئے مسجد سے خروج جائز نہیں، نیز اس میں اخراج ریح کا اظہار ہے جو طبعاً، عقلاً، شرعاً قبیح ہے،

فائدہ:۔ ریح سے تعفن زائل کرنے کے لئے ہومیوپیتھک دوا کاربوویج بہت مفید ہے، فقط واللہ تعالیٰ اعلم،

۱۹ ذیقعدہ سنہ ۹۱ھ

معتکف کا مسجد میں حجامت بنوانا:

سوال: معتکف کو مسجد میں حجامت بنوانا جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا،

الجواب باسم ملہم الصواب

اپنی حجامت خود بنانا جائز ہے، اور حجام سے بنوانے میں یہ تفصیل ہے کہ اگر وہ بدون عوض کام کرتا ہے تو مسجد کے اندر جائز ہے، اور اگر بالعوض ہے تو معتکف مسجد کے اندر رہے مگر حجام مسجد سے باہر بیٹھ کر حجامت بنائے، مسجد کے اندر اجرت سے کام کرنا جائز نہیں، فقط واللہ تعالیٰ اعلم،

۲۷ ذیقعدہ سنہ ۹۲ھ

منذور اعتکاف قضاء روزہ کے ساتھ صحیح نہیں،

سوال: منذور اعتکاف اور رمضان کے قضاء روزوں کے ضمن میں ادا ہو سکتا ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا،

الجواب باسم ملہم الصواب

اگر کسی نے معین رمضان میں اعتکاف کی نذر مانی تو اس کو رمضان کے روزوں کے ساتھ ادا کیا جا سکتا ہے، اگر رمضان میں اعتکاف نہ کر سکا تو اسی رمضان کے قضاء روزوں کے ساتھ بھی ادا ہو سکتا ہے، ورنہ مستقل نفل روزہ کے ساتھ اعتکاف کرے، دوسرے رمضان میں یا واجب آخر میں یہ اعتکاف ادا نہ ہوگا، اور اگر غیر معین اعتکاف کی نذر کی ہو تو اس کے لئے مستقل روزے رکھے، قضاء روزہ کافی نہیں، قال فی التنویر فلو نذر اعتکاف شہر رمضان لزمہ واجزأہ عن صوم الاعتکاف وان لم یعتکف قضی شہرا بصوم مقصود، وفی الشرح لعود شرطہ الی الکمال الاصلی فلم یجز فی رمضان آخر ولا فی واجب

سوا قضاء رمضان الاول لانه خلف عنه وتحقیقه فی الاصول فی بحث الامر (رد المحتار ص۱۳۲ ج ۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

غرۂ شوال ۹۴ھ

جس مسجد میں جماعت نہ ہو اس میں اعتکاف صحیح ہے:

سوال: ایک مسجد میں صرف تین وقت جماعت ہوتی ہے کیا اس میں اعتکاف درست ہے؟ یا کہ اعتکاف کی صحت کے لئے پانچوں وقت جماعت شرط ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

صحتِ اعتکاف کے لئے علی الراجح مسجد جماعت شرط نہیں، لہٰذا ایسی مسجد میں اعتکاف صحیح ہے، قال فی العلائیۃ فی مسجد جماعۃ ھو ماله امام ومؤذن اديت فيه الخمس اولا وعن الامام اشتراط اداء الخمس فيه وصححه بعضهم وقالا يصح فی کل مسجد وصححه السروجی وقال ابن عابدین رحمه الله تعالیٰ (قوله وصححه السروجی) وهو اختیار الطحاوی قال الخیر الرملی وهو ایسر خصوصا فی زماننا فینبغی ان یعول علیه (رد المحتار ص۱۲۰ ج ۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۲۳ ربیع الآخر ۹۰ھ

بعض امور مفسدہ و غیر مفسدہ:

سوال: مندرجہ ذیل امور مفسد اعتکاف مسنون ہیں یا نہیں؟

(۱) وضوء سے قبل یا بلا قصد وضوء وضوء خانہ پر بیٹھ کر صابون سے ہاتھ منہ دھونا۔

(۲) وضوء کے بعد وضوء خانہ پر کھڑے ہوکر رومال سے وضوء کا پانی خشک کرنا۔

(۳) وضوء سے قبل ہاتھ کی گھڑی وضوء خانہ پر ہاتھ سے نکال کر جیب میں رکھنا پھر وضوء شروع کرنا، یا وضوء خانہ پر وضوء کے لئے چڑھتے ہوئے ہاتھ میں سے گھڑی نکال کر جیب میں رکھنا۔

(۴) بیت الخلاء میں لائن لگی ہوئی ہو تو وہاں انتظار میں کھڑے ہونا۔

(۵) وضوء سے قبل وضوء خانہ پر بیٹھ کر ٹوپی یا رومال وضوء خانہ کی جالی یا کھونٹی پر رکھنا۔

(۶) گھر سے کوئی کھانا لانے والا نہ ہو تو کھانے کے لئے گھر جانا۔

(۷) کھانے کے لئے گھر جانے پر معلوم ہوا کہ کھانے کی تیاری میں تھوڑی دیر ہے مثلاً سالن کو بگھار لگ رہا ہے اس کا انتظار کرنا۔

⑧ احتلام ہو گیا اور ٹھنڈا پانی نقصان کرتا ہے تو پانی گرم کرنے کے لئے مسجد سے نکلنا یا گرم پانی کے لئے گھر جانا اور وہاں پانی گرم ہونے کے انتظار میں ٹھہرنا،
کیا اس صورت میں یہ جائز ہے کہ تیمم کرکے مسجد ہی میں رہے اور گھر سے گرم پانی آنے تک مسجد ہی میں انتظار کرے؟
⑨ حالتِ اعتکاف میں بیمار ہو گیا، اور دوا لاکر دینے والا کوئی نہ ہو، یا ڈاکٹر کے پاس جانا ضروری ہو تو دوا کے لئے مسجد سے نکلنا، بینوا توجروا،

الجواب باسم ملہم الصواب

①② اعتکاف فاسد ہو جائے گا۔
③⑧ جائز ہے، احتلام کی صورت میں گرم پانی کے انتظار میں تیمم کرکے مسجد میں ٹھہرنا، بلکہ یہی ضروری ہے۔ تیمم کرکے مسجد سے فوراً نکل جائے، مسجد سے باہر پانی گرم ہونے کے انتظار میں ٹھہرنا جائز نہیں۔
⑨ دوا کے لئے نکلنے سے اعتکاف فاسد ہو جائے گا اور اس روز کی قضا لازم ہے، البتہ سخت مجبوری کی صورت میں نکلنے سے گناہ نہیں ہوگا، اعتکاف بہرحال فاسد ہو جائے گا اور قضا لازم ہوگی، قال فی شرح التنویر وحرم علیہ الخروج الا لحاجة الانسان طبیعیة کبول وغائط وغسل لو احتلم ولا یمکنہ الاغتسال فی المسجد کذا فی النہر او شرعیة فلو خرج ولو ناسیا ساعة زمانیة لا رملیة کما مر بلا عذر فسد فیقضیہ وان خرج بعذر یغلب وقوعہ وھو ما مر لا غیر لا یفسد واما ما لا یغلب کانجاء غریق وانہدام مسجد فمسقط للاثم لا للبطلان والا لکان النسیان اولیٰ بعدم الفساد کما حققہ الکمال (رد المحتار ص ۱۳۵ ج ۲)۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۷ر شوال [illegible]

کتاب الحج

محصر کا حکم:

سوال: ایک شخص نے حج کا احرام باندھا، مگر بعد میں راستہ مسدود ہو جانے یا اور کسی وجہ سے جا نہیں سکا تو یہ کیا کرے؟ بینوا توجروا

الجواب ومنه الصدق والصواب

اگر اس نے صرف حج یا صرف عمرہ کا احرام باندھا ہے تو ایک قربانی کی قیمت بھیجدے اور اگر قران یعنی حج و عمرہ دونوں کا احرام باندھا ہے تو دو قربانیوں کی قیمت بھیجے اور دن مقرر کرے کہ فلاں دن فلاں وقت پیشتر میری طرف سے حرم میں ذبح کی جائے، یہ ضروری نہیں کہ یہ قربانی ایام نحر ۱۰، ۱۱، ۱۲ ذی الحجہ ہی میں کی جائے، بلکہ اس سے قبل یا بعد بھی کی جا سکتی ہے، جب یہ مقرر وقت گذر جائے احرام کھول دے، سر منڈانا ضروری نہیں، مستحب ہے، بعض نے صرف حرم میں احصار کی صورت میں سر منڈانا واجب قرار دیا ہے، قول وجوب احوط وعدم وجوب ارجح ہے، پھر اس پر آئندہ سال قضاء واجب ہے، اگر صرف عمرہ کا احرام تھا تو صرف عمرہ کی قضاء واجب ہے، اور صرف حج کا احرام تھا تو حج و عمرہ دونوں واجب ہیں، اور حج و عمرہ دونوں کا احرام تھا تو ایک حج اور دو عمرے قضاء میں واجب ہیں، قال فی التنویر بعث المفرد دما والقارن دمین وعین یوم الذبح فی الحرم ولو قبل یوم النحر بلا حلق وتقصیر وعلیه ان حل من حجه حجة وعمرة وعلی المعتمر عمرة والقارن حجة وعمرتان وفی الشامیة (قوله بلا حلق وتقصیر) لکن لو فعله کان حسنا وهذا عندهما وعن الثانی روایتان (الی قوله) وفی السراج وهذا الخلاف اذا احصر فی الحل اما فی الحرم فالحلق واجب اه قال فی الشرنبلالیة کذا جزم به فی الجوهرة والکافی وحکاه البرجندی عن المصفی بقیل فتأمل وقیل انما لا یجب الحلق علی قولهما

اذا کان الاحصار فی غیر الحرم اما فیہ فعلیہ الحلق (رد المحتار ص ۲۲۳ ج ۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۸ ذی الحجہ سنہ ۸۲ھ

متمتع محصر پر ایک ہی دم ہے:

سوال: زید اشہر حج میں بغرض تمتع گھر سے نکلا راستہ میں حسب قاعدہ عمرہ کا احرام باندھ لیا مکہ مکرمہ پہنچنے سے قبل محصر ہو گیا اب زید احرام سے نکلنے کے لئے قارن کی طرح دو دم احصار بھیجے یا مفرد بالعمرہ کی طرح ایک دم بھیجے؟

زید کا ارادہ یہ تھا کہ عمرہ سے فارغ ہو کر حلق کے بعد ۸ ذی الحجہ کو احرام حج باندھے گا۔ اکثر عبارات فقہیہ سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ زید مذکور پر ایک دم احصار بھیجنا واجب ہو کیونکہ معتمر محصر پر ایک ہی دم کا وجوب لکھا ہے، لیکن بالتصریح یہ جزئیہ نہیں ملا کہ تمتع کا ارادہ رکھنے والے زید جیسے معتمر کا بھی یہی حکم ہے، عام معتمرین دوبارہ حج کا ارادہ نہیں رکھتے صرف عمرہ ہی کرنا چاہتے ہیں اس سے کچھ مختلف یا وجہ شبہ یہ ہے کہ بیان القرآن تحت قولہ تعالیٰ فَإِنْ أُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ کی توضیح میں حضرت تھانوی قدس سرہ نے قارن اور متمتع محصر پر دو دم بھیجنے کا وجوب لکھا ہے، وھٰذا نصہ مسئلہ: اگر حج و عمرہ کسی صورت سے پورا نہ کر سکے ایسے شخص کو چاہئے کہ کسی معتبر شخص سے ٹھہرا لے کہ فلاں تاریخ حد حرم کے اندر یہ جانور آپ کی طرف سے ذبح کر دینا اور قران اور تمتع میں جن کا ذکر عنقریب آتا ہے دو بکری ذبح کر دینا ہو۔

خدمت عالیہ میں گزارش ہے کہ مسئلہ ہذا کے بارے میں اپنی تحقیق سے مطلع فرمائیں کہ بیان القرآن میں تسامح ہوا ہے یا مسئلہ ہی ایسے ہے یا اس میں روایات مختلف ہیں؟ اور متمتع سائق الہدی عمرہ سے فارغ ہو کر حلق سے پہلے اگر احرام حج باندھ کر محصر ہو جائے، یا متمتع غیر سائق الہدی عمرہ سے فارغ ہوا اور حلق نہیں کرایا یعنی احرام نہیں کھولا اور بعد میں حج کا احرام باندھ لیا اور بعد ازاں احصار کی صورت پیش آئی تو ان دونوں صورتوں میں تحلل کے لئے دو دم احصار ضروری ہوں گے، ان دونوں صورتوں کا حکم معلوم کرنا مطلوب نہیں، بلکہ صرف اس صورت کا جو صدر استفتاء میں درج ہے حکم مطلوب ہے۔ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

بندہ نے جس قدر غور کیا یہی سمجھ میں آیا کہ صورت مسئولہ میں ایک ہی دم احصار ہوگا، بیان القرآن میں تسامح واقع ہوا ہے، یہ حکم ضمن کلیات میں منقول ہونے کے

علاوہ معقول بھی ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم ۱۱ صفر سنہ ۸۳ھ

عمر میں ایک بار فرضیت حج میں حکمت:

سوال: صلوٰۃ، زکوٰۃ میں تکرار ہے، حج میں تکرار کیوں نہیں؟ ساری عمر میں صرف ایک دفعہ کیوں فرض ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب ومنہ الصدق والصواب

اولاً تو احکام منصوصہ میں حکمت کا متلاشی رہنا ضعف ایمان کی دلیل ہے، ثانیاً عقلاً جملہ فرائض میں تکرار نہ ہونا چاہیے تھا، لان الامر لا یقتضی التکرار، مگر تکرار بسبب تکرار سبب ہوا تکرار امر، و حج کا سبب یعنی بیت اللہ واحد ہے، لہٰذا مقتضی تکرار کوئی چیز نہیں، ثالثاً حج میں نسبت دیگر عبادات کے مشقت زیادہ ہے، اس لئے حج کو جہاد فرمایا گیا ہے، معذور سے سقوط صلوٰۃ و عدم سقوط صوم میں بھی یہی حکمت ہے، قال فی التنویر ہو فرض مرۃ، وفی الشرح لان سببہ البیت وھو واحد، وفی الحاشیۃ (قولہ لان سببہ البیت) بدلیل الاضافۃ فی قولہ تعالیٰ وَلِلّٰہِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ فان الاصل اضافۃ الاحکام الی اسبابہا کما تقرر فی الاصول ولا یتکرر الواجب اذا لم یتکرر سببہ و لحدیث مسلم یا ایہا الناس قد فرض علیکم الحج فحجوا فقال رجل اکل عام یا رسول اللہ فسکت حتی قالہا ثلاثا فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لو قلت نعم لوجبت ولما استطعتم قال فی النھر والآیۃ وان کانت کافیۃ فی الاستدلال علی نفی التکرار لان الامر لا یحتملہ الا ان اثبات النفی بمقتضی النفی اولی (رد المحتار ج ۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۲۹ ربیع الآخر سنہ ۸۳ھ

نفل حج کی نیت سے فرض ساقط نہ ہوگا:

سوال: زید پر حج فرض نہ تھا، اس لئے اس نے نفل حج کی نیت کی تو اس کے ذمہ سے حج کا فریضہ ساقط ہوگا یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب ومنہ الصدق والصواب

نفل حج کی نیت سے فریضہ حج ادا نہ ہوگا، خواہ نیت کرنے والے پر بوقت نیت حج فرض ہو یا نہ ہو، قال فی الشامیۃ تحت (قولہ علی مسلم الخ) النوع الرابع شرائط وقوع

الحج عن الفرض (فی تتمۃ الی ان قال) وعدم نیۃ النفل وعدم الافساد وعدم الفوت عن الغیر (رد المحتار ص ۲۹۲ ج ۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۱۰ ربیع الآخر سنہ ۸۵ھ

محرم سے حلق کرانا:

سوال: محرم حلال ہوتے وقت ایک دوسرے کا حلق کرسکتے ہیں یا نہیں؟ یعنی جو شخص ابھی خود حلال نہیں ہوا وہ دوسرے کا حلق کرسکتا ہے یا نہیں؟ اس میں یہاں اختلاف ہو رہا ہے، اس لئے مفصل تحریر فرمائیں۔ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

اگر حلق سے پہلے کے تمام ارکان سے دونوں فارغ ہوچکے ہوں اور اب صرف حلق ہی باقی ہو تو اس وقت ایک دوسرے کا حلق کرنا جائز ہے، قال فی اللباب واذا حلق رأسه او رأس غیرہ عند جواز التحلل ای الخروج من الاحرام باداء افعال النسک لم یلزمه شیء (اللباب ص ۱۵۲) وفی الغنیۃ ولو حلق رأسه او رأس غیرہ من حلال او محرم جاز لما الحلق لم یلزمه ما شیء (غنیۃ ص ۹۳) علامہ مخدوم محمد ہاشم رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: باید کہ حلق نکند از دست محرمی، پس اگر حلق کرد او را محرم لازم آید بر حالق صدقہ نصف صاع گندم در حلق ورم، مگر آنکہ جماعہ از محرمان فارغ گشتہ باشند از افعالے کہ قبل از حلق اند و باقی نماند باشد بر ایشان مگر حلق آنگاہ حلق کنند بعضے از ایشان بعض دیگر را لازم نیاید بر ایشاں چیزے، کذا فی منسک الناسک للعلامۃ ابی الضیاء الحنفی (حیاۃ القلوب ص ۲۰۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

یکم ربیع الاول سنہ ۸۲ھ

جس نے اپنا حج نہیں کیا وہ حج بدل کرسکتا ہے:

سوال: حج بدل میں مامور کا اپنا حج کیا ہوا ہونا ضروری ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

ضروری نہیں، بہتر ہے لخلاف الشافعی رحمہ اللہ تعالیٰ البتہ اگر مامور پر حج فرض ہو تو اس کے لئے حج بدل مکروہ تحریمی ہے، مگر آمر کے لئے کراہت تنزیہیہ ہے، قال فی الشامیۃ قال فی البحر والحق انها تنزیهیة علی الآمر لقولهم والافضل الخ تحریمیة علی

الصرورة المأمور الذي اجتمعت فيه شروط الحج ولم يحج عن نفسه لأنه آثم بالتأخير اھ (رد المحتار ص ۲۴۳ ج ۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲۰ محرم سنہ ۸۵ھ

احرام میں ٹوپی پہننے کی جزاء:

سوال: احرام کے نفلوں سے فراغت کے بعد ٹوپی اتارنا یاد نہ رہا، اسی طرح غیب احرام طیبہ پہن لیا، پھر دیر کے بعد یاد آیا تو ٹوپی اتار کر دوبارہ نیت کرلی، اس پر کیا جزاء واجب ہوئی؟ نیز صرف سر ڈھانکنے کی ایک ہی جزاء واجب ہوگی یا لبس مخیط کی جزاء الگ ہوگی؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

ٹوپی ایک گھنٹے سے کم پہنی ہو تو ایک مٹھی گیہوں اور اس سے زائد پر نصف صاع صدقہ اور بارہ گھنٹے یا زائد پر دم واجب ہے، دوسرا قول یہ ہے کہ گھنٹے سے کم پر بھی نصف صاع ہے، ترجیح میں اختلاف ہے، ٹوپی سلی ہوئی ہو تو بھی لبس مخیط کی الگ جزاء نہیں لأن الارتفاق واحد بخلاف الستر بالمتلون فإن فيه ارتفاقين الستر والطيب، اسی لئے اگر ٹوپی کے ساتھ کرتہ بھی پہن لیا تو بھی ایک ہی جزاء ہوگی، فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲۴ رجب سنہ ۸۹ھ

حج بدل میں تمتع و قران کا حکم:

سوال: حج بدل کرنے والا قران کرے یا تمتع یا افراد؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

اس کو افراد کرنا چاہئے، آمر کی اجازت سے تمتع و قران بھی کرسکتا ہے، مگر دم شکر مامور پر ہوگا، اگر آمر بخوشی دم شکر کی قیمت ادا کردے تو جائز ہے، اس زمانہ میں عرفاً آمر کی طرف سے تمتع و قران و دم شکر کا اذن ثابت ہے، اس لئے صراحۃً اذن ضروری نہیں، محتاطاً صراحۃً اذن حاصل کرلینا بہتر ہے، فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲۸ ربیع الآخر سنہ ۸۸ھ

آفاقی اشہر حج میں مکہ سے مدینہ گیا تو تمتع یا قران کرسکتا ہے یا نہیں؟:

سوال: ① اگر کوئی آفاقی اشہر حج میں عمرہ سے فارغ ہوکر مدینہ طیبہ یا ریاض وغیرہ آفاق میں چلا جائے، اور پھر اسی سال حج کرنے کے خیال سے مکہ مکرمہ یا حدود حرم میں کسی

دوسری جگہ آئے تو اس کو افراد کا احرام باندھنا چاہیے یا عمرہ کا احرام باندھ کر آئے اور عمرہ کرکے ۸ ذی الحجہ کو حج کا احرام باندھے؟

(۲) اگر آفاقی نے رمضان میں عمرہ کیا اور شوال میں مدینہ طیبہ چلا گیا تو کیا اس سال تمتع یا قران کر سکتا ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

(۱) آفاقی اشہر حج میں عمرہ کے بعد مدینہ منورہ یا کہیں اور آفاق میں چلا جائے تو واپسی کے وقت اس کے لئے حج افراد کا احرام باندھنا بہتر ہے، امام صاحب رحمہ اللہ کے نزدیک وطن اصلی کے سوا کسی دوسرے مقام کی طرف سفر سے تمتع باطل نہیں ہوتا اور صاحبین رحمہما اللہ تعالیٰ کے نزدیک باطل ہو جاتا ہے، چونکہ پہلا عمرہ تمتع کا شمار نہ ہوا اس لئے اب نئے سرے سے تمتع یا قران جو بھی چاہے کر سکتا ہے، اور امام صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے مذہب پر وہ بحکم مکی ہوا اس لئے قران تو نہیں کر سکتا، البتہ اس کا تمتع کا عمرہ باقی ہے، اور اس کے بعد حج سے قبل دوسرے عمرہ کا جواز مختلف فیہ ہے، قول اصح یہ ہے کہ مکہ میں رہتے ہوئے مکروہ ہے، مگر آفاقی سے جائز ہے اس لئے مدینہ طیبہ سے واپسی پر عمرہ کا احرام باندھنے میں چنداں حرج نہیں، معہذا اختلاف سے بچنے کے لئے صرف حج ہی کا احرام باندھنا بہتر ہے۔

(۲) اگر شوال شروع ہونے کے بعد مکہ مکرمہ سے آفاق میں گیا تو عند الصاحبین رحمہما اللہ تعالیٰ تمتع و قران کر سکتا ہے، عند الامام رحمہ اللہ تعالیٰ یہ شخص بحکم مکی ہے اس لئے تمتع و قران نہیں کر سکتا، اسی پر فتویٰ ہے، لہٰذا افراد کرے، البتہ نظم حکومت کے تحت مجبور ہو اور الطاف احرام مشکل ہو تو تمتع کی گنجائش ہے۔ واما الآفاقی اذا دخل المیقات او دخل مکۃ بعمرۃ وحل منها قبل اشهر الحج فان مکث بها حتی دخل اشهر الحج فهو کالمکی بالاتفاق وان خرج الی الآفاق قبل اشهر الحج فکالآفاقی بالاتفاق او فیها فکالمکی عند ابی حنیفۃ الا ان یعود الی اهله فکالآفاقی عندهما (کبیر زغنیۃ ص ۱۲۱) مناسک کی عام کتابوں میں لکھا ہے کہ مکی نے تمتع یا قران کیا تو بکراہت تحریمہ صحیح ہو جائے گا اور اس پر دم شکر کی بجائے دم جبر واجب ہے، اس لئے اس سے خود نہیں کھا سکتا، مگر علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ کی تحقیق یہ ہے کہ حکم صحت مع الکراہۃ التحریمیہ صرف قران کے لئے ہے، مکی کا تمتع منعقد ہی نہیں ہوتا، اس لئے تمتع کی صورت میں دم جبر واجب نہیں، بطلان تمتع سے بطلان عمرہ کا وہم نہ ہو لان الباطل لا یستلزم

الثانی وقال العلامة المخدوم محمد هاشم السندی رحمه الله تعالیٰ اختلاف کرده اند در آنکه مکی در حج کی بمعنی عدم جواز است مع وجود صحت وانعقاد یا بمعنی عدم صحت وانعقاد اصلا، وصحیح آنست که قران وحج مکی منعقد میشود ولهذا واجب می شود بروے دم جبر للجنایة بمثل اینکه اگر در حج آفاقی را اما عمره پس منعقد نمیشود اصلا در حق او (الیٰ قوله) ولهذا لازم نباشد بروے دم درین صورت زیرا که دم از لوازم تمتع است وچون متعلق گشت ملزوم منتفی گشت لازم او (حیاة القلوب ص ۲۰۸) فقط والله تعالیٰ اعلم

۳ ربیع الاول ۸۶ھ

مکی آفاق سے واپسی پر تمتع یا قران کرسکتا ہے یا نہیں؟

سوال: مکہ معظمہ اور جدہ کے رہنے والے رمضان کے آخری عشرہ میں مدینہ طیبہ چلے جاتے ہیں اور شروع شوال میں جدہ والے جدہ آجاتے ہیں، اور مکہ معظمہ والے مکہ معظمہ آتے ہیں یا جدہ ہو کر مکہ معظمہ کے راستہ سے جدہ واپس آتے ہیں، اور اسی سال حج کا ارادہ رکھتے ہیں، تو وہ اب جبکہ میقات سے باہر چلے گئے تو آفاقی ہوگئے ایسی حالت میں تمتع کرسکتے ہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

یہ لوگ قران کرسکتے ہیں تمتع نہیں کرسکتے، یہ حکم ان لوگوں کا ہے جن کا حرم یا حل میں وطن اصلی ہے، جنہوں نے وہاں وطن اصلی نہیں بنایا صرف ملازمت یا تجارت وغیرہ کے لئے وہاں مقیم ہیں وہ تمتع بھی کرسکتے ہیں، اور جو شخص اشہر حج شروع ہونے کے بعد آفاق میں گیا ہو وہ قران بھی نہیں کرسکتا خواہ اس کا وطن اصلی ہو یا نہ ہو، قال فی الشامیة فی بیان شروط القران معزیا الی اللباب السادس ان یکون آفاقیا ولو حکما فلا قران لمکی الا اذا خرج الی الآفاق قبل اشهر الحج (رد المحتار ص ۲۰۷ ج ۲)

ومزید التفصیل فی الشامیة ص ۲۱۱ ج ۲ و ص ۲۱۲ ج ۲۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲۲ محرم ۹۱ھ

حکم قران وتمتع: (مذکورہ بالا دو فتاوی کی منضبط وجامع تلخیص)

(۱) آفاقی اشہر حج میں عمرہ کرنے کے بعد آفاق میں غیر وطن اصلی میں چلا گیا۔

عند الصاحبین رحمہما اللہ تعالیٰ یہ مرفق تمتع میں باقی نہیں رہا، لہٰذا قران وتمتع جائز ہیں۔

عند الامام رحمہ اللہ تعالیٰ اس عمرہ سے منعقد ہونے والا تمتع باقی ہے، لہٰذا قران جائز نہیں، عمرہ

مذکورہ آفاقی سے جو تفریع ہے مفتی الراجح، بوجہ اختلاف ذکر نا بہتر ہے۔

(۲) آفاقی حل یا حرم میں چلا گیا، پھر اشہر حج میں آفاق میں غیر وطن اصلی میں چلا گیا۔

عند الصاحبین رحمہما اللہ تعالیٰ قران و تمتع دونوں جائز ہیں، و عند الامام رحمہ اللہ تعالیٰ

دونوں ناجائز۔ قران کرے گا تو دم جبر لازم ہوگا، تمتع میں نہیں، لانہ لم ینعقد۔

(۳) حل یا حرم میں مستوطن بوطن اصلی اشہر حج سے قبل آفاق میں چلا گیا۔ قران جائز ہے اور تمتع ناجائز۔

(۴) حل یا حرم میں مستوطن بوطن اصلی اشہر حج میں آفاق میں چلا گیا۔

قران و تمتع دونوں ناجائز۔ واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

۲۰ ذی الحجہ ۱۴۱۲ھ

تین جوڑے کپڑوں سے زائد لباس حاجت اصلیہ میں داخل نہیں:

سوال: اگر کسی مرد یا عورت کے پاس بقدر روپیہ تو اتنا نہیں جو مصارف حج کے لئے کافی ہو البتہ زیور، زرعی جائیداد، مکانات یا دوسرا سامان اتنا موجود ہے کہ اگر وہ اس کا کچھ حصہ فروخت کردے تو مصارف حج پورے ہو سکتے ہیں، کیا ایسی صورت میں اس شخص پر حج فرض ہوگا یا نہیں؟ اور کیا اس شخص کے لئے ان اشیاء کو بقدر ضرورت فروخت کرکے فوراً حج کرنا ضروری ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملهم الصواب

زرعی جائیداد اور مکانات وغیرہ جو حوائج اصلیہ سے زائد ہوں تو ان کو فروخت کرکے فوراً حج کرنا فرض ہے، اور زیور جو حوائج اصلیہ سے نہیں بلکہ تین جوڑے کپڑوں سے زائد لباس بھی ضرورت میں داخل نہیں، کما فی الفصحیۃ الشامیۃ، آجکل لڑکیوں کو جہیز میں ضرورت سے زائد اتنا سامان دیا جاتا ہے کہ ان پر حج فرض ہو جاتا ہے، اگر اسی سال حج کے لئے بقدر روپیہ نہ ہو تو سامان بیچ کر حج کرنا فرض ہے، تاخیر کرنا گناہ ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۵ رمضان المبارک ۸۴ھ

میقات سے بدون احرام تجاوز:

سوال: طائف کا رہنے والا بدون احرام مکہ چلا گیا، اور پھر بھی طائف سے اسی سال یا دوسرے سال عمرہ کرلیا تو اس پر بدون احرام دخول مکہ کی وجہ سے جو سزا تھی وہ معاف ہوگئی یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملهم الصواب

بدون احرام دخولِ حرم تحت گناہ ہے، اور اس پر توبہ اور آفاق کی کسی میقات پر واپس جا کر حج یا عمرہ کا احرام باندھنا واجب ہے، اگر واپس نہیں گیا اور وہیں سے احرام باندھ لیا تو گنہگار ہوگا اور دم واجب ہوگا، البتہ اگر اسی سال آفاق کی کسی بھی میقات پر جا کر حج یا عمرہ کا احرام باندھ لیا یا حرم ہی میں احرام باندھا مگر طواف کا ایک شوط پورا کرنے سے قبل کسی میقات پر جا کر تلبیہ کہہ کر حج یا عمرہ کر لیا تو دم ساقط ہو گیا، اس حج یا عمرہ میں بدون احرام تجاوز کی وجہ سے واجب کی ادائیگی کی نیت ضروری نہیں، بلکہ حج یا عمرہ نفل یا نذر یا حج فرض جو نیت بھی کرے گا اس سے بدون احرام تجاوز کا واجب ادا ہو جائے گا، اگر اسی سال آفاق کی میقات سے حج یا عمرہ نہیں کیا بلکہ دوسرے سال کیا تو دم ساقط نہ ہوگا، البتہ تجاوز کی وجہ سے جو نسک واجب ہوا تھا وہ ادا ہو جائے گا اگرچہ نفل یا نذر یا فرض کی نیت کی ہو، قال فی الخانیة ولو دخل الآفاقی مکة بغیر احرام ثم رجع الی المیقات فی تلک السنة واحرم بحجة الاسلام سقط عنه ما کان واجبا بالمجاوزة ودخول مکة بغیر احرام عندنا وان لم یخرج من مکة حتی مضت السنة ثم خرج الی المیقات فی السنة الثانیة واحرم بحجة الاسلام وحج یجزیه حجة الاسلام ولا یسقط عنه الدم الذی کان واجبا علیه فی العام الاول (خانیة علی هامش الهندیة ص ۲۸۷ ج ۱) علائیہ میں دوسرے سال میں بنیتِ حج فرض و منذور وعمرۂ منذورہ عدم سقوط تحریر ہے، مگر شامیہ میں فتح وبحر سے سقوط کی ترجیح نقل کی ہے، البتہ بحر نے بنیت عمرۂ منذورہ سے عدم سقوط کی ترجیح نقل کرنے کے بعد فتح القدیر کے قول سقوط کو ترجیح دی ہے، فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۱۶ ذی الحجہ ۸۳ھ

سعی کی ابتداء صفا سے واجب ہے:

سوال: اگر کسی نے بجائے صفا کے مروہ سے سعی شروع کی تو اس کا کیا حکم ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملهم الصواب

صفا سے ابتداءِ سعی واجب ہے، اگر بجائے صفا کے مروہ سے سعی شروع کی تو ترکِ واجب کی وجہ سے پہلا شوط غیر معتبر ہے، اس کے بعد سات شوط پورے کرے، اگر اس وقت سات شوط نہیں کیا تو بعد میں جب چاہے ایک شوط کرے، البتہ سعی حج کی تکمیل سے قبل وقوفِ عرفات کر لیا، تو پوری سعی دوبارہ کرے، اگر نہیں کی تو دم واجب ہے، اور ایک شوط چھوڑ دیا تو صدقہ

ہے، اسی طرح دو یا تین شرط چھوڑے تو ہر شرط کے عوض صدقہ واجب ہے، چار اور اس سے زیادہ شرائط چھوڑنے پر دم ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۵ ذیقعدہ سنہ ۸۸ھ

حکومت حج نہ کرنے دے تو کیا حکم ہے؟

سوال: آج چند سال ہوگئے برما کا کوئی آدمی حج نہیں کرسکتا، حکومت برما کی طرف سے کلیۃً اجازت نہیں ہے، تو اس حال میں جس پر حج فرض ہوا اور وہ حج نہ کرسکے تو گناہ ہوگا یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

عند الامام رحمہ اللہ تعالیٰ اس صورت میں حج فرض نہیں، صاحبین رحمہما اللہ تعالیٰ کے ہاں ایسے پر حج بدل کرانا فرض ہے، پھر عذر زائل ہوگیا تو دوبارہ خود حج کرے، یہ دونوں قول صحیح ہیں، اول اگرچہ اوسع ہے مگر ثانی احوط ہونے کے علاوہ اکثر مشائخ کا مختار بھی ہے، لہٰذا حج بدل کی کوئی صورت ممکن ہو تو اس پر عمل کرنا لازم ہے، یہ اختلاف اس صورت میں ہے کہ مانع سے قبل حج فرض نہ ہوا ہو، اگر پہلے سے فرض تھا اس کے بعد عاجز ہوگیا تو بالاتفاق دوسرے سے حج کرانا فرض ہے، قال فی شرح التنویر غیر محبوس وخائف من سلطان یمنع منہ

وقال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ تعالیٰ فلا یجب علی مقعد ومفلوج وشیخ کبیر لا یثبت علی الراحلۃ بنفسہ واعمی وان وجد قائدا ومحبوس وخائف من سلطان لا بانفسہم ولا بالنیابۃ فی ظاہر المذہب وہو روایۃ عنہما وظاہر الروایۃ عنہما وجوب الاحجاج علیہم ویجزیہم ان دام العجز وان زال اعادوا بانفسہم، والحاصل انہ من شرائط الوجوب عندہ ومن شرائط وجوب الاداء عندہما وثمرۃ الخلاف تظہر فی وجوب الاحجاج والایصاء کما ذکرنا وہو مقید بما اذا لم یقدر علی الحج وہو صحیح فان قدر ثم عجز قبل الخروج الی الحج تقرر دینا فی ذمتہ فیلزمہ الاحجاج (الی قولہ) وظاہر التحفۃ اختیار قولہما وکذا الاسبیجابی وقواہ فی الفتح ومشی علی ان الصحۃ من شرائط وجوب الاداء اھ من البحر والنہر وحکی فی اللباب اختلاف التصحیح وفی شرحہ انہ مشی علی الاول فی النہایۃ وقال فی البحر العمیق

انه المذهب الصحیح وان الثانی صححه قاضی خان فی شرح الجامع واختاره کثیر من المشایخ ومنهم ابن الهمام (رد المحتار ص ۱۴۴ ج ۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۱۹/ ذی الحجہ [illegible]ھ

نابینا کے لئے حج کا حکم:

سوال: اندھے پر حج فرض ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

نابینا اور مفلوج وغیرہ سب معذورین کا وہی حکم ہے جو اوپر حکومت کی طرف سے ممانعت کے بارے میں بیان ہوا، فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۱۹/ ذی الحجہ [illegible]ھ

عمرہ کرنے سے فرضیت حج میں تفصیل:

سوال: کیا عمرہ کرنے سے حج فرض ہو جاتا ہے؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

اگر شوال شروع ہونے سے قبل واپس آگیا تو حج فرض نہیں ہوا، البتہ اگر شوال وہیں شروع ہو گیا اور اس کے پاس حج کے مصارف بھی ہوں تو حج فرض ہو جائے گا، اگر حکومت کی طرف سے حج تک ٹھہرنے کی اجازت نہ ہو تو فرضیت حج میں اختلاف ہے، راجح یہ ہے کہ اس پر حج بدل کرانا فرض ہے، مگر مکہ ہی سے حج کرا دے، بعد میں خود حج کی استطاعت ہو گئی تو دوبارہ کرے، کالمقعد والمفلوج والاعمی والمحبوس والخائف من السلطان، فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۱۰/ جمادی الآخرۃ [illegible]ھ

حج بدل کہاں سے کرایا جائے؟:

سوال: حج بدل کہاں سے کرانا چاہئے؟ اگر مکہ ہی سے کرا لیا جائے تو جائز ہو یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

اگر زندہ معذور کے امر سے یا مردہ کی وصیت سے حج بدل کیا جا رہا ہو تو موصی یا آمر کے وطن سے حج کرانا ضروری ہے، اگر ثلث مال ناکافی ہو اور ورثہ زیادہ کی اجازت نہ دیں تو جہاں سے بھی ثلث مال سے حج ہو سکے، اگر موصی یا آمر نے خود کوئی جگہ یا مال متعین کر دیا ہو تو وہیں سے کیا جائے اگرچہ مکہ ہی سے ہو، مگر صاحب استطاعت کے لئے ایسا کرنا مکروہ ہے، اگر حج کا امر یا وصیت نہیں کی

بلکہ کسی کی طرف سے تبرعاً کوئی شخص حج کرانا چاہتا ہے تو مکہ سے بھی جائز ہے، البتہ صاحب استطاعت کے لئے میقات سے کرانا افضل ہے، مکہ سے حج کرانے کی صورت میں اس کا خاص اہتمام کیا جائے کہ حج کرنے والا متقی دیندار قابل اعتماد ہو، کیونکہ کئی لوگ متعدد حضرات کی طرف سے حج بدل کرلیتے ہیں جس سے کسی کا بھی حج نہ ہوگا، نیز حج بدل میں اجارہ کی صورت نہ ہونے پائے، فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۱۲ ذی الحجہ ۸۴ھ

ماءِ زمزم و فضلِ وضوء قائماً پینا مستحب نہیں!:

سوال: وضوء سے بچا ہوا پانی اور ماءِ زمزم قائماً پینا سنت ہے یا مستحب؟ اور مستقبل قبلہ ہونا کیسا ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

فضل وضوء وماءِ زمزم قائماً پینے کی کراہت واستحباب میں اختلاف ہے، راجح یہ ہے کہ بلاکراہت جائز ہے، مگر مستحب نہیں، البتہ استقبال قبلہ مستحب ہے، قال العلائی رحمہ اللہ تعالیٰ فی آداب الوضوء وان یشرب بعدہ من فضل وضوئہ کماء زمزم مستقبل القبلۃ قائماً او قاعداً وفیما عداھما یکرہ قائماً تنزیھا وفی الشامیۃ والحاصل ان انتفاء الکراہۃ فی الشرب قائماً فی ھذین الموضعین محل کلام فضلا عن استحباب القیام فیھما ولعل الاوجہ عدم الکراہۃ ان لم نقل بالاستحباب لان ماء زمزم شفاء وکذا فضل الوضوء (رد المحتار ص ۸۸ ج ۱) وفی الحج منھا (قولہ شرب من ماء زمزم) ای قائماً مستقبلا القبلۃ متضلعا منہ متنفسا فیہ مرارا ناظرا فی کل مرۃ الی البیت (رد المحتار ص ۲۲۴ ج ۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۱۰ محرم ۸۵ھ

وقوف مزدلفہ چھوڑنے کا حکم:

سوال: مریض، ضعیف، مستورات، عذر کی وجہ سے مزدلفہ میں وقوف ترک کریں تو جائز ہے مگر ان کے ساتھ کی وجہ سے تندرست ہو بھی وقوف نہ کرے اور صبح صادق سے قبل مزدلفہ سے منیٰ چلا جائے تو اس تندرست پر دم واجب ہوگا یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

اس صورت میں تندرست آدمی پر دم واجب ہے، اس لئے کہ اس کا ترک وقوف

بلا عذر ہے، فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲۳ محرم ۸۹ھ

سوال مثل بالا:

سوال: سورج نکلنے سے پہلے مزدلفہ نہیں پہونچا تو اس کا شرعاً کیا حکم ہے؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

اگر وقوف مزدلفہ کسی قدرتی عذر کی وجہ سے نہ ہو سکا مثلاً کوشش کے باوجود وقت سے مزدلفہ طلوع آفتاب سے قبل نہ پہونچ سکا تو کوئی جزاء واجب نہیں، البتہ مخلوق کی طرف سے کسی رکاوٹ کی وجہ سے یا عمداً ترک وقوف سے دم واجب ہے، قال فی العلائیۃ لو ترکہ لعذر کزحمۃ بمزدلفۃ لاشیء علیہ، وفی الشامیۃ عن شرح اللباب ولو فاتہ الوقوف بمزدلفۃ باحصار فعلیہ دم من ان فاتہ عذر من جانب المخلوق فلا یؤثر اھ (رد المحتار ص ۲۱۲ ج ۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۳ جمادی الاولیٰ ۸۹ھ

احرام میں لنگوٹ یا نیکر پہننا:

سوال: احرام کی حالت میں لنگوٹ اور احرام کے نیچے نیکر پہن سکتا ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

آنت وغیرہ اترنے کے عذر کی وجہ سے لنگوٹ باندھنا جائز ہے، اور بدون عذر مکروہ ہے مگر اس پر کوئی جزاء واجب نہیں، نیکر پہننا بہرحال ناجائز ہے، اور اس پر لبس مخیط کی جزاء واجب ہے، قال فی شرح التنویر فان زرّرہ او خلّلہ او عقدہ اساء ولادم علیہ، وفی الشامیۃ وکذا الوشد بحبل ونحوہ لشبہہ حینئذ بالمخیط (رد المحتار ص ۲۲۲ ج ۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲۳ محرم ۹۸ھ

احرام میں جرابیں پہننا جائز نہیں:

سوال: احرام کی حالت میں جرابیں سوتی یا اونی پہننا جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

احرام میں کسی بھی قسم کی جرابیں پہننا جائز نہیں، قال فی شرح التنویر وخفین الا ان لا یجد نعلین فیقطعہما اسفل من الکعبین عند معقد الشراک فیجوز لبس موزۃ لا الجوربین (رد المحتار ص ۲۲۲ ج ۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲۵ ذیقعدہ ۸۹ھ

عورت کے لئے بلا محرم سفرِ حج حرام ہے:

سوال: ایک ضعیفہ اسّی سالہ غیر مشتہاۃ اس سال حج کرنا چاہتی ہے، اس کے ساتھ کوئی محرم نہیں، سوائے اس کے کہ جہاز میں جانے والے عازمین حج کی مستورات کی معیت رہے گی؛ کیا شرعًا ایسا جائز ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملهم الصواب

عورت خواہ کتنی ہی بڑی ہو اس کے لئے بلا محرم سفرِ حج حرام ہے، اگرچہ اس کے ساتھ دوسری عورتیں بھی اپنے محارم کے ساتھ ہوں تو بھی جائز نہیں، اگر مرتے دم تک محرم میسر نہ ہو تو اس پر حج بدل کی وصیت فرض ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۱۹ رجب سنہ ۱۳۹۰ھ

میت کی طرف سے بدوں وصیت حج کرنا:

سوال: اگر کوئی آفاقی کسی متوفی یا معذور شخص کی طرف سے اس کی وصیت یا امر کے بغیر از خود اپنے خرچ سے حج بدل کرے تو کیا اس کے لئے بھی اس شخص کے وطن سے جانا ضروری ہے جس کی طرف سے وہ حج بدل کر رہا ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملهم الصواب

متوفی یا معذور کی طرف سے فرض حج ادا کرنے کے لئے اس کا امر ضروری ہے، بدوں امر کسی اجنبی نے حج کیا تو یہ حج کرنے والے کا ہوگا، وہ اس کا ثواب جسے چاہے بخش دے، لہٰذا اس میں میقات وغیرہ کی قید نہیں، البتہ اگر وارث نے متوفی کی وصیت کے بغیر اس کی طرف سے حج کیا تو اس سے متوفی کا فرض ادا ہونے کی امید ہے، مگر اس میں بھی متوفی کی میقات سے احرام باندھنا ضروری نہیں، جس میقات سے چاہے باندھ سکتا ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۲۷ رجب سنہ ۱۳۹۲ھ

سفرِ حج میں مرنے والے پر وجوبِ وصیت کی تفصیل:

سوال: اگر کسی شخص کا سفرِ حج میں حج کرنے سے قبل انتقال ہو جائے تو کیا اس کے ذمہ سے فرض ساقط ہو جائے گا؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملهم الصواب

اگر اس پر اسی سال حج فرض ہوا تھا تو راستہ میں موت واقع ہونے سے فرض ساقط ہو گیا

اور اگر حج پہلے فرض ہوچکا تھا تو اس میں یہ تفصیل ہے کہ وقوف عرفہ کے بعد فوت ہوا تو فرض ادا ہوگیا، اس سے قبل فوت ہوا تو فرض ساقط نہیں ہوا، اس لئے اس پر اس کے شہر سے حج بدل کی وصیت کرنا فرض ہے، اگر ثلث مال اس کے شہر سے کافی نہ ہو تو جہاں سے بھی ثلث میں حج ہوسکے وہیں سے کرایا جائے۔ قال فی التنویر خرج الی الحج ومات فی الطریق واوصی بالحج عنه فان فسر المال او المکان فذاک والا فیحج عنه من بلده، وفی الشرح انما تجب الوصیة به اذا اخره بعد وجوبه اما لو حج من عامه فلا، وفی الحاشیة (قوله ومات فی الطریق) اراد به موته قبل الوقوف بعرفة ولو کان بمکة بحر وفی التجنیس اذا مات بعد الوقوف بعرفة اجزأ عن المیت لان الحج عرفة بالنص (قوله فالامر علیه) ای الشأن مبنی علی ما فسر ای بینه فان فسر المال یحج عنه من حیث یبلغ وان فسر المکان یحج عنه منه ط، قلت والظاهر انه یجب علیه ان یوصی بما یبلغ من بلده ان کان فی الثلث سعة فلو اوصی من دون ذلک او عین مکانا دون بلده یأثم لما علمت ان الواجب علیه الحج من بلده یسکنه (رد المحتار ص ۶۰۶ ج ۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔ ۲۰ رجب [illegible]

۱۲ ذی الحجہ کو رمی قبل الزوال جائز نہیں:

سوال: ذی الحجہ کی بارہویں تاریخ کو رمی جمار ضعیفوں، بیماروں اور عورتوں کے لئے زوال سے قبل جائز ہے یا نہیں؟ جمہور کے قول کے مطابق مشہور مذہب تو یہی ہے کہ ذی الحجہ کی گیارہویں اور بارہویں تاریخ میں رمی زوال کے بعد کرنی چاہئے، لیکن بعض اکابر علماء جن میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دام اللہ فیوضہم اور حضرت مولانا سید مہدی حسن صاحب مفتی دار العلوم دیوبند بھی شامل ہیں فرماتے ہیں کہ یہ لوگ زحمت اور ہجوم سے بچنے کے لئے اگر بارہویں تاریخ کی رمی قبل از زوال کرکے فارغ ہوجائیں تو کوئی حرج نہیں، ان حضرات کے مطبوعہ فتاویٰ کتابی شکل میں موجود ہیں جو بغرض ملاحظہ ارسال خدمت ہے، بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ مذکورہ بالا دونوں بزرگوں نے اپنی رائے سے رجوع فرمالیا ہے، اس سلسلہ میں جناب والا کی رائے معلوم کرنے کے لئے یہ استفتاء ارسال خدمت ہے کہ کیا بارہویں تاریخ کو قبل از زوال رمی کرنا جائز ہے یا نہیں؟ بصورت جواز علی الاطلاق جائز ہے خواہ رمی کرنے والا قوی تندرست اور مرد ہو یا صرف عورتوں، ضعیفوں، کمزوروں اور بیماروں کے لئے یہ گنجائش ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

رسالہ مسئلہ گزشتہ سال حافظ ریاض الحق صاحب مرحوم نے بھی استصواب کی غرض سے پیش کیا تھا، میں نے ان سے زبانی کہدیا تھا کہ میں اس سے متفق نہیں، آپ کا خط ملنے کے بعد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب دامت برکاتہم سے بذریعہ ٹیلیفون دریافت کیا تو فرمایا کہ میں اس سے رجوع کا بارہا اعلان کرچکا ہوں، مگر اس کے باوجود رسالہ میں میرا فتوی مسلسل چھاپا جا رہا ہے۔ شاید حضرت مفتی مہدی حسن کی طرف نسبت بھی خود ساختہ ہی ہو، مزید طرفہ یہ کہ اسی رسالہ میں مدرسہ امینیہ دہلی کے جواب میں اس کی تصریح موجود ہے کہ جواز کا قول ضعیف ہے اور قول ضعیف پر فتوی نہیں دیا جا سکتا، خوشیکہ مذہب مشہور و مفتی بہ یہی ہے کہ بارہویں کی رمی قبل الزوال جائز نہیں، اور نہ ہی وہ ضرورت قابل اعتناء ہے جس کی بناء پر رسالہ میں جواز کا فتوی دیا گیا ہے، جب عورتوں، مریضوں، ضعیفوں کے لئے بوقت شب رمی بلا کراہت جائز ہے تو رمی قبل الزوال کی کیا ضرورت رہی؛ نفس پرستی کو ضرورت نہیں کہا جا سکتا۔ رسالہ میں اثبات ضرورت کے لئے امور موہومہ کو محقق کرکے دکھایا گیا ہے۔ فقط واللہ اعلم۔

۲۰ ذیقعدہ سنہ ۸۲ھ

رمی میں جواز نیابت کی شرط

سوال: ایک شخص کے پاؤں میں چوٹ آگئی جس کی وجہ سے وہ نقل و حرکت سے بالکل معذور ہو گیا، اس لئے اس نے اپنی رمی دوسرے شخص سے نیابۃً کرائی، اور کوئی دوسرا محرم مرد نہ ہونے کی وجہ سے اپنی بیوی اور لڑکی کی طرف سے بھی کسی دوسرے مرد سے رمی کرائی تو کیا ان تینوں کی رمی صحیح ہو گئی؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

اگر سوار ہو کر بھی جمرات تک نہ جا سکتا ہو، یا سواری یا کوئی اٹھا کر لے جانے والا نہ ملے تو اس کی رمی ہو گئی، بیوی اور لڑکی کی طرف سے نیابۃً رمی صحیح نہیں، جمرات تک جانے کے لئے محرم ساتھ ہونا ضروری نہیں، اس لئے اُن پر دم واجب ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۲۵ ربیع الآخر سنہ ۹۳ھ

طواف زیارت بلا وضو کرنے سے دم واجب ہے:

سوال: ایک شخص کے پیر میں چوٹ لگ گئی، حرم شریف میں طہارت سے پہلے گر گیا،

ظہر کے بعد طواف زیارت کیا، پیٹ سے پانی یا مواد کبھی کبھی نکلتا جاتا تھا، اس کے باوجود طواف زیارت کر لیا تو کیا اس کا طواف زیارت ہوگیا؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملهم الصواب

ایام نحر کے اندر زخم سے خون بند ہونے کا انتظار کرنا واجب تھا، معذا طواف کر لیا تو ہوگیا لیکن واجب طہارت ترک کرنے کی وجہ سے دم لازم ہوگا، البتہ بعد میں اس طواف کا اعادہ کر لیا تو دم ساقط ہوگیا اگرچہ ایام نحر کے بعد اعادہ کیا ہو کما فی الشامیۃ۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۴ رشعبان ۹۳ھ

دم شکر سے عاجز کا حکم:

سوال: منیٰ میں قربانی کرنے سے قبل کسی کی رقم چوری ہوگئی، اب وہ قربانی نہیں کر سکتا، تو کیا کرے؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملهم الصواب

اگر صرف حج افراد تھا تو اس پر قربانی واجب نہیں، اور اگر تمتع یا قران تھا تو حلق کر کے احرام کھول ڈالے، اور جب قدرت ہو ایک جانور بنیت دم شکر حدود حرم میں ذبح کرے، اس پر دم جنایت نہیں، کیونکہ یہ معذور ہے، قال فی العلائیۃ فان فاتت الثلاثۃ تعین الحلق فلو لم یقدر تحلل وعلیہ دمان، قال ابن عابدین رحمہ اللہ تعالیٰ ای دم التمتع ودم التحلل قبل اوانہ بحر عن الھدایۃ وتمامہ فیہ وفیما علقناہ علیہ (رد المحتار ص ۔۔ ج ۲)

وقال ابن نجیم رحمہ اللہ تعالیٰ فلو لم یقدر علی الھدی تحلل وعلیہ دمان دم التمتع ودم التحلل قبل الھدی کذا فی الھدایۃ ھنا وقال فیما یاتی فی آخر الجنایات فان حلق القارن قبل ان یذبح فعلیہ دمان عند ابی حنیفۃ رحمہ اللہ تعالیٰ دم بالحلق فی غیر اوانہ لان اوانہ بعد الذبح ودم بتاخیر الذبح عن الحلق وعندھما یجب علیہ دم واحد وھو الاول فنسبہ صاحب غایۃ البیان الی التخلیط لکونہ جعل احد الدمین ھنا دم الشکر والآخر دم الجنایۃ وھو صواب وفیما یاتی اثبت عند ابی حنیفۃ دمین آخرین سوی دم الشکر ونسبہ فی فتح القدیر ایضا فی باب الجنایات الی السھو ولیس کما قالا بل کلامہ صواب فی الموضعین فھنا لما لم یکن جانیا بالتاخیر لانہ لعجزہ لم یلزمہ لاجلہ دم ولزمہ دم للحلق

في غير أوانه، وفي باب الجنايات لو كان جانيا بحلقه قبل الذبح لزمه دمان كما قررناه ولم يذكر دم الشكر لأنه قدمه في باب القران وليس الكلام الآن في الجناية.

وقال ابن عابدين رحمه الله تعالى في حاشيته منحة الخالق لكن لزوم الدمين هنا خلاف المذهب وسبق حمل كلام الهداية عليه لتصحيحه وإخراجه عن الخطأ والسهو هذا وقد يقال إنه إذا لم يكن جانيا بالتأخير لم يكن جانيا أيضا بالحلق في غير أوانه فينبغي أن لا يلزمه إلا دم القران لأن العجز عن ذلك وقد نقل الشرنبلالي في رسالته عن شرح مختصر الطحاوي للإمام الإسبيجابي ما نصه ولو لم يصم الثلاثة لم يجز الصوم بعد ذلك ولا يجزئه إلا الدم فإن لم يجد هديا تحلل وعليه دم المتعة ودم عليه لتحلله قبل أن يذبح ولا دم عليه لترك الصوم اهـ

(البحر الرائق ص ۳۹۲ ج ۲)

ان مختلف عبارات میں غور کرنے کے بعد بندہ کا خیال یہ ہے کہ اگر متمتع یا قارن نے قادر علی دم الشکر ہونے کی وجہ سے یوم نحر سے قبل تین روزے نہیں رکھے، مگر ذبح سے قبل کسی حادثہ کی وجہ سے عاجز ہو گیا کما فی الصورۃ المسئول عنہا تو اس پر صرف دم شکر واجب ہے جب قدرت ہو ادا کرے، چونکہ اس میں اس کا کوئی قصور نہیں اس لئے اس پر دم جنایت واجب نہ ہوگا، اور اگر شروع ہی سے دم شکر پر قادر نہ تھا اس کے باوجود روزے نہ رکھے تو اسے معذور اور غیر جانی قرار دینا بعید ہے، اس لئے اس پر ایک دم جنایت بھی حلق قبل الذبح کی وجہ سے واجب ہوگا، اور اگر ایام نحر میں ذبح نہ کیا تو دوسرا دم تاخیر کی وجہ سے واجب ہوگا، اس طرح اس پر کل تین دم واجب ہوئے ایک دم شکر اور دو دم جنایت، غنیہ میں بھی اس صورت میں تین دم لکھے ہیں۔

البتہ اگر یوم نحر سے قبل تین روزے مرض وغیرہ کی وجہ سے نہ رکھ سکا تو اسے معذور قرار دے کر اس پر صرف دم شکر کا قول کیا جا سکتا ہے، وھذا ما عندی والعلم عند اللہ العزیز العلیم۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۶ ربیع الآخر سنہ ۹۲ھ

حرم میں مستقل وطن نہ بنائے تو تمتع کر سکتا ہے:

سوال: میں مکہ مکرمہ میں ملازم ہوں، آجکل حکومت سعودیہ کے قانون کے مطابق

ملک سے ایک مرتبہ باہر جانا پڑتا ہے، اس لئے میں پاکستان آگیا ہوں، اب میں حج تمتع کرنا چاہتا ہوں اس کی کیا صورت ہوگی؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

آپ نے چونکہ مکہ مکرمہ کو ہمیشہ کے لئے مستقل وطن نہیں بنایا اس لئے پاکستان سے تمتع کرسکتے ہیں، اگر مستقل وطن بنالیں تو تمتع نہیں کرسکیں گے، نقل ابن عابدین رحمہ اللہ تعالی عن اللباب فی بیان شرائط التمتع التاسع عدم التوطن بمکۃ فلو اعتمر ثم عزم علی المقام بمکۃ ابدا لا یکون متمتعا وان عزم شہرین ای مثلا ثم حج کان متمتعا رحمتی بحث الحادی عشر ان یکون من اهل الآفاق والعبرۃ للتوطن فلو استوطن المکی فی المدینۃ مثلا فهو آفاقی وبالعکس مکی اھ (رد المحتار ص ۲۲۱ ج ۲)

فقط واللہ تعالی اعلم

۶ر ذیقعدہ [illegible]

دوگانہ طواف مکروہ وقت میں پڑھنے کا حکم:

سوال: اگر کسی نے مکروہ وقت میں طواف کیا اور اس کے بعد اسی مکروہ وقت میں دو رکعتیں پڑھ لیں تو دوگانہ طواف ادا ہوگیا یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

اگر یہ دوگانہ طلوع، غروب یا استواء کے وقت پڑھا تو بالاتفاق ادا نہیں ہوا، درمیان میں خیال آگیا تو منقطع کردے، اور تمام کرلیا تو بھی مکروہ وقت کے بعد دوبارہ پڑھے، اور اگر وقت فجر یا بعد عصر دوگانہ طواف پڑھا تو بھی قطع کرنا واجب ہے البتہ اگر پورا کرلیا تو بقول بعض اس کا اعادہ واجب نہیں بلکہ مستحب ہے، قال ابن عابدین رحمہ اللہ تعالی ولو صلاها فی وقت مکروہ قیل صحت مع الکراهۃ ویجب قطعها [illegible] فی الطلاق نظرا لما مر فی اوقات الصلوۃ من ان الواجب ولو لغیرہ کرکعتی الطواف والنذر لا تنعقد فی ثلاثۃ من الاوقات المنهیۃ اعنی الطلوع والاستواء والغروب بخلاف ما بعد الفجر وصلوۃ العصر فانها تنعقد مع الکراهۃ فیهما (رد المحتار ص ۱۰۳ ج ۲)، لیکن کتاب الصلوۃ میں ابن عابدین رحمہ اللہ تعالی نے بدائع سے نقل فرمایا ہے کہ اگر کسی نے مکروہ وقت میں نفل پڑھے تو ان کا اعادہ واجب نہیں، اور اس کی تعلیل یوں بیان فرمائی ہے، لانه اداها کما وجبت (رد المحتار ص ۲۳۹ ج ۱)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ دوگانہ طواف مکروہ وقت میں پڑھا تو اس کی قضاء واجب ہوگی، لانہا وجبت کاملۃ وادّاہا ناقصۃ۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۳ رجب سنہ ۸۶ھ

حج میں تأخیر جائز نہیں:

سوال: زید پر حج فرض ہے مگر وہ بعض دنیوی مصالح کی وجہ سے آئندہ سال تک ملتوی کر رہا ہے، کیا اس صورت میں زید گنہگار ہوگا؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

حج کی فرضیت علی الفور ہے، لہٰذا تأخیر سے گنہگار ہوگا، قال فی التنویر ھو فرض مرۃ علی الفور، وفی الشرح فی العام الاول عند الثانی واصح الروایتین عن الامام ومالک واحمد رحمہم اللہ تعالیٰ فیفسق وترد شہادتہ بتأخیرہ ای سنینا، وفی الحاشیۃ ثم لا یخفی انہ لا یلزم من عدم الفسق عدم الاثم فانہ یأثم ولو بمرۃ۔ (رد المحتار ص ۱۵۲ ج ۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۲۴ ربیع الثانی سنہ ۸۶ھ

وقت فرضیت حج:

سوال: ایک شخص اشہر حج میں مال کا مالک ہو گیا مع تمام شرائط کے، اور بعد میں مال خرچ کر دیا یا تلف ہو گیا، تو کیا حج کی قضا ضروری ہے؟ یا وجوب حج ساقط ہو گیا؟ ماحصل یہ کہ وقت وجوب حج کس وقت سے شروع ہوگا؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

اشہر حج میں مالدار ہوا تو حج فرض ہو گیا، البتہ اگر ایسے بعید ملک میں رہتا ہو کہ وہاں سے اشہر حج سے قبل حجاج روانہ ہوتے ہوں تو قافلہ حجاج کی روانگی کا وقت معتبر ہوگا، اگر اس وقت مالدار ہے تو حج فرض ہو گیا، اگر حج نہیں کیا تو قضاء واجب ہوگی، قال ابن الہمام رحمہ اللہ تعالیٰ والاولی ان یقال اذا کان قادرا وقت خروج اھل بلدہ ان کانوا یخرجون قبل اشہر الحج لبعد المسافۃ او قادرا فی اشہر الحج ان کانوا یخرجون فیہا ولم یحج حتی افتقر تقرر دینا وان ملک فی غیرہا وصرفہا الی غیرہ لا شیء علیہ (فتح القدیر ص ۱۲۴ ج ۲) وقال ابن عابدین رحمہ اللہ تعالیٰ فی شرائط وجوب الحج والوقت ای القدرۃ

فی اشهر الحج او فی وقت خروج اهل بلده علی ما یأتی (رد المحتار ص ۱۵۴ ج ۲) وقال بعده
علی قوله مع اهل الطریق ای وقت خروج اهل بلده وان کان مخیفا فی
غیره بحر (رد المحتار ص ۱۵۵ ج ۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۱۳ محرم سنہ ۹۱ھ

طواف زیارت نہ کرسکا تو بدنہ کی وصیت واجب ہے:

سوال: اگر کسی شخص نے طواف زیارت نہ کیا اور پھر عمر بھر ادا نہ کرسکا تو یہ شخص کیا کرے؟ کیا مرض الموت میں وصیت کر جائے یا اس میں اور کوئی تفصیل ہے؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

اس پر مرض الموت میں ایک بدنہ یعنی اونٹ یا گائے حرم میں ذبح کرنے کی وصیت کرنا واجب ہے، قال فی الشامیة (قوله وبقیت رقبته) ای وقت صحته الی آخر العمر فلو مات قبل فعله فقد ذکر بعض المحشین عن شرح اللباب للقاضی محمد عید عن البحر العمیق انهم قالوا ان علیه الوصیة ببدنة لانتفاء العذر من قبل من له الحق وان کان آثما بالتأخیر اھ فتأمل (رد المحتار ص ۲۰۸ ج ۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۱۰ رجب سنہ ۹۲ھ

ایام نحر میں طواف وداع جائز ہے:

سوال: اکثر معلمین جدہ سے معلم کا انتظام کرتے ہیں، جو جدہ سے سیدھے منیٰ وغیرہ اور ۱۲ ذی الحجہ کو زوال کے بعد منیٰ سے سیدھے جدہ لے جاتے ہیں تو اس طرح طواف وداع کرنا مشکل ہو جاتا ہے، کیا ان حالات میں طواف وداع طواف زیارت کے بعد ایک اور طواف کر لینے سے ادا ہو جاتا ہے؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

اہل جدہ پر طواف وداع واجب نہیں، آفاقی پر واجب ہے، اور طواف زیارت کے بعد ایام نحر میں بھی جائز ہے اگرچہ بنیت نفل ہو، فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۷ محرم سنہ ۱۴۰۱ھ

عذر من جهة المخلوق کی وجہ سے ترک طواف وداع:

سوال: اگر کسی نے تمام احکام حج انجام دیئے، صرف طواف صدر نہیں کیا تھا کہ اچانک

ایسا واقعہ پیش آیا کہ وہ طواف وداع نہ کرسکا جیسے اس سال میں ہوا کہ کئی دن تک مسجد حرام بوجہ باغیوں اور مدعیان مہدویت بند رہی تو کیا اس پر دم ہے یا معذور سمجھا جائے گا؟ نیز اگر نفل طواف کیا تو اس کے قائم مقام ہوگا یا نہیں؟ بعض علماء اعلان کر رہے ہیں کہ جن لوگوں نے طواف وداع نہیں کیا ان پر دم واجب ہے، حضرت والا مسئلہ کی پوری تحقیق تحریر فرمائیں، بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملهم الصواب

جس نے طواف زیارت کے بعد کوئی نفل طواف کر لیا وہ طواف وداع کے قائم مقام ہوگیا اس لئے اس پر دم واجب نہیں، اور اگر نفل طواف نہیں کیا تو اس پر دم واجب ہے، کیونکہ یہ عذر من جہۃ العباد ہے جو مسقط حق اللہ تعالیٰ نہیں۔

عذر کی وجہ سے ترک واجب میں تین قول ہیں، ایک یہ کہ عذر مطلقاً مسقط دم ہے، دوسرا یہ کہ جن اعذار کا مسقط ہونا منصوص ہے ان کے سوا دوسرے اعذار مسقط دم نہیں، تیسرا یہ کہ عذر من جہۃ العباد مسقط نہیں، عذر سماوی مسقط ہے، وهو الراجح، قال فی العلائیۃ فلو طاف بعد ارادة السفر ونوى التطوع اجزأه عن الصدر، وفی الشامیۃ الحاصل کما فی الفتح وغیره ان من طاف طوافا فی وقته وقع عنه نواه او نوی غیره اولا او نوی طوافا آخر الی قوله او بعد ما حل النفر بعد ما طاف للزيارة يوم النحر وان نواه للتطوع (رد المحتار ص ۲۰۳ ج ۲) وقال الطحطاوی رحمه الله تعالى (قوله ولا احصار بعد ما وقف بعرفة الخ) فان دام الاحصار لزمه دم لترك كل واجب من وقوف بمزدلفة ورمي الجمار ولكن التأخير الحلق والطواف وهذا في الاحصار بالعدو ولانه من قبل العباد ولا يكون عذرا في اسقاط حق الله تعالى كما قالوه في باب التيمم ان العدو اذا اسروا حتى صلى بالتيمم فانه يعيدها بالوضوء اذا اطلق لانه من قبل العباد فلا ينافي قولهم كل واجب ترك لعذر لا يجب فيه دم لان المراد بالعذر فيه العذر السماوي كالاحصار بالمرض مثلا فهذه الصورة وكالحيض لا كما بحثه صاحب البحر واقره اخوه (طحطاوی علی الدر باب الاحصار ص ۵۴۳ ج ۱) وقال ابن نجيم رحمه الله تعالى ثم ان دام الاحصار حتى مضت ايام التشريق الى ان قال وقد ظهر لي ان كلامهم محمول على الاحصار بسبب العدو لا مطلقا فانه اذا كان بالمرض فهو سماوي يكون عذرا في ترك الواجبات وان كان من قبل العباد

بعض اہل علم کو شامیہ مطلب فی جنایات المحصر کی عبارت (قولہ الا علی اہل مکۃ) افاد
وجوبہ علی کل حاج آفاقی مفرد او متمتع او قارن بشرط کونہ مدرکا مکلفا غیر معذور
فلا یجب علی المکی ولا علی المعتمر مطلقا وفائت الحج والمحصر والمجنون والصبی
والحائض والنفساء کما فی اللباب وغیرہ، سے مغالطہ ہوا ہے کہ مسئلہ زیر بحث میں طواف
صدر ساقط ہے، حالانکہ یہاں محصر سے محصر عن الحج مراد ہے، کما ھو ظاہر من مقابلۃ المکی ولا
بل المحصر الحقیقی ھو الذی احصر عن الحج ولا احصار بعد الوقوف بعرفۃ،
فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲۰ صفر [illegible]ھ

حاجت سے زائد زمین ہو تو حج فرض ہے:

سوال: زید کے پاس اتنی زمین ہے کہ اس سے صرف سال بھر کے لئے اس کا گذارہ ہوتا
ہے، اس کے علاوہ کوئی کاروبار نہیں ہے، البتہ تمام زمین یا کچھ زمین فروخت کرنے سے حج کا انتظام
ہو سکتا ہے، آیا اس صورت میں زمین فروخت کرکے زید کو حج کرنا فرض ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

اگر بقدر مصارف حج زمین بیچنے کے بعد اس کے پاس بقدر معاش زمین بچ جاتی ہے تو حج فرض
ہے، قال العلامۃ قاضی خان رحمہ اللہ تعالیٰ وان کان صاحب ضیعۃ ان کان لہ
من الضیاع ما لو باع مقدار ما یکفی لزادہ وراحلتہ ذاہبا وجائیا ونفقۃ عیالہ
واولادہ ویبقی لہ من الضیعۃ قدر ما یعیش بغلۃ الباقی یفترض علیہ الحج
والا فلا (خانیۃ علی ہامش الہندیۃ ص ۲۸۲ ج ۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۱۷ ذی الحجہ [illegible]ھ

احرام میں گردن، کان اور پیشانی ڈھکنا:

سوال: بحالت احرام میں بوقت ضرورت کانوں پر، گردن پر، پیشانی پر رومال باندھ سکتے
ہیں یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

گردن اور کانوں پر کپڑا ڈالنے میں کوئی حرج نہیں، پیشانی ڈھکنا جائز نہیں، البتہ
بوقت ضرورت جائز ہے، مگر جزاء بہرحال لازم ہوگی جس کی تفصیل یہ ہے کہ ربع عضو چہرہ یا سر کا

چوتھائی حصہ یا چوتھائی سے زیادہ ایک دن یا ایک رات ڈھانکا تو دم واجب ہے، اور چوتھائی سے کم یا ایک دن یا ایک رات سے کم ڈھانکا تو نصف صاع صدقہ واجب ہے، اور عذر سے ڈھانکا تو پہلی صورت میں اختیار ہے کہ دم دے یا تین صاع چھ مساکین پر صدقہ کرے یا تین روزے رکھے، اور دوسری صورت میں نصف صاع ایک مسکین کو صدقہ دے یا ایک دن کا روزہ رکھے، قال العلائی رحمہ اللہ تعالی ولا بأس بتغطية اذنيه وقفاه (رد المحتار ص ۲۲۱ ج ۲) وقال ابن عابدين رحمه الله تعالى في تغطية كل الوجه او الرأس يوما او ليلة دم والربع منهما كالكل وفي الاقل من يوم او من الربع صدقة كما في اللباب (رد المحتار ص ۲۲۵ ج ۲) وفي العلائية وان طيب او حلق او لبس بعذر خير ان شاء ذبح في الحرم او تصدق بثلاثة اصوع طعام على ستة مساكين او ان شاء صام ثلاثة ايام ولو متفرقة، وفي الشامية (قوله ان شاء ذبح الخ) هذا فيما يجب فيه الدم اما ما يجب فيه الصدقة فانه يتخير بين ان يتصدق بما وجب عليه من نصف صاع او اقل على مسكين او صيام يوم كما في اللباب (رد المحتار ص ۲۳۰ ج ۲) فقط والله تعالی اعلم

۵ صفر سنہ ۹ھ

سوال متعلق بالا:

سوال: آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ بلا عذر چہرہ یا سر چوتھائی سے کم یا ایک دن یا ایک رات سے کم ڈھانکا تو نصف صاع صدقہ واجب ہے، اس پر احقر کو دو اشکال ہیں:

(۱) شامیہ میں ہے (قوله بلا ثوب) كذا في الفتح والبحر والظاهر انه لو كان الوضع بالثوب فعليه الكراهة التحريمية فقط لان الانف لا يبلغ ربع الوجه افاده ط (رد المحتار ص ۲۲۱ ج ۲) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ربع سے کم ڈھانکنے پر کوئی جزا واجب نہیں۔

(۲) آپ نے ایک دن یا ایک رات سے کم میں مطلقاً نصف صاع صدقہ لکھا ہے، حالانکہ درمختار میں ہے وفي اقل من ساعة نصف صاع وفيما دونها قبضة وظاهره ان الساعة فلكية (رد المحتار ص ۲۲۱ ج ۲) اس میں تصریح ہے کہ ایک گھنٹے سے کم ڈھانکنے کی صورت میں ایک مٹھی صدقہ واجب ہے،

ان دونوں مسائل کے بارے میں تحقیق فرما کر ممنون فرمائیں،

والاجر من الله الكريم

الجواب باسم ملہم الصواب

① شامیہ میں لفظ "فقط" سے صرف نفی دم مقصود ہے، مطلق جزاء کی نفی مقصود نہیں، اس پر مندرجہ ذیل قرائن ہیں:-

(۱) کراہت تحریمیہ دلیل وجوب جزاء ہے۔

(۲) لان الانف لایبلغ ربع الوجه سے تعلیل ربع الوجہ موجب دم ہے، اس سے اس کی نفی سے وجوب دم کی نفی ہوئی نہ کہ مطلق جزاء کی۔

(۳) شامیہ میں یہ عبارت بحوالہ طحطاوی مذکور ہے، اور طحطاوی کی اصل عبارت میں عدم لزوم دم کی تصریح ہے، ونصه ولم يبين حكم ما اذا كان الوضع بثوب وظاهره كراهة التحريم واما لزوم الدم فلم يتعلق موجبه لان اقل ما يوجبه تغطية ربع الوجه والانف بخصوصه لا يصل الربع (طحطاوی علی الدر [illegible])،

(۴) خود شامیہ ص ۱۰۵ ج ۲ میں بحوالہ لباب اس کی تصریح موجود ہے کہ ربع سے کم میں صدقہ واجب ہے،

② درمختار کی عبارت مذکورہ کی شرح میں علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں (قوله فی الخزانة الخ) اما فی البحر ضعفه كما افاده فی اللباب (رد المحتار ص ۲۲۶ ج ۲)
لباب میں فرماتے ہیں (قوله وفی الاقل صدقة) وفی الاقل الساعة الواحدة ای الفلكية وما دونها خلافا لما فی خزانة الاكمل انه فی ساعة نصف صاع و فی اقل من ساعة قبضة من بر ولم يعرج فی اللباب على ما فی الخزانة واقره شارحه واعترض بمخالفته لما ذكره الفقهاء (رد المحتار ص ۲۳۰ ج ۲) اس سے ثابت ہوا کہ علامہ ابن نجیم، علامہ ابن عابدین اور دوسرے فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ ایک گھنٹے سے کم کی صورت میں بھی وجوب صدقہ کاملہ کے قائل ہیں، البتہ کتب مناسک لباب، شرح اللباب اور اس کے حاشیہ ارشاد الساری وغیرہ میں خزانہ کے مطابق ایک مٹھی کے قول کو ترجیح دی ہے، بوجہ ترجیح میں اختلاف ہے، قول اول احوط ہے، لیکن ثانی اوسع، فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۷ صفر سنہ ۱۴۰۳ھ

نقاب چہرہ سے لگ گیا

سوال: اگر کسی عورت کے حالت احرام میں چہرہ پر برقع کا نقاب ہوا سے اڑ کر لگ جائے یا

سوتے میں چادر وغیرہ اس کے یا کسی مرد کے چہرہ پر پڑ جائے تو اس کی جزاء کیا ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

ایک گھنٹہ سے کم وقت ہو تو اس کی جزاء میں اختلاف ہے کہ نصف صاع صدقہ واجب ہے یا ایک مٹھی، بحر، شامیہ اور دوسری کتب فقہ میں قول اول کو ترجیح دی گئی ہے، اور کتب مناسک میں دوسرے کو، اول احوط ہے اور ثانی اوسع، بار بار ابتلاء کے وقت اس پر عمل کرنے کی گنجائش ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔ ۳ رمضان ۸۴ھ

ترک رمی کا حکم:

سوال: اگر کوئی شخص دسویں ذی الحجہ کی رمی نہ کرسکے تو کیا اس کی قضاء گیارہویں یا بارہویں کو بھی کرسکتا ہے؟ اسی طرح جو شخص گیارہویں یا بارہویں کی رمی نہ کرسکے تو کیا اس کی قضاء بارہویں یا تیرہویں کو کرسکتا ہے؟ دریافت طلب یہ امر ہے کہ اگر کسی دن رمی معین وقت میں نہ کرسکے تو کیا اس کی قضاء تیرہویں تاریخ تک کسی دن کرسکتا ہے یا صرف دوسرے ہی دن کرسکتا ہے اور بعد کو صرف دم دیدے؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

قضاء اور دم دونوں واجب ہیں، قضاء کا وقت تیرہویں تک ہے اس کے بعد نہیں، اور دم کی تفصیل یہ ہے کہ سب ایام کی یا ایک دن کی پوری یا نصف سے زائد کنکریاں چھوڑ دیں تو دم واجب ہے، اور ایک دن کی نصف سے کم چھوڑیں تو ہر کنکری کے عوض نصف صاع صدقہ واجب ہے، اگر صدقہ کا مجموعہ دم کی قیمت کے برابر ہوجائے تو اس سے کچھ کم کردیں۔ قال العلائی رحمہ اللہ تعالیٰ فی موجبات الدم او الرمی کلہ او فی یوم واحد او الرمی الاولیٰ او اکثرہ ای اکثر یوم (الی قولہ) او احدی الجمار الثلاث ویجب لکل حصاۃ صدقۃ الا ان یبلغ دما فینقص کما مر وفی الشامیۃ (قولہ او الرمی کلہ) انما یجب بترکہ کلہ دم واحد لان الجنس متحد کما فی الحلق والترک انما یتحقق بغروب الشمس من اخر ایام الرمی وھو الرابع لانہ لم یعرف قربۃ الا فیھا وما دامت الایام باقیۃ فالاعادۃ ممکنۃ فیرمیھا علی التألیف ثم بتأخیرھا یجب الدم عندہ خلافا لھما بحر وبہ علم ان الترک غیر قید لوجوب الدم بتأخیر الرمی کلہ او تأخیر رمی یوم الی ما یلیہ اما لو اخرہ الی اللیل فلا شیء علیہ کما مر تقریرہ فی بحث

الربع (قولہ فکما مر) ای بنقص ما اشار (رد المحتار ص [۲۲۶،۲۲۵ ج۲]) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲۶ رجب سنہ ۹۳ھ

شیعہ کی طرف سے حج بدل جائز نہیں:

سوال: اگر کوئی شیعہ کسی سنی کو حج بدل کے لئے بھیجے تو یہ جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

شیعہ کافر ہیں، اس لئے کسی مسلمان کو شیعہ کی طرف سے حج بدل کرنا جائز نہیں، شیعہ کے ساتھ اس قسم کے معاملات سے عوام میں یہ زہر پھیلتا ہے کہ وہ شیعہ کو مسلمان سمجھنے لگتے ہیں حتی کہ ان کے ساتھ رشتے ناطے کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے، حالانکہ شیعہ بلاشبہہ کافر ہیں، شیعہ مذہب کی تفصیل میرے رسالہ "حقیقت شیعہ" میں ہے، یہ رسالہ احسن الفتاوی جلد اول میں ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۵ محرم سنہ ۹۳ھ

سر کے چند بال کاٹ کر احرام کھول دیا:

سوال: میں کچھ عرصے سے جدہ میں مقیم ہوں، گزشتہ دنوں میں کئی عمرے کئے، میں نے اور میرے ساتھیوں نے دوسرے لوگوں کی دیکھا دیکھی چند بال کٹوانے پر ہی اکتفاء کیا، اب پتہ چلا کہ یہ درست نہیں، حضرت مطلع فرمائیں کہ میں اور دوسرے صاحبان اب کیا کریں؟ یہ غلطی کئی مرتبہ ہوئی ہے۔ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

اگر انگلی کے پورے کی لمبائی کے برابر بال کاٹے جا سکتے ہوں تو چوتھائی سر کے بال پورے کی لمبائی کے برابر کاٹنے سے حلال ہو جائے گا، مگر پورے سر کے بال برابر کرنا واجب ہے، اور اگر پورے کی لمبائی کے برابر بال نہ کاٹے جا سکتے ہوں یعنی بال چھوٹے ہوں تو منڈانا ضروری ہے، بدوں منڈانے احرام نہ کھلے گا، آپ حدود حرم میں جا کر سر کے بال کٹوا کر یا منڈا کر حلال ہوں اور جتنی بار شرعی طریق سے حلال ہوئے بغیر احرام کھولا ہے ہر بار کے لئے دم دیں، احرام کھولنے کے بعد محظورات احرام میں سے جتنے افعال بھی کئے ہوں اُن پر کوئی دم وغیرہ نہیں، لزعمہ انہ حلال کذا فی کتب المذہب۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

[illegible] صفر سنہ ۹۹ھ

قارن عمرہ کے بعد طواف قدوم کرے:

سوال: قارن مکہ مکرمہ پہنچ کر پہلے طواف قدوم کرے اور اس کے بعد عمرہ کے باقی ارکان طواف سعی اور حلق یا تقصیر انجام دے یا پہلے عمرہ پھر طواف قدوم کرے؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

پہلے عمرہ کے سب افعال ادا کرے مگر حلق یا تقصیر نہ کرے، اس کے بعد طواف قدوم کرے۔ قال فی التنویر وطاف للعمرۃ سبعۃ اشواط یرمل فی الثلاثۃ الاول ویسعی بلا حلق ثم یحج کما مر وفی الشرح فیطوف للقدوم ویسعی بعدہ ان شاء (رد المحتار ص ۲۶۱ ج ۲)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲۹ ربیع الآخر سنہ ۹۹ھ

عرفات میں زوال کے بعد پہنچنا:

سوال: عرفات میں زوال سے غروب آفتاب تک وقوف واجب ہے، اگر کوئی شخص اپنی غفلت اور سستی یا کسی عذر مثلاً سواری نہ ملنے یا راستہ بھول جانے سے غروب سے کچھ قبل عرفات میں پہنچے اور غروب کے بعد میدان عرفات سے نکلے تو کیا اس کا وقوف ہو جائے گا اور دم دینا تو نہ ہوگا؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

وقوف صحیح ہے، دم واجب نہیں، فی واجبات التنویر ومد الوقوف بعرفۃ الی الغروب، قال ابن عابدین رحمہ اللہ تعالیٰ (قولہ الی الغروب) لم یقل من الزوال لان ابتداءہ من الزوال غیر واجب وانما الواجب ان یمدہ بعد تحققہ مطلقا الی الغروب کما افادہ فی شرح اللباب (رد المحتار ص ۲۰۱ ج ۲)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲۷ ذی القعدہ سنہ ۹۹ھ

عرفات میں غروب کے بعد پہنچنا:

سوال: اگر عرفات میں کوئی شخص نویں ذی الحجہ کے غروب تک بھی نہ پہنچ سکے اور غروب کے بعد دسویں کی صبح صادق سے قبل پہنچ جائے تو فرض وقوف تو ہو جائے گا، لیکن کیا نویں ذی الحجہ کی غروب تک واجب وقوف نہ کرنے کی وجہ سے دم دینا ہوگا؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

اگر کسی قدرتی عذر کی وجہ سے تاخیر ہوئی تو دم نہیں، اور اگر غفلت یا مخلوق کی طرف سے عذر کے باعث تاخیر ہوئی تو دم واجب ہے، قال ابن عابدین رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ: یستثنی من الاطلاق الاول فی وجوب الجزاء ما فی اللباب لو ترک شیئا من الواجبات بعذر لا شیء علیہ علی ما فی البحر اھ واطلق بعضھم وجوبہ فیہ الا فیما ورد النص بہ وھی ترک الوقوف بمزدلفۃ وتاخیر طواف الزیارۃ عن وقتہ وترکھا الصدر للحیض والنفاس وترک المشی فی الطواف والسعی وترک السعی وترک الحلق لعلۃ فی راسہ اھ لکن ذکر شارحہ ما یدل علی ان المراد بالعذر ما لا یکون من العباد حیث قال عند قول اللباب ولو فاتہ الوقوف بمزدلفۃ باحصار فعلیہ دم، ھذا غیر ظاہر لان الاحصار من جملۃ الاعذار الا ان یقال ان ھذا مانع من جانب المخلوق فلا یؤثر ویدل لہ ما فی البحر ان فیمن احصر بعد الوقوف حتی مضت ایام النحر ثم خلی سبیلہ ان علیہ دما لترک الوقوف بمزدلفۃ ودما لترک الرمی ودما لتاخیر طواف الزیارۃ اھ ومثلہ فی احصار النھر وسیاتی توضیحہ ھناک ان شاء اللہ تعالیٰ (رد المحتار ص۲۱۴ ج۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۲۰ ذیقعدہ [illegible]

سوال متعلق بالا:

سوال: آپ نے ایک استفتاء کے جواب میں تحریر فرمایا ہے کہ اگر غفلت یا مخلوق کی طرف کے عذر کی وجہ سے کوئی شخص عرفات میں غروب آفتاب کے بعد پہنچا تو اس پر دم واجب ہے، حالانکہ شامیہ میں اس صورت میں عدم وجوب کی تصریح ہے: اما اذا وقف لیلا فلا واجب فی حقہ حتی لو وقف ساعۃ لا یلزمہ شیء کما فی شرح اللباب (رد المحتار ص۲۰۱ ج۲)۔ ذرا مفصل تحریر فرما کر تشفی فرمائیں، جزاکم اللہ تعالیٰ احسن الجزاء۔

الجواب باسم ملہم الصواب

قدرتی عذر کی وجہ سے تاخیر ہوگئی تو دم نہیں، عمداً یا مخلوق کی طرف سے کسی رکاوٹ کی وجہ سے تاخیر کا موجب دم ہونا اس پر موقوف ہے کہ وقوف کا دن میں ہونا واجب ہو، اس صورت میں ترک واجب کی وجہ سے دم واجب ہوگا، غنیۃ میں اس کو واجبات میں شمار کیا ہے: والوقوف بعرفۃ

نہاراً فمن لاعذر لہ رمدہ الی الغروب (غنیۃ ص ۲۲) سوال میں شامیہ کی ذکر کردہ عبارت کے بعد یہ الفاظ بھی ہیں نعم یکون تارکاً واجب الوقوف نہاراً الی الغروب اس سے بھی وجوب ثابت ہوا، وکذا اشعر بہ ظاہر اطلاق الطحطاوی رحمہ اللہ تعالیٰ فی قولہ ان الجمع بین جزء من النہار وجزء من اللیل واجب (طحطاوی علی المراقی ص ۴۸۸) لہٰذا اس کے ترک سے دم واجب ہونا چاہئے، شامیہ میں شرح اللباب سے جو عدم لزوم شئی نقل کیا ہے وہ اس دم سے متعلق ہے جو بظاہر ترک مدالوقوف کی وجہ سے واجب ہونا چاہئے تھا مقصد یہ ہے کہ مدالوقوف کا وجوب چونکہ صرف وقوف نہاراً کی صورت میں ہے اس لئے رات میں وقوف کی صورت میں یہ واجب ترک نہیں ہوا لہٰذا یہ امر موجب دم نہیں، اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ دوسرے واجب یعنی وقوف نہاراً کا ترک بھی موجب دم نہیں، عبارت مذکورہ کا یہ مطلب یعنی عدم وجوب دم کا تعلق سیاق عبارت سے بالکل واضح ہے، دوسری تمام کتب میں بھی عدم وجوب دم کی بناء یہی تحریر کی ہے کہ وقوف لیلاً کی صورت میں مدالوقوف واجب نہیں، آگے دوسرے واجب یعنی ترک الوقوف نہاراً کی وجہ سے وجوب دم کے حکم سے کوئی تعرض نہیں کیا، ہدایہ کے حاشیہ بین السطور میں عدم وجوب دم کی بناء مذکورہ کی تعبیر یوں اختیار کی ہے فیجب بترکہ ای الاستدامۃ الی غروب الشمس الدم بخلاف ما اذا وقف لیلاً لان استدامۃ الوقوف علی من وقف نہاراً لا لیلاً کے تحت بین السطور تحریر ہے دفع لما یتوہم من انہ لما کانت الاستدامۃ واجبۃ لزم ترک الواجب فیما اذا وقف لیلاً فیجب الدم ولیس کذلک (ہدایۃ ص ۲۷۵ ج ۱)

حاصل یہ کہ شامیہ اور غنیہ میں وقوف نہاراً کو واجب قرار دیا ہے اس لئے اس کا ترک موجب دم ہونا چاہئے، دوسری کسی کتاب میں وقوف نہاراً کا وجوب یا اس کے ترک کی وجہ سے وقوف لیلاً کی صورت میں وجوب دم کی تصریح نہیں مل سکی بیان میں سکوت سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کے ہاں وقوف نہاراً واجب نہیں، لہٰذا اس کا ترک موجب دم نہیں، اور علامہ عینی رحمہ اللہ تعالیٰ نے حضرت امام رحمہ اللہ تعالیٰ سے بلا ذکر بناء مطلقاً عدم وجوب دم کی تصریح نقل فرمائی ہے، ونصہ وقال ابوحنیفۃ والثوری والشافعی رحمہم اللہ تعالیٰ الاعتماد علی النہار من یوم عرفۃ من وقت الزوال واللیل کلہ تبع فان وقف جزءاً من النہار اجزأہ وان وقف جزءاً من اللیل اجزأہ الا انہم یقولون ان وقف جزءاً من النہار بعد الزوال دون اللیل کان علیہ دم وان وقف جزءاً من اللیل دون النہار لم یجب علیہ دم (عمدۃ القاری ص ۲ ج ۱۰)

اس لئے شامیہ و غنیہ میں وقوف خیار کا واجبات میں شمار صحیح نہیں معلوم ہوتا، دوسرے فقہاء کی عبارات کے مفہوم اور علامہ عینی رحمہ اللہ تعالیٰ کی تصریح سے ثابت ہوا کہ مسئلہ زیر بحث میں دم واجب نہیں، فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۸ر صفر سنہ ۱۴۰۳ھ

نماز کے لئے مقام ابراہیم کے قرب کی حد

سوال: طواف کے بعد دو رکعت نفل کی مقام ابراہیم کے پاس جو فضیلت ہے وہ مقام ابراہیم سے کتنی دور پڑھنے سے ادا ہو جائے گی، اس کی کوئی تحدید بھی ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملهم الصواب

اس کی کوئی تحدید نہیں، عرف میں جس کو قرب سمجھا جاتا ہے وہ مراد ہے، حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما مقام ابراہیم سے ایک یا دو صف کا فاصلہ چھوڑ کر نفل پڑھتے تھے، عرفاً بھی دو صف سے زیادہ فاصلہ بعید شمار ہوتا ہے، قال فی الشامیۃ (قولہ عند المقام) عبارۃ اللباب خلف المقام قال والمراد به ما يصدق عليه ذلك عادة وعرفا مع القرب وعن ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنهما انه اذا اراد ان يركع خلف المقام جعل بينه وبين المقام صفا او صفين او رجلا او رجلين رواه عبد الرزاق اھ (رد المحتار ص ج۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۱۷ر جمادی الاولیٰ سنہ ۱۴۰۲ھ

مقام ابراہیم پر دعاء کا ثبوت:

سوال: مقام ابراہیم پر واجب الطواف ادا کرنے کے بعد دعاء کرنا کیسا ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملهم الصواب

سرسری تلاش سے کوئی صریح حدیث نہیں ملی، کلیات ذیل سے ثبوت ملتا ہے:۔

① یہ امر مسلم ہے کما قال مجاهد رحمه الله تعالى في تفسير قوله تعالى وَاتَّخِذُوا مِنْ مَقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى. اور مقام ابراہیم کے پاس حکم نماز سے ثابت ہوا کہ پورے حرم بلکہ مسجد حرام کے بھی دوسرے بقاع پر مقام کو فضیلت ہے، لہذا یہ فضیلت دعاء میں بھی ہوگی بالخصوص جبکہ نماز بھی دعاء ہی ہے۔

② نماز کے بعد دعاء برفع الیدین مختلف احادیث سے ثابت ہے، جن کی تفصیل میرے رسالہ "زبدۃ الخلاف فی الدعاء بعد الصلوات" میں درج ہیں، یہ رسالہ احسن الفتاوی جلد سوم میں شائع

ہو چکا ہے، پس مقام کے پاس نماز بھی اس حکم میں داخل ہے، استثناء محتاج دلیل ہے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲۰ جمادی الآخرہ [illegible]

بدون ارادۂ نسک دخول حرم پر وجوب احرام کا ثبوت:

سوال: بخاری ومسلم شریف کی حدیث عن ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما قال وقّت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لاهل المدینة ذا الحلیفة ولاهل الشام الجحفة ولاهل نجد قرنا ولاهل الیمن یلملم، قال فهن لهن ولمن اتی علیهن من غیر اهلهن ممن کان یرید الحج والعمرة فمن کان دونهن فمن اهله حتی ان اهل مکة یهلون منها کے مطابق بعض دوسرے مسالک میں بدون حج یا عمرہ کی نیت کے احرام باندھ کر حرم محترم میں داخل ہونا ضروری نہیں، حنفیہ کے نزدیک ضروری ہونے کی دلیل کیا ہے؟ خصوصاً ایسے معذورین کے لئے بھی جو ضعف وعلالت وغیرہ کی وجہ سے طواف وسعی وغیرہ سے قاصر ہوں اور سواری پر بھی مالی استطاعت نہ رکھنے کی وجہ سے معذور ہوں۔ بینوا توجروا

الجواب باسم ملهم الصواب

ائمہ اربعہ اور جمہور فقہاء ومحدثین رحمہم اللہ تعالیٰ کا مسلک عدم جواز ہے، البتہ امام مالک وشافعی رحمہما اللہ تعالیٰ سے روایت جواز بھی ہے، امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ سے عدم جواز کی روایت مشہور ہے، جمہور کے دلائل درج ذیل ہیں:

① قال اللہ تعالیٰ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ إِنْ شَاءَ اللَّهُ آمِنِينَ مُحَلِّقِينَ رُءُوسَكُمْ وَمُقَصِّرِينَ، اس کی توضیح آئندہ قول شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کے تحت آرہی ہے۔

② روی ابن ابی شیبة والطبرانی عن ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنهما مرفوعاً لا یجاوز احد المیقات الا محرما، قال الحافظ رحمه اللہ تعالیٰ وفی اسناده ضعیف قلت ضعّفه البعض ووثّقه جماعة واخرجه ابن عدی من وجهین ضعیفین واخرجه الشافعی رحمه اللہ تعالیٰ عن ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنهما باسناد صحیح جید لکنه موقوف، قلت فهذا الموقوف الصحیح یشعر بصحة مرفوع ضعیف (فتح الملهم ص [illegible])

③ اخرجه البیهقی بلفظ لا یدخل احد مکة الا محرما، قال الحافظ واسناده جید (نیل الاوطار ص ۱۸ ج ۴، اعلاء السنن ص ۱۲ ج ۱۰)

④ قال الشافعی رحمه الله تعالیٰ بعد کلام طویل لاثبات منع المجاوزۃ بلا احرام من دلالات کتاب الله تعالیٰ ویحکی ان النبیین کانوا یحجون فاذا اتوا الحرم مشوا اعظاما له ومشوا حفاۃ، ولم یحك لنا عن احد من النبیین ولا الامم الخالیة انه جاء احد البیت قط الا حراما ولم یدخل رسول الله صلی الله علیه وسلم مکة علمناه الا حراما الا فی حرب الفتح فبهذا قلنا ان سنة الله تعالیٰ فی عباده ان لا یدخل الحرم الا حراما وبان من سمعناه من علمائنا قالوا فمن نذر ان یاتی البیت یاتیه محرما بحجة او عمرۃ (قال) ولا احسبهم قالوه الا بما وصفت وان الله تعالیٰ ذکر وجه دخول الحرم فقال لقد صدق الله رسوله الرؤیا بالحق لتدخلن المسجد الحرام ان شاء الله آمنین محلقین رؤسکم ومقصرین (قال) فدل علی وجه دخوله للنسك وفی الامن وعلی رخصة الله فی الحرب وعفوه فیه عن النسك الخ (الام ص ۱۳۱ ج ۲)

جوابِ مستدل المجوزین

① کلام اللہ وکلام الرسول صلی اللہ علیہ وسلم میں مفہوم مخالف معتبر نہیں، بالخصوص جبکہ یہ مفہوم خلاف منطوق ہے، عند المعارضۃ بالاتفاق منطوق کو ترجیح ہے۔

② ارادۂ نسک سے ارادۂ حرم مراد ہے، لثبوت التلازم بینهما بالادلة التی حررنا وانه صلی اللہ علیہ وسلم عبر به للتنبیه علی ان من شان المسلم الذی یرید الحرم ان یرید النسك،

③ فقط ارادہ سے تخییر ثابت نہیں ہوتی، بلکہ یہاں ارادۂ واجبہ کا حکم مذکور ہے، کما فی قوله تعالیٰ ومن اراد الآخرة وسعی لها سعیها وهو مؤمن فاولئك كان سعیهم مشكورا، وقوله تعالیٰ وجعلنا اللیل والنهار خلفة لمن اراد ان یذكر او اراد شكورا، و قوله صلی الله علیه وسلم من اراد الحج فلیعجل، وقوله صلی الله علیه وسلم من اراد الجمعة فلیغتسل، ونظائره كثیرة،

اتمام کلام کے لئے مجوزین کے دوسرے دلائل پر بحث بھی تحریر کی جاتی ہے،

① روی جابر رضی الله تعالیٰ عنه عند مسلم والنسائی ان النبی صلی الله علیه وسلم

دخل یوم فتح مکة وعلیه عمامة سوداء بغیر احرام وانس رضی الله تعالیٰ عنه اخرج البخاری
ان النبی صلی الله علیه وسلم دخل مکة عام الفتح وعلی رأسه المغفر وفیه دلالة علی
جواز دخول مکة للحرب بغیر احرام،

والجواب عنه ان القتال فی مکة خاص بالنبی صلی الله علیه وسلم لما ثبت
فی الصحیح ان النبی صلی الله علیه وسلم قال فان ترخص احد لقتال رسول الله صلی
الله علیه وسلم فیها فقولوا ان الله اذن لرسوله صلی الله علیه وسلم ولم یأذن لکم
فدل علی عدم جواز قیاس غیره علیه، لا یقال ان غایة ما فی هذا الحدیث اختصاص
القتال به صلی الله علیه وسلم واما جواز المجاوزة فلا لان جواز القتال یستلزم
جواز المجاوزة بلا احرام للمنافاة الظاهرة بین القتال والاحرام لقوله تعالیٰ
فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ وایضا فان المحرم
ممنوع عن لبس المخیط من القمیص والدرع ونحوهما مامور بکشف الرأس والوجه
کما یأتی والمقاتل محتاج الی لبس الدروع وتغطیة الرأس ونحوها کما لا یخفی
فلما جوز الله القتال بمکة لرسوله صلی الله علیه وسلم واصحابه ساعة من نهار
جوز لهم مجاوزة المیقات بغیر احرام ایضا فاتضح بذلك ما قاله الشوکانی وغیره
فی هذا المقام والعلم عند الله الملك العلام، وقال محمد رحمه الله تعالیٰ
فی الموطا ان النبی صلی الله علیه وسلم دخل مکة حین افتتحها غیر محرم ولذلك
دخل وعلی رأسه المغفر وقد بلغنا انه حین احرم من حنین قال هذه العمرة
لدخولنا مکة بغیر احرام یعنی یوم الفتح فکذلك الامر عندنا من دخل مکة
بغیر احرام فلا بد له من ان یخرج فیهل بعمرة او بحجة لدخوله مکة بغیر
احرام وهو قول ابی حنیفة رحمه الله تعالیٰ والعامة من فقهائنا ام (ص ۲۲۲)
قلت وبلاغات المجتهد حجة لا سیما عند اصحابه واتباعه فهذا الخاتمة اعلاؤ
قاطعة لعرق النزاع والسلام،

(۴) قال الشوکانی وقد کان المسلمون فی عصره صلی الله علیه
وسلم یختلفون الی مکة لحوائجهم ولم ینقل انه امر احدا منهم باحرام
کقصة الحجاج بن علاط رضی الله تعالیٰ عنه وکذلك قصة ابی قتادة

رضی اللہ تعالی عنه لما عقر حمارا وحشیا وھو حلال فجاوز المیقات لا بنیة
الحج ولا العمرۃ فقررہ صلی اللہ علیه وسلم اھ (ص ۱۸۱ ج ۲)

قلت ان اراد اختلاف من ھو داخل المیقات الی مکة لحوائجھم فلا یرد
علینا لجواز دخولھم مکة بلا احرام عندنا وان اراد اختلاف من ھو خارج المیقات
فغیر مسلم فان المواقیت بعیدة عن مکة بمراحل ولا تتعلق الحوائج الانسانیة
ولا المدنیة الا بمصر قریب وتعلقھا بالمصر البعید نادر واما قصة الحجاج
ابن علاط رضی اللہ تعالی عنه واتیانه مکة بعد فتح خیبر لجمع امواله ففیھا
ما یدل علی انه لم یدخل مکة مظھرا الاسلام معلنا من اھلھا بل وانما دخل
الیھم علی انه منھم کاتما اسلامه وقد استأذن رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم
ان یقول فیه وفی اصحابه فاذن له ان یقول فلم یکن الحجاج قادرا علی احرام
النسك علی طریقة الاسلام ولو احرم من المیقات لفعل فی عمرته ما یفعله المشرکون
ولھتف بما کانوا یھتفون به من کلمات الشرك والکفر ولا یخفی ان التکلم
بالکفر اشد من مجاوزۃ المیقات بلا احرام فلما ابتلی ببلیتین اختار اھونھما
والقصة ذکرھا ابن ھشام فی السیرۃ (ص ۱۹۱ ج ۲) ومحمد رحمه اللہ تعالی
فی السیر الکبیر والسرخسی فی شرحه (ص ۲۸۳ ج ۳) ویحتمل ان تکون قصة
الحجاج قبل توقیت المواقیت فقد عرفت اختلاف اھل السیر فی وقت فرض الحج
قال بعضھم فرض سنة تسع وقیل ست ومن قال فرض سنة ست لم یقم
دلیلا علی انه کان قبل فتح خیبر او بعده واما قصة ابی قتادۃ فقد ثبت انه لم
یخرج مع رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم قاصدا مکة بل کان النبی صلی اللہ
علیه وسلم قد بعثه علی الصدقة وخرج علیه السلام واصحابه وھم محرمون
حتی نزلوا عسفان وجاء ابو قتادۃ رضی اللہ تعالی عنه وھو حل الحدیث اخرجه
الطحاوی فی شرح معانی الآثار بسند لا بأس به (الجوھر النقی ص ۳۵۲ ج ۱)
فمن ادعی خروج ابی قتادۃ رضی اللہ تعالی عنه من المدینة مریدا دخول مکة
فلیأت ببرھان فان الظاھر خروجه الی موضع الصدقة ثم التحق بالنبی
صلی اللہ علیه وسلم لما سمع بخروجه فکان له مجاوزۃ المیقات بغیر احرام

لعدم ارادته دخول مکة قبل لحوقه بالنبی صلی اللہ علیہ وسلم واللہ تعالیٰ اعلم وقد نص ابن القیم علی ان قصة ابی قتادة رضی اللہ تعالیٰ عنه کانت سنة ست مع الحدیبیة ووهم الطبری حیث ذکرها فی حجة الوداع (زاد المعاد ص ۲۳۸ ج ۱) ولم یکن اذ ذاک توقیت المواقیت ولا فرض الحج بل کان کل ذلک بعده وقال الاثرم کنت اسمع اصحاب الحدیث یتعجبون من هذا الحدیث ویقولون کیف جاز لابی قتادة رضی اللہ تعالیٰ عنه مجاوزة المیقات بلا احرام ولا یدرون ما وجهه حتی رأیته مفسرا فی حدیث عیاض عن ابی سعید رضی اللہ تعالیٰ عنه قال خرجنا مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاحرمنا فلما کان مکان کذا اذا نحن بابی قتادة رضی اللہ تعالیٰ عنه کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم بعثه فی شیء قد سماه فذکر حدیث الحمار الوحشی کذا فی التلخیص الحبیر ص ۲۲۵ ج ۱) ای لم یکن خروجه لدخول مکة بل لامر آخر وانما قصد مکة بعد ما لقی النبی صلی اللہ علیہ وسلم بعسفان وفی قول الاثرم دلالة علی ان مجاوزة المیقات بلا احرام لا تجوز عند اهل الحدیث ایضا فافهم (اعلاء السنن ص ۳۲ ج ۱۰) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۱۰ جمادی الآخرۃ سنہ ۱۴۰۱ھ

طواف کی دعائیں:

سوال: عرصے سے مجھے اس کی بھی تلاش ہے کہ جو اذکار و دعائیں سنت سے ثابت ہیں وہ معلوم ہوں جو اس طرح پر مجھے نہیں مل سکیں، کتابوں میں اس طرح منقول نظر آتا ہے کہ طواف اس طرح شروع کرے اور یہ پڑھے، فلاں رکن پر یہ دعاء وغیرہ، مگر اس طرح بہت کم اذکار و دعاؤں کے متعلق ملتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں نیت فرمائی، اس کے بعد اس طرح گھومے اور یہ پڑھا اور فرمود وغیرہ آپ کے علم تبحر و وسیع اور فکر بلیغ سے امید قوی رکھتا ہوں کہ ایسا مواد مزید فراہم فرمائیں گے ان شاء اللہ تعالیٰ۔ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملهم الصواب

اس بارہ میں یہ روایات ملتی ہیں:

① عن ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنهما انه کان اذا استلم الحجر قال بسم اللہ واللہ اکبر، وسنده صحیح،

(۲) وروی العقیلی ایضا من حدیثہ کان اذا اراد ان یستلم الحجر یقول اللّٰھم ایمانا بک وتصدیقا بکتابک واتباعا لسنة نبیک ثم یصلی علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم ثم یستلمہ ورواہ الواقدی فی المغازی مرفوعا (نیل الاوطار ص ۴۳ ج ۵)

(۳) عن عبد اللہ بن السائب رضی اللہ تعالی عنہ قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول ما بین الرکنین ربنا آتنا فی الدنیا الخ رواہ ابوداؤد (مرقاة ص ۲۴۱ ج ۵)

(۴) عن ابی ہریرة رضی اللہ تعالی عنہ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال وکل بہ سبعون ملکا یعنی الرکن الیمانی فمن قال اللّٰھم انی اسألک العفو والعافیة فی الدنیا والآخرة ربنا آتنا الخ قالوا آمین، رواہ ابن ماجة،

(۵) وعنہ رضی اللہ تعالی عنہ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال من طاف بالبیت سبعا ولا یتکلم الا بسبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر ولا حول ولا قوة الا باللہ محیت عنہ عشر سیئات وکتبت لہ عشر حسنات ورفع لہ عشر درجات الحدیث رواہ ابن ماجة،

(۶) واخرج الحاکم انہ علیہ الصلوة والسلام قال ما انتہیت الی الرکن الیمانی قط الا وجدت جبریل عندہ قال قل یا محمد قلت ما اقول قال قل اللّٰھم انی اعوذ بک من الکفر والفاقة ومواقف الخزی فی الدنیا والآخرة ثم قال جبریل ان بینہما سبعین الف ملک فاذا قال العبد ھذا قالوا آمین،

(۷) روی الحاکم بسند صحیح انہ علیہ الصلوة والسلام کان یقول بین الیمانیین اللّٰھم ربنا آتنا فی الدنیا (الی) عذاب النار ثم قال اللّٰھم قنعنی بما رزقتنی وبارک لی فیہ واخلف علی کل غائبة لی بخیر،

(۸) واخرج الازرقی عن علی رضی اللہ تعالی عنہ انہ کان اذا مر بالرکن الیمانی قال بسم اللہ واللہ اکبر السلام علی رسول اللہ ورحمة اللہ وبرکاتہ اللّٰھم انی اعوذ بک من الکفر والفقر ومواقف الخزی فی الدنیا والآخرة ربنا آتنا الخ وجاء ذلک عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم مرسلا لابن المسیب لکن باسناد ضعیف (مرقاة ص ۲۴۱ و ۲۴۲ ج ۵)

ان ادعیہ میں سے اکثر کی سند ضعیف ہے، لہٰذا ان کو سنت سمجھنا جائز نہیں،

اشواط طواف کی مروجہ دعاؤں کا کوئی ثبوت نہیں، ان دعاؤں میں بہت غلو ہونے لگا ہے، اس میں مندرجہ ذیل مفاسد ہیں:

① ان دعاؤں کے عام اہتمام اور دینی اداروں کی طرف سے ان کی روز افزوں اشاعت کے باعث عوام ان کو ضروری سمجھنے لگے ہیں، ایسی حالت میں امر مندوب بھی مکروہ ہو جاتا ہے چہ جائیکہ جس کا ثبوت ہی نہ ہو۔

② اکثر لوگوں کو دعائیں یاد نہیں ہوتیں، طواف میں کتاب دیکھ کر پڑھتے ہیں، اور ازدحام میں کتاب پڑھتے ہوئے چلنے سے خشوع نہیں رہ سکتا۔

③ ازدحام میں کتاب پر نظر رکھنا اپنے لئے اور دوسروں کے لئے بھی باعث ایذاء ہے، مخصوص دعاؤں کی خاطر جتھوں کی صورت میں چلنا سخت تکلیف دہ ہے جو حرام ہے، غیر ثابت امر کی خاطر ارتکاب حرام کیا جاتا ہے۔

④ جتھوں کی صورت میں چلا چلا کر دعائیں پڑھنے سے دوسروں کے خشوع میں خلل پڑتا ہے۔

خدا کرے کہ علماء دین کو مفاسد مذکورہ کی طرف التفات ہو اور وہ غیر ثابت دعاؤں کی اشاعت کی بجائے ان سے اجتناب کی تبلیغ میں مصروف ہو کر اپنا فرض ادا کریں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۱۲ جمادی الآخرہ سنہ ۱۴۰۲ھ

مریض ریح طواف کیسے کرے؟

سوال: ایک شخص حج کو جانے کا ارادہ رکھتا ہے، اور وہ ریاح کی مرض میں مبتلا ہے، تھوڑی تھوڑی دیر میں وضو ٹوٹ جاتا ہے، بعض اوقات تو ایک دو منٹ بھی وضو نہیں رہتا وہ طواف کس طرح کرے؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

اگر یہ معذور شرعی کی حد میں داخل ہے تو بلا وضو طواف کر سکتا ہے، حکم معذور کی تفصیل و قول معلوم کرنے کا طریقہ احسن الفتاوی ص ۲ ج ۲ میں ملاحظہ ہو۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۷ رجب سنہ ۱۴۰۲ھ

حالت طواف میں بیت اللہ کو دیکھنا:

سوال: طواف کرتے وقت سینہ یا پیٹھ بیت اللہ کی طرف کرنا مکروہ تحریمی ہے، اگر اسی حالت میں کچھ فاصلہ طے کیا تو اتنے حصہ کے طواف کا اعادہ واجب ہے، کیا یہ مسئلہ صحیح ہے؟

اور بیت اللہ کو دیکھنا خلاف اولیٰ ہے یا مکروہ تحریمی؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملهم الصواب

صحیح ہے، طواف میں موضع سجود پر نظر رکھنا مستحب ہے، بیت اللہ کی طرف یا کسی دوسری طرف نظر کرنا خلاف استحباب ہے، وینبغی ان لا یجاوز بصرہ محل مشیہ کالمصلی لا یجاوز بصرہ محل سجودہ لانہ الادب الذی یحصل بہ جمع القلب (منحۃ) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۲۵ جمادی الاولیٰ سنہ ۹۲ھ

استقبال بیت بوقت استلام رکن یمانی:

سوال: رکن یمانی کا استلام یہ ہے کہ چہرہ، منہ اور سینہ بیت اللہ کے سامنے کئے بغیر صرف دونوں ہاتھ لگائیں یا صرف داہنا ہاتھ لگائیں، کیا یہ مسئلہ صحیح ہے؟ استلام کے وقت کچھ نہ کچھ تو بیت اللہ کی طرف ہو جائے گا؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملهم الصواب

استلام رکن یمانی کے وقت استقبال بیت کرے، (تنبیہ) لیس شیٔ من الطواف یجوز عند ما فیہ استقبال البیت فاذا استقبلہ عند استلام احد الرکنین ینبغی ان یثبت قدمیہ فی موضعہ حالۃ الاستقبال (غنیۃ ص ۱۰۱) واللہ تعالیٰ اعلم

۲۵ جمادی الاولیٰ سنہ ۱۴۰۰ھ

ترک طواف زیارت:

سوال: آپ سے دریافت کیا تھا کہ جس شخص نے طواف زیارت عذر کی وجہ سے ترک کردیا تو پھر کیا تدارک ہے؟ آپ نے جواب میں فرمایا تھا کہ طواف زیارت کرے، اب سوال یہ ہے کہ طواف زیارت حج کے موسم میں کرے یا جب چاہے جا کر طواف زیارت کرسکتا ہے؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملهم الصواب

جب چاہے طواف زیارت کرسکتا ہے، نیا احرام باندھے بغیر ویسے ہی جا کر طواف کرے اور تاخیر کی وجہ سے دم دے۔

طواف زیارت سے قبل دوسرے حج یا عمرہ کا احرام باندھنا جائز نہیں، بیوی سے صحبت کرنا بھی حرام ہے، اگر بیوی سے صحبت کرلی تو دم تاخیر کے علاوہ بدنہ یعنی پوری گائے

یا پورا دنبہ بھی واجب ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم
۱۷ محرم سنہ ۱۴۰۳ھ

وقوف مزدلفہ کے بعد بقیہ افعال چھوڑ دیئے :

سوال: کوئی شخص احرام باندھ کر چلا، وقوف عرفہ بھی کیا اور مزدلفہ پہنچ گیا یہاں پر وہ اپنے ساتھیوں سے الگ ہو گیا، بہت تلاش کرنے کے باوجود نہیں مل سکا، پریشان ہو کر آخر وہ دس تاریخ کو منیٰ پہنچا یہاں بھی اپنے ساتھیوں سے نہ مل سکا، اور دسویں تاریخ کے جو احکام ہیں ان کو کئے بغیر واپس جدہ احرام کی حالت میں آگیا، اس کے ساتھی بارھویں کی شام جدہ پہنچے، تو پھر اس کو کہا کہ کسی وقت بھی جا کر طواف زیارت اور سعی کر لو، اس کا کیا حکم ہے؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملهم الصواب

ترک رمی کی وجہ سے ایک دم، ایام نحر میں حلق نہ کرنے کی وجہ سے دوسرا دم، طواف زیارت میں تاخیر کی وجہ سے تیسرا دم، مجموعہ تین دم دے، اگر حج تمتع یا قران تھا تو دم شکر بھی دے، اور اس میں تاخیر کی وجہ سے بھی ایک دم دے، اور دم شکر سے پہلے حلق کیا تو اس کی وجہ سے بھی ایک دم واجب ہے، اور اگر حلق حرم سے باہر کیا تو اس کی وجہ سے بھی ایک دم واجب ہوگا۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم
۱۳ محرم سنہ ۱۴۰۳ھ

حرم میں پالتو کبوتر بھی حرام ہے :

من مكة المكرمة زادها الله تعالىٰ تشريفا وتكريما

سوال: ماقولكم دام فضلكم اندرین مسئلہ کہ یہاں مسجد مکہ مکرمہ کے اندر چند قسم کے کبوتر پائے جاتے ہیں، ایک تو وحشی شکاری جو رنگ و نسل میں عام ہندو پاک کے وحشی کبوتر کے مثل ہیں، اس قسم کے علاوہ شامی اور مصری اور دیسی کبوتر عام طور پر حدود حرم کے اندر لوگ پالتے ہیں اور کھاتے ہیں، بعض علماء حدود حرم کے اندر مطلق کبوتر بلا امتیاز حرام کہہ رہے ہیں اور بعض علماء پالتو کبوتر یعنی گھر کے پلے ہوئے کبوتروں کو حلال بتا رہے ہیں، لہٰذا حضرت والا از روئے تحقیق شرعی حکم تحریر فرما کر کیا ہے؟ امید ہے کہ تسلی بخش جواب دے کر ممنون فرمائیں گے، وعند اللہ اجر عظیم۔

الجواب باسم ملهم الصواب

حرم میں پالتو کبوتر بھی حرام ہے، اور اس کو ذبح کرنے سے جزاء واجب ہے، قال فی التنویر فلو قتل محرم صيدا او دل عليه قاتله مع وجود اسباب او عدمها فعليه جزاؤه ولو سبعا غير صائل او حماما مسرولا او في الشرح بفتح الواو ما في رجليه ريش كالسراويل او في الحاشية

به بخلاف مالک رحمه الله تعالیٰ فیه فانه یقول لاجزاء فیه لانه الوف لا یطیر بجناحیه کالبط (رد المحتار ص۳۳۳ ج۲) وقال العلامة الکاسانی رحمه الله تعالیٰ والحمام المسرول صید فیه الجزاء عند عامة العلماء وعند مالک رحمه الله تعالیٰ لیس بصید وجه قوله ان الصید اسم للمتوحش والحمام المسرول مستأنس فلا یکون صیدا کالدجاج والبط الذی یکون فی المنازل ولنا ان جنس الحمام متوحش فی اصل الخلقة وانما یستأنس البعض منه بالتولد والتأنیس مع بقائه صیدا کالظبیة المستأنسة والنعامة المستأنسة والطوطی ونحو ذلک حتی یجب فیه الجزاء (بدائع ص۱۹۶ ج۲) فقط والله تعالیٰ اعلم (مزید تحقیق تتمہ میں ہے)

۲۷ ربیع الاول ۸۵ھ

زیارة قبر النبی صلی اللہ علیہ وسلم:

سوال: غیر مقلدین زیارت روضۂ مطہرہ کی نیت سے سفر کرکے مدینہ منورہ میں حاضری کو ناجائز بلکہ شرک کہتے ہیں، اور حدیث لا تشد الرحال الا الی ثلاثة مساجد المسجد الحرام والمسجد الاقصی ومسجدی، سے استدلال کرتے ہیں، جمہور امت اس حدیث کا کیا مطلب بیان فرماتے ہیں؟ اور بنیت زیارت روضۂ مطہرہ شد رحال کے جواز کیا دلائل ہیں؟ بینوا بالتفصیل اجرکم الله الجلیل،

الجواب باسم ملهم الصواب

حدیث لا تشد الرحال الا الی ثلاثة مساجد الخ میں قصر حقیقی نہیں، بلکہ باعتبار مساجد کے قصر اضافی ہے، یعنی ان تین مساجد کے سوا کسی مسجد کی طرف شد رحال جائز نہیں، مطلقاً شد رحال سے نہی مقصود نہیں، حدیث میں قصر اضافی ہونے پر مندرجہ ذیل قرائن ہیں،

① قال الحافظ رحمه الله تعالیٰ روی احمد من طریق شهر بن حوشب قال سمعت اباسعید رضی الله تعالیٰ عنه وذکرت عنده الصلوٰة فی الطور فقال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم لا ینبغی للمصلی ان یشد رحاله الی مسجد تبتغی فیه الصلوٰة غیر المسجد الحرام والمسجد الاقصی ومسجدی وشهر حسن الحدیث (فتح الباری ص۵۳ ج۳)، اس حدیث میں اس کی تصریح ہے کہ نماز کے لئے کسی مسجد کی طرف شد رحال سے نہی ہے، زیارت وغیرہ کے لئے شد رحال اس میں داخل نہیں،

② اس پر اجماع ہے کہ حاجی کے لئے عرفات، مزدلفہ اور منیٰ کی طرف شد رحال فرض ہے، اسی طرح جہاد اور دار الکفر سے ہجرت کے لئے فرض ہے، اور طلب علم کے لئے مستحب بلکہ بعض صورتوں میں فرض ہے اور تجارت وغیرہ مقاصد دنیا کے لئے جائز ہے،

غیر مقلدین روایت عبد الرزاق لا تتخذوا قبری عیدا سے بھی استدلال کرتے ہیں، اس کے

[illegible] جمہور نے اس حدیث کے دو مطلب بیان فرمائے ہیں:

① عید کی طرح زیارت کے لئے کوئی خاص تاریخ یا دن متعین نہ کیا جائے۔

② قبر مبارک پر عید کی طرح زیب و زینت کے ساتھ لہو و لعب کے لئے اجتماع نہ کیا جائے، بلکہ زیارت، دعاء اور سلام کے لئے حاضری دی جائے۔

زیارت کے لئے استحباب شد رحال کے دلائل:

① عن ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من زار قبری وجبت له شفاعتی. أخرجه الدارقطنی والبیهقی (وفاء الوفاء ص ۳۹۴ ج ۲)

والحدیث حسن صحیح وقد صححه ابن السکن وعبد الحق وتقی الدین السبکی (نیل الأوطار [illegible]) وقال الذهبی طرق هذا الحدیث کلها لینة یقوی بعضها بعضا لأن ما فی رواتها متهم بالکذب، قال ومن أجودها إسنادا حدیث حاطب من زارنی بعد موتی فکأنما زارنی فی حیاتی. أخرجه ابن عساکر وغیره (وفاء الوفاء ص ۳۹۹ ج ۲)

وفی الحدیث أکبر دلالة علی فضیلة زیارة قبر النبی الکریم علیه وعلی آله وأصحابه أفضل الصلوات وأکمل التسلیم، وأی فضیلة أعلی وأسنی من وجوب شفاعته صلی اللہ علیه وسلم لمن زاره.
قال العلامة الشوکانی فی النیل وقد اختلفت فیها أقوال أهل العلم فذهب الجمهور إلی أنها مندوبة وذهب بعض المالکیة وبعض الظاهریة إلی أنها واجبة وقالت الحنفیة إنها قریبة من الواجبات وذهب ابن تیمیة الحنبلی حفید المصنف المعروف بشیخ الإسلام إلی أنها غیر مشروعة وتبعه علی ذلک بعض الحنابلة وروی ذلک عن مالک والجوینی والقاضی عیاض کما سیأتی. احتج القائلون بأنها مندوبة بقوله تعالی ﴿وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذ ظَّلَمُوا أَنفُسَهُمْ جَاءُوكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللَّهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُولُ﴾ الآیة، ووجه الاستدلال بها أنه صلی اللہ علیه وسلم حی فی قبره بعد موته کما فی حدیث الأنبیاء أحیاء فی قبورهم وقد صححه البیهقی وألف فی ذلک جزءا. قال الأستاذ أبو منصور البغدادی قال المتکلمون المحققون من أصحابنا إن نبینا صلی اللہ علیه وسلم حی بعد وفاته انتهی. وقد صح عن أبی أیوب الأنصاری رضی اللہ تعالی عنه أنه قال لمن أنکر علیه وضع وجهه علی القبر إنما جئت رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم ولم آت اللبن أو الحجر کما سیأتی. فثبت أن حکم الآیة باق بعد وفاته صلی اللہ علیه وسلم فینبغی
۳۴ لمن ظلم نفسه أن یرد قبره ویستغفر اللہ عنده فیستغفر له الرسول، واستدلوا

④ عن ابن عمر رضی الله تعالیٰ عنهما قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم من حج البیت ولم یزرنی فقد جفانی رواه ابن عدی فی الکامل وقال لا اعلم رواه عن مالک غیر النعمان ابن شبل ولم ار فی احادیثه حدیثا قد جاوز الحد فاذکره وروی فی صدر ترجمته عن عمران ابن موسیٰ انه وثقه وعن موسیٰ بن هارون انه متهم قال السبکی هذه التهمة غیر مفسرة والحکم بالتوثیق مقدم علیها (وفاء الوفاء ص ۳۹۸ ج ۲)

وقوله صلی الله علیه وسلم من حج البیت فلم یزرنی فقد جفانی صریح فی جواز شد الرحال بل استحبابه لاجل زیارة قبره صلی الله علیه وسلم فان العالم لا یصل الی المدینة النبویة الا بشد الرحال کما لا یخفی وفیه ایضا اشارة بتقدیم الحج علی الزیارة والله تعالیٰ اعلم (اعلاء السنن ص ۲۳۲ ج ۱۰)

⑤ عن ابن عباس رضی الله تعالیٰ عنهما مرفوعا من حج الی مکة ثم قصدنی فی مسجدی کتبت له حجتان مبرورتان رواه الدیلمی فی مسند الفردوس (وفاء الوفاء ص ۴۰۱ ج ۲)

⑥ عن عمر رضی الله تعالیٰ عنه قال سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول من زار قبری او قال من زارنی کنت له شفیعا او شهیدا ومن مات فی احد الحرمین بعثه الله عز وجل فی الآمنین یوم القیامة رواه ابو داود الطیالسی وابو جعفر العقیلی ولفظه من زارنی متعمدا کان فی جواری یوم القیامة (وفاء الوفاء ص ۴۰۱ ج ۲)

وفی الباب عن عبد الله بن عمرو وابی هریرة وانس بن مالک وابن عباس وعلی بن ابی طالب وغیرهم رضی الله تعالیٰ عنهم (وفاء الوفاء ص ۴۰۲ ج ۲)

⑦ عن ابن عمر رضی الله تعالیٰ عنهما قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم من حج فزار قبری بعد وفاتی کان کمن زارنی فی حیاتی رواه الدارقطنی والطبرانی فی الکبیر والاوسط وغیرهما

وعنه رضی الله تعالیٰ عنهما من حج فزار قبری بعد موتی کان کمن زارنی فی حیاتی وصحبنی رواه ابن الجوزی فی مثیر العزم الساکن الی اشرف الاماکن وابن عدی فی کامله (وفاء الوفاء ص ۳۹۹ ج ۲)

⑧ عن بکر بن عبد الله رضی الله تعالیٰ عنه عن النبی صلی الله علیه وسلم قال

من اتى المدينة زائرا لي وجبت له شفاعتي يوم القيامة ومن مات في احد الحرمين بعث آمنا. رواه يحيى بن الحسن بن جعفر الحسيني في اخبار المدينة ولم يتكلم عليه السبكي (وفاء الوفاء ص ۱۳۰۳ ج ۴)

فالحديث حسن جيد الاسناد رحمه الله طائفة قد اغمضت عيونها عن كل ذلك وانكرت مشروعية زيارة قبر هذا النبي الكريم وحرمت من مثل هذا الفضل العظيم وزعمت ان لا ينوي الزائر الا مسجد النبي صلى الله عليه وسلم فقط ولم تدر ان فضيلة المسجد انما هي لاجل النبي صلى الله عليه وسلم فجواز نية المسجد يستدعي جواز نية زيارته صلى الله عليه وسلم بالاولى فالله يهديهم ويصلح بالهم ويرزقنا وجميع المسلمين والمسلمات فضيلة صحبة النبي صلى الله عليه وسلم بزيارة قبره ويجمع بيننا وبينه كما امنا به ولم نره (اعلاء السنن ص ۳۳۲ ج ۱۰)

قال العلامة القسطلاني رحمه الله تعالى ومن اعتقد غير هذا فقد انخلع من ربقة الاسلام وخالف الله ورسوله صلى الله عليه وسلم وجماعة العلماء الاعلام وقد اطلق بعض المالكية انها واجبة وقال القاضي عياض انها سنة من سنن المسلمين مجمع عليها وفضيلة مرغب فيها (مواهب ص ۳۸۲ ج ۲) ولمن يريد زيادة التفصيل والبحث عن اسانيد الاحاديث المذكورة في الباب فراجع اعلاء السنن، فقط والله تعالى اعلم

۲۵ ربیع الآخر ۱۴۰۲ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قال عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فانظروا حذوھا من طریقکم (بخاری)

تحریر الثقات لمحاذاۃ المیقات

- جدہ تک بلا احرام تجاوز کے عدم جواز کی مفصل بحث،
- محاذاۃ میقات کی تحقیق،
- بحری سفر میں یلملم کی محاذات کہاں ہوتی ہے؟

پاکستان اور ہندوستان کی میقات کی تحقیق

سوال: مولانا شیر محمد صاحب سندھی مہاجر مدینہ منورہ نے اپنی کتاب "قرۃ العینین فی زیارۃ الحرمین" کے تکملہ میں اپنی تحقیق تحریر فرمائی ہے کہ ہندو پاکستان کے حجاج کی میقات یلملم نہیں بلکہ جدہ ہے، اس تحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ بحری جہاز یلملم کی محاذات سے حل میں داخل نہیں ہوتا، بلکہ حل سے باہر ہی آفاق میں گھومتا ہوا جدہ پہنچتا ہے جو کہ حل سے خارج ہے، اس لئے کہ حل اس شکل مخمس کا نام ہے جو پانچ مواقیت کے نقاط کو خطوط مستقیمہ کے ملانے سے حاصل ہوتی ہے، اور جدہ خط واصل بین الجحفۃ و یلملم سے خارج ہے، جس کا نقشہ یہ ہے:۔

شمال
مشرق
مغرب
جنوب
مکہ مکرمہ
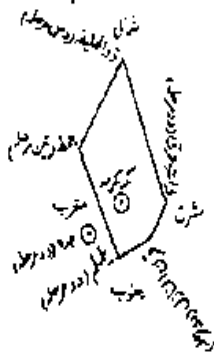
تکملہ قرۃ العینین میں مذکورہ دلائل میں سے عبارات ذیل میں یہ امر مصرح ہے کہ حل مخمس ہے، جو خطوط واصل بین نقاط المواقیت سے محاط ہے: ثم الحل الصغیر یبتدئ من اطراف من الحرم کل جهة ینتھی الی المواقیت کانھا مخمسة الشکل ان حرم الحرم ای المواقیت مثل الحرم محیط بما فی جوفه مثل الخطوط الممتدة بین النقاط فکما ان النقاط مواقیت فکذلک الخطوط بینھا الخ (رسالۃ الحج، مصنفہ ملا اخوند جان)
کیا یہ تحقیق صحیح ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب

یہ امر ظاہر اور معقول ہے کہ جب کسی خطۂ ارض کی حدود بیان کی جاتی ہیں تو ان حدود کے درمیان خطوط مستقیمہ کی محاط سطح ہی مراد ہوتی ہے، مگر بندہ کو مدت سے اس تحقیق پر چند اشکالات ہیں:۔

① اصطلاح میں محاذاتِ میقات کے معنی یہ ہیں کہ مستقبل مکہ مکرمہ کے دونوں کندھوں سے گزرنے والا خط میقات پر پہنچے،

② احکام شریعت کا مدار عرف پر ہے، جغرافیائی تدقیقات پر نہیں، پس اگر کوئی شخص

جحفہ کے قریب سے مکہ مکرمہ کی طرف جا رہا ہو تو اسے عرف میں جحفہ کی محاذات سے تجاوز سمجھا جائے گا، حالانکہ خط واصل بین الجحفۃ و یلملم بہت آگے چل کر آئے گا، اور خط واصل بین الجحفۃ وذی الحلیفۃ اس محاذات سے بہت قبل آجاتا ہے، وقس علیٰ ہذہ المواقیت الاُخر۔

③ کتب مناسک میں تحریر ہے کہ اگر دو میقاتوں کی محاذات سے گزر ہو تو دوسری میقات کی محاذات سے تجاوز بلا احرام جائز نہیں، اگر خط واصل بین المیقاتین کو معتبر قرار دیا جائے تو دونوں میقاتوں کی محاذات ہی ایک خط ہوگا، دو میقاتوں کی علیحدہ علیحدہ محاذات متصور نہیں ہو سکتی۔ قال فی الدر المنتقی ولو مر بمیقاتین فاحرامہ من الابعد افضل ولو اخرہ الی الثانی [illegible] علیہ ولو لم یمر بواحد منہا تحری واحرم اذا حاذی احدھما وابعدھما افضل فان لم یکن بحیث یحاذی فعلی مرحلتین (الدر المنتقی علی الملتقی ص ۲۶۱ ج ۱) وفی الہندیۃ وان سلک بین المیقاتین فی البحر او البر اجتہد واحرم اذا حاذی میقاتا منہما وابعدھما اولی بالاحرام منہ کذا فی التبیین (عالمگیریۃ ص ۲۲۱ ج ۱) وفی العلائیۃ ولو لم یمر بہا تحری واحرم اذا حاذی احدھما وابعدھما افضل فان لم یکن بحیث یحاذی فعلی مرحلتین (رد المحتار ص ۲۱۴ ج ۲)

④ قال فی البحر ولعل مرادھم بالمحاذاۃ المحاذاۃ القریبۃ من المیقات والا فآخر المواقیت باعتبار المحاذاۃ قرن المنازل (البحر الرائق ص ۳۴۳ ج ۲)

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ محاذات میقات سے مراد خط واصل بین المیقاتین نہیں بلکہ مکہ سے بعد بقدر بعد میقات مراد ہے، یعنی مکہ مکرمہ کو مرکز فرض کر کے میقات کے بعد پر دائرہ کھینچا جائے تو اس دائرہ کا محیط قوس محاذات میقات کہلائے گا۔

⑤ قال فی ارشاد الساری الی مناسک الملا علی القاری تحت قولہ (وان لم یعلم المحاذاۃ) فانہ لا یتصور عدم المحاذاۃ (فعلی مرحلتین من مکۃ) کجدۃ المحروسۃ من طرف البحر وقولہ کجدۃ فانہا علی مرحلتین عرفیتین من مکۃ و ثلاث مراحل شرعیۃ ووجہہ ان المرحلتین اوسط المسافات والا فالاحتیاط الزیادۃ کذا فی شرح نظم الکنز واقول لعل وجہہ ایضا ان اقرب المواقیت الی مکۃ علی مرحلتین عرفیتین من مکۃ فقدر بذلک واللہ اعلم کذا فی لطوالع الانوار للعلامۃ الشیخ محمد عابد السندی (ارشاد الساری ص ۵۱)

یعنی جس شخص کو باوجود تحری کے محاذات کا علم نہ ہو سکے وہ مکہ سے دو مرحلے کے فاصلہ
پر احرام باندھے جس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے اور معقول ہے کہ آخر المواقیت (قرن المنازل)
مکہ سے دو مرحلے پر ہے (یعنی مکہ سے آفاقی کا کم از کم فاصلہ دو مرحلہ ہے) حالانکہ خط واصل
بین الجحفۃ ویلملم کا مکہ سے فاصلہ دو مرحلے سے بہت کم ہے۔

۲ عبارات ذیل سے ثابت ہوتا ہے کہ جدہ حل میں ہے۔

(۱) وقیدنا بقصد مکۃ لان الآفاقی اذا قصد موضعا من الحل کخلیص یجوز
له ان یتجاوز المیقات غیر محرم واذا وصل الیه التحق باهله (الی ان قال)
وهذه المسألة یکثر وقوعها فیمن یسافر فی البحر الملح وهو مأمور بالحج ولم
یکن بوصوله فی وسط السنة فهل له ان یقصد البندر المعروف بجدة لیدخل
مکۃ بغیر احرام حتی لایطول الاحرام علیه ثم یحرم بالحج فان المأمور بالحج
لیس له ان یحرم بالعمرۃ (بحر ص ۳۴۲ ج ۲)

(۲) قال ابن عابدین رحمه الله تعالیٰ فی حاشیته علی البحر (قوله فلا یدخل
الحرم عند قصد النسك الا محرما) قال العلامة الشیخ قطب الدین
فی منسکه ومما یجب التیقظ له سکان جدة بالجیم واهل حدة بالمهملة
واهل الاودیة القریبة من مکة فانهم فی الاغلب یأتون الی مکة فی سابع
ذی الحجة او فی الثامن بغیر احرام ویحرمون من مکة للحج فعلی من
کان حنفیا منهم ان یحرم بالحج قبل ان یدخل الحرم والا فعلیه دم
لمجاوزة المیقات بغیر احرام (بحر ص ۳۴۲ ج ۲)

(۳) قال الملا علی القاری فی مناسکه (ومن جاوز وقته) ای الذی وصل
الیه سالکه (یقصد مکانا فی الحل کبستان بنی عامر او جدة او حدة
مثلا بحیث لم یمر علی الحرم ولیس له عند المجاوزة قصد ان یدخل
الحرم بعد دخول المکان (ثم بداله) ای ظهر وعن له ان یدخل مکة)
ای او الحرم ولم یرد نسکا حینئذ (فله ان یدخلها) ای مکة وکذا
الحرم (بغیر احرام) وفیه اشکال اذ ذکر الفقهاء فی حیلة دخول الحرم بغیر احرام
ان یقصد بستان بنی عامر ثم یدخل مکة وعلی ماذکره المصنف

وحرمها ثم تحصل الحيلة كما لا يخفى فالوجه في الحيلة ان يقصد البستان

قصدا اوليا ولا يضره قصد دخول الحرم بعده قصدا ضمنيا او عارضيا كما اذا

قصد مدينة جدة لبيع وشراء اولا ويكون في خاطره انه اذا فرغ منه ان يدخل

مكة ثانيا بخلاف من جاء من الهند مثلا بقصد الحج اولا وانه يقصد

دخول جدة تبعا ولو قصد بيعا وشراء (مناسک ملا علی قاری ص ۵۹)

(۲) وقال العلائي انما يقصد موضعا من الحل كخليص وجدة حل له مجاوزته

بلا احرام فاذا حل به التحق باهله فله دخول مكة بلا احرام وهو الحيلة

لمريد ذلك الا لمأمور بالحج للمخالفة (رد المحتار ص ۱۵۸ ج ۲)

ان عبارات کا یہ جواب صحیح نہیں کہ جدہ میقات ہے، اور مواقیت حل میں داخل ہیں،
اور اہل مواقیت کے احکام بھی وہی ہیں جو اہل حل کے ہیں، اس لئے کہ جدہ خط واصل بین
المواقیت سے خارج کافی دور واقع ہے، لہذا تحقیق مذکور کی بناء پر اسے میقات قرار دے کر
بحکم حل کہنا صحیح نہیں، پس اب محاذات کی صرف دو صورتیں ہو سکتی ہیں:

① جو اشکال اول میں مذکور ہوئی یعنی مستقبل مکہ مکرمہ کے دونوں کندھوں پر سے گذرنے والا
خط میقات پر پہنچے،

② اشکال چہارم میں بحر کی عبارت کا مفہوم یعنی وہ مقام جس کی مسافت میقات کی
مسافت کے برابر ہو،

محاذات کی ان دونوں تفسیروں کا مصداق تقریباً ایک ہی ہے، استقبال مکہ مکرمہ کی
حالت میں جس مقام پر دائیں یا بائیں جانب سے میقات کی مسافت ہوگی تقریباً اس کی
مسافت بھی مساوی ہوگی، البتہ یلملم اور رابغ کے درمیان سمندر میں جدہ کی طرف جاتے ہوئے
ایسی صورت پیش آسکتی ہے جس میں مقام مساوی المسافۃ سے بہت آگے جا کر رابغ یا یلملم
سے مسافت ہوتی ہے، جیسا کہ نقشہ سے ظاہر ہے،

شیخ احمد بن حجر الہیتمی المکی نے "تحفۃ المحتاج بشرح المنہاج" میں اس صورت کو "فان لم
یکن بحیث یحاذی فعلی مرحلتین من مکۃ" کا مصداق قرار دیا ہے، مگر چونکہ دو سے
میقات کی مسافت کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے، خصوصاً جب کہ مابین یا پہاڑ یا سمندر
کا بُعد حائل ہو، مزید براں اس میں ایک دقت یہ بھی ہے کہ مسافت کی تعیین استقبال مکہ مکرمہ

پر موقوف ہے، ورنہ ضروری نہیں کہ ہر راستہ مکہ مکرمہ کی طرف سیدھا آتا ہو، اس کے برخلاف مسافت کی تعیین سہل ہے، اور اس میں احتیاط بھی ہے، کیونکہ مساواۃ مسافت، مسامتت سے کچھ قبل ہی ہو جاتی ہے، اور سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ مسئلہ محاذات کی اصل بنیاد حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول "فانظروا حذوها من طریقکم" اور آپ کا ذات عرق کی تعیین فرمانا ہے، آپ کے اس قول و عمل سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ محاذات میں مسامتت کی بجائے مساواۃ مسافت کا لحاظ کیا جائے گا، کما سیاتی ان شاء اللہ تعالیٰ، اسی لئے اکثر فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ نے محاذات میں مساواۃ مسافت ہی کا اعتبار کیا ہے۔

غرضیکہ ابن حجر ہیتمی نے محاذات میں اصل اعتبار مسامتت کا کیا ہے، چونکہ یہ اکثر حالات میں تقریباً مساواۃ مسافت کو مستلزم ہے، اس لئے انہوں نے بار بار مساواۃ مسافت کا بھی ذکر کیا ہے، اور جہاں ان دونوں میں تفاوت کی صورت پیدا ہوئی اسے "فان لم یکن بحیث یحاذی الخ" سے حل کر دیا، اور جمہور فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ نے اصل مدار ہی مساواۃ مسافت پر رکھا ہے، اس صورت میں عدم محاذاۃ متصور ہی نہیں ہو سکتی، اسی لئے وہ "فان لم یکن بحیث یحاذی" کی تفسیر یوں فرماتے ہیں "ای فان لم یعلم المحاذاۃ فانہ لا یتصور عدم المحاذاۃ نعلی مرحلتین" یعنی تحری کامل کے باوجود بھی محاذات کا فیصلہ نہ کر سکے تو مکہ مکرمہ سے دو مرحلے کے فاصلہ پر لازماً احرام باندھ لے۔

محاذات کی تفسیر میں معمولی اختلاف صرف تکمیل فائدہ کے لئے لکھ دیا ہے، ورنہ مسئلہ زیر بحث پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا، تفسیر محاذات سے متعلق چند عبارات تحریر کی جاتی ہیں:

① حاذی میقاتا ای سامتہ بان کان علی یمینہ او یسارہ (تحفۃ المحتاج علی هامش حاشیة الشروانی ص ۴۲ ج ۴)

② ولعل مرادهم بالمحاذاۃ القریبة والا فآخر المواقیت باعتبار المحاذاۃ قرن المنازل (البحر الرائق ص ۳۲۲ ج ۲)

③ قول عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فانظروا حذوها من طریقکم فحد لهم ذات عرق، قال فی النهایة ذات عرق حذو قرن المنازل والحذو الازاء والمقابل ای انها محاذیتها وذات عرق میقات اهل العراق وقرن میقات اهل نجد ومسافتهما من الحرم سواء (نهایة لابن اثیر ص ۲۲۲ ج ۱)

تحریر الثقات ——— ۰

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قرن المنازل کی محاذات میں ذات عرق کی تعیین مسافت کی تعیین سے فرمائی تھی، "من طریقکم" کی تفسیر اگرچہ بعض شارحین نے "من غیر میل" سے بھی کی ہے، مگر اس کے مقبول معنی یہ ہیں کہ مسافت انسان کی بجائے محاذات مقام یعنی مساوات مسافت کا اندازہ کیا جائے۔

④ واما اذا قصد ها من طریق غیر مسلوک فانہ یحرم اذا بلغ موضعا یحاذی میقاتا من ھذہ المواقیت لانہ اذا حاذی ذلک الموضع میقاتا من المواقیت صار فی حکم الذی یحاذیہ فی القرب من مکۃ ولو کان فی البحر صار فی موضع لو کان مکان البحر بر لم یکن لہ ان یجاوزہ الا باحرام فانہ یحرم کذا قال ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ (بدائع ص ۱۶۴ ج ۲)

اس عبارت میں محاذات انسان کی بجائے محاذات مقام ذکر کرنے میں بھی اسی طرف اشارہ ہے کہ محاذات میقات معلوم کرنے کا اصل طریقہ یہی ہے کہ مقام کی مسافت کا اندازہ کیا جائے۔

⑤ وخرج بقولنا الی جہۃ الحرم ما لو جاوزہ یمنۃ او یسرۃ فلہ ان یؤخر احرامہ لکن بشرط ان یحرم من محل مسافتہ الی مکۃ مثل مسافۃ ذلک المیقات وبہ یعلم ان الجائی من الیمن فی البحر لہ ان یؤخر احرامہ من محاذاۃ یلملم الی جدۃ لان مسافتہا الی مکۃ کمسافۃ یلملم کما صرحوا بہ بخلاف الجائی فیہ من مصر لیس لہ ان یؤخر احرامہ عن محاذاۃ الجحفۃ لان کل محل من البحر بعد الجحفۃ اقرب الی مکۃ منہا فتنبہ لذلک فانہ مہم (تحفۃ المحتاج علی ہامش حاشیۃ الشروانی ص ۴۵ ج ۴)

⑥ علامہ سید غلام علی بلگرامی متوفی ۱۲۰۰ھ مآثر الکرام میں سید قادری بلگرامی سے نقل فرماتے ہیں "معنی محاذات این است کہ مسافت از جائیکہ احرام بستہ شود تا مکہ برابر مسافت مابین میقات ومکہ باشد۔"

ان عبارات میں تصریح ہے کہ محاذات میقات سے مراد مساوات مسافت ہے، یعنی مواقیت کی محاذات خط مستقیم کی بجائے بشکل دائرہ ہوگی، بایں طور کہ مکہ مکرمہ کو مرکز فرض کر کے ہر میقات کے بُعد پر دائرہ کھینچا جائے، اگر دو میقاتیں قرب و بُعد میں مختلف ہوں تو دونوں کے درمیان دو قوسیں ہوں گی، ان میں سے ایک قوس میقات ابعد کی محاذات اور دوسری قوس میقات اقرب کی محاذات شمار ہوگی، جس کا نقشہ یوں ہوگا:

كما نبه عليه تلميذه عبد الرؤف بن يحيى الزمزمي، وقال محمد بن
الحسن وتواحبر الشيخ رحمه الله تعالى بحقيقة الأمر ما افتى به قال الشيخ
على بن الجمال وما في التحفة مبني على اتحاد المسافة الظاهر من كلامهم
فإذا تحقق التفاوت فهو قائل بعدم الجواز قطعا بدليل صريح كلامه
النص في ذلك انتهى وأيضا كل محل من البحر بعد رأس العلم أقرب إلى
مكة من يلملم وقد قال ابن الشيخ في الجحفة ونص عبارته بخلاف الجائي
فيه من مصر ليس له أن يؤخر إحرامه من محاذاة الجحفة لأن كل
محل من البحر بعد الجحفة أقرب إلى مكة منها انتهى (حاشية الشرواني على التحفة ص ۴۲ ج ۴)

⑤ آجکل کی جدید ترین تحقیقات اور سعودی حکومت کے مصدقہ نقشوں سے بھی یہ امر قطعی طور پر ثابت ہو گیا ہے کہ یلملم تقریباً ساٹھ میل کی مسافت پر ہے،

مندرجہ بالا نصوص کے مقابلہ میں صرف ابن حزم کا تیس میل کا قول قابل قبول نہیں، لہٰذا اسے یا تو سہو ناسخ پر محمول کیا جائے گا یا میلوں کی مقدار میں اختلاف پر، تاج العروس میں سرین کے بارے میں دو قول نقل کئے ہیں، تین میل اور چھ میل، دونوں میں تضعیف وتنصیف کی نسبت ہے، نیز حاشیۂ شروانی علی التحفہ میں ہے کہ یلملم کے قریب ایک اور پہاڑ ہے، جو کہ مکہ مکرمہ کی طرف ممتد ہے، اس کی آخری طرف مکہ مکرمہ سے دو مرحلے سے بھی کم ہے، بعض نے اس پہاڑ کو یلملم سمجھ کر قرب مسافت کا قول نقل کیا ہے جو صحیح نہیں۔ (ص ۴۶ ج ۴)

بعض حضرات کا خیال ہے کہ مساوات مسافت باعتبار مراحل کے لی جائے گی، میلوں کا فرق غیر معتبر ہے، اس لحاظ سے جدہ اور یلملم کی مسافت مساوی ہے، یہ خیال محاذات کی مذکورہ بالا دونوں تفسیروں کے خلاف ہونے کے علاوہ عبارات فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ کے بھی خلاف ہے،

قال الشروانی ان مبنی المواقیت علی التقریب کلام التحفة والنهاية والمغنی وغيرهم صريح فی خلافه (حاشية الشروانی علی التحفة ص ۴۲ ج ۴)

آگے یہ بحث رہ جاتی ہے کہ جدہ پہنچنے سے قبل یلملم کی محاذات جہاں سے بدون احرام آگے بڑھنا جائز نہیں کس مقام پر ہوتی ہے؟ سو معتبر اور مصدقہ نقشوں کے ملاحظہ اور

بحری جہاز کے کپتان کی بہ ممکن تحقیق کے بعد یہ ثابت ہوا کہ یلملم کی محاذات کا راستہ جدہ سے تقریباً ساٹھ میل قبل سمندر کے ساحل پر پہنچتا ہے، مگر ساحل تقریباً پندرہ میل کے عرض میں غیر محفوظ ہے، اس لئے جہاز ساحل سے دور رہتا ہے، اس صورت میں جدہ سے تقریباً تیس میل قبل یلملم کی محاذات (مساوات مسافت) آتی ہے، مگر آئندہ چل کر شاید کسی وقت ساحل محفوظ ہو جائے، نیز کشتیوں پر بھی سفر ہوتا ہے جو اس وقت بھی ساحل کے قریب سے گزر سکتی ہیں، لہٰذا جدہ سے ساٹھ میل قبل ہی مقام احرام قرار دینا لازم ہے، فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

رشید احمد

۲۱ر جمادی الآخرۃ سنہ ۱۳۸۲ھ

تحریرالثقات ————

مسائل حج سے متعلق مفصل و مختصر بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں جن میں اس رسالہ میں مندرج مسائل بھی متفرق طور پر موجود ہیں، معہذا ان مسائل میں عوام بلکہ خواص بھی غلطی کرتے ہیں اس لئے ان کو الگ کتابچہ کی صورت میں ہر سال حجاج کرام میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

حج کے بعض ضروری مسائل

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(۱) بحری جہاز جب کنارے کے ساتھ لگا ہوا ہو اس میں نماز کا جواز مختلف فیہ ہے، مگر جواز راجح ہے، لہٰذا جہاز سے اُتر کر نماز پڑھیں، اگر جہاز کا عملہ اُترنے کی اجازت نہ دے تو جہاز ہی میں نماز پڑھ لیں، مگر جہاز چلنے کے بعد اس کا اعادہ کریں، چونکہ کنارے لگے ہوئے جہاز میں نماز کے جواز کا بھی ایک قول ہے، اس لئے اس مسئلہ میں دوسروں پر شدت نہ کریں، خود احتیاط کریں۔

ہوائی جہاز میں پرواز سے قبل نماز صحیح ہو حالتِ پرواز میں بلا ضرورت صحیح نہیں البتہ اگر خطرہ ہو تو وقت بچانے کو پڑھ لیں بعد میں اعادہ واجب ہے۔

(۲) احرام کا لباس پہن کر سر ڈھانپ کر نفل پڑھیں، پھر سر کھول کر تلبیہ پڑھیں۔

(۳) عورتیں احرام میں سر پر رومال باندھنا ضروری سمجھتی ہیں اور اس کو احرام سمجھتی ہیں یہ جہالت اور بدعت ہے، غیر محرم سے سر اور چہرے کا پردہ فرض ہے، اور بالوں کی حفاظت کے لئے سر پر رومال باندھنا بھی فی نفسہ جائز ہے، مگر چونکہ عوام اس کو احرام سمجھنے لگے ہیں اور رومال باندھنے سے ان کے غلط عقیدے کی تائید ہوتی ہے اس لئے بہر صورت اس سے احتراز لازم ہے، پردے کے لئے برقع یا چادر کافی ہے، نقاب یا چادر چہرے پر اس طرح لٹکائیں کہ کپڑا چہرے سے نہ چھوئے، بعض عورتیں وضو کے وقت بھی سر سے رومال نہیں کھولتیں اور رومال پر مسح کر لیتی ہیں ان کا نہ وضو ہوتا ہے نہ نماز۔

(۴) مسجد میں پانی کی خرید سے احتراز کریں۔

(۵) حالتِ احرام میں حجرِ اسود کا بوسہ نہ لیں اور نہ ہاتھ لگائیں کیونکہ اس میں خوشبو لگی ہوتی ہے۔

(۶) طواف کے دوران حجرِ اسود کا بوسہ لینے کے لئے انتظار نہ کریں، بلکہ موقع مل جائے تو بہتر ورنہ دور سے ہاتھوں سے اشارہ کر کے ہاتھوں کو چوم لیں ٹھہریں نہیں کیونکہ طواف کے درمیان ٹھہرنا خلافِ سنت ہے، البتہ طواف کے شروع یا بالکل آخر میں بوسہ کے انتظار میں ٹھہرنے میں مضائقہ نہیں۔

(۷) حجرِ اسود کو بوسہ دیتے وقت چاندی کے حلقہ پر ہاتھ نہ رکھیں۔

(۸) حجرِ اسود کا بوسہ اس حالت میں جائز نہیں جبکہ ازدحام کی وجہ سے اپنے نفس کو یا کسی دوسرے کو تکلیف پہنچنے کا خطرہ ہو اور عورتوں کے لئے اس حال میں حجرِ اسود چومنا بالکل حرام ہے جبکہ اجنبی مردوں کے ساتھ جسم لگنے کا احتمال ہو۔

⑨ جب حجرِ اسود کی طرف منہ کریں تو اسی حالت میں دائیں جانب کو ہرگز نہ سرکیں بلکہ پہلے دائیں طرف کو گھوم جائیں اور پھر آگے چلیں۔

⑩ طواف کرتے وقت بیت اللہ سے اتنا ہٹ کر چلیں کہ جسم کا کوئی حصہ بیت اللہ کی بنیاد پر سے نہ گزرے۔

⑪ طواف میں رکن یمانی کو بوسہ نہ دیں، بلکہ اس کی طرف سینہ پھیر کر دونوں ہاتھ یا صرف داہنا ہاتھ لگائیں، وہاں ہاتھ نہ لگا سکیں تو یہاں نہ لگائیں اور نہ ہی دور سے اشارہ کریں۔

⑫ عورتوں کو ایسے ہجوم کے وقت طواف کرنا جائز نہیں جس میں مردوں کے ساتھ جسم لگنے کا اندیشہ ہو، دوسرے اوقات میں بھی مردوں سے باہر کی طرف مطاف کے کنارے کے قریب طواف کریں۔

⑬ مکہ مکرمہ میں ہوتے ہوئے طواف کے برابر کوئی نفل عبادت نہیں، خوب طواف کریں۔

⑭ عورتوں کے لئے مسجد نبوی اور مسجد حرام میں نماز پڑھنے سے اپنے مکان میں پڑھنا زیادہ ثواب ہے۔

⑮ حرمین شریفین میں کئی حضرات اس پریشانی میں رہتے ہیں کہ نماز کی جماعت میں کوئی عورت آگے یا ساتھ یا ان کے آگے نہ کھڑی ہو، ان کو پریشان نہیں ہونا چاہئے، اس لئے کہ اس صورت میں مرد کی نماز تب فاسد ہوتی ہے کہ امام نے عورتوں کی امامت کی بھی نیت کی ہو اور اس کا یقین نہیں، اسلئے کہ وہاں کے علماء کے ہاں عورتوں کی نیت ضروری نہیں، لہٰذا مردوں کی نماز ہوجائے گی، البتہ مردوں کی صف میں کھڑی ہونے والی عورت کی نماز نہ ہوگی۔ بلکہ امام عورتوں کی نیت نہ کرے تو مردوں کے پیچھے کھڑی ہونے والی عورتوں کی نماز میں بھی اختلاف ہے، عدم صحت راجح ہے، مع ہذا اختلاف کے پیش نظر دوسروں پر شدت نہ کریں، خود احتیاط کریں، تفصیل میرے رسالہ "المشکاۃ لمسائل المحاذاۃ" میں ہے۔

⑯ منیٰ، عرفات اور مزدلفہ میں نماز امام کے ساتھ نہ پڑھیں، کیونکہ وہ مسافر شرعی نہ ہونے کے باوجود قصر کرتے ہیں، لہٰذا الگ خیمہ میں جماعت کریں۔

⑰ عرفات سے واپسی پر بعض گاڑی والے مزدلفہ کی حد شروع ہونے سے قبل ہی اتار دیتے ہیں، مسجد مشعر الحرام سے کچھ پہلے سڑک پر جہاں مزدلفہ کا بورڈ لگا ہوا ہے اس سے آگے گزر کر اتریں۔

⑱ مزدلفہ میں معلم اپنی سہولت کے لئے فجر کی اذان قبل از وقت دلاتے ہیں، اس وقت فجر کی نماز صحیح نہیں ہوتی، اور صبح صادق سے قبل مزدلفہ سے نکلنے پر دم واجب ہوگا، صبح صادق کا یقین ہونے کے بعد فجر کی نماز پڑھیں، اور اس کے بعد مزدلفہ سے نکلیں، ۸ ذی الحجہ کو مسجد حرام میں جماعت قائم ہونے کا وقت محفوظ کرلیں، اور اس کے بھی پانچ منٹ بعد مزدلفہ میں فجر کی نماز پڑھیں۔

⑲ عورت پر خود رمی کرنا لازم ہے، اگر اس کی طرف سے مرد رمی کرے گا تو صحیح نہ ہوگی، اور عورت پر دم

واجب ہوگا۔

(۱۰) رمی اور قربانی میں اتنی جلدی کرنا کہ ازدحام کی وجہ سے اپنے نفس کو یا کسی دوسرے کو تکلیف پہنچنے کا خطرہ ہو حرام ہے۔ غروب سے کچھ قبل اطمینان سے رمی کریں۔ اگر اس وقت بھی سخت ازدحام ہو تو غروب کے بعد رمی کریں، ایسی حالت میں غروب کے بعد رمی کرنے میں کوئی کراہت نہیں۔

(۱۱) رمی کرتے وقت کنکریاں پتھروں کے گرد جو دیوار ہے اس کے احاطہ میں پھینکیں، اگر پتھر کو کنکری ماری اور وہ پتھر سے ٹکرا کر احاطہ کے اندر گر گئی تو رمی درست ہوگئی، اور اگر باہر گری تو صحیح نہیں ہوئی، دوبارہ ماریں۔

(۱۲) بارہویں ذی الحجہ کو بہت سے لوگ زوال سے قبل ہی رمی کر کے مکہ مکرمہ چلے جاتے ہیں، ان کی رمی نہیں ہوئی، اس لئے ان پر دم واجب ہوگا۔

(۱۳) حج تمتع یا قران میں جو جانور منیٰ میں ذبح کیا جاتا ہے اسے "دمِ شکر" کہتے ہیں اور یہ عید کی قربانی سے الگ واجب ہے، حاجی پر سفر کی وجہ سے عید کی قربانی واجب نہیں، البتہ اگر کوئی ۸ ذی الحجہ سے کم از کم ۱۵ روز قبل مکہ مکرمہ میں آ کر رہا تو وہ مقیم ہوگیا، اس لئے قربانی کے دنوں میں اگر وہ صاحب نصاب ہو تو اس پر دم شکر کے علاوہ عید کی قربانی بھی واجب ہے، خواہ منیٰ میں ذبح کرے یا اپنے وطن میں کرا لے، اگر کسی نے دم شکر کو عید کی قربانی سمجھ کر ادا کیا تو دم شکر ادا نہیں ہوا، اگر دم شکر ادا کرنے سے پہلے احرام کھول دیا تو اس پر دم شکر کے علاوہ ایک اور دم بھی واجب ہو جائے گا، اور اگر ایام نحر کے اندر دم شکر نہیں دیا تو تاخیر کی وجہ سے تیسرا دم واجب ہو جائے گا، اس طرح اسے چار جانور ذبح کرنے پڑیں گے۔

(۱۴) احرام کھولنے کے لئے سر منڈائیں، یا کم از کم چوتھائی سر کے بال انگلی کے پورے کی لمبائی کے برابر کٹائیں، اگر بال اتنے چھوٹے ہوں کہ انگلی کے پورے کی لمبائی کے برابر نہ کاٹے جا سکیں تو ان کا منڈانا ضروری ہے، کاٹنے سے احرام نہ کھلے گا۔

(۱۵) صفا اور مروہ پر زیادہ اوپر چڑھنا جہالت ہے۔

(۱۶) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے حاضری کے لئے دھکا بازی خصوصاً عورتوں کا غیر محرموں کے ہجوم میں داخل ہونا حرام ہے، ایسی حالت میں دور سے سلام پڑھیں۔

مسائل حج —————— ۲

طواف کی دُعائیں

طواف کے چکروں میں جو دعائیں پڑھنے کا عام دستور ہوگیا ہے ان کا شریعت میں کوئی ثبوت نہیں، چکروں کی تخصیص کے بغیر صرف چند ایک کی ضعیف روایت ملتی ہے البتہ ایک دو دعائیں قابلِ اعتماد روایت سے ثابت ہیں مگر ان کی بھی کسی چکر کے ساتھ تخصیص ثابت نہیں۔

وجوہ ذیل کی بنا پر چکروں کی دعائیں پڑھنا بدعت اور گناہ ہے:

① جو عمل ضعیف حدیث سے ثابت ہو اس کو سنت سمجھنا بدعت اور ناجائز ہے جبکہ یہ دعائیں کسی ضعیف حدیث سے بھی ثابت نہیں، اور عوام و خواص ان کو سنت سے بھی بڑھ کر فرض سمجھتے ہیں، اس لئے یہ بہت خطرناک بدعت اور بہت بڑا گناہ ہے۔

② ان دعاؤں کے التزام اور دینی اداروں کی طرف سے ان کی روز افزوں اشاعت کی وجہ سے عوام ان کو ضروری سمجھنے لگے ہیں، ایسی حالت میں امر مندوب بھی مکروہ ہوجاتا ہے چہ جائیکہ جس کا ثبوت ہی نہ ہو۔

③ اکثر لوگوں کو دعائیں یاد نہیں ہوتیں، طواف میں کتاب دیکھ کر پڑھتے ہیں، اور ازدحام میں کتاب پڑھتے ہوئے چلنے سے خشوع نہیں رہ سکتا۔

④ ازدحام میں کتاب پر نظر رکھنا اپنے لئے اور دوسروں کے لئے بھی باعث ایذاء ہے بالخصوص دعاؤں کی خاطر جتھوں کی صورت میں چلنا سخت تکلیف دہ ہے جو حرام ہے۔

⑤ جتھوں کی صورت میں چلا چلا کر دعائیں پڑھنے سے دوسروں کے خشوع میں خلل پڑتا ہے۔

⑥ عوام دعاؤں کے الفاظ صحیح نہیں ادا کر پاتے تو معلم جیسے کو رٹ کے الفاظ کہلوانے کی کوشش کرتے ہیں جبکہ طواف میں شعر نہ مکروہ تحریمی ہے، علاوہ ازیں اس صورت میں بعض لوگوں کی بیت اللہ کی طرف پشت یا سینہ ہو جاتا ہے یہ بھی مکروہ تحریمی ہے، اور اسی حالت میں کچھ آگے کو سرک گئے تو اتنے حصہ کے طواف کا اعادہ واجب ہے۔

اللہ کرے کہ علماء دین کو مفاسد مذکورہ کی طرف التفات ہو اور وہ اس بدعت شنیعہ و معصیت علانیہ کی اشاعت کی بجائے اس سے اجتناب کی تبلیغ کا فرض ادا کریں۔

انوار الرشید
فقیہ العصر شیخ الحدیث مفتی اعظم
حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب لدھیانوی دامت برکاتہم
کے
نصیحت آموز و بصیرت افروز حالات و ارشادات
جنکے مطالعہ سے ہزاروں کی زندگیوں میں ایسا انقلاب عظیم
آگیا کہ وہ دنیا کی بجائے جنت کمانے لگے ہیں.
اضافات کیساتھ
ایچ ایم سعید کمپنی ادب منزل پاکستان چوک کراچی